قیامِ پاکستان کے بعد حکمرانوں اور سیاستدانوں کی منتخب آپ بیتیاں: تحقیق و تنقید

تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی (اُردو)

مقالہ نگار:

محمد سلیم (پی ایچ۔ڈی ریسرچ سکالر)

آئی۔ڈی: ۱۰۸۰۸

نگران:

پروفیسر ڈاکٹر سلمان علی

قرطبہ یونیورسٹی آف سائنس اینڈ انفارمیشن ٹیکنالوجی حیات آباد پشاور

سال: ۱۷-۲۰۱۶ء

فہرستِ ابواب

دیباچہ

آپ بیتی اُردو ادب کی قدیم مگر اہم صنف ہے جو ہمیشہ سے لوگوں کی توجہ کی محور رہی ہے۔ جدید دَور میں آپ بیتیوں کا مطالعہ تاریخی، سیاسی، سماجی، ادبی اور نفسیاتی لحاظ سے ادب کی ایک اہم شاخ کے طور پر سامنے آیا ہے۔ آپ بیتی میں ہمیں ماضی کے واقعات، تاریخ کے سفر، نجی حالات، بود و باش، رسوم و رواج، عقائد و نظریات، پسند و مشاغل، خاندانی پس منظر اور بھرپور ادبی چاشنی ملتی ہے اِس لیے آپ بیتی تمام اصناف نثر کا احاطہ کر کے ادب عالیہ کا مقام حاصل کر لیتی ہے۔

اُردو ادب میں آپ بیتی فارسی زبان کے راستے آئی۔ ڈائری یا روز نامچہ، ملفوظات، مکتوبات، تذکرے، سفر نامے اور سوال نامے وغیرہ آپ بیتیوں کی قدیم صورت ہیں تاہم اُردو میں آپ بیتی کا سلسلہ اُنیسویں صدی کے آخر سے شروع ہوتا ہے۔ اِس دوران سیاسی، سماجی، تہذیبی، تاریخی، ادبی، لسانی، مذہبی اور کئی موضوعات پر آپ بیتیاں ظہور میں آئیں۔ آپ بیتیاں جہاں اظہارِ ذات کی عکاسی کرتی ہیں وہاں آپ بیتی نگار کے اعتقاد، ماحول، خاندان، اپنے قریب ترین افراد کے تذکرے اور نصب العین سمجھنے میں بھی معاون ہوتی ہیں۔ ادب کے علاوہ بھی آپ بیتیوں میں ہمیں وہ کچھ ملتا ہے جو تاریخ کے صفحات میں بھی نہیں مل سکتا۔ اِن کے مطالعے سے تاریخ کی کئی اُلجھنیں دُور ہو سکتی ہیں۔ اُردو کی تقریباً تمام قدیم و جدید آپ بیتیوں میں تاریخ، سیاست اور معاشرت کا وہ رنگ جھلکتا ہے کہ اگر ان آپ بیتیوں کو سامنے رکھ کر تاریخ مرتب کی جائے تو غیر مسلموں کی پیدا کردہ زیادہ تر غلط فہمیاں دُور ہو کر اِس برِاعظم کی تاریخ کی شکل تبدیل ہو جائے گی۔ آپ بیتی لکھنے والا خود اپنی تحریر کا مرکزی کردار ہوتا ہے لیکن جن لوگوں کا وہ ذکر کرتا ہے اُن کی خوبیاں اور خامیاں بھی اُجاگر کر کے اُنہیں زندہ و جاوید کر دیتا ہے۔ ایک کامیاب آپ بیتی نگار متانت اور سنجیدگی سے بغیر کسی مبالغے کے حقائق اور صداقتیں مؤثر انداز سے بیان کرتا ہے۔ اُس کے عہد میں کیا انقلابات آئے، کون کون سی تحریکیں اُٹھیں، کس سیاسی جماعت کا کیا کردار رہا، پرانی قدریں کیسی مٹ گئیں اور نئی بستیاں کیسے اور کیونکر آباد ہوئیں۔ اِن سب سوالات کا جواب آپ بیتی کی ہر منزل پر نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ بیتی ہر طرح کے قاری کے لیے دلچسپی کا سامان بن جاتی ہے۔ ہر زبان کی آپ بیتی عموماً اپنے زمانے کے کامیاب افراد، سیاستدان، نامور سپاہی، برگزیدہ ہستیاں، حکمران، وزراء اور بڑے تاجر تحریر کرتے ہیں۔ جن میں ان افراد کی زندگی کے نشیب و فراز پر روشنی پڑتی ہے اور معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کون سے اُصول تھے جن پر عمل کر کے اُن لوگوں نے زندگی کے تمام مسائل کا مقابلہ کر کے شہرت عام اور بقائے دوام حاصل کی۔ دراصل یہی وہ کتابیں ہیں جو اِس قابل ہیں کہ ملک کا ہر نوجوان اگر چاہے تو اِسے پڑھ کر اپنے اندر وہ خوبیاں پیدا کر سکتا ہے جو کامیابی کی معراج ہیں۔ ہر دَور اپنی مخصوص تہذیب رکھتا ہے۔ تاریخ کے بنیادی خد و خال تو صدیوں بعد تبدیل ہوتے ہیں مگر فروعی اور روزمرہ کی چیزیں ہمہ وقت تبدیل ہوتی رہتی

ہیں۔ جن کی نشاندہی عام تاریخی کتابیں نہیں کر سکتیں۔اِس کے لیے ہمیں آپ بیتیوں کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے جن کی مدد سے ہم کسی قوم، ملت اور ملک کی تہذیب کی ابتداء، ارتقا اور عہد بہ عہد ترقیوں کا ٹھیک اندازہ لگا سکتے ہیں۔ زندگی کی بہت سی باتیں، قومی راز، اہم انکشافات، سیاسی معلومات، اعصابی جنگیں اور اِس قسم کی سینکڑوں خفیہ باتیں جو کسی حکمران، سیاستدان اور قومی رہنما کے علم میں تو موجود ہوتی ہیں لیکن کاغذ پر نہ آسکنے سے معدوم ہو جاتی ہیں اور دنیا ان سے محروم رہتی ہے۔

افسوس یہ ہے کہ فکر کے موتی، علم و دانش کے آبگینے، ادبی فن پارے، شعر و شاعری کے اعلیٰ ٹکڑے اور علم و فضل کے بے مثال خزانے ضبط تحریر میں نہ آنے کے سبب دنیا کے سامنے نہ آسکے۔ اگر ہمارے یہاں بھی ترقی یافتہ معاشروں کی طرح آپ بیتیاں لکھنے کا عام رواج ہوتا تو قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ہمارا ادب کتنا ثروت مند ہوتا۔ اردو زبان میں اب تک جو آپ بیتیاں لکھی گئیں اُن میں مذہبی لوگوں، حکمرانوں، ججوں، وکیلوں، کھلاڑیوں، سپاہیوں، اعلی آفسروں (بیوروکریٹوں)، دانشوروں، صحافیوں اور تاجروں کی آپ بیتیاں قابل ذکر ہیں جنہوں نے ایک خاص نکتہ نظر سے اپنی سرگزشتیں تحریریں کیں ہیں۔ جہاں تک سیاست دانوں کا تعلق ہے تو حکمران اور سیاست دان ہمارے معاشرے کا وہ طبقہ ہے جو ملک کی تقدیر کا فیصلہ کرتا ہے۔ کسی بھی ملک کی علمی، سیاسی، سماجی، ادبی اور معاشی تاریخ میں سیاست دانوں کی خصوصی اہمیت ہوتی ہے۔اِن لوگوں کے سینوں میں ایسے راز ہوتے ہیں جو ہمیں کسی اور ذریعے سے معلوم نہیں ہوتے۔اِن کی باتیں، تجزیئے، مشاہدات اور تجربات کو لوگ حقیقت تسلیم کر کے اپنی رائے مرتب کرتے ہیں۔ یہ طبقہ اکثر یہ فیصلہ کرتا ہے کہ ہم عصر تاریخ کے حقائق کہاں تک صداقت پر مبنی ہیں۔ یہ لوگ جب ملکی اور بین الاقوامی حالات و واقعات کو ذاتی تجربے یا مشاہدے کی روشنی میں بیان کرتے ہیں تو اِن کے حوالوں کو بنیادی ماخذ کے طور پر لیا جاتا ہے۔ سیاستدان اور حکمران لوگوں کو بصیرت دیتے ہیں، نئے افکار، خیالات، تصورات اور الفاظ زبان کو دیتے ہیں جس سے نہ صرف زبان کا دائرہ پھیلتا ہے بلکہ سیاسی، لسانی، سماجی اور ادبی تاریخ بھی وسیع ہوتی ہے۔ سیاستدانوں کی لکھی ہوئی آپ بیتیوں میں اُن کی ذاتی زندگی کے نشیب و فراز کے ساتھ ساتھ اپنے وقت کی سیاسی، علمی، ادبی اور سماجی تاریخ کی شاندار جھلکیاں بکھری ہوتی ہیں۔ اگرچہ سیاسی آپ بیتیوں پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ مخصوص سیاسی نظریات کی ترویج کے لیے لکھی جاتی ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اِن آپ بیتیوں میں سیاسی موضوعات کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت کچھ موجود ہوتا ہے جو ہر مکتب فکر کے لوگوں کے لیے دلچسپ بھی ہے اور سبق آموز بھی۔ علاوہ ازیں حکمران اور سیاستدان عوامی اثاثے (پبلک پراپرٹی) تصور کیے جاتے ہیں اِس لیے ان کے مشاغل، پسند و ناپسند، تعلیم، خیالات و نظریات، نجی معاملات اور دیگر سرگرمیوں میں لوگ دلچسپی لیتے ہیں۔ دوران تحقیق

سیاستدانوں کی آپ بیتیوں کے کئی نئے رُخ ہمارے سامنے آئے جس سے معلوم ہوا کہ سیاسی آپ بیتیاں اپنی تخلیقی اہمیت کے سبب کیا قدر و قیمت رکھتی ہیں۔ یہ نہایت وسیع موضوع تھا۔ دورانِ تحقیق یہ بھی معلوم ہوا کہ ہمارے ملک کی تاریخ، سماجیات، سیاست اور تمام چھوٹے بڑے واقعات جس نے ہماری تاریخی، معاشرتی، ملی اور فکری رویوں کی سمت متعین کی کب، کیوں اور کیسے پیش آئے۔ کسی بھی قوم و ملت کے سیاسی رہنما صرف سیاسی رہنما نہیں ہوتے بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں لوگوں کی اصلاح، تبدیلی اور رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں اِس لیے رہنما کہلاتے ہیں۔ چنانچہ قائدِ اعظم محمد علی جناح، علامہ محمد اقبال، مہاتما گاندھی، نیلسن منڈیلا، ونسٹن چرچل، ماوزے تنگ، خان عبدالغفار خان وغیرہ صرف سیاسی لیڈر نہیں تھے بلکہ لوگ اِن سے نشست و برخاست، اندازِ گفتگو، اخلاقیات اور زندگی کے بنیادی اُصول بھی سیکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اِن کی زندگیوں کا ہر واقعہ اور آپ بیتیوں کا ایک ایک حرف قیمتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قوموں کے عروج و زوال کی تفصیلی داستان تاریخ کے پاس امانت رکھی ہوتی ہے۔ عروج و زوال کی تاریخ کے بنیادی ماخذ اُن لوگوں کی لکھی ہوئی دستاویزات، سرگزشتوں، سوانح حیات پر مشتمل ہوتے ہیں جو کسی ملک، قوم یا خاندان کی ترقی یا زوال کے اسباب کے بارے میں سوچتے ہیں اور ان کا تجزیہ کرتے ہیں۔ چنانچہ سیاستدانوں اور حکمرانوں کی آپ بیتیاں کسی بھی قوم کے ادب و تاریخ کا ایک اہم حصہ ہوتی ہیں جو نہ صرف ابتدا کے چشم دید گواہ اور عروج و زوال کے عینی شاہد ہوتے ہیں بلکہ بڑی حد تک تاریخ کو بنانے یا بگاڑنے کے عمل میں بھی براہِ راست شریک ہوتے ہیں۔ یہی وہ سبب ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آپ بیتیوں خصوصاً سیاسی آپ بیتیوں کی اہمیت اور زیادہ ہو گئی ہے۔ سیاستدانوں کی آپ بیتیوں کی اِن گوناگوں اہمیت کی وجہ سے ہم نے اِسے تحقیق کا موضوع بنایا تاہم حیران کن بات یہ ہے کہ اُردو میں آپ بیتی کی صنف جتنی مشہور ہے اِس لحاظ سے اِس پر تحقیقی کام نہیں ہوا۔ خصوصاً جرنیلوں، کھلاڑیوں، سرکاری آفسروں (بیوروکریٹوں)، صنعتکاروں اور سیاستدانوں کی آپ بیتیوں پر کوئی اہم سندی کام آج تک سامنے نہیں آیا۔ اُردو کے مختلف رسائل و جرائد یا اخباروں کے ادبی ایڈیشنوں میں بعض سیاستدانوں کی آپ بیتیوں پر مختصر تجزیے تو وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہتے ہیں مگر بہ حیثیت مجموعی پاکستان کے حکمرانوں اور سیاستدانوں کی آپ بیتیوں پر مفصل تحقیقی کام منظر عام پر نہیں آیا تھا۔ ہمارے ملک کے سیاستدانوں کی آپ بیتیاں اگرچہ اعلیٰ ادبی معیار کی حامل نہیں تاہم تاریخی، سماجی، سیاسی اور دیگر حوالوں سے تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہیں۔ دوسری بات یہ کہ یہ آپ بیتیاں اُردو زبان میں لکھی گئیں ہیں تو اِن سے کیسے چشم پوشی کی جا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اُردو اور تاریخ ادب اُردو کے ایک طالب علم کی حیثیت سے یہ فرض جانا کہ سیاسی آپ بیتیوں پر تحقیقی نوعیت کا کام ہو اِس سے پہلے کہ یہ زمانے کی دست بُرد کی زد میں آئیں۔ اُردو میں کئی سیاستدانوں

نے اپنی آپ بیتیاں لکھیں کیونکہ ہر مشہور آدمی زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر ضرور یہ سوچنے لگتا ہے کہ میں اپنے ارتقائی سفر اور زندگی کی کامیابیوں اور ناکامیوں میں دیگر لوگوں کو بھی شریک کروں۔اِس طرح وہ ذاتی طمانیت کے ساتھ ساتھ اپنے وقت کی تاریخی،ادبی، معاشرتی اور معاشرے کے دیگر حوادث کو بھی ریکارڈ پر لاتا ہے۔ ہم نے اِس تحقیقی مقالے میں ایک کڑا معیار رکھا اور صرف حقیقی سیاستدانوں کا انتخاب کیا۔ تھامس جیفرسن امریکہ کے بانیوں میں شامل مدبر اور دانشور گزرا ہے۔ اُس نے امریکی اعلان آزادی بھی تحریر کیا تھا۔ جیفرسن کا قول ہے کہ ''جو آدمی باقاعدہ عوام سے منتخب ہو کر پارلیمنٹ میں نہ آئے وہ سینیٹر ہو سکتا ہے، ٹیکنوکریٹ ہو سکتا ہے، پروفیشنل ہو سکتا ہے، خوشامدی یا چاپلوس ہو سکتا ہے لیکن حقیقی سیاستدان نہیں ہو سکتا''۔ چنانچہ ہم نے صرف اُن سیاستدانوں کا انتخاب کیا ہے جو ایک سے زیادہ مرتبہ عام انتخابات میں کامیاب ہو کر اسمبلی میں آئے تھے یا ملک کے صدر، وزرائے اعظم، وزرائے اعلیٰ یا گورنر کے منصب پر رہے تھے۔ جو سیاستدان اِس معیار پر پورا نہیں اُترے ہم نے اُن کی آپ بیتیوں کو اِس فہرست میں شامل نہیں کیا۔ لٰہذا حقیقی سیاستدانوں اور حکمرانوں کی آپ بیتیوں کو مد نظر رکھ کر ہم نے اِس مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔

پہلے باب میں آپ بیتی کا تعارف اور بنیادی مباحث درج کیے گئے ہیں۔آپ بیتی کی تعریف، فن آپ بیتی نگاری کی تاریخ اور ارتقا، اُردو آپ بیتی کی قدیم شکلیں اور ارتقا کے ادوار، آپ بیتی نگاری کے اُصول، اُردو آپ بیتیوں کے اسالیب، آپ بیتیوں کی قدر و قیمت، اِس کے فنی لوازمات اور اُردو آپ بیتی کی جدید اقسام کا تنقیدی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ نیز آپ بیتی اور سوانح عمری میں فرق بھی اِس باب میں شامل ہے۔

دوسرا باب مکمل آپ بیتیاں کے نام سے ہے جس میں وہ آپ بیتیاں شامل کی گئیں ہیں جس میں مصنف نے پیدائش سے آپ بیتی لکھنے کے زمانے تک زندگی کے تمام اہم اور چیدہ چیدہ واقعات بیان کیے ہیں۔اِن آپ بیتیوں میں مصنفین نے زندگی کی کہانی تاریخی تناظر میں بیان کی ہے اور اُن کی زندگیوں کے خاص خاص ادوار واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔اِن آپ بیتیوں میں مصنف اور اُس کا سماج پوری طرح چلتا پھرتا نظر آتا ہے۔ نیز یہ آپ بیتیاں بڑی حد تک فنِ آپ بیتی نگاری کے اُصولوں کے مطابق لکھی گئیں ہیں۔ ہم نے اِن آپ بیتیوں میں بڑی تفصیل سے لکھنے والوں کی ذاتی زندگی، خاندانی پس منظر، عقائد و نظریات اور سماجی تبدیلیوں کا جائزہ لیا ہے۔ تاریخی واقعات، سیاسی تبدیلیوں، محلاتی سازشوں، بغاوتوں، جنگوں، آئینی بحرانوں، فوجی حکومتوں اور جمہوریت کی ناکامی کے بارے میں ان کے مشاہدات اور آنکھوں دیکھے واقعات کا تنقیدی و تحقیقی مطالعہ پیش کیا ہے۔ نیز ہم نے اِن مکمل آپ بیتیوں میں یہ بھی تلاش کیا ہے کہ مصنفین نے کتنے انکشافات کیے ہیں، مبالغہ آرائی سے کس قدر کام لیا ہے اور ان کے ہاں خود نمائی یا نرگسیت کے عناصر کس حد تک موجود ہیں۔ ہم نے مکمل آپ بیتیوں

کے اسلوب،ادبی خصائص اور تحریر کے فکری و فنی خصوصیات کو بھی تلاش کر کے لکھا ہے۔

تیسرے باب میں جزوی آپ بیتیوں کو تحقیق کا موضوع بنایا گیا ہے۔ جزوی آپ بیتیوں سے مراد وہ آپ بیتیاں ہیں جو کسی مخصوص دور، حالات یا عنوان کے تحت لکھی گئیں ہوں اور جن میں مصنف نے ضمنی طور پر اپنی خود نوشت کو بھی مختصراً شامل کیا ہو۔ جزوی آپ بیتیاں یک رُخی اور سرسری ہوتی ہیں۔اِن کو پڑھ کر مصنف کی زندگی، پسند و مشاغل، فکری ارتقا اور شخصیت مکمل طور پر واضح نہیں ہوتی اور نہ اِس قسم کی آپ بیتیوں میں مصنف کی ذات کا کامل اظہار ہوتا ہے۔ صرف اِتنا ہے کہ جزوی آپ بیتیوں کے ذریعے مصنفین کے اہم کارناموں، نصب العین، جذباتی تموج، زندگی کی طرف مثبت یا منفی میلان اور شخصی کوائف پر روشنی پڑتی ہے۔ جزوی آپ بیتیوں میں ہم نے لکھنے والوں کے نجی حالات زندگی، تاریخی حقائق، معاشی اور اقتصادی حالات، سماجی تبدیلیوں، صداقت و واقعیت، اپنے اِرد گرد لوگوں کے احوال و واقعات نیز اُن کی کامیابیوں اور ناکامیوں کا احوال اُصول تحقیق کی روشنی میں درج کیا ہے۔ ہم نے اِن یادداشتوں میں زبان و ادب، تاریخ و سیاست، تہذیب و ثقافت اور سماجی تغیر و تبدل کے مختلف پہلوؤں کا بڑی عرق ریزی سے مطالعہ کیا ہے۔ علاوہ ازیں اِن آپ بیتیوں کے ادبی خصائص مثلاً اسلوب، انتخاب الفاظ، پیرایہ اظہار، رومانیت، پیکر تراشی، منظر نگاری پر بھی تنقیدی بحث کی گئی ہے۔ مختصراً یہ ساری آپ بیتیاں بڑی دلچسپ، بامقصد اور معلوماتی ہیں جن میں آپ بیتی نگاروں نے اپنی زندگی کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کے سیاسی، سماجی، معاشرتی، تہذیبی اور ثقافتی پس منظر سے ہمیں بڑی حد تک آگاہ کیا ہے۔

چوتھا باب ترجمہ شدہ آپ بیتیوں کے حوالے سے ہے۔اس باب میں وہ آپ بیتیاں شامل ہیں جو دیگر زبانوں سے اُردو میں ترجمہ کی گئیں ہیں۔ ترجمہ شدہ آپ بیتیوں میں اُٹھائے گئے مباحث مثلاً ذاتی حالات، خاندانی پس منظر، پسند و مشاغل، اِس مقام تک پہنچنے میں درپیش مشکلات، وہ عوامل جس نے اُنہیں سیاست کا راستہ دِکھایا اور اِس طرح کے دیگر واقعات کو تحقیق و تنقید کے کسوٹی پر پرکھا گیا ہے۔ مصنفین نے زندگی کے سفر میں جن اہم واقعات، حالات، مشاہدات اور تجربات کو بیان کیا ہے اُن کو تنقید کا موضوع بنایا گیا ہے یہاں یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ کیا ملک میں رونما ہونے والے بڑے بڑے حادثوں، مشرقی پاکستان کی علیحدگی، بار بار فوجی حکومتیں آنے، سیاسی تبدیلیوں اور دہشت گردی کے بارے میں اِن لوگوں کا موقف صداقت پر مبنی ہے یا مصلحتوں کا شکار ہیں۔ نیز ہمارے سیاستدان کس حد تک اپنی تہذیب و ثقافت کا شعور رکھتے ہیں۔آخر میں ترجمہ شدہ آپ بیتیوں میں ترجمے کے نقائص اور اُردو زبان کو دیے گئے نئے الفاظ، محاورات، تراکیب اور اصطلاحات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔اِس موقع پر اُن الفاظ، محاورات اور ضرب المثال کی فہرست بھی دی گئی ہے جس نے ترجمے کے ذریعے اُردو زبان وادب کا دامن مالا مال کیا ہے۔

پانچویں باب میں جملہ تحقیقی کام کا مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے اور تحقیق سے حاصل شدہ نتائج کو درج کیا گیا ہے۔
تحقیق کے لیے جب مقالہ نگار کو اپنی پسند کے موضوع پر کام کی اجازت مل گئی تو خیال تھا کہ موضوع کے ساتھ متعلقہ مواد آسانی سے مل سکے گا لیکن بعد میں اندازہ ہوا کہ یہ کام اِتنا آسان نہیں کیونکہ زیادہ تر بنیادی ماخذ مارکیٹ اور لائبریریوں میں دستیاب نہیں تھے اور پھر اِس کے ساتھ وابستہ ثانوی مواد بھی موجود نہیں تھا کیونکہ یہاں جب کسی کتاب کی ایک ایڈیشن ختم ہو جائے تو پھر اگلا ایڈیشن مشکل سے سامنے آتا ہے۔ سب سے بڑی دِقت یہ تھی کہ یہاں آپ بیتیوں پر تحقیقی اور تنقیدی کام بہت کم ہوا ہے اِس لیے حوالے کی کتابیں ڈھونڈنے میں سخت دُشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔

اِس سلسلے میں باچاخان میموریل لائبریری کوہاٹ، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج لائبریری کوہاٹ، گورنمنٹ ڈگری کالج کے ڈی اے کوہاٹ کی لائبریری، قرطبہ یونیورسٹی پشاور کی لائبریری، کوہاٹ پبلک لائبریری کے ڈی اے کوہاٹ، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی لائبریری اسلام آباد اور پنجاب پبلک لائبریری لاہور سے بھرپور استفادہ کیا گیا۔ ہم اِن تمام لائبریرین حضرات کا خصوصی شکریہ ادا کرتے ہیں جنہوں نے ہماری مدد کی۔ خاص طور پر ڈاکٹر طارق سلیم کا جو لکی مروت میں ایک بڑی ذاتی لائبریری کے مالک ہیں اور جس نے ہمارے ساتھ کافی تعاون کیا۔ اِس مقالے کی تکمیل میں اپنے اساتزہ کرام کا بطور خاص ممنون ہوں جن میں ڈاکٹر ستار خٹک صاحب، ڈاکٹر شید احمد کاکا خیل صاحب اور ڈاکٹر عباس صاحب شامل ہیں۔ ان سب اساتزہ صاحبان نے وقتاً فوقتاً رہنمائی فرمائی۔ اپنے قریبی دوست احمد اقبال کا شکریہ بھی لازم ہے کہ انہوں نے حقیقی معنوں میں دوستی کا حق ادا کیا اور مفید معلومات بہم پہنچاتے رہے۔

ہم اِس موقع پر اپنے والدین کی دُعاؤں، بھائیوں کی نیک تمناؤں، دوستوں کے مفید مشوروں اور اپنی بیگم کی حوصلہ افزائی کے بھی سپاس گزار ہیں اور آخر میں نگران کار ڈاکٹر سلمان علی صاحب کا بھی خصوصی شکریہ ادا کرتے ہیں جس نے میرے کام میں ذاتی دلچسپی لے کر اور قدم قدم پر میری رہنمائی، مدد اور اعانت کر کے میرے کام کو آسان بنایا۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ مقالہ ہر قسم کی غلطیوں سے پاک ہو گا تاہم اس بات سے مطمئن ہیں کہ ہم نے اپنے وقت، عہد، ملک اور قوم کے بڑے بڑے سیاسی رہنماؤں کے ادبی احوال و آثار کو بڑی حد تک محفوظ بنایا ہے۔

محمد سلیم

پہلا باب

آپ بیتی تعارف و مباحث

آپ بیتی اپنے آپ پر گزرے حالات واقعات کو لکھنے کا نام ہے۔ اپنا حال اور حالات زندگی سنانے کو اصطلاح ادب میں آپ بیتی یا خود نوشت کہا جاتا ہے۔ فنِ سوانح نگاری پر تفصیل سے اظہار خیال سے پہلے آپ بیتی کی تعریف سے بحث کی جائے گی تاکہ اس کی حدود و قیود اور امکانات کا تعین کیا جا سکے۔

آپ بیتی کے معنی اور تعریف:

مختلف اُردو لغات آپ بیتی کے لغوی معنی کچھ یوں کرتے ہیں۔

(۱) فیروز اللغات اُردو جامع:

"(۱) اپنی کہانی (۲) اپنا حال (۳) خود نوشت حالات زندگی"۔ (۱)

(۲) رابعہ اُردو لغت:

"(۱) اپنی سر گزشت (۲) اپنی رام کہانی (۳) اپنے اُوپر گزری ہوئی"۔ (۲)

(۳) علمی اُردو لغت جامع:

"آٹو بایو گرافی۔ اپنی سر گزشت۔ ترجمہ حال۔ خود گزشت۔ خود نوشت سوانح حیات۔ ہڈ بیتی" (۳)

(۴) فرہنگ آصفیہ:

"(۱) سر گزشت (۲) کسی شخص کی زندگی کا حال (۳) تذکرہ (۴) کسی عالم خواہ فاضل خواہ بڑے بڑے کام کرنے والے بہادر یا حاکم کے وہ واقعات جو اُس کی عمر میں گزرے ہوں"۔ (۴)

(۵) اُردو انسائیکلوپیڈیا:

"خود نوشت سوانح عمری۔ یورپ میں روسو کے "اعترافات" اس صنف میں انقلابی کتاب ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے سینٹ آگسٹاٹن کے "اعترافات" سے اس کی ابتدا ہو چکی تھی۔ بعد میں ایک وقت ایسا آیا کہ بعض اہم سیاسی شخصیتوں مثلاً ہٹلر اور مسولینی نے اِسے ذاتی پروپیگنڈے کا ذریعہ بنایا۔ مشرقی ادبیات میں آپ بیتی کا رواج زمانہ قدیم سے چلا آ رہا ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں مغل سلاطین نے اس پر خصوصی توجہ کی۔ اس سلسلے میں توزک بابری اور توزک جہانگیری خاص

طور پر قابل ذکر ہیں۔ ٹیگور، گاندھی جی، پنڈت جواہر لال نہرو اور ایوب خان کی
آپ بیتیاں بھی ایک خاص مقام رکھتی ہیں''۔(۵)

(٦) کشاف تنقیدی اصطلاحات:

''وہ تصنیف جس میں مصنف نے اپنے حالات زندگی خود قلم بند کیے ہوں''۔(٦)

(۷) ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی آپ بیتی کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اپنی زندگی کے احوال و واقعات کا بیان آپ بیتی کہلاتا ہے۔اِسے ''خود نوشت''
(Autobiography) بھی کہہ سکتے ہیں۔آپ بیتی محض احوال و واقعات
کا مجموعہ نہیں ہوتی بلکہ اکثر اوقات کہنے لکھنے والے کی داخلی کیفیتوں ،دلی
احساسات، شخصی و عملی تجربوں، زندگی کے جزباتی پہلوؤں اور بحیثیت مجموعی
زندگی کے بارے میں اس کی نقطہ نظر کی ترجمانی کرتی ہے۔ مصنف بعض اوقات
اُن خارجی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی عوامل کا بھی ذکر کرتا ہے جو کبھی اُس پر
اثرانداز ہوئے یا جنہوں نے اُس کی زندگی کا ایک خاص رُخ متعین کرنے میں اہم
کردار ادا کیا''۔(۷)

آپ بیتی ایک شخص کی انفرادی زندگی کا بیان سہی لیکن اپنی سر گزشت سناتے سناتے وہ اپنے ارد گرد کے ماحول اور اپنے ہم عصروں کا احوال بھی سپرد قلم کرتا ہے اور بسا اوقات ایک آپ بیتی لکھنے والا اپنے ساتھیوں، مشاہیر یا ہم عصروں کا وہ ریکارڈ بھی مرتب کر جاتا ہے جس کا کسی تاریخی کتاب یا کسی اور ذریعے سے تفصیل ممکن نہیں ہوتی۔اس لیے آپ بیتی نام ہے واقعات کے مجموعے کا اور واقعات کا یہ مجموعہ لکھنے والے کا انفرادی بھی ہو سکتا ہے اور قومی یا اجتماعی بھی چنانچہ پروفیسر آل احمد سرور کو کہنا پڑا:

''آپ بیتی، جگ بیتی بھی ہوتی ہے کیونکہ ایک فرد اپنے خاندان ،ماحول علمی
اِداروں، تحریکوں، شخصیات، تہذیبی، ادبی، معاشرتی اور سیاسی حالات سے دوچار
ہوتا ہے۔اُن سے بہت کچھ لیتا ہے اور شاید تھوڑا بہت انہیں دیتا بھی ہے۔''(۸)

(۸) گوپی چند نارنگ آپ بیتی کی تعریف یوں کرتے ہیں:

''عموماً کہا جاتا ہے کہ The writing of one's own history یا

Story of one's life written by himself یعنی اپنی
داستان حیات خود تحریر کرنا خود نوشت سوانح ہے"۔(۹)

آپ بیتی کی یہ بھی ایک آسان اور جامع تعریف ہے لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہر عام و خاص شخص کی زندگی کی کہانی آپ بیتی کے زمرے میں شامل کی جاسکتی ہے، اگر تکنیکی لحاظ سے دیکھا جائے تو جواب ہاں میں ہو گا لیکن ادبی لحاظ سے آپ بیتی صرف سپاٹ کہانی نہیں ہوتی جس کا آغاز، انجام یا ترتیب نہ ہو کیونکہ آپ بیتی کا جب ہم بطور ادبی صنف مطالعہ کرتے ہیں تو آپ بیتی میں ادبی شان تب پیدا کی جاسکتی ہے جب مصنف تاریخی واقعات، سماجی حالات اور ثقافتی اثرات کو اپنے من میں اُتار کر اسے از سر نو تخلیق کرے۔ تخلیقی جوہر کے بغیر کوئی بھی ادبی صنف ایک ادنی درجے کی کہانی یا اخباری خبر کے سوا کچھ بھی نہیں۔

(۹) اُردو خود نوشت نگاری کی تنقیدی تاریخ میں ڈاکٹر پرویز پروازی نے کافی اہم کام کیا ہے۔ اُس نے اُردو کے تقریباً تمام مشہور خود نوشتوں پر اپنے نپے تلے انداز میں تنقید کی ہے۔ اپنی کتاب "پس نوشت اور پس پس نوشت" میں خود نوشت کی تعریف یوں کرتے ہیں:

> "خود نوشت سوانح عمری کی سادہ تعریف تو بس اتنی سی ہے کہ وہ سوانح عمری جو خود لکھی گئی ہو بالکل افسانہ کی سہل ممتنع تعریف کی طرح کہ مختصر افسانہ وہ افسانہ ہے جو مختصر ہو"۔(۱۰)

ڈاکٹر موصوف آپ بیتی کی تاریخ پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:

> "ادب کی تاریخ میں سوانحی ادب کی اصطلاح خاص وسیع اصطلاح ہے، اس میں تاریخ، حالات، وقائع، ڈائری، جرنل اور رجال سب کچھ ہی سما سکتا ہے مگر اِس دائرے کو تنگ کرتے ہوئے علماء ادب نے بیسوی صدی کے آغاز تک یاداشتی ادب یعنی Memories اور سوانحی ادب یعنی Biography کو جُدا جُدا اکائی کی حیثیت سے تسلیم کیا اور انہیں اسی حیثیت سے جانچا اور پرکھا ہے۔ سوانحی ادب میں خود نوشت سوانح عمری کا لفظ 1809ء میں استعمال میں آنا شروع ہوا مگر جن ابتدائی خود نوشت سوانح عمریوں کا ذکر ادب میں موجود ہے ان میں سینٹ آگسٹین (۳۵۰۔۴۰۳) کے "اعترافات" کو پہلی خود نوشت سوانح عمری قرار دیا جاتا ہے"۔(۱۱)

(۱۰) نقوش کے ایڈیٹر محمد طفیل نے آپ بیتی کی تعریف کچھ اس طرح کی ہے:

''مختصر لفظوں میں آپ بیتی کسی انسان کی زندگی کے تجربات مشاہدات، محسوسات، نظریات کی مربوط داستان ہوتی ہے جو اس نے سچائی کے ساتھ بے کم وکاست قلم بند کر دی ہو اور جس کو پڑھ کر اس کی زندگی کے نشیب و فراز معلوم ہوں۔ اس کے نہاں خانوں کے پردے اُٹھ جائیں اور ہم اس کو خارجی زندگی کی روشنی میں پرکھ سکیں''۔(۱۲)

(۱۱) یوسف حسین خان آپ بیتی کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''عالمی ادب میں آپ بیتی لکھنا ادیبوں کا دلچسپ مشغلہ رہا ہے۔ بیتے ہوئے زمانے کے واقعات و حالات جب حافظے میں اُبھرتے ہیں تو اصلی نقوش میں وہ مبہم اثرات بھی شامل ہو جاتے ہیں جو زندگی کے مشاغل سے لازمی طور پر پیدا ہوتے ہیں۔ جب قوت ارادی حافظے کے دروازے کو کھٹکھٹاتی ہے تو یہ سب کے سب لبیک کہتے ہوئے حاضر ہو جاتے ہیں۔ آپ بیتی زندگی کی تاریخ بھی ہے اور ماورائے تاریخ بھی۔ حافظے کو کھنگالنے سے زندگی کی جو تصویر سامنے آتی ہے اس میں ایک طرح کی طلسمی خاصیت پیدا ہو جاتی ہے۔ بشرط یہ کہ کہانی کہنے والا اپنے فن کے آداب کو جانتا ہو''۔(۱۳)

یوسف حسین خان نے آپ بیتی کی تعریف لکھتے ہوئے چند اہم امور کی طرف ہماری توجہ دلائی ہے وہ یہ کہ آپ بیتی یقیناً اپنے اَیام گزشتہ کے اچھے اور بُرے واقعات اور تجربات کے بیان کا نام ہے۔ لکھنے والے کے حافظے میں بے شمار واقعات ہوتے ہیں اس میں کچھ اہم اور کچھ غیر اہم واقعات، کچھ چیزیں مبہم اور کچھ نہایت واضح شکل میں موجود ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے وہ سب کچھ احاطہ تحریر میں نہیں لا سکتا انہیں لازماً کچھ واقعات چھوڑنے پڑتے ہیں۔ یوسف حسین خان کا کہنا ہے کہ انہیں زیادہ اہم واقعات کو اُٹھانا چاہیے۔ یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ جن واقعات یا حقائق کو آپ بیتی نگار اہم نہیں سمجھتا وہ قاری کے لیے زیادہ اہم ہو سکتے ہیں یا جن کو وہ اہم سمجھتا ہے پڑھنے والے کے لیے وہ اہمیت کے حامل واقعات نہیں ہوتے، یہاں پھر آپ بیتی کی صنف کچھ متنازعہ ہو جاتی ہے۔ یوسف حسین خان نے دوسری بات یہ کی ہے کہ آپ بیتی لکھنے والے کو آپ بیتی کے فن پر مکمل عبور حاصل کرنا چاہیے تب اُن کے بیان میں طلسماتی خاصیت پیدا ہو سکتی ہے۔ یہاں سوال

یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر مصنف کو فن آپ بیتی پر عبور نہ ہو تو کیا انہیں آپ بیتی نہیں لکھنا چاہیے؟ واقعہ یہ ہے کہ تحریر میں جادوئی اثر حقیقت نگاری اور خلوص سے آتا ہے، سچائی اور خلوص پر مبنی آپ بیتیاں لوگوں میں خود ہی مشہور ہو جاتی ہیں۔ ''ناقابل فراموش''اس کی سب سے بڑی مثال ہے البتہ اس بات پر یوسف حسین خان سے اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ آپ بیتیاں تاریخ بھی ہیں اور تاریخ سے ہٹ کر بھی بہت کچھ ہیں۔ ہمیں تاریخی کتابوں میں اپنے مشاہیر ،تاریخی واقعات اور سماجی حالات کے بارے میں اُتنی معلومات نہیں ملتیں جو ہماری آپ بیتیوں میں بکھرے پڑے ہیں اِس لحاظ سے دیکھا جائے تو آپ بیتیوں کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔

(۱۲) ڈاکٹر سید شاہ علی کے نزدیک ''خود نوشت سوانح عمری وہ روداد ہے جس میں انسان اپنی داخلی زندگی کی کیفیات، نشوونما اور نفس و روح کی کشمکش وغیرہ کا بیان کرتا ہے''۔ (۱۴)

مراد یہ ہے کہ ہم دوسرے لوگوں کا ذکر اچھے یا برے انداز میں وقتاً فوقتاً کرتے رہتے ہیں۔ دنیا کے تمام ادبیات میں زیادہ تر افراد ہی کو موضوع سخن بنایا گیا ہے۔ خود نوشت سوانح عمری کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں فرد اپنی ذاتی زندگی اور اپنے معیوب وصفات کو بیان کرتا ہے۔ اُن کی اندورنی کشمکش اُن کو تحریر لکھنے پر آمادہ کرتی ہے۔ چنانچہ آپ بیتی واحد وہ مقام ہے جہاں آپ مجرم ،استغاثہ اور منصف ہر روپ میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔

(۱۳) علم الدین سالک اپنے ایک مضمون ''آپ بیتیوں کے بعض نمایاں پہلو'' میں لکھتے ہیں:

> ''خود نوشت سوانح نگاری ایک قسم کی تاریخ ہوتی ہے۔ تاریخ میں ایک قوم یا ایک ملک کے واقعات مربوط کر کے بیان کیے جاتے ہیں مگر سوانح نگاری میں انفرادیت کا پہلو غالب ہوتا ہے اور یہ فرد واحد کی زندگی کے کارناموں پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ افسانے کا رنگ رکھتی ہے مگر افسانہ نہیں ہوتی۔ افسانہ خیالی ہوتا ہے اور یہ حقیقت۔ اس میں صحت واقعات کا خیال رکھا جاتا ہے۔ البتہ اس میں لکھنے والے کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ اسے اس انداز سے لکھے کہ یہ آرٹ کا ایک دلکش مرقع بن جائے۔''۔ (۱۵)

(۱۴) یوسف جمال انصاری کے بقول:

> '' ہماری زندگی خوا انفرادی ہو یا اجتماعی گوناگوں تجربات سے مرکب ہے۔ ہر سانس ایک تجربہ ہے اور ہر لمحہ ایک عالم ۔یونہی زندگی کا سفر طے ہوتا رہتا ہے سوانح حیات مرتب کرنا گویا ہر سانس کا محاسبہ کرنا ہے''۔ (۱۶)

(۱۵) ریحانہ خانم اپنے ایک مضمون ''آپ بیتی کیا ہے''، میں آپ بیتی کی تعریف میں لکھتی ہیں:

''آپ بیتی وہ تحریر ہے جس میں انسان کے خارجی اور داخلی زندگی کے ہر طرح کے کوائف سامنے آئیں۔ جس میں تجربات، کیفیات، جذبات محسوسات، سوچنے کے انداز اور طرز عمل اور طریقے، سب کی وضاحت ہو اور جس میں شخصیت کا کوئی کو ناڈھکا چھپا نہ رہا ہو''۔(۱۷)

(۱۶) آخر میں ڈاکٹر سید عبداللہ کے ایک مضمون آپ بیتی سے رجوع کرتے ہیں جس میں وہ آپ بیتی لکھنے کو ایک مشکل فن قرار دیتے ہیں۔ڈاکٹر صاحب نے خارجی واقعات کی تفصیل اور دوسروں کے چشم دید واقعات کو آپ بیتی کا نام دیا ہے چنانچہ لکھتے ہیں:

''آپ بیتی حد درجہ تاثراتی چیز ہوتی ہے اگر یہ سوانح عمری ہے تو اس کو سائنٹیفک ہونا چاہیے صحیح سوانح نگار اپنے مواد سے سر مو تجاوز نہیں کر سکتا لیکن آپ بیتی میں مواد اپنی ذات کے اندر سے نکلتا ہے۔خود کوزہ و خود کوزہ گر۔خود ہی مجرم، خود ہی گواہ، خود ہی جج۔اگر کوئی یہ کہے کہ آپ بیتی لکھنے والا شاعر کی مانند اپنے تاثرات پر انحصار کرتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ شاعر نے کبھی واقعاتی صحت کا دعویٰ نہیں کیا۔اس کا طریقہ کار تاثر، تخیل اور تفکر کو ملانا ہے۔اس میں صداقت عمومی مد نظر ہوتی ہے۔آپ بیتی میں صداقت خصوصی کی جستجو لازمی ہے۔اس کے علاوہ اسے جج بھی بننا ہے۔''۔(۱۸)

آپ بیتیوں کی مندرجہ بالا تعریفوں کی روشنی میں درج ذیل نتائج ہمارے سامنے آتے ہیں۔

۱۔ آپ بیتی کا مطلب ہے اپنے حالات کو خود لکھنا۔

۲۔ آٹو بیائیو گرافی (آپ بیتی) بائیو گرافی (سوانح نگاری) ہی کی ایک قسم ہے جس میں مصنف اپنی زندگی کی کہانی بیان کرتا ہے۔

۳۔ آپ بیتی کسی فرد کے احوال و واقعات کا مجموعہ نہیں بلکہ اس کے داخلی احساسات، کیفیات، عملی تجربوں اور زندگی کے بارے میں اس کی نقطہ نظر کی ترجمان بھی ہوتی ہے۔

۴۔ آپ بیتی کسی انسان کے اقوال وافعال اور خیالات و نظریات کی وہ مربوط داستان ہے جو اس کی داخلی اور خارجی

زندگی کو بے کم وکاست دنیا کے سامنے لاتی ہے۔

۵۔ آپ بیتی انفرادیت کی حامل وہ تحریر ہے جو تاریخ نہ ہوتے ہوئے بھی تاریخ ہے جس میں نہ صرف صحت واقعات کا خیال رکھا جاتا ہے بلکہ صداقت اور سچائی کا عنصر لے کر ادب میں ایک ممتاز مقام حاصل کرتی ہے۔

۶۔ آپ بیتی کا تعلق انسان کے ذاتی اور نجی معاملات سے ہے لیکن یہ ایک اہم آرٹ بھی ہے جس میں لکھنے والا زندگی کے بے شمار واقعات میں محض چند واقعات کو منتخب کر کے زندگی کی چلتی پھیرتی تصویریں آنکھوں کے سامنے متحرک کرتا ہے اور اس طرح آپ بیتی کو ادب کا ایک اہم صنف بنالیتا ہے۔

مختصراً آپ بیتی ادب کی وہ اہم صنف ہے جو انسان کی ذاتی زندگی کے اہم حالات وواقعات کا مجموعہ ہوتی ہے جس میں فرد اپنے احساسات، تجربات، معلومات، مشاہدات، نظریات، خیالات اور شخصیت کے داخلی اور خارجی کیفیات من وعن اُسی طرح سے پیش کرتا ہے جس طرح اُس کے مشاہدے میں آئے تھے۔

آپ بیتی اور خود نوشت سوانح عمری میں فرق:

آپ بیتی کے لیے سر گزشت، خود نوشت، روزنامچہ، خود نوشت سوانح عمری اور سوانح عمری کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔اُردو کے لغات عموماً یہ تمام الفاظ ہم معنی اور مترادف کے طور پر استعمال کرتے ہیں لیکن تکنیکی لحاظ سے ان الفاظ میں کافی فرق ہے۔

سر گزشت اور خود نوشت کے درمیان امتیاز بتاتے ہوئے وہاج الدین علوی لکھتے ہیں:

> ''خود نوشت اور سر گزشت اگرچہ ایک سمجھی جاتی ہے لیکن یہ ایک دوسرے سے اس لیے مختلف ہیں کہ خود نوشت کا مصنف اپنی ذاتی تاریخ لکھتا ہے جبکہ سر گزشت میں کم و بیش عوامی واقعات ہوتے ہیں جن میں مصنف صرف ایک معاون کی حیثیت رکھتا ہے''۔(۱۹)

ڈاکٹر سید عبداللہ نے تو خود نوشت سوانح عمری اور آپ بیتی میں بھی فرق بتایا ہے اور لکھا ہے:

> ''مجھے یہ تسلیم ہے کہ ایک خاص قسم کی سوانح عمری (یعنی اپنے سوانح زندگی) لکھے جا سکتے ہیں مگر میں سوانح عمری اور آپ بیتی میں فرق کرتا ہوں اور وہ اس لیے کہ اپنی سوانح عمری لکھ کر بھی ضروری نہیں کہ کوئی شخص آپ بیتی لکھ سکے۔اپنی سوانح عمری اس حد تک تو ہو سکتی ہے کہ کوئی شخص اپنی زندگی کے چیدہ چیدہ

واقعات لکھ دے یا زیادہ سے زیادہ تھوڑی دوران کے باطنی محرکات کا بیان بھی
کردے لیکن یہ ممکن نہیں کہ کوئی شخص وہ سب کچھ لکھ دے جو اس پر اور اس کے
دل پر گزری ہے"۔(۲۰)

ہمارے ہاں اکثر لوگ خود نوشت اور آپ بیتی میں فرق نہیں کرتے بلکہ دونوں ہم معنی الفاظ سمجھتے ہیں تاہم مختلف ناقدین نے آپ بیتی اور خود نوشت سوانح عمری میں تیکنیکی اور فنی لحاظ سے درج ذیل فرق بتایا ہے:

۱۔ خود نوشت اور آپ بیتی دونوں کسی شخص کی زندگی کے واقعات خود اس کے قلم سے لکھنے کا نام ہے لیکن دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ خود نوشت نگار اپنی ذات کو اتنی اہمیت نہیں دیتا جتنا وہ ارد گرد کے ماحول اور اشخاص و واقعات کو دیتا ہے۔ وہ اپنی زندگی اور اپنی ذات ثانوی رکھتا ہے جبکہ آپ بیتی لکھنے والے کا مقصد خود اپنی تاریخ بیان کرنا ہے جس میں اس کے افکار و جزبات اور قلبی تعلق شامل رہتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو تزک بابری، تزک جہانگیری خود نوشت ہیں۔ وہاج الدین علوی کے اس خیال سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا کہ تزک بابری اور تزک جہانگیری سر گزشت ہیں۔ (۲۱)

۲۔ خود نوشت زندگی کے چیدہ چیدہ واقعات کے بیان کا نام ہے جبکہ آپ بیتی اُن سب واقعات کا مجموعہ ہے جو انسان کے ساتھ وقتاً فوقتاً پیش آئے۔ آپ بیتی یا خود نوشت میں یہ بات بھی بہت اہم ہے کہ کن واقعات کو منظر عام پر لایا جائے اور کن کو اخفا میں رکھا جائے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو واقعات مصنف غیر اہم جان کر سپرد قلم نہیں کرتا لوگوں کی نظر میں وہ زیادہ اہم ہوں اس لیے آپ بیتی لکھنے والے کو اہم یا غیر اہم میں نہیں پڑنا چاہیے اور یہ فیصلہ قاری پر چھوڑنا چاہیے۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ چند منتخب واقعات کا مجموعہ خود نوشت تو ہو سکتا ہے آپ بیتی نہیں۔

۳۔ سوانح عمری یا خود نوشت سوانح عمری خارج کے بیان کا نام ہے اور آپ بیتی داخلی اور باطنی تجربات کا۔(۲۲)

۴۔ آپ بیتی میں مصنف اپنی ذاتی تاریخ لکھتا ہے اس لیے اُس کا محور اور مرکز اپنی ذات ہوتی ہے جبکہ خود نوشت زیادہ تر عوامی واقعات کا مجموعہ ہوتا ہے جن میں مصنف صرف ایک معاون کی حیثیت رکھتا ہے۔ "شہاب نامہ" آپ بیتی کی بڑی اچھی مثال ہے جس میں آپ بیتی لکھنے والا کسی صفحے پر بھی نظروں سے اُجھل نہیں ہوتا جبکہ "یادوں کی بارات" میں جوش کئی کئی صفحات اور واقعات کے بعد رونما ہوتا ہے۔

۵۔ یوں تو ادب کے ہر صنف میں آپ بیتی کے عناصر تلاش کیے جا سکتے ہیں (افسانہ، ناول اور غزل کا تو سارا دار و مدار ہی آپ بیتی پر ہے کہ یہ خام مواد فن کار کی ذات سے لیتے ہیں) لیکن سفر نامے اور آپ بیتی تو ایک دوسرے سے اسی طرح پیوست ہیں کہ ان کو ایک باریک خط (سفر) نے ایک دوسرے سے الگ الگ کیا ہوا ہے چنانچہ مستنصر حسین تارڑ کے کچھ سفر ناموں اور مختار مسعود کے سفر نامے "سفر نصیب"۔(۲۳) پر تو بادی النظر میں آپ بیتی کا گمان ہوتا ہے چنانچہ بعض

ناولوں، افسانوں اور سفر ناموں کو بھی ایک طرح کا خود نوشت کہا جا سکتا ہے لیکن آپ بیتی کا اسلوب، انداز اور بیانیہ ایک جدا پیرایہ رکھتا ہے۔ آپ بیتی کا سٹائل ہی اس کو منفرد اور ممتاز بناتا ہے۔

۶۔ خود نوشت نگار کسی مخصوص واقعے، موقع، جشن وغیرہ کا حال جب بھی اپنے مشاہدے کی روشنی میں بیان کرے گا تو اس کی ذات اور اس کا اپنا وجود بڑی حد تک اس سے الگ رہتا ہے جبکہ آپ بیتی میں اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے اس میں دوسرے لوگوں کا حال ضمنی طور سے آئے گا اور لکھنے والے کی شخصیت غالب رہے گی۔

۷۔ خود نوشت ایک طرح سے اظہار ذات کا ذریعہ ہے جس میں مصنف کا مقصد خود بینی اور خود نمائی کی خواہش ہے یہی وجہ ہے کہ خود نوشت میں بیرون بینی کا عنصر زیادہ ملتا ہے برخلاف اس کے آپ بیتی کا کام حالات و واقعات کو اس صداقت سے منظر عام پر لانے ہیں جس طرح وہ پیش ہوئے تھے۔ بقول ڈاکٹر وہاج الدین علوی واقعے کے ساتھ مصنف کا خصوصی قلبی تعلق بھی ہونا چاہیے اور یہ قلبی تعلق آپ بیتی کی قدر و منزلت میں اضافہ کرتا ہے۔ (۲۴)

آپ بیتی اور سوانح عمری میں فرق:

سوانح نگاری بھی آپ بیتی کی طرح ہماری قدیم زبانوں میں ایک اہم صنف کے طور پر رائج رہی ہے۔ عیسائی، یہودی اور یونانی علماء نے برگزیدہ ہستیوں کی سوانح لکھ کر سوانح نگاری کا آغاز کیا تھا۔ تاہم جدید سوانح نگاری کو اس کی اکمل صورت میں رائج کرنے کا سہرا پلوٹارک کے سر ہے اس کے بعد گبن اور کارلائل نے اس فن کو سائنسی خطوط پر استوار کر کے اسے مزید شہرت دی اور آج اس کو ہر ترقی یافتہ زبان میں ایک مستقل فن کا درجہ حاصل ہے۔ ذیل کے چند تعریفوں سے سوانح نگاری کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

''سوانح عمری بطور ایک ادبی صنف کے افراد کی زندگی کی تاریخ ہے''۔(۲۵)

''سوانح عمری ایک انسان کی حیات ہے''۔(۲۶)

''سوانح عمری کسی انسانی روح کی مہمات حیات کی ہو بہو تصویر ہے''۔(۲۷)

ڈاکٹر جانسن یورپ کے مشہور سوانح نگار ہیں اس نے سوانح نگاری کے لیے قواعد اور اصول مرتب کر کے سوانح لکھی۔ وہ فن سوانح نگاری کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ان کامیابیوں سے نظر بچا کے گزرنا جو انسان کی زندگی کو عظیم ترین بناتی ہیں اور اپنے خیالات کو گھریلو رازوں تک پہنچانا اور روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو منظر عام پر لانا ہی سوانح نگاری کا فن ہے''۔(۲۸)

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی سوانح نگاری اور آپ بیتی کی تعریف لکھتے ہوئے ان دونوں میں موجود فرق کی نشان دہی یوں کرتے ہیں:

> ''بظاہر تو سوانح عمری (Biography)اور آپ بیتی (Autobiography) میں صرف صیغے (Person) کا فرق ہے مگر دونوں مزاجاً ایک دوسرے سے مختلف ہیں سوانح عمری کس شخص کی زندگی کا مکمل، مفصل اور جامع مرقع ہوتا ہے۔ سوانح نگار کو تنقید و تبصرے سے کام لینا پڑتا ہے۔ وہ ایک مدلل مداح ہو سکتا ہے اور ایک غیر جانبدار مبصر بھی مگر آپ بیتی لکھنے والے کو زیادہ مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ اُس کے لیے کھلے بندوں کوئی دعوی آسان نہیں ہوتا۔ وہ اپنے منہ میاں مٹھو بن سکتا ہے اور نہ اپنی اَنا کو اپنی ذات سے جدا کر سکتا ہے''۔(۲۹)

جہاں تک مشرقی زبانوں میں بائیو گرافی لکھنے کا رواج ہے تو زمانہ متوسط میں مسلمانوں کی بائیو گرافی زیادہ وقعت پزیر ہوئیں تاہم اس کا زیادہ تر انحصار روایت پر ہوتا تھا روایت اتنی قابل اعتنا نہ تھی صرف رجال حدیث میں خصوصی احتیاط برتی گئی۔ سترہویں صدی عیسوی میں یورپ میں بائیو گرافی کو انتہائی ترقی ہوئی، رفتہ رفتہ بائیو گرافی کے فن نے بھی تاریخ کی طرح فلسفے کی شکل اختیار کر لی۔ جہاں واقعات سے منطقی طور پر استخراج کیا جاتا ہے۔ بائیو گرافی سے آئندہ کی نسلیں سبق حاصل کرتی ہیں۔ بے شمار لوگوں نے سوانح سے تحریک حاصل کی اور کارہائے نمایاں سر انجام دے کر زمانے کو عظیم فائدے پہنچائے۔ ایک مغربی مصنف بائیو گرافی کی اہمیت بتلاتے ہوئے کہتا ہے:

> ''بائیو گرافیاں ہمیں چلا چلا کر اور سمندر کی طوفان کی طرح غل مچا کر یہ آواز دیتی ہیں کہ جاؤ اور تم بھی ایسے کام کرو''۔(۳۰)

اُردو میں جدید سوانح نگاری کا آغاز سر سید کے عہد سے ہوتا ہے۔ سر سید کی تحریک ہماری بیداری کی تحریک ہے۔ سر سید اور اس کے رفقاء کے زندگی آموز قلم نے خوابیدہ مسلمانوں کو بیدار کیا اور نہ صرف انہیں مستقبل کی نوید سنائی بلکہ اپنے شاندار ماضی سے بھی ان کا رشتہ بحال کرایا۔ چنانچہ یہی وہ زمانہ تھا جب ہمیں سوانحی ادب کی شدید ضرورت محسوس ہوئی تاکہ ہم اپنی عظیم شخصیتوں کی فعال کردار سے تحریک عمل حاصل کر کے اخلاق کی بلندی کا سبق حاصل کر سکیں۔ اس دور میں شبلی نے سوانحی تاریخ کو مسلمانوں کے سامنے پیش کر کے ان کا سر فخر سے بلند کیا اور حالی نے مسلمانوں کے سامنے سوانح نگاری کے ذریعے وہ تاریخی کردار پیش کیے جن سے اُن پر ہدایت و رشد کے نئے در وا ہوئے۔

اگرچہ آپ بیتی اور سوانح میں فکر اور موضوع کے لحاظ سے کئی مماثلتیں ہیں لیکن یہ دو مختلف علمی وادبی اسلوب ہیں۔

۱۔ آپ بیتی اور سوانح کا آسان اور سیدھا سادہ فرق یہ ہے کہ سوانح عمری میں کسی دوسرے فرد کے حالات زندگی لکھے جاتے ہیں جیسے الطاف حسین حالی کی ''حیات سعدی'' اور ''یادگار غالب'' اور آپ بیتی میں مصنف اپنی زندگی کے حالات خود لکھتا ہے جیسے قدرت اللہ شہاب کا ''شہاب نامہ'' اور احسان دانش کا ''جہاں دانش''

۲۔ آپ بیتی لکھنے والا زیادہ تر اپنی یادداشتوں اور حافظے پر انحصار کرتا ہے لیکن سوانح نگار موضوع، اُس شخص کی آپ بیتی، ڈائری، خطوط اور ہم عصروں کی شہادتوں سے مواد لے کر ترتیب دیتا ہے۔

۳۔ آپ بیتی میں سچائی، صداقت، خلوص اور واردات قلبی پر زور دیا جاتا ہے لیکن سوانح نگاری میں صرف سچائی، صداقت اور غیر جانبداری کافی نہیں ہو سکتی، سوانح نگاری میں اظہار بیان، تخلیقی صفت، استخراج کرنے کا مادہ، تاریخ کا شعور اور منطقی استدلال بھی لازمی ہیں۔ اس لیے تو ڈاکٹر عبدالقیوم کو لکھنا پڑا:

> ''صرف واقعات کا سلسلہ وار بیان فنی اعتبار سے کافی نہیں سمجھا جاتا بلکہ انتخاب واقعات اور معمولی جزیئات تک رسائی حاصل کرنا بھی ضروری ہے۔ اظہار بیان ہی ایک مخصوص سلیقہ اور واقعات کی تدوین میں حسن ترتیب بنیادی اور اہم چیز ہو گئی ہے''۔(۳۱)

۴۔ سوانح نگاری میں فرد کو دوربین سے دیکھا جاتا ہے جبکہ آپ بیتی میں فرد کا خود کو خوردبین سے دیکھنے کا نام ہے۔(۳۲)

۵۔ آپ بیتی تاریخ اور زمانے کو اپنا موضوع بناتی ہے جبکہ سوانح ایک فرد سے بحث کرتی ہے۔

۶۔ سوانح میں تاریخ اور قوم کے حوالے سے افراد کی طرف سفر کیا جاتا ہے لیکن آپ بیتی میں ذات سے فرد، جماعت، قوم، ملک اور تاریخ کی طرف بڑھا جاتا ہے۔

۷۔ آپ بیتی میں عظیم اور بڑے واقعات کو پیش کیا جاتا ہے خصوصاً وہ واقعات جس نے مصنف کی شخصیت، کردار اور مستقبل کو سنوارنے میں اہم کردار ادا کیا تھا لیکن سوانح نگار افراد کی اُن نجی معاملات میں بھی جھانک سکتا ہے جس کی اجازت آپ بیتی نگار نہیں دے سکتا۔

۸۔ سوانح عمری کا فن تقاضا کرتا ہے کہ اُس کے ہیرو کے حالات زندگی پیدائش سے موت تک بیان کیے جائیں لیکن آپ بیتی لکھنے والے سے مکمل حالات زندگی بیان کرنے کی توقع نہیں کیا جا سکتی۔

۹۔ سوانح عمری ارادے سے اور باقاعدہ کس خاص مقصد سے لکھی جاتی ہے۔اس کے خاص اُصول مرتب کر کے تحریر میں لائی جاتی ہے لیکن آپ بیتی اتفاقی چیز ہے اور اسے لگے بندے اُصولوں یا قاعدوں اور کلیوں اور منصوبے کے تحت نہیں چلایا جاسکتا۔

۱۰۔ آپ بیتی لکھنے والا اپنی داخلی اور خارجی زندگی سے خوب واقف ہے وہ چونکہ دماغی کشمکش اور دل کی دنیا سے بڑی حد تک واقف ہے اس لیے وہ انکشاف ذات کرنے کے حوالے سے آزاد بھی ہے اور خود مختار بھی لیکن سوانح نگار مصنف کی تحریروں اور ہم عصروں کی شہادتوں پر انحصار کرتا ہے۔اس لیے وہ بسا اوقات صحیح نتیجے پر پہنچنے سے قاصر ہوتا ہے اس بات کی وضاحت ''ریحانہ خانم''اپنے ایک مضمون میں کرتی ہیں۔

> ''سوانح نگار کو ہر طرح کا مواد حاصل کرنے کے لیے بڑی جانچ پڑتال اور جستجو سے کام لینا پڑتا ہے ' مگر خود لکھنے والا اپنے آپ سے ہر طرح سے واقف ہونے کا فائدہ رکھتا ہے۔ سوانح نگار کو کسی میں جان ڈال دینے کا کٹھن کام کرنا ہوتا ہے جبکہ آپ بیتی لکھنے والا خود اپنی شخصیت و انفرادیت سمیت اپنی تحریر میں آسانی سے جلوہ گر ہو سکتا ہے''۔(۳۳)

فن آپ بیتی نگاری کی تاریخ اور ارتقاء:

زمانہ قدیم ہی سے خود نوشت سوانح عمریوں اور آپ بیتیوں میں دو خاص قسم کے رجحان دیکھنے کو ملتے ہیں اس بناء پر انگریز ناقدین نے قدیم آپ بیتیوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔پہلی وہ آپ بیتیاں ہیں جن میں زیادہ تر خارجی واقعات کو قلمبند کیا گیا تھا اور خود کو یا ذاتی حالات و واقعات کو ثانوی قرار دے کر صرف ایک جز بنا لیا جاتا تھا۔ مشہور لوگوں کی سوانح، تاریخ یا کسی واقعے کا چشم کشا رپورٹ اس قسم کی آپ بیتیوں کی اقسام ہیں۔دوسری قسم اُن آپ بیتیوں کی ہے جن میں مصنف خود کو عام روش سے الگ تھلگ یا بلند سمجھتا ہے۔ وہ ذاتی کیفیات، اپنی نشو و نما، خیالات کی کشمکش کو سچائی سے بیان کرتا جاتا ہے۔یہ آپ بیتیوں کی کامل تر، قابل تر، عمدہ اور جدید تر شکل ہے۔

ایک چینی عالم، تاریخ دان اور مفکر سیما چان کی خود نوشت شی جی (تاریخی دستاویز) کو فن آبیتی نگاری کی معلوم تاریخ میں اولیت اور تقدیم کا شرف حاصل ہے۔(۳۴)

فن آپ بیت نگاری کے دوسرے مرحلے میں پہلی صدی عیسوی کے آغاز ہی میں سینٹ پال کے خطوط ، سائیرو (Cicero) کے خطوط اور جولیس سیزر کی ڈائری(commenteries) کو آپ بیتی کی تاریخ میں خصوصی شہرت

حاصل ہے۔(۳۵) اول الذکر آپ بیتیوں میں آپ بیتی کے پردے میں عیسائی مذہب کی تبلیغ کا مقصد شامل تھا اور موخر الزکر میں سیزر نے اپنی فتوحات اور کارناموں کا ذکر بڑھا چڑھا کر کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خود نوشت سوانح عمریوں کی تاریخ اُتنی ہی پرانی ہے جتنا خود حضرت انسان۔ روزنامچے، ڈائریاں اور شخصی خاکے آپ بیتی کی اولین قسمیں ہیں اور قدیم بھی، جن میں اُس زمانے کی تاریخ، تہذیب، رسومات اور مصروفیات پر روشنی پڑتی ہے۔

منظم، مربوط اور بطور فن آپ بیتیوں کی تاریخ عیسائی عہد سے شروع ہوتی ہے۔ اولین عیسائی مبلغین نے اپنی سرگزشتیں خاص دلچسپی اور مشنری جزبے سے لکھی ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں ڈاکٹر شاہ علی کہتے ہیں:

> ''ابتدائی خود نوشت سوانح عمریاں مذہبی جزبے سے لکھی گئیں۔ ظاہر ہے ان پر مذہبی رنگ نہایت نمایاں ہے۔ حضرت عیسیٰؑ نے اپنے پیروکاروں سے کہا تھا کہ انسان جو کچھ ہے وہ اس سے اہم ہے کہ وہ کرتا کیا ہے؟ اس کا فرض ہے کہ وہ اپنا مطالعہ صاف گوئی سے کرے اور اس مطالعے میں اپنی جیسی اندھی مخلوق کی مدد کرے''۔(۳۶)

چوتھی صدی عیسوی میں سینٹ آگسٹین کے اعترافات کو صحیح معنوں میں جدید آپ بیتی کی طرف پہلا قدم کہا جا سکتا ہے۔ گو کہ اس آپ بیتی میں بھی آگسٹین نے مذہب عیسائیت کی اہمیت، اُن کا عیسائی مذہب اختیار کرنا اور عیسائیت کی تبلیغ کو اپنے بیانیے کا مرکز و محور بنایا ہے تاہم اس آپ بیتی میں اُس نے اپنے بچپن سے بڑھاپے تک کے اہم حالات و واقعات کا احاطہ کیا ہے۔ اس کے بعد کارڈن(۱۵۷۶ء۔۱۵۰۷ء) کی لکھی ہوئی خود نوشت ''De vita propria'' اور مانٹین (۱۵۸۹ء۔۱۵۷۱ء) کی ''میرے مضامین''۔(۳۷) وہ خود نوشت سوانح عمریاں ہیں جو مربوط اور کامیاب آپ بیتیوں کی نہ صرف عمدہ نمونے ہیں بلکہ انکشاف ذات، معرفت نفس اور اپنی سیرت، خیالات اور شخصیات کے کامیاب ابلاغ بھی ہیں۔ اس کے بعد روسو کے ''اعترافات'' آپ بیتی کی تاریخ میں وہ کارنامہ ہے جس نے آپ بیتی کے شوق اور اہمیت کا احساس پیدا کیا۔ اُس نے خود اپنی آپ بیتی کو ''اعمال نامہ'' کہا اور لکھا:

> ''میں ایک ایسی مہم کا آغاز کر رہا ہوں جس کی کوئی مثال نہ ہو گی''۔(۳۸)

روسو نے اپنی خوبیوں اور خامیوں کو اس طرح بیان کیا کہ آج ان کی آپ بیتی کے بڑے حصے پر مبالغے کا گمان ہوتا ہے لیکن اس سے روسو کے ''اعترافات'' کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ اس کے بعد تو یورپ میں اطالوی، یونانی اور انگریزی

زبانوں میں آپ بیتیوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو جاتا ہے تاہم روسو کے بعد جن آپ بیتیوں کو شہرت ملی اس میں فرانکلن کی آپ بیتی میں جزائیات نگاری اور تاریخی شعور، گبن کی فلسفیانہ خود پسندی اور دلکش طرز بیان، ہیوم کا اختصار اور مل کی منظر نگاری وہ نمایاں اور پسندیدہ چیزیں ہیں جو ان آپ بیتیوں کا طرۂ امتیاز ہیں۔ان مصنفین نے اپنی آپ بیتیوں میں تاریخی، تہذیبی، رومانوی اور تخیلاتی انداز فکر اپنا کر اس صنف ادب کو لوگوں میں مقبول بنایا۔انگریزی ادبیات میں اٹھارویں صدی عیسوی کا عہد روشن خیالی کا عہد ہے چنانچہ اس عہد میں ماسوں، جانسن، لانگ فیلو، پلوٹارک اور ٹرالوپ وغیرہ کی آپ بیتیاں وہ قابل قدر آپ بیتیاں ہیں جن میں نہ صرف اُن کے فکر و فن کو سمجھنے میں آسانی ملتی ہے بلکہ اُس عہد کے کئی سارے تاریخی، معاشی، معاشرتی اور سماجی حالات و واقعات کے چشم کشا رپوٹ بھی ہیں۔اس کے بعد یورپی آٹو بائیو گرافی بیسوی صدی میں داخل ہو جاتی ہے۔ بیسوی صدی کی آپ بیتیوں میں ایڈولف ہٹلر کی میری جدوجہد (1924)، ایڈورڈ بک کی"The Americanization(1920)"، ایڈمنڈ گوسے کی"Father and Son(1911)"، سیموئل بٹلر کی"Way of all Flesh(1903)"، جم جوائس کی"Young man(1916) "(۳۹) وہ مشہور آپ بیتیاں ہیں جو عصری مسائل، تاریخ، تہذیب، مذہب، معاشرے اور اپنے عہد کے وسیع منظر نامے کو پیش کرتی ہیں۔

اُردو آپ بیتی کا تذکرہ کرتے ہوئے فارسی ادبیات کے آپ بیتیوں کا سرسری تذکرہ بھی ضروری ہے کیونکہ دونوں زبانوں کا نہ صرف گہرا رشتہ ہے بلکہ اُردو آپ بیتی دیگر اصناف ادب کی طرح فارسی کی تتبع میں شروع کی گئیں۔فارسی زبان میں بادشاہوں، وزراء، علماء، صوفیاء اور شعراء نے مستقل آپ بیتیاں لکھیں جو اپنے زمانے کے علم و ادب، تمدن، معاشرت اور ثقافت کی منظر کشی کرتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فارسی اور دیگر زبانوں اور قوموں کی تاریخ جنگ و جدل، مار کٹائی اور درباری رسوم و رواج کے سوا کچھ بھی نہیں تاہم اُس زمانے کی آپ بیتیاں "عوام کی سرگرمیوں" کی تاریخ ہیں چنانچہ علم الدین سالک کو لکھنا پڑا:

> "افسوس ہے کہ ہم نے اپنی قدیم آپ بیتیوں کو مرتب اور شائع کرنے کی جانب
> اپنی توجہ مبذول نہ کی ورنہ آج ہماری تاریخ بڑی حد تک مختلف ہو سکتی تھی۔یورپ
> کو اپنی آپ بیتیوں پر بڑا ناز ہے لیکن ہم نے اسے درخور اعتنا نہیں جانا"۔(۴۰)

فارسی زبان و ادب میں بابر کی "تزک بابری" جہانگیر کا "جہانگیر نامہ"، "فتوحات فیروز شاہی" اور "رقعات عالمگیری" وہ تاریخی آپ بیتیاں ہیں جو سلیس زبان، شگفتہ انداز بیان اور واقعات کی دلکشی کے ساتھ ساتھ تاریخی قدر و

منزلت بھی رکھتی ہیں۔اس کے علاوہ امیر خسرو کے ملفوظات، شیخ نصیر الدین شاہ کے ملفوظات اور نظام الدین اولیاء کے ملفوظات وہ تحریریں ہیں جن کو ہندوستان میں فارسی زبان کی اولین آپ بیتیوں کا شرف حاصل ہے۔ان میں لکھنے والوں کے ذاتی عادات و خصائص، نجی زندگی، عوام الناس کے رجحانات اور اُن کے دینی خدمات کی تفصیل صراحت سے ملتی ہے۔

اُردو میں آپ بیتیوں کا باقاعدہ آغاز کب ہوا؟ اس کا حتمی جواب مشکل ہے۔ ہمارے ہاں علماء، صوفیا اور شعراء تذکروں کے آخر میں اپنے ذاتی حالات تھوڑے بہت ضرور لکھتے اور یہی تذکرے، نکات، سر گزشتیں اور ملفوظات اُردو آپ بیتی کی ابتدائی صورتیں تھیں۔تاہم آپ بیتی بطور ایک الگ صنف اور فن کے جدید زمانے کی پیداوار ہے۔ میر تقی میر، میر حسن اور مصحفی کے عہد سے لے کر کافی عرصے تک علماء اور شعراء نے اپنے حالات، تذکرے، لطائف اور زندگی کے مشہور واقعات رقم کیے ہیں۔ بعض ادیبوں نے دوسرے لوگوں کی حالات زندگی اور فکر و فن کو بیان کیا ہے لیکن ضمنی طور پر اپنے حالات یا اُن کے ساتھ اپنا تعلق بھی تحریر کیا ہے۔ میر تقی میر سے تذکرہ لکھنے کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ ابوالکلام آزاد، حسرت موہانی اور شورش کشمیری تک چلا آتا ہے۔تاہم یہ تذکرے آپ بیتی کے جدید اصولوں اور تعریف پر پورا نہیں اترتے اس کی وجہ پرویز پروازی یہ بتاتے ہیں:

> ’’گو کہ ان تزکرہ نگاروں نے اپنے بارے میں کھل کر بات کی ہے اور نہ یہ تذکرے جدید زمانے کی آپ بیتی کی تعریف پر پورا اُترتے ہیں۔ اگر وہ مشرقی انکساری سے کام نہ لیتے تو ہماری سوانحی ادب کو زیادہ فائدہ پہنچتا‘‘۔(۴۱)

بہر حال ان سب کمزرویوں کے باوجود ہم ان تزکروں کو اُردو آپ بیتی کا نقش اولین کہہ سکتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان میں باقاعدہ اور منظم آپ بیتیوں کا رواج ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد شروع ہوتا ہے۔ جوں جوں انگریزی عملداری اور غلبہ بڑھتا گیا علوم و فنوں میں بھی ترقی اور انقلاب آتا گیا اُردو آپ بیتی بھی اس انقلاب سے نہ بچ پائی۔اس سلسلے میں اُردو میں جو سب سے پہلی مربوط آپ بیتی لکھی گئی وہ مولانا جعفر تھانسیری کی آپ بیتی ’’کالا پانی‘‘ ہے۔ جس میں مولانا نے اپنی زندگی خصوصاً جزائر انڈے مان ’’کالا پانی‘‘ میں اپنے قید و بند کے حالات و واقعات بیان کیے ہیں۔ جدید تحقیق سے ثابت ہے کہ یہ آپ بیتی اُردو کی پہلی منظم اور مربوط آپ بیتی ہے۔(۴۲)

مذکورہ آپ بیتی میں مولانا نے اپنی آپ بیتی سناتے سناتے وہابی تحریک کے مقاصد، انگریز کے مظالم، مسلمانوں میں شرک و بدعات نیز تاریخی حقائق کو بھی بڑی مہارت سے بیان کیا ہے۔اس کے علاوہ اُس زمانے کی دوسری اہم آپ بیتی جو آپ بیتی کے جدید تعریف پر پورا اُترتی ہے۔ ظہیر الدین دہلوی کی ’’داستان غدر‘‘ ہے۔(۴۳)

اس آپ بیتی میں ہمیں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے واقعات، سیاسی انتشار، تہذیبی تبدیلیاں، زوال پزیر معاشرت کی جھلکیاں، زبان و بیان اور محاورے کا مٹھاس اور منفرد اسلوب سب کچھ ملتے ہیں۔ تاہم ۱۸۵۷ء کی ''داستان غدر'' ہو کر بھی یہ غدر کی داستان نہیں ہے کیونکہ واقعات کے بیان اور انتخاب میں انتہائی احتیاط سے کام لیا گیا ہے ہو سکتا ہے اُس زمانے کے حالات ہی ایسے ہوں۔ اس طرح خان بہادر منشی عنایت حسین کی ''آیام غدر'' ''داستان غدر'' سے بہتر تصنیف ہے جبکہ بہادر شاہ ظفر کی آپ بیتی ''واقعات ظفر'' میں زوال پزیر معاشرے کی جھلکیاں زیادہ تفصیل سے ملتی ہیں لیکن اس میں بھی ظفر نے اپنی کہانی سپاٹ اور محتاط انداز سے بیان کی ہے۔ جہاں تک اُردو میں سیاسی آپ بیتیوں کا تعلق ہے تو مولانا حسرت موہانی کی ''قید فرنگ'' کو ایک خاص اہمت حاصل ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد جب ہندوستانیوں میں انگریز کا خوف کم ہوا، سیاسی بیداری کی تحریکیں شروع ہوئیں تو سیاسی آپ بیتیاں بھی منظر عام پر آنے لگیں۔ ''قید فرنگ'' ایک لحاظ سے قدیم اُردو آپ بیتیوں میں کامیاب آپ بیتی ہے جو اصول آپ بیتی یعنی خلوص، صداقت، سچائی، جرأت، حق گوئی پر پورا اُترتی ہے۔ اُس دور میں چودھری افضل حق نے بھی ''میرا افسانہ'' اور ''دوزخ'' لکھ کر اُردو ادب میں دو نہایت اہم آپ بیتیوں کا اضافہ کیا ہے۔ اس کے بعد اُردو آپ بیتیوں میں ایک نئے باب کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب خواجہ حسن نظامی کی ''آپ بیتی'' شائع ہوتی ہے۔ (۴۴)

خواجہ حسن نظامی ایک صاحب طرز انشاپرواز تھے اُس کی آپ بیتی اپنے زمانے کی سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی دور کی انمول تاریخ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھا ادبی مرقع بھی ہے۔ سید رضا علی عابدی کی آپ بیتی ''اعمال نامہ'' مولانا حسین احمد مدنی کی ''نقش حیات''، رشید احمد صدیقی کی ''آشفتہ بیانی'' عبدالمجید سالک کی ''سر گزشت'' دیوان سنگھ مفتون کی ''ناقابل فراموش'' اور مرزا فرحت اللہ بیگ کی ''میری داستان'' اُردو بیتیوں کی تاریخ میں وہ آپ بیتیاں ہیں جن میں اُس زمانے کی تاریخ، سیاست، ملکی حالات، انگریزی اثر و رسوخ، دینی مشاغل، فن اور ادب ہر زاویے سے اُردو ادب میں قابل ذکر اضافہ ہیں۔ آج کے جدید تر زمانے میں لکھی گئیں آپ بیتیاں صحافی، ادبی، عسکری، سیاسی، ثقافتی اور تاریخی حوالے سے ایک نئے باب کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس زمانے کی آپ بیتیوں کا آغاز جوش ملیح آبادی کی ''یادوں کی بارات'' سے ہوتا ہے اور قدرت اللہ شہاب کا ''شہاب نامہ'' مشتاق احمد یوسفی کی ''زر گزشت'' احسان دانش کی ''جہان دانش''، قراۃ العین حیدر کی ''کار جہان دراز ہے'' مرزا ادیب کی ''مٹی کا دیا'' کشور ناہید کی ''بری عورت کی کتھا'' تک سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ انگریزی ادب کے زیر اثر لکھی گئی ان آپ بیتیوں کی خاص بات ان کا انداز بیان، جدت، سچائی اور غیر معمولی جرأت ہے آج کا دور ابلاغ اور پیش کش کا دور ہے آج آپ بیتیوں کی اہمیت پہلے سے زیادہ ہو چکی ہے۔ ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کے ساتھ

ساتھ سیاسی اور عسکری لوگوں کی طرف سے آپ کا بیتیاں لکھنے کا رجحان بڑھ گیا ہے اب سیاستدانوں، فوجی جرنیلوں اور بیروکریٹوں کی آپ بیتیوں میں لوگ خصوصی دلچسپی لیتے ہیں۔ آپ بیتیاں زبان و بیان اور تاریخی حوالوں کے علاوہ معاشرتی تبدیلیوں کی بھی مستند دستاویز کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اُردو آپ بیتیوں کے ارتقاء کے مختلف ادوار:

ہم اُردو آپ بیتیوں کو اپنی سہولت کے لیے پانچ ادوار میں تقسیم کرتے ہیں۔

۱۔ پہلے دور کی آپ بیتیوں میں قدیم تزکرے، مکتوبات اور ملفوظات شامل ہیں۔ اس دور کے بعض تزکروں اور ملفوطات میں دیگر لوگوں کا ذکر کرتے کرتے ضمنی طور پر ذاتی کوائف بھی شامل کیے گئے ہیں۔ نفی ہستی، انکسار، ریاضت وعبادت کے جزبات ان تحریروں میں چھائے ہوئے ملتے ہیں۔

۲۔ اُردو آپ بیتیوں کا دوسرا دور ۱۸۵۷ء سے ۱۹۰۰ء تک کا دور ہے اس زمانے کی بیشتر آپ بیتیوں میں اختصار اور محتاط انداز ملتا ہے۔ ان آپ بیتیوں پر ایک ان دیکھے خوف کی فضاء چھائی ہوئی ہے۔ مصلحت کوشی اور مدافعانہ انداز ان آپ بیتیوں کا خاصہ ہے مولانا جعفر تھانسیری کا ''کالا پانی'' ظہیر دہلوی کا ''داستان غدر'' اور منشی عنایت حسین کا ''ایام غدر'' اس دور کی اہم آپ بیتیاں ہیں۔

۳۔ اُردو آپ بیتی کا تیسرا دور 1914ء سے 1947ء تک کے زمانے پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ دور ہندوستان میں سیاسی اور فکری بیداری کا دور ہے، دلیرانہ اور بے باکانہ انداز، سادگی، اعتدال، جفاکشی اور شیرین بیانی اُس زمانے کے اکثر لوگوں کا طرۂ امتیاز تھا اور یہ صفات ہمیں اس دور کی آپ بیتیوں میں بھی ملتی ہیں۔ ادبی لحاظ سے بھی اس دور کی آپ بیتیوں کا معیار کافی بلند ہے۔ مولانا حسرت موہانی کی ''قید فرنگ'' چودھری افضل حق کا ''میرا افسانہ'' خواجہ حسن نظامی کی ''میری آپ بیتی'' اور سر رضا علی کی ''اعمال نامہ'' اس دور کی نمائندہ آپ بیتیاں ہیں۔

۴۔ اُردو آپ بیتیوں کے تاریخ وار نقا کا چوتھا دور ۱۹۴۷ء سے صدی کے آخر یعنی ۱۹۸۰ء اور ۱۹۹۰ء تک کے عرصے پر محیط ہے۔ تقسیم ہند کے نتیجے میں ہونے والے فسادات، مہاجرت، معاشرتی و سماجی تبدیلیاں، فوجی حکومتیں، مشرقی پاکستان کی علیحدگی، مشترکہ خاندانی نظام کی ٹوٹ پھوٹ، صنعتی انقلابات، افغان جنگیں، سوشو کلچرل تبدیلیاں وہ حوادث ہیں جو ہماری قومی تاریخ کے اہم باب ہیں اس لیے اس عہد میں لکھی گئی آپ بیتیوں میں مذکورہ مضامین کا عکس ہم مختلف صورتوں میں واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں۔

صداقت پسندی، خلوص، ادبی چاشنی، افسانوی رنگ اور بے خوفی وغیرہ اس دور کی آپ بیتیوں کی نمایاں خصائص

ہیں۔ شورش کشمیری کی ''بوئے گل''، یوسف حسین خان کی ''یادوں کی دنیا'' دیوان سنگھ مفتون کی ''ناقابل فراموش'' جنرل ایوب خان کی ''جس رزق سے آتی ہے پرواز میں کوتاہی'' قدرت اللہ شہاب کا ''شہاب نامہ'' احسان دانش کا ''جہان دانش''، جوش کی ''یادوں کی برات'' اور الطاف گوہر کی ''گوہر گزشت'' اس دور کی نمائندہ آپ بیتیاں ہیں۔

۵۔ اُردو آپ بیتیوں کی تاریخ کا پانچواں دور اکیسویں صدی سے شروع ہوتا ہے۔ آج کا عہد سائنس و ٹیکنالوجی کا دور ہے اور دنیا کی ترقی کا نقطہ عروج بھی۔ سوشل میڈیا کی بے پناہ آزادی اور عالمگیریت نے انسان کی نجی زندگی کو طشت از بام کر دیا ہے۔ آج کوئی بھی بات راز نہیں رہ سکتی یہی وجہ ہے کہ اب آپ بیتی کا بنیادی اصول سچائی اور صداقت قدرے آسان ہو گیا ہے۔ جمہوری اقدار، سچائی اور بے خوفی، شخصی آزادی، اظہار رائے، مادیت، بے گانگی، جنسی شعور اور برق رفتار زندگی نئے میلینیم (New Melinum) کی زندہ اور درخشاں اوصاف ہیں جو لامحالہ اس دور کی آپ بیتیوں میں بھی محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ سادگی بیان، سچائی، بے خوفی، جنسی آزادی، مبالغہ آمیزی، اسلوب کی تازہ کاری، انگریزی محاورات اور اصطلاحات کا بے دریغ استعمال اس دور کی آپ بیتیوں کی اہم خصوصیات ہیں۔ داؤد رہبر کی ''پراگندہ طبع لوگ''، رشید امجد کی ''تمنا بے تاب''، جسٹس سجاد علی شاہ کی ''کانچ کے گھر''، جاوید ہاشمی کی ''میں باغی ہوں''، بے نظیر بھٹو کی ''دختر مشرق'' اور جنرل پرویز مشرف کی ''سب سے پہلے پاکستان'' اس دور کی یادگار آپ بیتیاں ہیں۔

آپ بیتی کی مختلف شکلیں و صورتیں:

ادب اظہار ذات اور حدیث دل کی ترجمانی کا نام ہے۔ اظہار ذات اور ترجمانی دل ہر صنف ادب میں ہوتی ہے۔ اس لیے آپ بیتی کے عناصر ہر صنف میں ڈھونڈے جا سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ شاعری بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ غزل تو ہے ہی واردات قلبی کا نام۔ علاوہ ازیں قصائد میں عرب اور ایرانی شعراء نے جس طرح سے اپنے سوانحی کوائف وضاحت سے بیان کیے ہیں قابل تعریف ہیں۔ نثری اصناف میں ناول، افسانے، ڈرامے، انشائیے اور سفر نامے تخلیق کار کی ذات، شخصیت، موضوع کے ساتھ تعلق خاطر اور نجی حوادث و تجربات کے بغیر خام اور نامکمل تصور ہوتے ہیں۔ یوں تو آپ بیتی کا دامن ادب کے ہر حصے تک پھیلا ہوا ہے لیکن ادب کے بعض اصناف آپ بیتی کے بغیر پروان ہی نہیں چڑھ سکتے۔ ہماری مشرق زبانوں میں بالعموم اور اُردو میں بالخصوص درج ذیل اصناف جدید آپ بیتی کی قدیم صورتیں ہیں۔

ا۔ ڈائری یا روزنامچہ:

روزنامچے ہماری قدیم ادب کی ایک قسم ہے۔ پرانے زمانے کے بادشاہوں، مشاہیر اور ادیبوں کے روزنامچے خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ ڈائری میں نہ صرف اس شخص کے ذاتی حالات قلمبند ہوتے ہیں بلکہ اُس کا پورا دور ڈائری میں

جلوہ گر دکھائی دیتا ہے۔ زمانہ قدیم کے بعض بادشاہوں، وزیروں، امیروں، نوابوں، صوبہ داروں اور ضلع داروں یا تعلقہ داروں نے اپنے روزنامچے لکھے ہیں حتیٰ کہ مصری بادشاہوں کے روزنامچے بھی اُن کے مرقدوں سے ملے ہیں۔ جن کو دنیا کے قدیم ترین روزنامچے تسلیم کیا جاتا ہے۔ قدیم روزنامچے میں لوگوں کے روزمرہ معمولات، مشاغل کاروبار روزوشب نیز مصنف اپنی یادداشت کے لیے ضروری باتیں قلمبند کرتے جن میں نمائش سے زیادہ اخفا کا خیال رکھا جاتا لیکن پھر بھی یہ اپنی ذات کے ساتھ ساتھ زمانے کی داستان ہوتے تھے۔ فارسی اور اُردو کے بعض روزنامچے خصوصی طور پر ادبی انداز سے لکھے گئے ہیں جو تاریخ سے ہٹ کر بلند پایہ ادبی مقام بھی رکھتے ہیں۔ روزنامچے آپ بیتی کے لحاظ سے کیا اہمیت رکھتے ہیں؟ اس کا جواب وہاج الدین علوی یوں دیتے ہیں:

> ''نثری ادب سے روزنامچہ نگاری اظہار ذات کے لیے موزوں سمجھی جاتی ہے۔ چونکہ ایسا ادب خود بینی یا خود نمائی کی خواہش پر مبنی ہوتا ہے اور بالخصوص سوانحی ادب میں یہ عنصر زیادہ پایا جاتا ہے اور روزنامچے کی تحریر کا محرک بھی یہی جذبہ ہے۔ اگرچہ واقعات اور حادثات کا تعلق براہ راست روزنامچہ نگار کی ذات سے معلوم نہیں ہوتا لیکن ان واقعات کی تہہ میں جھانکنے سے اور روزنامچہ نگار کی رائے کے تجزیے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ روزنامچے کا بنیادی محرک شعوری یا غیر شعوری طور پر روزنامچہ نگار کی ذات ہے، اظہار ذات یا خواہش خود بینی ہے اور یہی خصوصیت ہے جو روزنامچوں اور ڈائریوں کو خود نوشت سوانح نگاری کے فن سے قریب کرتی ہے''۔(۴۵)

اُردو میں خواجہ حسن نظامی اور مظہر علی سندیلوی، قاضی عبدالغفار، علامہ اقبال اور ناصر کاظمی کی ڈائریاں خصوصیت کی حامل ہیں۔

۲۔ ملفوظات:

ملفوظات کے لغوی معنی ہیں زبان سے نکلی ہوئی باتیں، اصطلاح ادب میں ملفوظات کا مطلب ہے:

> ''علم و عرفان میں نمایاں حیثیت رکھنے والے کسی شخص کے مجلس فرمودات اور اخبار و احوال جو کسی عقیدت مند نے حاضر خدمت رہ کر ایک سامع اور شاہد کی حیثیت سے قلمبند کیے ہوں ملفوظات کہلاتے ہیں''۔(۴۶)

غالباً ملفوظات کا دستور زیادہ تر عربی، فارسی اور اُردو زبانوں میں رہا ہے۔ یورپی زبانوں میں چونکہ چھاپہ خانہ بہت پہلے آیا تھا۔ اس لیے وہاں ملفوظات کا رواج نہیں ملتا۔ یہ ملفوظات عموماً تاریخ وار مرتب کیے جاتے تھے اور ان میں شیخ کے فرمودات کے ساتھ ساتھ اس کے روزمرہ مشاغل، سیاست، معاشرت اور لوگوں کی اقتصادی حالت کا بھی بیاں ہوتا۔ آخر میں شاگرد یا مرید اپنے ذاتی احوال اور شیخ کے ساتھ تعلق خاطر کا بھی تفصیل سے ذکر کرتا اس لیے ملفوظات اگر ایک طرف شیخ کی مرتب شدہ آپ بیتی ہوتی تو دوسری طرف خود مصنف کی بھی اچھی خاصی خود نوشت بن جاتی۔ اُردو زبان میں ملفوظات ہی وہ اولین مأخذ ہیں جن میں ہمیں علم کے ساتھ ساتھ خود نوشت سوانح عمری کے عناصر بھی ملتے ہیں۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ملفوظات ہماری زبان کی آپ بیتی کے اولین نقوش ہیں۔ شیخ فرید الدین گنج شکر نے خواجہ بختیار کاکی کے ملفوظات ''فوائد السالکین'' کے نام سے مرتب کیے۔ خواجہ نظام الدین اولیا نے اپنے شیخ طریقت بابا فرید شکر گنج کے ملفوظات ''راحت القلوب'' کے نام سے لکھے۔ امیر حسن سنجری نے خواجہ نظام الدین اولیا کے ملفوظات ''فوائد الفواد'' کے نام سے مرتب کیے اور حمید قلندر نے حضرت چراغ دہلوی کے ملفوظات ''خیر المجالس'' لکھے۔

۳۔ مکتوبات:

مکتوبات بھی آپ بیتیوں کے اولین شکلیں تصور کی جاتی ہیں۔ اگرچہ خطوط کا سراغ قدیم ترین تہذیبوں میں بھی ملتا ہے لیکن بعد کے زمانوں میں خطوط بطور ایک صنف اور فن کے مروج رہے۔ انگریزی اور دیگر یورپی زبانوں میں پندرویں اور سولہویں صدی عیسوی میں مکتوب نگاری ایک مستقل فن کے طور پر سامنے آئی۔ اس بات میں تو کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ شخصیت کے اظہار اور ذاتی جزبات واحساسات کی گنجائش ہر دوسری تحریر کی نسبت خط میں زیادہ ہوتی ہے۔ تاہم ایک طویل عرصے تک مکتوبات کو ادب کا درجہ حاصل نہیں تھا۔ بعد میں ادیبوں نے مکتوبات میں، سادگی، سلاست اور اسلوب کو بھی شامل کر کے اس کو ادب کا باقاعدہ صنف بنایا۔ مکاتیب میں مکتوب نگار کی روزمرہ کی چھوٹی موٹی باتیں، ذاتی پسند و ناپسند، مشاغل اور سیاسی و سماجی حالات کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ خطوط میں چونکہ تسلسل، نظم اور ربط نہیں ہوتا، مکتوب نگار کو جس طرح بات ذہن میں آتی ہے سپرد قلم کرتا جاتا ہے اس لیے اس میں آپ بیتی کی کوئی واضح اور متعین شکل نہیں بنتی لیکن پھر بھی مصنف کی ذات، ماحول اور شخصیت و کردار کے بارے میں کافی کچھ مل جاتا ہے اس لیے خطوط شخصیت کے اچھے خاصے خود نوشت حالات زندگی ہو سکتے ہیں۔ آج بھی جن مشاہیر یا ادیبوں نے باقاعدہ اپنی سرگزشتیں نہیں لکھیں اُن کے خطوط بڑی حد تک اس کمی کو پورا کرتے ہیں۔ غالب کے خطوط اُن کی خود نوشت سوانح عمری اور سیاسی و تہذیبی لحاظ سے ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ غالب کے علاوہ سر سید احمد خان، محمد حسین آزاد، شبلی نعمانی، علامہ اقبال، نیاز فتح

پوری اور ابوالکلام آزاد کے خطوط ان کے ذاتی کوائف، سیاسی، سماجی، تہذیبی اور اقتصادی احوال اور نجی معاملات و مسائل کے حوالے سے خصوصی شہرت رکھتے ہیں۔

مکتوبات کی سوانحی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے یوسف جمال انصاری لکھتے ہیں:

"جہاں تک سوانح نگاری کا تعلق ہے یہ امر مسلمہ ہے کہ خطوط خود نوشت سر گزشت ہوتے ہیں۔ آج بھی مشہور ادبی و سیاسی شخصیتوں کے خطوط ہمارے ادب کا ایک قابل قدر سرمایہ ہیں جیسے خطوط غالب، غبار خاطر اور مکتوبات نیاز فتح پوری وغیرہ۔" (۴۷)

۴۔تذکرے:

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے ہاں تنقیدی شعور، تجزیاتی تحریر اور فن پارے پر بے لاگ تبصرے کی روایت مغربی زبانوں کے زیر اثر آئی لیکن مشرق میں تذکرہ نگاری کی روایت بہت قدیم ہے۔تذکرہ نگاری کے تین مقاصد ہوتے تھے۔ادبی تاریخ مرتب کرنے، شاعروں اور ادیبوں کے فن و شخصیت پر تبصرہ کرنے اور اپنے آباؤاجداد کے کارنامے ریکارڈ پر لانے کے لیے یہاں تذکرہ نگاری کا رواج رہا۔ شاعروں کے حالات، مشہور ادبی واقعات یا لطائف وغیرہ کو بیان کرنے کے لیے تذکروں کا سہارہ لیا جاتا تھا۔دوسری اور تیسری قسم کے تذکروں میں کچھ کچھ ذاتی کوائف اور زندگی کی داستان ملتی ہے اس لیے تذکرے فن آپ بیتی کی فہرست میں شامل ہو جاتے ہیں۔میر تقی میر، میر حسن، مصحفی، محمد حسین آزاد وغیرہ نے تذکرے لکھے ہیں۔اُردو میں تذکرے لکھنے سے اُردو ادب کو یہ فائدہ پہنچا کہ ابتدا سے موجودہ زمانے تک مشاہیر کے حالات زندگی مرتب ہو گئے۔تاہم انگریزی اثرات سے تذکرہ نگاری میں زیادہ شان پیدا ہو گئی۔اُردو تذکروں میں تجزیاتی انداز، جاندار تبصرے اور تنقیدی شان جدید دور میں پیدا ہوئی۔ابوالکلام آزاد، مولوی عبدالحق اور رشید احمد صدیقی کے تذکرے عالمانہ اور ادیبانہ شان رکھتے ہیں۔تذکروں کی سوانحی اہمیت اور جدید آپ بیتی میں تذکرہ نگاری کا مقام اہم ہے۔

تذکروں کی خوبیوں اور خامیوں پر جناب یوسف جمال انصاری یوں روشنی ڈالتے ہیں:

"بعض لکھنے والوں نے اپنا تذکرہ اپنے قلم سے کیا ہے یہ سلسلہ یوں تو میر، میر حسن اور مصحفی سے شروع ہے اور حسرت موہانی تک چلا جاتا ہے لیکن یہ بھی عجیب بات ہے کہ مشرقی عجز وانکسار نے ان تذکرہ نویسوں کو کھل کر اپنی ذات کے متعلق کہنے کی اجازت نہیں دی۔ دوسروں کے حالات میں تو انہوں نے پوری کی پوری کتابیں

لکھ ڈالیں لیکن جب اپنی باری آئی تو اپنے بارے میں چند سطروں ہی میں اشارے کر گئے۔ بہر حال ان اشارات کو مجتمع کر کے خود مصنف کے الفاظ کو اس طرح ترتیب دیا جا سکتا ہے کہ اس کے خود نوشت حالات یکجا ہو جائیں''۔(۴۸)

۵۔سفر نامہ:

سفر نامہ بھی آپ بیتی کی قدیم اقسام میں سے ایک اہم قسم ہے۔ سفر نامے کا سراغ بھی قبل مسیح کے ادب میں ملتا ہے۔ سفر کے حالات، اجنبی ملکوں کی زبان، ثقافت اور بود و باش دوسرے مقام پر رہنے والوں کے لیے ہمیشہ دلچسپی کا باعث رہا ہے۔ اس لیے سفری داستان کو سننے اور سنانے والے دونوں نے دلچسپی سے سنا اور پڑھا ہے۔ سفری داستانیں (سفر نامے) کسی زمانے میں زبانی کلامی ہوتی تھیں اور پھر گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ تحریری، مربوط اور منظم صورت اختیار کر گئیں ۔''کشاف تنقیدی اصطلات'' کے مصنف سفر نامے کی تعریف اور لوازمات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''اچھا سفر نامہ وہ ہے جس میں مشاہدے کی گہرائی، ثقافتی مطالعے کا سلیقہ، انسان کی اساسی وحدت کا شعور اور اجنبی دیار و انصار کی زندگی کا ایسا صحیح تعارف شامل ہو جو مبنی بر صداقت ہونے کے علاوہ قارئین کے لیے دلچسپ، خیال انگیز اور بصیرت افروز ہو''۔(۴۹)

سفر نامے ایک لحاظ سے خود نوشت ہوتے ہوئے بھی تاریخ کے بہت قریب ہیں کیونکہ سفر ناموں میں تاریخی مواد بھرا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ سفر نامہ نگار عمارتوں، بازاروں، لوگوں کے رہین سہن، اقتصادی حالات کی تفصیل لکھ کر آگے بڑھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سفر ناموں میں بہت کچھ ہوتا ہے ان میں دوسروں کے حالات بھی ہوتے ہیں اور اپنے تجربات بھی۔ چونکہ سفر نامے میں مصنف کی زندگی کے کچھ واقعات اور مخصوص سفر کے حالات رقم ہوتے ہیں اس لیے سفر نامہ آپ بیتی کی سرحدوں میں داخل ہو جاتی ہے۔ ویسے بھی اکثر سفر ناموں پر جزوی یا وقتی آپ بیتی کا اطلاق ہوتا ہے وہاج الدین علوی کے الفاظ میں:

> ''سفر نامے زندگی کے ایک چھوٹے سے حصے پر مشتمل ہوتے ہیں جبکہ خود نوشت زندگی کے اہم ادوار پر محیط ہوتی ہے سفر نامے میں دنیا کے ایک یا زیادہ خطوں کے جغرافیائی ماحول، تہذیبی اور سماجی حالات اور وہاں کے انسانوں کا احوال ہوتا ہے۔ سفر نامے لکھنے والے کے مشاہدات اور یادداشت پر مبنی ہوتے ہیں اور ان میں بھی

خود نوشت کی طرح سفر نامہ لکھنے والا اپنی ذات اظہار کا وسیلہ بناتا ہے'' (۵۰)

مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ ذاتی تجربات، مشاہدات، احساسات، ارد گرد کے ماحول کا بیان، تاریخی حقائق کا تذکرہ اور اظہار ذات جیسی اوصاف اور خصوصیات آپ بیتی اور سفر ناموں میں مشترک ہیں اس لیے سفر نامے میں آپ بیتی کے عناصر آسانی سے تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جدید آپ بیتی یا خود نوشت سوانح عمری کے رواج سے پہلے سفر نامے ہی اس مقصد کو بڑی حد تک پورا کرتے تھے۔

(4) انٹرویوز:

انٹرویوز (مواجہات) جدید تر زمانے کی پیداوار ہے۔ ہمارا دور چونکہ ابلاغ اور صحافت کا دور ہے اس دور میں مشاہیر سے خصوصی انٹرویو کا اہتمام کر کے سیاست، معاشرت، دین اور ادب کے حوالے سے اُن کے خیالات معلوم کیے جاتے ہیں پھر دوران گفتگو وہ شعوری اور غیر شعوری طور پر اپنی سوانحی کوائف بھی بیان کرتا جاتا ہے۔ بعض انٹرویو اور سوالنامے تو خاص طور پر اس طرح تیار کیے جاتے ہیں تاکہ اُس شخص کے ذاتی کوائف اور زندگی کے اہم واقعات منظر عام پر آ سکیں اس قسم کے انٹرویوز خود نوشت سوانح عمری کے ساتھ ساتھ نفسیاتی حوالوں سے بے حد اہم ہوتے ہیں۔ تنقید نگاری کے جدید اصولوں کے مطابق شخصیت نگاری کو سمجھے بغیر ادب کو سمجھنا دشوار ہے اس لیے بھی انٹرویو کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ آج کل شخصیت نگاری پر بہت زیادہ کام ہو رہا ہے اور شخصیات کو سمجھنے کے لیے انہیں نئے نئے زاویوں سے پرکھا جا رہا ہے۔ سیاستدانوں، کھلاڑیوں اور فن کاروں کی آپ بیتیوں اور زندگی کے چیدہ چیدہ واقعات ان کے انٹرویوز میں بکھرے ملتے ہیں۔ سیاسی خود نوشتوں میں انٹرویوز بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ کسی خاص تاریخی واقعے، سیاسی حادثے، قومی المیے، بڑے بحران اور مخصوص حوالوں سے دیکھا جائے تو انٹرویوز آپ بیتیوں کا نعم البدل ہو سکتی ہیں۔ جزوی اور تاثراتی آپ بیتیوں میں انٹرویوز کو شامل کیا جا سکتا ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، عبدالمجید سالک، ڈاکٹر محمد دین تاثیر، ممتاز مفتی اور ن م راشد کے انٹرویوز اس ضمن میں خصوصی شہرت رکھتے ہیں۔ سیاست دانوں میں نواز شریف کے وہ طویل انٹرویوز جو اس نے صحافی سہیل وڑائچ کے ساتھ کئی نشستوں میں کئے اور جو آج کتابی صورت میں چھپے ہیں بڑی حد تک آپ بیتی کی تشنگی کو پورا کرتے ہیں۔ (۵۱)

انٹرویو یا سوال نامے اور مرتب شدہ آپ بیتی کی سب سے بڑی قباحت یہ ہے کہ اس میں انٹرویو لینے والا اپنی مرضی کی باتیں شامل کر کے حقائق کو توڑ موڑ کر پیش کرتے ہیں۔ یہی وہ عنصر ہے جو انٹرویو کو جزوی یا نامکمل آپ بیتی کی صف سے الگ کرتی ہے۔ مختصر یہ کہ ہم آپ بیتی کے نقوش ادب کے ہر صنف میں دیکھ سکتے ہیں۔ رپورتاژ، انشائیے، شخصی خاکے،

مثنوی، قصیدے اور غزل وہ اضاف سخن ہیں جن میں ہم فرد کے عمومی اور انفرادی تجربے کی جھلکیاں واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں۔

آپ بیتی نگاری کے اصول:

آپ بیتی لکھنا بھی ایک فن ہے۔ ہماری مشرقی زبانوں بالخصوص اُردو زبان میں جدید آپ بیتی کا فن انگریزی ادب کے زیر اثر پروان چڑھا اور اُردو میں بھی مغربی زبانوں کی تتبع میں بڑی کامیاب آپ بیتیاں لکھی گئیں ہیں۔ جس طرح ہم نے پچھلے صفحات میں تفصیل سے بیان کیا کہ مشرقی زبانوں میں منظم اور مربوط آپ بیتیوں کا رواج نہیں تھا تزکرے، سرگزشتیں اور روزنامچے اس مقصد کو پورا کرتے تھے۔ اُردو کے جدید آپ بیتی کے فنی لوازمات زیادہ تر انگریزی ادبیات سے مستعار لیے گئے ہیں۔ انگریزی زبان میں ''روسو'' کی آپ بیتی ''اعترافات'' سے عہد جدید کی آپ بیتی کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس لیے آپ بیتی لکھنے کے اُصول بھی بڑی حد ان کی وضع کردہ ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنے ایک مضمون ''آپ بیتی'' میں روسو کے اعترافات کی ابتدائی عبارت دی ہے جس میں روسو نے آپ بیتی کے موٹے موٹے اُصول وضع کیے ہیں:

> ''میں نے ایک مہم کا بیڑا اُٹھایا ہے جس کی کوئی نظیر نہیں اور شاید کوئی دوسرا آدمی اس کی تقلید (کی جرأت) بھی نہ کر سکے گا۔ میں کشتہ تقدیر مخلوق کے سامنے ایک انسان کی تصویر رکھ رہا ہوں اور یہ انسان کون ہے میں خود ہوں، میں اپنے دل کے بھید جانتا ہوں میں نے دوسرے انسانوں کو بھی دیکھا ہے۔ میں اُن میں سے کسی جیسا نہیں اُن سے بہتر ہونے کا دعوی تو نہیں کر سکتا پر اتنا کہہ سکتا ہوں کہ مجھ میں کچھ ندرت ضرور ہے۔ کیا فطرت نے مجھے جس سانچے میں ڈھالا ہے اس کو خود ہی توڑ کر کوئی اچھا کام کیا؟ اس کا فیصلہ میری کتاب کو پڑھ کر ہی کیا جا سکے گا۔ میں نے سچائی اور پوری آزادی کے ساتھ اپنے عیب وہنر کو بیان کیا ہے۔ میں نے اپنا کوئی جرم نہیں چھپایا۔ میں نے اپنی خوبیوں کو بڑھا چڑھا کر بیان نہیں کیا۔ اگر کہیں کہیں میں نے زیب داستان کا ارتکاب کیا ہے تو محض اس وجہ سے کہ بعض بعض موقعوں پر میری یاد نے میرا ساتھ نہیں دیا لہٰذا مجھے وہ خلا پورے کرنے پڑے۔ عین ممکن ہے کہ میں نے بعض ایسی باتوں کو یقینی سمجھ لیا ہو جو احتمالی تھیں لیکن میں

> نے جان بوجھ کر جھوٹ کو سچ نہیں کیا۔ میں جیسا بھی تھا ویسا ہی میں نے اپنے آپ کو پیش کیا کبھی بُرا اور قابل نفرت، کبھی نیک طبیعت، کشادہ دل اور رفیق۔ میرے بنی نوع میرے ان اعترافات کو سنیں، میری پستی پر شرمائیں، میرے دکھ پر کانپ جائیں اور اگر ان میں کسی میں بھی ہمت ہو تو وہ اس خلوص اور جرأت کے ساتھ اپنے دل کو ٹٹولے اور کہہ سکتا ہے تو صاف صاف کہہ دے کہ میں اس آدمی (روسو) سے برتر ہوں"۔(۵۲)

روسو نے اپنے اس بیان میں آپ بیتی لکھنے کے درج ذیل اصول بیان کیے ہیں جو آج کسی بھی زبان میں کامیاب خود نوشت لکھنے کے لیے مشعل راہ ہیں:

(۱) آپ بیتی لکھنا ایک مہم جوئی ہے۔

(۲) آپ بیتی لکھتے ہوئے سچائی اور پوری آزادی کے ساتھ اپنے عیب و ہنر اور ذاتی عادات و خصائص بیان کیے جائیں۔

(۳) اپنے کسی جرم کو نہ چھپایا جائے اور نہ جان بوجھ کر جھوٹ کو سچ میں بدلا جائے۔

(۴) انسان اپنی مختصر سی زندگی میں قسم قسم کے فکری اور جزباتی تموج سے گزرتا ہے وہ کبھی زاہد خشک بن جاتا ہے اور کبھی رند خراب، لہٰذا انہیں اپنی تمام ذہنی کیفیات کا کھل کر اظہار کرنا چاہیے۔

(۵) آپ بیتی لکھنے والا اخلاقی جرأت سے کام لے۔ وہ زندگی کے اہم حالات و واقعات بے کم و کاست سپرد قلم کرے تب جا کر اس کی آپ بیتی پڑھنے والوں کے لیے دلچسپی کا باعث بن سکتی ہے۔

یہ تو روسو کے بیان کردہ اُصول تھے۔ اب ہم ایک معیاری، کامیاب اور دلچسپ آپ بیتی لکھنے کے عمومی اصول و ضوابط قدرے تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

۱۔ آپ بیتی کو ذاتی تجربے کا بہترین نمونہ کہا جاتا ہے۔ اس لیے آپ بیتی لکھنے والے کو جان بوجھ کر ہیرو بننے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ ذاتی تجربات، روزمرہ کے واقعات، احساسات، جزبات اور معلومات کو پوری سچائی اور خلوص کے ساتھ پیش کرنا چاہیے، حقائق پر مبنی آپ بیتیوں کو شہرت عام اور بقائے دوام حاصل ہوتا ہے۔ اُردو آپ بیتیوں کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ یا تو آپ بیتی اور افسانے کے فن کی آمیزش کی گئی ہے۔ (جیسا کہ شہاب نامہ) یا آٹو بائیو گرافی اور بائیو گرافی کو ملایا گیا ہے۔ (مثلاً الکھ نگری)

۲۔ آپ بیتی میں تحریر کیا ہوا ہر واقعہ جزئیات کی حد تک ذاتی تجربے کی روشنی میں ریکارڈ ہوتا ہے لہٰذا ایسی باتیں لکھنا

جو مصنف کے تجربے سے نہیں گزریں آپ بیتی کے بنیادی اصول کے خلاف ہے۔ آپ بیتی لکھنے والے کو اپنی زندگی کے حالات کے ساتھ ساتھ اپنے ارد گرد کے لوگوں کے بارے میں بھی تھوڑا بہت لکھنا چاہیے تاکہ آپ بیتی اور جگ بیتی کا مناسب امتزاج ہو سکے نیز داخلی اور خارجی واقعات میں توازن بھی ضروری ہے ورنہ آپ بیتی یک رُخی اور غیر دلچسپ ہو جاتی ہے۔ اُردو کی زیادہ تر آپ بیتیوں میں خارج کی طرف رجحان پایا جاتا ہے۔ مغربی آپ بیتیوں میں حقائق سے جس طرح کے پردے اُٹھائے گئے ہیں اور انتہائی نجی معاملات کو پورے جزئیات کے ساتھ جس طرح بیان کیا گیا ہے، اُردو کے لکھاریوں سے اُس آزادی کی توقع نہیں کی جاسکتی تاہم عمومی حقائق اور مختلف واقعات کے وقوعہ میں احتیاط یا پردہ پوشی تاریخی جرم ہے۔

۳۔ کسی بھی آپ بیتی میں شخصیت کا ارتقاء اور واقعات کی ترتیب اس حیثیت سے نہیں لکھی جاسکتی کہ زندگی کو پوری طرح چلتا پھیرتا اور بولتا چالتا دکھایا جا سکے دوسری بات یہ کہ بچپن اور جوانی کی باتوں کا پورے سیاق وسباق سے یاد رکھنا بھی مشکل ہے۔ تیسری یہ کہ لکھنے والے کی زندگی کی بعض باتیں خود ان کے لیے اہم ہوں گی لیکن قاری کے لیے تاریخی، ثقافتی اور سیاسی طور پر اتنی اہمیت کی حامل نہیں ہوں گی۔ چوتھی یہ کہ آپ بیتی لکھنے والا حد بندی کر لیتا ہے اور واقعات کے بیان میں کانٹ چھانٹ کرتا ہے۔ اس لیے کوئی بھی آپ بیتی مکمل آپ بیتی نہیں ہو سکتی۔

۴۔ آپ بیتی لکھنے کا ایک اہم اصول یہ ہے کہ لکھنے والا دلچسپ اور خاص خاص باتوں کو قلمبند کرے۔ ایک معیاری آپ بیتی میں انتخاب واقعات اور ترتیب و تشکیل کا ہونا از حد ضروری ہے تاکہ شخصیت کے اہم نکات صحت و وسعت کے ساتھ ضبط تحریر میں لائی جاسکیں اور آپ بیتی ایک رسمی، بے جان مجموعہ واقعات کی بجائے ایک شاندار مرقع بن جائے۔ آپ بیتی کے اس اصول کے بارے میں ڈاکٹر شاہ علی رقمطراز ہیں:

> ''خود نوشت سوانح عمری میں واقعات زندگی کا انتخاب ضروری ہے ورنہ فرد کی ایک دن کی مصروفیات کے بیان کے لیے کئی سو صفحات ناکافی ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ روزمرہ کے معمولی مشاغل کا حزف لازمی ہے اس کے علاوہ بہت سے انسانی محسوسات، افکار، اقوال اور افعال ہنگامی ہوتے ہیں اسی طرح انسان کے بہت سے اعمال ہیں جنھیں کارنامے کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ لہذا اتحاد کے لیے کڑا انتخاب ضروری ہے''۔(۵۳)

اُردو میں لکھی گئی بعض آپ بیتیاں مثلاً خواجہ حسن نظامی، سر رضا علی، عبادت بریلوی اور یوسف حسین خان کی آپ بیتیوں میں جملہ لطائف وظرائف اور حالات و واقعات سے پہلو تہی کرنے سے افسوس ہوتا ہے۔ اُردو آپ بیتیوں میں

کتنی تاریخی،ادبی اور تہذیبی حقائق سے چشم پوشی کر کے اپنی آپ بیتیوں کے قد کاٹ کو گھٹایا گیا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مشرقی زبانوں میں کھل کر بات کرنا اتنا آسان نہیں جتنا سمجھا جاتا ہے۔اگر خود نوشت سوانح عمریوں میں چند ضروری باتوں کا خیال نہ رکھا جائے تو اس سے نہ تو دلچسپی پیدا ہو سکتی ہے اور نہ ایک کامیاب خود نوشت بن سکتی ہے۔ڈاکٹر عبدالقیوم نے جدید سوانح نگاری کے کچھ اُصول بتائے تھے جو خود نوشت سوانح عمری پر بھی صادق آتے ہیں:

> ''اسٹر یچی کا دیباچہ(Preface) جدید سوانح نگاری کا منشور (manifesto)ہے جس میں اُس نے ایجاز و اختصار، حسن انتخاب، آزادی خیال، اظہار حقیقت ،غیر جانبداری، بے تعصبی اور متعلقہ واقعات کی ترتیبِ مناسب اور غیر جزباتی انداز کے ساتھ پیش کرنے پر زور دیا ہے اور اب انھیں اثرات کو قبول عام حاصل ہو رہا ہے'' (۵۴)

۵۔ سچ یہ ہے کہ آپ بیتی لکھنے کا کوئی خاص اصول ہی نہیں۔''روسو'' جیسے اصول پسند اور سچے و کھرے شخص کو بھی اعتراف کرنا پڑا کہ میں نے بعض موقعوں پر زیب داستان کا ارتکاب کیا ہے جب حافظے نے میرا ساتھ نہیں دیا۔اگر آپ بیتی لکھنے والا بندھے ٹکے اصول سامنے رکھ کر پہلے منصوبہ بنائے کہ میں نے یوں یوں لکھنا ہے تو وہ بناوٹ اور تصنع سے نہیں بچ سکتا اس طرح انکشاف اور اظہار ذات کا اصل اصول ختم ہو جاتا ہے۔آپ بیتی چونکہ گزرے ہوئے ایام کی سر گزشت اور فرد کی کہانی ایک منظم اور منطقی انداز سے تحریر کرنے کا نام ہے۔اس لیے آپ بیتی میں بے ساختگی ، صداقت ، خلوص بنیادی اصول ہیں۔رہا آپ بیتی کا مقام و مرتبہ متعین کرنے کا مسئلہ تو یہ کام قاری اور تاریخ کے سپرد کرنا چاہیے کہ ''جس دیے میں جان ہو گی وہ دیا رہ جائے گا''۔

اُردو آپ بیتیوں کا اسلوب:

اسلوب عربی لفظ ہے جس کی جمع اسالیب ہے اُردو لفظ اسلوب انگریزی کے ایک لفظ''Style'' کے مترادف ہے جو یونانی زبان کے''Stylus'' سے انگریزی میں آیا جبکہ یونانی زبان میں لاطینی زبان کے ایک لفظ''Stylos'' سے داخل ہوا تھا چنانچہ پروفیسر عارف متین کے مطابق:

> ''یہ عربی لفظ ہے جو انگریزی لفظ''Style'' کے مترادف ہے۔یہ ہڈی یادھات کے اس قلم کو کہتے ہیں جس سے موم ، چڑھی کی ٹکیوں پر رکھا جاتا ہے۔اسلوب کے لفظی معنی ہیں چال، ڈھب، ڈھنگ، ضابطہ، طرز، فقرے کی تشکیل نو وغیرہ۔''(۵۵)

آج کل اسلوب کسی بھی زبان میں لکھنے کے طریقے اور ڈھنگ کو کہتے ہیں۔اسلوب کا استعمال صرف طرز تحریر کے معنوں میں نہیں بلکہ فنون لطیفہ کے دیگر ضابطوں میں بھی ہوتا ہے۔اسلوب نہ صرف لکھنے کا ڈھنگ ہے بلکہ یہ وہ تعلق اور بنیاد ہے جس کے ذریعے لکھنے والا قاری کے ساتھ تعلق پیدا کرتا ہے۔اصول فن، خصوصیات فن اور قوت اظہار سب باتوں کا اطلاق لفظ اسلوب پر کیا جا سکتا ہے۔اسلوب تحریر کی شناخت بھی ہے اور انفرادیت بھی بلکہ فکر، زبان، دماغ کی خارجی تصویر سب کو ملا کر دیکھنے اور پڑھنے سے ہی اسلوب کی صحیح تعریف سمجھ میں آسکتی ہے۔اسلوب چونکہ ہر لکھنے والے کی ذات سے تعلق رکھتا ہے اس لیے ہر لکھاری کا دوسروں سے الگ اور منفرد اپنا خاص اسلوب ہو گا۔ہر شخصیت نفسیاتی اور جزباتی لحاظ سے دوسری شخصیت سے الگ ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ ہر آدمی کا اسلوب بھی دوسروں سے جدا اور الگ ہوتا ہے۔ ایک مغربی نقاد کے الفاظ میں ''اسلوب خود ہی آدمی ہے''۔اسلوب بہت ہی نایاب چیز ہے اور صاحب اسلوب ''نایاب تر''۔صاحب اسلوب ہزاروں میں کہیں ایک پیدا ہوتا ہے۔ایک اچھی، دلکش، شستہ، شائشتہ اور رواں تحریر، فن تحریر پر کامل دسترس کا نتیجہ ہے جو محنت، لگن اور مشاقی سے حاصل ہو سکتی ہے۔اسلوب کا تعلق منفرد شخصیت اور بے مثال تخلیقی تخیل سے ہے۔

دنیا کی کسی بھی زبان میں جتنے اچھے مصنف ہیں اُتنے اچھے اسلوب بھی ہیں۔اُردو کے نقادوں نے عمومی طور پر اسلوب کے تین اقسام بتائے ہیں۔

''(ا) پر شکوہ یا جلیل اسلوب (ابوالکلام آزاد اس اسلوب کے نمائندہ اسلوب نگار ہیں)

(۲) سادہ اسلوب (مولوی عبدالحق کا اسلوب)

(۳) امتزاجی اسلوب (ڈپٹی نذیر احمد اور شبلی نعمانی کا اسلوب)''۔(۵۶)

ڈاکٹر طارق سعید نے ان تین اسالیب کو مزید تقسیم کر کے اُردو نثر میں درج ذیل گیارہ اسالیب کی نشان دہی کی ہے:

''(ا) سادہ اسلوب (۲) سلیس اسلوب (۳) سپاٹ اسلوب (۴) علامتی اسلوب (۵) تعقیدی اسلوب (۶) خطیبانہ اسلوب (۷) انانیتی اسلوب (۸) استعاراتی اور محاکاتی اسلوب (۹) مکتبی اسلوب (۱۰) سماجی اسلوب (۱۱) مذہبی اسلوب''۔(۵۷)

یہاں سوال یہ ہے کہ ادب کا ہر صنف جدا اُسلوب کا متقاضی ہے خود نوشت لکھنے کے لیے کون سا اسلوب بہتر رہتا ہے۔اِس کا جواب یہ ہے کہ اُردو آپ بیتی کو کئی اسالیب میں لکھنے کا رواج رہا ہے اور آج بھی لوگ اسے نئے نئے اور تازہ

اسالیب میں لکھ رہے ہیں۔اب تک لکھی گئی اُردو آپ بیتیوں کے اسالیب کے بارے میں ڈاکٹر پرویز پروازی لکھتے ہیں:

> ''اُردو میں خودنوشت سوانح عمریوں کے تین اسلوب نمایاں ہوئے۔ واحد حاضر میں لکھنے کا اسلوب جو ہماری بیشتر خودنوشتوں کا اسلوب ہے۔صیغہ غائب میں لکھنے کا طریق مثلاً حمید نسیم کی ''ناممکن کی جستجو''یا تیسرے شخص کو اپنی سوانح خود روایت کرنے کا اسلوب جیسے حکیم نور الدین خان کی ''مرقاۃ الیقین'' جو حکیم صاحب نے اکبر شاہ خان کو املا کروائی۔صدر ایوب خان کی ''جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی''اصلاً انگریزی میں لکھوائی ہوئی خودنوشت ہے جو بعد میں اُردو میں ترجمہ ہوئی۔'' (۵۸)

آپ بیتی باطنی محرکات، چیدہ چیدہ واقعات اور دل پر گزرنے والے حالات کو من و عن تحریر کرنے کا نام ہے جو جس ادا و انداز سے وقوع پزیر ہوئیں۔آپ بیتی ناول، افسانہ یا ڈرامانہیں جو حقیقت اور تخیل کی امیزش سے پروان چڑھے۔ مبالغہ جہاں تک ناول اور افسانے کے لیے ضروری ہے آپ بیتی کے لیے سم قاتل ہے۔آپ بیتی ایک لحاظ سے زمانے کی تاریخ ہے لیکن اسلوب نگارش، صداقت، ایجاز واختصار اور غیر جزباتی انداز اس کو ادب کا ایک اہم صنف بناتی ہے۔اسلوب کے لحاظ سے ڈاکٹر سید عبداللہ نے اُردو آپ بیتیوں کی چھ اقسام بیان کی ہیں۔(۵۹)

اُردو آپ بیتیوں کا اگر زیادہ باریک بینی سے جائزہ لیا جائے تو ہر آپ بیتی ایک خاص نقطہ نظر سے لکھی گئی ہے اس لیے ہر آپ بیتی کا انداز واسلوب جدا ہے۔ مثلاً ''رضا علی'' نے ہندوستان کی شائستگی، ادبی و تعلیمی ماحول اور تہذیبی زندگی کو پیش کیا ہے۔''دیوان سنگھ مفتون" نے سیاست کا ماحول، اداروں کا طریقہ کار، ریاستوں کا ظلم و ستم اور ہندوستانی وضع داری کو بیان کیا ہے۔''مولانا سالک'' نے اپنی آپ بیتی میں دوسروں کے خاکے لکھے ہیں اور ''مولانا حسین احمد مدنی'' نے اپنی آپ بیتی میں محاسبہ نفس، اخلاق آموزی اور پند ونصائح لکھے ہیں۔آپ بیتی کے اسلوب کے لیے ضروری ہے کہ رومانوی اور تخیل کی دنیا میں گل گشت کاری سے عاری ہو بلکہ یوں لگے گویا وہ کسی کو روداد زندگی سنا رہا ہے اور بقول کلیم الدین احمد:

> ''انتہائی جزباتی کیفیت کے بیان میں بھی اعتدال، تسلسل اور استقامت کے اصولوں کو برتا جائے''۔(۶۰)

آپ بیتی میں خاکساری، کسر نفسی اور معروضی انداز بیان آپ بیتی کی شان کے خلاف ہے۔آپ بیتی چونکہ زندگی کی تاریخ بھی ہے اور ماوراء تاریخ بھی اس لیے آپ بیتی میں سچائی، صداقت اور کھرا پن انتہائی ضروری ہے۔آپ بیتی میں

مصنف کا کردار مرکزی ہوتا ہے لیکن ساتھ ساتھ دیگر کردار بھی آتے ہیں جن میں کچھ بڑے کردار ہوتے ہیں اور کچھ چھوٹے۔ ہمارے اکثر مصنفین چھوٹے کرداروں کو نظرانداز کرتے ہیں۔ حالانکہ چھوٹے کرداروں کی بھی اپنی اہمیت ہے کہ ان کے سوا زمانے کی فضاء پیدا نہیں ہوتی۔ مشاہدے اور مطالعے کے بنیاد پر لکھی گئیں آپ بیتیوں کی قدر و قیمت بھی زیادہ ہوتی ہے تاہم نقاد اس بارے میں دو نظریے رکھتے ہیں پہلا یہ کہ خودنوشت سوانح عمری لکھنے والے کو خود مرکزی کردار ہونا چاہیے دوسرا یہ کہ لکھنے والے کا خود مرکزی مقام نہ ہو بلکہ واقعات اور یادوں کا ایک جلوس یا کاروان ہو جو بہتا چلا جائے۔ اس طرح بے ساختگی اور طرز ادا کی سادگی آپ بیتیوں کی وقعت میں اضافہ کرتی ہے۔ سیاست دانوں کی آپ بیتیوں پر سب سے بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ یہ اپنے نظریات کی تبلیغ و تشریح کے لیے لکھتے ہیں لیکن اس قسم کی بھونڈی آپ بیتیاں قاری کی توجہ حاصل نہیں کر پاتیں۔ اُردو میں بعض آپ بیتیاں اپنی منفرد اسلوب نگارش کی وجہ سے زندہ ہیں جن میں ''شہاب نامہ''، ''اعمال نامہ''، ''مٹی کا دیا'' اور ''جہان دانش'' زیادہ مشہور آپ بیتیاں ہیں چنانچہ قدرت اللہ شہزاد کے خیال میں:

> ''آپ بیتی کے لیے ضروری ہے کہ خودستائی اور نرگسیت سے عاری ہو۔ کامیاب خودنوشت کے لیے ایسا اسلوب چاہیے جو قارئین کے ذہنوں کو براہ راست متاثر کرے''۔(۶۱)

آپ بیتی اگرچہ تاریخ نہیں لیکن تاریخی حقائق کا بیان تو ہے۔اس میں ماحول، اداروں، تحریکوں، شخصیات، تہذیب، سیاسی اور معاشرتی حالات کی تفصیل دینے سے آپ بیتی جگ بیتی بن جاتی ہے یہ مصنف کا طرز بیان اور اسلوب ہی ہے کہ خشک اور سپاٹ واقعات کو قابل توجہ بناتا ہے۔ آپ بیتی فکشن نہیں کہ اسے رنگین نوا بنایا جائے بلکہ صداقت، حقیقت نگاری، وسعت نظر اور دلکش اسلوب آپ بیتی کو جاذب نظر بناتا ہے۔ آپ بیتی لکھنے والا اکثر و بیشتر اپنے تاثرات پر انحصار کرتا ہے لیکن تاثراتی اور تجزیاتی اسلوب آپ بیتی کے لیے قابل قبول نہیں۔ بیانیہ، سادہ اور پر خلوص انداز اس کے لیے شرط اولین ہے۔ ڈاکٹر پرویز پروازی اُردو آپ بیتیوں کے اسالیب پر یہ جامع تبصرہ پیش کرتے ہیں:

> ''اسی طرح جتنے منہ اُتنی باتیں کے مصداق خودنوشت سوانح عمری کے اسلوب کے بارے میں یہ محاورہ وضع کر لینے میں کوئی ہرج نہیں کہ جتنے خودنوشت سوانح نگار اتنے ہی اسلوب۔ اگر ایسا نہ ہو تو کس کو کیا پڑی ہے کہ زید، بکر یا عمرو کی خود لکھی ہوئی سوانح پڑھتے پھریں؟ ان اسالیب کا جائزہ واضح کرتا ہے کہ خودنوشت

سوانح عمریاں ذاتی اور ذہنی سطح پر ایک دوسرے سے ممتاز، منفرد، جدا اور مختلف
ہوتی ہیں۔"۔(۶۲)

اُردو آپ بیتیوں کی قدر و قیمت:

اُردو میں خود نوشت نگاری کا سلسلہ انیسوی صدی کے ربع آخر سے شروع ہوتا ہے اس دوران سیاسی، سماجی، تہذیبی، تاریخی، ادبی، لسانی، مذہبی اور کئی طرح کے موضوعات پر آپ بیتیاں ظہور میں آئیں۔ آپ بیتیاں جہاں اظہار ذات اور ماحول کی عکاسی میں معاون ہوتی ہیں۔ وہی صاحب سوانح کے اعتقاد، ماحول، خاندان اور نصب العین کی بھی غمازی کرتی ہیں۔

درج ذیل سطور میں ہماری اُردو زبان میں لکھی جانے والی آپ بیتیوں کی اہمیت کا اختصار سے ذکر کرتے ہیں۔

۱۔ آپ بیتیوں میں ہمیں وہ کچھ ملتا ہے جو ہمیں تاریخ کی صفحات میں نہیں مل سکتا۔ ان کے مطالعے سے تاریخ کی کئی اُلجھنیں دور ہوتی ہیں۔ اُردو کی تمام قدیم وجدید آپ بیتیوں میں سیاست و معاشرت کا وہ رنگ جھلکتا ہے کہ اگر ان کو سامنے رکھ کر تاریخ مرتب کی جائے تو اس براعظم کی تاریخ کی شکل تبدیل ہو جائے گی اور غیر مسلموں کی پیدا کردہ زیادہ تر غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی۔

۲۔ ہر زبان کی آپ بیتی اپنے زمانے کے کامیاب لوگ، سیاسی افراد، جرنیل برگزیدہ بزرگ اور عظیم المرتبت انسان تخلیق کرتے ہیں۔ جن میں اُن کی زندگیوں کے اُتار چڑھاؤ، زمانے کے نشیب و فراز، ذاتی تجربات، مشاہدات، کامیابیاں اور اُصول پرستی کی جھلکیاں جابجا نظر آتی ہیں یہ وہ کتابیں ہیں جو اس قابل ہیں کہ ملک کا ہر نوجوان اسے پڑھ کر اپنے اندر وہ خوبیاں پیدا کرے جس سے انسان کامیابی کی معراج حاصل کر سکتا ہے۔

۳۔ آپ بیتی لکھنے والا خود اپنی تحریر کا مرکزی کردار ہوتا ہے لیکن جن لوگوں کا وہ ذکر کرتا ہے اُن کی خوبیاں بھی نمایاں ہو جاتی ہیں اور وہ زندہ جاوید ہو جاتا ہے۔ ایک کامیاب آپ بیتی نگار متانت اور سنجیدگی سے لکھتا ہے۔ وہ مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیتا لیکن حقیقت کو بھی ایسے انداز سے بیان کرتا ہے کہ آپ بیتی میں افسانے کا مزا آتا ہے۔ ملک میں کیا انقلابات آئے، کون کون سی تحریکیں اُبھریں، کس سیاسی جماعت کا کیا کردار رہا۔ پرانی قدریں کیسے مٹ گئیں اور نئی بستیاں کیونکر آباد ہوئیں ان سب کا ذکر آپ بیتی کی ہر منزل پر نظر آتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو آپ بیتی میں تاریخ، افسانے، ڈرامے، ناول، سفر نامے اور انشایے غرض ہر صنف ادب کا رنگ شامل ہو جاتا ہے۔ اس لیے آپ بیتی ہر صنف ادب سے زیادہ مشہور و ممتاز ہو کر ہر طرح کے قاری کے لیے دلچسپی کا سامان بن جاتی ہے۔

۴۔ زندگی کی بہت سی باتیں، سیاسی راز، اقوام عالم کی کشمکش اور اعصابی جنگیں ایسی ہیں جو کسی ایک فرد واحد کے علم میں تو موجود ہوتی ہیں لیکن کاغذ پر نہ آسکنے کے سبب معدوم ہو جاتی ہیں اور دنیا ان رازوں سے محروم رہتی ہے۔ فکر کے کتنی موتی، علم و دانش کے آبگینے، ادبی فن پارے، شعر و شاعری کے اعلیٰ ٹکڑے اور علم و فضل کے بے مثال خزانے ضبط تحریر میں نہ آنے کے سبب دنیا کے سامنے نہ آسکے۔

اگر ہمارے یہاں بھی مغربی اور ترقی یافتہ معاشروں کی طرح آپ بیتی لکھنے کا رواج ہوتا تو قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ہمارا ادب کتنا ثروت مند ہوتا۔

۵۔ یہ بات تو بہر حال طے ہے کہ ہر دور اپنی مخصوص تہذیب رکھتی ہے تاریخ کے بنیادی خدوخال تو صدیوں بعد تبدیل ہوتے ہیں مگر فروعی اور روز مرہ کی چیزیں ہر دور اور ہر زمانے میں بدلتی رہتی ہیں۔ ان کی نشان دہی عام تاریخی کتابیں نہیں کر سکتیں پھر اس کے لیے ہمیں آپ بیتیوں کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ ان آپ بیتیوں کی مدد سے ہم کسی قوم، ملت ، ملک اور تہذیب کی ابتدا، ارتقا اور عہد بہ عہد ترقیوں کا اندازہ آسانی سے لگا سکتے ہیں جو تاریخ کے طالب علم کے طور پر ہمارے لیے بہت ضروری اور اہم ہیں۔ آپ بیتیوں کی ان گوناگوں اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے یوسف جمال انصاری اسے آپ بیتی کی ''سہ گونہ حیثیت'' کا نام دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''آپ بیتی اپنی سہ گونہ حیثیت کی وجہ سے ہمیشہ زندہ جاوید رہیں گی۔
> (۱) تاریخی حیثیت (۲) اخلاقی حیثیت (۳) یادگاری حیثیت۔ آج کی اس اشتہاری دور میں آپ بیتیوں کی اہمیت کم نہیں ہوئی بلکہ بڑھ گئی ہے''۔(۶۳)

۶۔ آپ بیتی سوانح نگاروں کے لیے اور نقادوں کے لیے نہایت مفید مواد مہیا کرتی ہے۔ یہ تاریخ، ادب اور ہر قسم کے حوالوں کے لیے اولین اور مستند مأخذ ثابت ہوتی ہیں۔ بڑے بڑے جرنیلوں، سیاست دانوں، ادیبوں، صحافیوں، مفکروں اور مصلحین قوم نے جب بھی اپنے حالات قلمبند کیے اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ان کے فن، فکر اور کارناموں کے ارتقا کے اسباب پر مستند مواد فراہم ہوا۔ ہماری اکثر آپ بیتیاں نفسیاتی نقطہ نظر سے خصوصی اہمیت رکھتی ہیں۔ فرائڈ اور ان کے ساتھیوں نے اپنے قدیم اور جدید فن کاروں کی اُن کی دستیاب خود نوشتوں کی روشنی میں تحلیل نفسی اور نفسیاتی تجزیے کیے اور کامیاب رہے۔

۷۔ جب ہم آپ بیتیوں کی تاریخی حیثیت کی بات کرتے ہیں۔ تو یہ امر بھی ملحوظ خاطر رہے کہ ہماری مشرقی تاریخ خصوصاً ہند و مسلم دور کی تاریخ قابل اعتبار نہیں۔ برطانیہ کے دور سے پہلے اور بعد میں بھی ساری تاریخی کتابیں سیاسی نقطہ

نظر سے لکھی گئیں۔اس تاریخ میں بڑی عیاری سے جھوٹ اور سچ کو آپس میں اس طرح آموز کیا گیا کہ ان کو ایک دوسرے سے الگ کرنا مشکل ہے۔آپ بیتیاں اس دوران آگے بڑھ کر تاریخی خلا کو کسی حد تک پُر کرتی ہیں۔ڈاکٹر پرویز پروازی کے الفاظ میں:

"یہاں جب سچے اور قابل اعتماد تاریخ کی ضرورت واہمیت شدت سے محسوس ہوتی ہے تو معمولی سپاہیوں اور چھوٹے آفسروں کی آپ بیتیاں یا ڈائریاں کسی حد تک ہماری یہ ضرورت پوری کرتی ہیں۔وہ تلبیس کاری کے بجائے صاف گوئی سے کام لیتے ہیں اور واقعات بلا کم وکاست بیان کرتے ہیں"۔(۶۴)

یوں آپ بیتیاں ادبی دائرے سے باہر نکل کر وہ تاریخی مقام حاصل کر لیتی ہیں جو ادب کے کسی دوسرے صنف کو میسر نہیں۔

آپ بیتی کے فنی لوازمات:

ہر کامیاب آپ بیتی میں تین عناصر خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔دیگر چیزیں ثانوی ہوتی ہیں۔سچائی، شخصیت اور فن۔یوں تو ادب کی ہر شاخ ان تین عناصر کی ترتیب و تشکیل کی رہن منت ہے لیکن آپ بیتی کے لیے یہ اجزا بنیادی شرائط ہیں۔انسان اپنی اَنا کی تسکین کے لیے اور یہ جتانے کے لیے کہ میں کتنا اہم ہوں اپنی کہانی سنانا چاہتا ہے۔یہ انسانی فطرت ہے کہ انسان خود کو سب سے الگ اور انوکھا خیال کرتا ہے۔انسانی غرور ،اپنے آپ سے محبت اور بے جا اعتماد اپنی غلطی تسلیم کرنے میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔بعض لکھنے والے دوسروں کو سبق پڑھاتے اور تلقین کرتے نظر آتے ہیں۔اس سے خود نوشت کی قدر وقیمت گھٹتی ہے۔آپ بیتی لکھنے والوں میں سے ایک عام رجحان یہ ملتا ہے کہ وہ اپنی ذات کے بیان میں ادھر اُدھر بہک جاتے ہیں اور دوسروں کا ذکر سنانا شروع کرتے ہیں۔کئی کئی صفحے سیاہ کرتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ خود اپنا ذکر کر رہے ہیں بعض لوگ اپنا ذکر کرتے کرتے سیاسی، معاشرتی حالات بیان کرنے لگتے ہیں جس سے اُن کی ذات پس منظر میں چلی جاتی ہے۔یہ خامیاں اکثر آپ بیتیوں میں پائی جاتی ہیں۔جس سے آپ بیتی کی قدر وقیمت کم ہوتی ہے۔اگر ایک لکھنے والا خلوص، ایمانداری اور صداقت سے کام لے ادھر اُدھر بھٹکنے سے بچے، جرأت کا ثبوت دے تو آپ بیتی لکھنا ایک بہت اعلی کام ہے۔اس کی افادیت کے بے شمار پہلو ہیں۔آپ بیتی ایک بلند پایہ فن ہے اس فن اور اس کے فنی لوازمات کو سمجھے بغیر نادر آپ بیتی نہیں لکھی جا سکتی یہی وجہ ہے کہ انگریزی میں ایک سے ایک اعلیٰ نمونہ خود نوشت سوانح عمری کا ملتا ہے جبکہ اُردو میں زیادہ تر سپاٹ، بیانیہ اور سر گزشت نما نثری کتابیں ہیں۔ایک معیاری اور کامیاب آپ بیتی درج ذیل خصوصیات کی

حامل ہوتی ہے۔

ا۔ سچائی اور صداقت:

دو قسم کی آپ بیتیوں کو پائیدار اور قابل اعتماد سمجھا جاتا ہے۔ اول وہ آپ بیتیاں جو قوت فیصلے اور مشاہدے پر انحصار کر کے لکھی گئی ہوں۔ دوسری وہ آپ بیتیاں جو نہ صرف معلوماتی ہوں بلکہ غیر جانبداری سے لکھی گئی ہوں۔ صداقت، سچائی، خلوص، ہمدردی اور صاف گوئی فن آپ بیتی نگاری کے بنیادی اُصول ہیں۔

۲۔ تاریخی ترتیب:

فن آپ بیتی میں اس بات کا بھی خصوصی خیال رکھا جائے کہ بیان میں سچائی کے ساتھ ساتھ ترتیب اور دلچسپی بھی برقرار رہے۔ اکثر نقاد اس کو ناممکن خیال کرتے ہیں لیکن یورپی زبانوں کی کامیاب مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ فن آپ بیتی کا دوسرا اہم اُصول تاریخی ترتیب ہے قدیم خود نوشت نگار اس پر عمل پیرا نہیں ہوتے تھے۔ آج بھی بعض لکھاری خصوصاً سیاست دان، تاجر اور کھیلوں سے وابستہ لوگ تاریخی ترتیب کا خیال نہیں رکھتے بلکہ واقعہ جس طرح اُن کی ذہن میں آتا ہے لکھ جاتے ہیں۔ یہ فن آپ بیتی کے خلاف ہے۔ پہلے انسان کی پیدائش ہوتی ہے، بچپن گزرتا ہے عظمت اُن کو بعد میں ملتی ہے۔ خود نوشت نگاری کے ارتقاء کا یہ طریقہ ہی نہیں جو اُردو کی زیادہ تر آپ بیتیوں میں مشترک ملتی ہے بلکہ اس سے فن کاری کا مظاہرہ بھی نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر سید شاہ علی ایک مغربی نقاد کے حوالے سے آپ بیتی میں تاریخی ترتیب کی اہمیت کو یوں بیان کرتا ہے:

> ''گاسی نے اس لیے خود نوشت میں وسیع النظری کو محل بتایا اور تاریخ کے لاتعداد انسانوں کے برعکس آپ بیتی میں لکھنے والے کے سوا سب کی حیثیت ضمنی قرار دی ہے۔ میرا اپنا اصول یہ ہے کہ دیگر ضمنی واقعات کو تاریخی ترتیب سے بتایا جائے تاکہ پڑھنے والے کنفیوژن میں نہ رہیں''۔(۶۵)

۳۔ اخلاقی بے تعلقی:

فن آپ بیتی نویسی کے لیے اخلاقی بے تعلقی اور بے تعصبی اتنی ہی ضروری ہے جتنی تاریخ نویسی کے لیے۔ اخلاقیات میں اُلجھنا اور واقعات کی فطری تصویر کشی کرنا دو متضاد چیزیں ہیں یہ دونوں چیزیں ایک آپ بیتی میں مشکل سے جمع ہو سکتی ہیں۔ اخلاقی تعلیم فنی تکمیل میں رکاوٹ ہے۔ ایک اچھا خود نوشت نگار کسی واقعے میں خود کو شامل نہیں کرتا اس کی مثال سائر اور تماش بین کی سی ہے۔ وہ اپنا تجزیہ دے سکتا ہے، واقعے کو جزئیات کی حد تک بیان کر سکتا ہے، اپنے جذبات

واحساسات کو قلمبند کر سکتا ہے لیکن خطیب اور واعظ نہیں بن سکتا۔ انسان دوسروں کی سر گزشت اس لیے پڑھتا ہے کہ وہ جدید زمانے کے پیچیدہ مسائل کی بدولت اور پریشانی کی وجہ سے اپنے جیسے انسان کی تلاش میں سر گرداں ہے، ناول ہو یا افسانہ، تاریخ ہو یا ڈراما یا آپ بیتی وہ اپنے جیسا انسان ڈھونڈتا ہے تاکہ انھیں اپنی مصیبتوں کا علاج نظر آئے۔ فن آپ بیتی میں بے تعصبی اور لا تعلقی کی اہمیت ڈاکٹر سید شاہ علی کچھ اس طرح بتاتے ہیں:

> ''سوانح نگاری ایک جذباتی نہیں بلکہ ذہنی فن ہے۔ جب کوئی بھی جذبہ ذہن پر اثر انداز ہو تو وہ جزبہ خوا احترام کی شکل میں ہو، شفقت کی شکل میں، اخلاقی خواہشات کی یا مذہبی ایقان کی صورت میں، سوانح نگاری کو ختم کر دیتا ہے''۔(٦٦)

۴۔ انداز بیان:

فرائڈ نے لاشعور پر ضرورت سے زیادہ زور دینے کے باوجود انسانی عزم، ارادے اور آزادی کا احساس دلانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ آج نئی اور پرانی شخصیتوں کو آز سر نو محدب عدسوں کے نیچے دیکھا جا رہا ہے اور قدیم فن کاروں کی اپنے بیانات کی روشنی میں تشریح و توضیح کی جا رہی ہے۔ واقعات اور تاریخی تسلسل کی ماہیت مختلف ہو سکتی ہے۔ جس کو ایماندارانہ اور گہرے مشاہدے کے بغیر سمجھنا مشکل ہے انسانی سر گزشت میں بے لاگ سچائی کا پتہ لگانے کے امکان کا مطالعہ کرنا گویا آپ بیتی کا مطالعہ کرنا ہے۔ تاریخی سچائی ہی اصل تلاش ہے اور شخصیت کا اظہار، انداز بیان کی سچائی میں بہتر طریقے سے ہو سکتا ہے۔ سر سڈنی آٹو بائیو گرافی (آپ بیتی) کو شخصیت کا سچا اظہار کہتا ہے۔(٦٧) فن آپ بیتی کی زیادہ بہترین تقسیم دو حصوں میں کی جا سکتی ہے۔ ایک ٹھوس سچائی، دوسری دلکش اور شیرین انداز بیان۔ ان دونوں کے امتزاج سے معیاری آپ بیتی جنم لیتی ہے۔

۵۔ فطری تصویر کشی:

آپ بیتی اخلاقی، تاریخی یا سائنسی تجسس سے آزاد ہے یہ خصوصیات آپ بیتی کے مقاصد میں شامل ہی نہیں۔ اچھی اور بری دونوں طرح کی آپ بیتیاں انسان لکھ سکتا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ مشرقی اور مغربی دونوں زبانوں میں ملفوظات، روز ناموں اور یادداشتوں کی صورت میں جو قدیم آپ بیتیاں مرتب کی گئی ہیں ان کو آپ بیتیاں کہنا فن آپ بیتی کے ساتھ ناانصافی کرنا ہے کیونکہ ان میں ذاتی نمود و نمائش، رازداری، پردہ داری کی بدولت تاریخ کا کوئی بھی گوشہ منور نہیں ہوتا۔ صرف آپ بیتیوں پر کیا موقوف آج سے چند صدیاں پہلے آج کے مروج علوم و فنون کا تصور بھی نہیں تھا اور اخلاقی عظمت کا بھوت ناول، داستان، ڈرامے غرض ہر صنف ادب پر سوار تھا۔ بہر حال آپ بیتی کا ایک بڑا مقصد واقعے کی سچی اور ہو بہو تصور

کشی کرنا ہے۔آپ بیتی لکھنے والے کو مخالف اور موافق دونوں قسم کی چیزوں کو قبول کر کے آگے پیش کرنا ہے واقعہ نگاری، حقیقت نگاری اور صاف گوئی آپ بیتی لکھنے والے کی تحریر کی جان ہے۔ایک اچھا خود نوشت نگار موضوع کے روشن اور تاریک پہلو سے بحث نہیں کرتا بلکہ اُس کا کام ایماندارانہ اور سچی مرقع کشی ہے۔ڈاکٹر وہاج الدین علوی کے مطابق:

"آپ بیتی کی فنی خصوصیات میں چار باتیں نہایت اہم ہیں۔ خود اظہاریت، تاریخی صداقت، جمالیاتی کیفیات اور ادبیت۔ آپ بیتی، آپ بیتی برائے آپ بیتی نہ ہو نیز فنی لحاظ سے خود نوشت یک رُخی نہ ہو (بلکہ) اس کو پڑھ کر مصنف کی شخصیت اور زندگی کی تفہیم آسان ہو جائے"۔(٦٨)

اُردو آپ بیتیوں کی جدید اقسام:

اپنی کہانی اور سرگزشت سنانا ہمیشہ سے انسان کی فطری مجبوری رہی ہے۔عام گفتگو سے لے کر قصے کہانی اور شعر و شاعری سے فکشن تک ہر پردے میں انسان اظہار ذات کی شدید خواہش رکھتا ہے۔اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو اپنی سرگزشت یا کہانی کسی مخصوص صنف کی محتاج نہیں ہوتی، نظم و نثر دونوں میں اسے پیش کیا جا سکتا ہے۔دنیا کی تقریباً ہر زبان میں لوگوں نے نظم اور نثر دونوں میں اپنی خود نوشتیں لکھی ہیں پھر اُردو کا دامن تو اس صنف ادب سے مالا مال ہے۔

جہاں تک منظوم آپ بیتیوں کا تعلق ہے تو غزل کا مزاج آپ بیتی کے بہت قریب واقع ہوا ہے اس میں واردات قلبی، صداقت اور جامعیت و اکملیت فن خود نوشت نگاری پر ہی تو دلالت کرتی ہے۔ایک زمانے تک جب آپ بیتی لکھنے کا باقاعدہ فن شروع نہیں ہوا تھا لوگ منتشر اور بے قاعدہ آپ بیتیاں تزکروں، یادداشتوں اور تزک کی صورت میں قلمبند کرتے تھے۔جدید، باقاعدہ، مربوط اور منضبط آپ بیتی یورپی ادبیات کے زیر اثر اُردو میں وارد ہوئی۔آج کل آپ بیتی کی جدید تعریف کی روشنی میں منظوم انداز میں بیان کی گئی سرگزشت، فکشن، ڈرامہ، حکایت یا ناٹک کے پردے میں بیان کی گئی اپنی کہانی کو آپ بیتی نہیں کہا جا سکتا۔چنانچہ یوسف جمال انصاری نے اس مختصر مگر جامع تعریف میں آپ بیتی کی حدود و قیود کا تعین کر دیا:

"آپ بیتی کے لیے بنیادی شرائط دو ہیں، اول یہ کہ مصنف اپنے حالات خود لکھے اور دوسرے یہ کہ وہ حالات نثر میں ہوں"۔(٦٩)

اُردو خود نوشت نگاری کی تاریخ میں ڈاکٹر وہاج الدین علوی نے غالباً پہلی مرتبہ بلحاظ ہئیت خود نوشت کی سات قسمیں گنوائی۔١۔ مکمل خود نوشت ٢۔ نامکمل خود نوشت ٣۔ مختصر خود نوشت ٤۔ طویل خود نوشتیں ٥۔ مکتوباتی خود نوشت

۶افسانوی خودنوشتیں۔ ۷۔ منظوم خودنوشتیں۔(۷۰)

ساخت کے لحاظ سے ہم اُردو آپ بیتیوں کو چار اقسام میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

۱۔ مکمل آپ بیتیاں ۲۔ جزوی آپ بیتیاں ۳۔ تراجم شدہ آپ بیتیاں ۴۔ متفرق آپ بیتیاں۔

درج ذیل سطور میں آپ بیتیوں کے چاروں اقسام کا مختصر مگر جامع تجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ مکمل آپ بیتیاں:

مکمل آپ بیتیوں سے ہماری مراد وہ آپ بیتیاں ہیں جس میں مصنف نے پیدائش سے آپ بیتی لکھنے کے زمانے تک اپنی زندگی اور سماج کے اہم اور چیدہ چیدہ واقعات بیان کیے ہوں۔ ضروری ہے کہ مصنف نے زندگی کی کہانی تاریخی تناظر میں بیان کی ہو اور جس میں زندگی کے خاص خاص ادوار امتیازی خصوصیات کے ساتھ دیکھے جا سکیں۔ مکمل آپ بیتیاں فن سوانح نگاری کے اصولوں کی روشنی میں تحریر ہوتی ہیں۔ اس قسم کی خودنوشتوں میں مصنف، اُن کا عہد اور سماج پوری طرح جیتا جاگتا نظر آتا ہے، ثقافتی جھلکیوں سے تہذیب کے نقوش اُجاگر ہوتے ہیں۔ ان آپ بیتیوں میں مصنف کی اپنی ذات اور معاملات، گھریلو حالات، خانگی امور، فکری سفر اور سارے اجزا بلحاظ مواد و فن شامل ہوتے ہیں۔ مختصر یہ کہ مکمل آپ بیتیوں میں مصنف کی ساری زندگی کے تجربات، افکار، اقدار، جذبات، نفسیات، معلومات، مشاہدات غرض سب کچھ شامل ہوتا ہے۔ اُردو کی زیادہ تر آپ بیتیاں اس فہرست میں شامل ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی ''آپ بیتی'' مرزا ادیب کی ''مٹی کا دیا'' احسان دانش کی ''جہاں دانش'' سر رضا علی کی ''اعمال نامہ'' اور جوش ملیح آبادی کی ''یادوں کی بارات''۔ مکمل آپ بیتیاں ہیں۔ نقادوں نے مکمل آپ بیتیوں کے لیے خاص خاص شرائط رکھی ہیں جن کی روشنی میں یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ یہ کہاں تک مکمل اور کامیاب آپ بیتی ہے۔ اول یہ کہ مصنف نے اپنی زندگی کو ایک پوری اکائی کے طور پر بیان کیا ہے کہ نہیں۔ دوم اس کے تجربات کس نہج تک محدود تھے۔ سوم اس نے اپنی کامیابیوں اور ناکامیوں کو کس حد تک بیان کیا ہے مزید یہ کہ خودنوشت نگار خود کو یا تو قصے سے منہا کر دیتے ہیں یا کلیتہً مرکزی حثیت اختیار کر لیتے ہیں دونوں صورتوں میں افراط و تفریط سے بچنا خودنوشت نگار کے لیے ضروری ہے۔

۲۔ جزوی آپ بیتیاں:

وہ آپ بیتیاں جن میں ایک خاص عہد، کوئی واقعہ یا مخصوص واقعات کا بیان ہو اور جو مصنف کی ساری زندگی پر محیط نہ ہو جزوی آپ بیتیاں کہلاتی ہیں چونکہ اس قسم کی آپ بیتی عام طور پر مصنف کی زندگی کے کسی مخصوص دور کی سرگزشت ہوتی ہے اس لیے اس کو جزوی آپ بیتی کا نام دیا گیا ہے۔ اُردو آپ بیتی کا آغاز بھی جزوی آپ بیتیوں سے ہوا ہے۔ زمانہ قدیم

میں مصنفین کسی عالمانہ مقالے یا دینی کتب کے آخر میں جزوی طور پر اپنے کوائف یا موجودہ مشاغل کا بیان قلمبند کر کے بات ختم کرتے تھے۔اُردو اور فارسی کی اس قسم کی جزوی آپ بیتیاں بھی ناقص اور غیر معیاری ہیں۔ جزوی آپ بیتیاں یک رُخی اور سر سری ہوتی ہیں۔ان کو پڑھ کر نہ تو مصنف کا زاویہ نظر، زندگی کی طرف رحجان، فکری ارتقا اور شخصیت واضح ہوتی ہے اور نہ ذات کا کامل اظہار ہوتا ہے۔ صرف اتنا ہے کہ جزوی آپ بیتیوں کے ذریعے مصنفین کے اہم کارنامے، نصب العین، جذباتی المیے اور مختصر کوائف پر روشنی پڑتی ہے۔اُردو میں اکثر کھلاڑیوں، شاعروں، سیاست دانوں اور فوجی حضرات نے اس قسم کی آپ بیتیاں لکھی ہیں۔ وہاج الدین علوی نے جزوی آپ بیتی کے لیے نامکمل خود نوشت اور مختصر خود نوشت کی اصطلاحیں استعمال کیں ہیں۔اُن کے مطابق اب تک ہزار ڈیڑھ ہزار مختصر خود نوشتیں لکھی جا چکی ہیں۔(۱۷)

چودھری افضل حق کا ''میرا افسانہ''، ظہیر دہلوی کی ''داستان غدر''، عبد الغفور مدھونی کی ''طالب علم کی کہانی'' اور بیگم کلثوم نواز کی ''جبر اور جمہوریت'' جزوی آپ بیتیوں کی نمایاں مثالیں ہیں۔

۳۔ترجمہ شدہ آپ بیتیاں:

وہ آپ بیتیاں جو دیگر زبانوں سے اُردو میں ترجمہ ہوئی ہیں۔ان آپ بیتیوں کی طویل فہرست ہے جو ملکی اور بین الاقوامی طور پر مشہور لوگوں نے سپردِ قلم کی ہیں۔اکثریت انگریزی میں لکھی گئیں آپ بیتیوں کی ہے جو اب اُردو ادب کا باقاعدہ حصہ ہیں۔ یہ آپ بیتیاں مصنفین کی پیدائش، خاندانی پس منظر، پسند و مشاغل اور عقائد و نظریات کے علاوہ، اہم تاریخی حقائق، انقلابات، سماجی تغیرات، سیاسی شعور اور بدلتی ثقافتی اقدار کے حوالے سے نہایت اہمیت کی حامل تصور ہوتی ہیں۔ ترجمہ شدہ آپ بیتیوں کا تاریخی، صحافتی اور ملکی و بین الاقوامی تعلقات کے نقطہ نظر سے بھی کافی قدر و قیمت ہے۔ خالص ادبی زاویے سے اگر ہم دیکھیں تو ترجمہ شدہ آپ بیتیاں منفرد زبان و بیان رکھتی ہیں، ترجمے سے نئے الفاظ، محاورات، ضرب المثال، تلمیحات، صنائع اور اصطلات اُردو زبان میں آتے ہیں۔اُن قارئین کے لیے ترجمہ شدہ آپ بیتیاں نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں جو انگریزی نہیں جانتے لیکن بین الاقوامی سیاست اور ثقافت میں دلچسپی رکھتے ہیں۔اس قسم کی آپ بیتیوں کے سبب نئے نظریات، تازہ افکار، سائنسی انداز فکر، جدید علوم کی اہمیت اور بین الاقوامی سازشوں سے اُردو کے قاری کو آگاہی حاصل ہوتی ہے۔

''خیمہ میں واپسی''(جنرل عتیق الرحمن)، ''کانچ کے گھر'' (جسٹس سجاد علی شاہ)، جج بولتا ہے (اجمل میاں)، ''سب سے پہلے پاکستان''(جنرل پرویز مشرف) ، ''میں اور میرا پاکستان''(عمران خان) اور ''کیا میں پاگل تھا'' (اجمل خٹک) کا شمار ترجمہ شدہ آپ بیتیوں میں ہوتا ہے۔

۴۔ متفرق آپ بیتیاں:

متفرق آپ بیتیوں کا کینوس بہت وسیع ہے۔ یہ آپ بیتیاں کہیں آپ بیتی کے فن پر پورا اُترتی ہیں اور کہیں نہیں اُترتیں۔ طویل مضامین، مکتوبات، ملفوظات، روزنامچے، انٹرویوز اور خطبات متفرق آپ بیتیوں کی فہرست میں آتے ہیں۔ یہ آپ بیتیاں یا ان میں اُٹھائے گئے نجی حالات و واقعات میں مصنف کی زندگی عادات و اطوار، مشاغل اور جذبات و احساسات کا مبہم سا اندازہ ہوتا ہے تاہم زندگی کی پوری تصویر سامنے نہیں آتی، متفرق آپ بیتیاں فرد کی مختصر حالات تک محدود ہوتی ہیں۔ متفرق آپ بیتی میں افسانوی، تذکراتی اور منظوم، غرض سب آپ بیتیاں آتی ہیں۔

متفرق آپ بیتیوں کی سب سے اہم اور دلچسپ قسم مرتب شدہ آپ بیتیاں اور مختلف اخبارات ورسائل میں قسط وار شائع شدہ آپ بیتیاں ہیں۔ اُردو میں مرتب شدہ آپ بیتیوں کا کافی بڑا ذخیرہ ہے لیکن ہم ان کا شمار باقاعدہ اور مربوط آپ بیتیوں میں نہیں کر سکتے کیونکہ اس قسم کی آپ بیتیاں آپ بیتی کے بنیادی شرط ''خود لکھی گئی ہو'' پر پورا نہیں اُترتیں۔ دوسرا یہ کہ مرتب کرنے والا اپنے مزاج، سوچ اور موقع و محل کے مطابق کمی بیشی کرتا ہے اس لیے مرتب شدہ آپ بیتیاں قابل اعتماد بھی نہیں ہوتیں۔ خودنوشت نگار اپنے قول و فعل کا خود ذمہ دار ہوتا ہے نیز آپ بیتی کی جملہ خوبیاں اور خامیاں اس کے کھاتے میں آتی ہیں لیکن مرتب شدہ آپ بیتیاں تاریخی لحاظ سے بھی زیادہ قابل قدر نہیں۔ سوانح نگار کے لیے مرتب شدہ اور غیر مطبوعہ آپ بیتیوں میں دلچسپی ہو سکتی ہے تاریخ دان کے لیے نہیں۔ علاوہ ازیں نفسیاتی آپ بیتیاں، اعترافی آپ بیتیاں، تجزیاتی آپ بیتیاں، جنگی آپ بیتیاں، شکاریات وغیرہ کا شمار متفرق آپ بیتیوں میں ہوتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ فیروز اللغات اُردو جامع، فیروز سنز لاہوار ص ۴۔

۲۔ رابعہ اُردو لغت جامع، رابعہ ہاؤس لاہور سن اشاعت ندارد ص۔۵

۳۔ علمی اُردو لغت جامع، علمی بک ہاؤس لاہور ۲۰۱۸ء، ص۔۷

۴۔ فرہنگ آصفیہ، جلد سوم، طبع سوم، مکتبہ لاہور، ص۱۱۷۔

۵۔ اُردو انسائیکلوپیڈیا، چوتھا ایڈیشن، فیروز سنز لاہور ۲۰۰۵ء ص ۱۳۔

۶۔ کشاف تنقیدی اصطلاحات، مرتبہ: ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد ۱۹۸۵ء ص۔۱

۷۔ اصناف ادب، رفیع الدین ہاشمی، سنگ میل پبلی کشنز لاہور، اشاعت اول ۲۰۱۲ء، ص۔۱۶۶

۸۔ خواب باقی ہیں، پروفیسر آل احمد سرور، فکشن ہاوس لاہور ۱۹۹۸ء ص۔۹

۹۔ بیسویں صدی میں اُردو ادب، گوپی چند نارنگ، سنگ میل پبلی کشنز لاہور ۲۰۰۸ء ص۔ ۳۳۴۔۳۳۵

۱۰۔ پس نوشت اور پس پس نوشت، ڈاکٹر پرویز پروازی، نیاز مانہ پبلی کشنز لاہور، سن اشاعت ندارد، ص۔۲۶

۱۱۔ ایضاً، ص۔۲۳

۱۲۔ محمد طفیل نقوش کا آپ بیتی نمبر، جلد اول ۱۹۶۴ء ص۔۳۰۲

۱۳۔ یادوں کی دنیا، یوسف حسین خان، فکشن ہاؤس لاہور ۱۹۹۶ء، ص۔۱۰

۱۴۔ اُردو میں سوانح نگاری، ڈاکٹر سید شاہ علی، گلڈ پبلی کیشنز ہاؤس لاہور، ص۔۶۵

۱۵۔ علم الدین سالک ''آپ بیتیوں کے بعض نمایاں پہلو''، مشمولہ: ماہ نامہ ''نقوش'' ادارہ فروغ اُردو لاہور، جون ۱۹۶۴ء ص۔۴۰

۱۶۔ یوسف جمال انصاری ''آپ بیتی اور اس کی مختلف صورتیں''، مشمولہ: نقوش ادارہ فروغ اُردو لاہور، جون ۱۹۶۴ء ص۔۴۹ ۔

۱۷۔ ریحانہ خانم ''آپ بیتی کیا ہے''، مشمولہ نقوش لاہور، جون ۱۹۶۴ء، ص۔۹۶

۱۸۔ ڈاکٹر سید عبداللہ ''آپ بیتی''، مشمولہ نقوش لاہور، جون ۱۹۶۴ء، ص۔۶۲

۱۹۔ اُردو خود نوشت فن و تجزیہ، وہاج الدین علوی، شعبہ اُردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ۱۹۸۹ء ص۔۴۰

۲۰۔ ڈاکٹر سید عبداللہ ''آپ بیتی'' مشمولہ: نقوش لاہور، جون ۱۹۶۴ء، ص۔۶۱

۲۱۔ اُردو خود نوشت فن و تجزیہ، وہاج الدین علوی، شعبہ اُردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، ۱۹۸۹ء، ص۔ ۴

۲۲۔ مسرت بانو، ڈاکٹر، ''ایک نڈر اور بے باک خاتون کی نوٹ بک''، مشمولہ: الحمرا لاہور، جنوری ۲۰۱۹ء، ص۔ ۱۲۵

۲۳۔ سفر نصیب، مختار مسعود، فیروز سنز لاہور، ۲۰۰۳ء۔

۲۴۔ اُردو خود نوشت فن و تجزیہ، وہاج الدین علوی، شعبہ اُردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ۱۹۸۹ء، ص۔ ۲۳

۲۵۔ آکسفورڈ ڈکشنری، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، جلد 4، ۱۹۷۰ء، ص۔ ۳۲۹

۲۶۔ اُردو میں سوانح نگاری، ڈاکٹر سید شاہ علی، گلڈ پبلشنگ ہاؤس لاہور ۱۹۶۱ء، ص۔ ۱۱

۲۷۔ ایضاً، ص۔ ۱۵

۲۸۔ سوانح نگاری کیا ہے؟ ڈاکٹر عبدالقیوم، مشمولہ: اُردو نثر کا فنی ارتقا، الوقار پبلیکشنز لاہور ۲۰۰۳ء ص۔ ۳۱۸

۲۹۔ اَصناف ادب، رفیع الدین ہاشمی، سنگ میل پبلی کشنز لاہور ۲۰۱۲ء ص۔ ۱۷۸

۳۰۔ اُردو میں سوانح نگاری، ڈاکٹر سید شاہ علی گلڈ پبلشنگ ہاوس لاہور ۱۹۶۱ء ص۔ ۶۰

۳۱۔ عبدالقیوم ڈاکٹر، سوانح نگاری کیا ہے؟'' مشمولہ: اُردو نثر کا فنی ارتقاء الوقار پبلی کشنز لاہور ۲۰۰۳ء ص۔ ۳۱۸

۳۲۔ اُردو میں جدید نثر نگاری کا ارتقاء، پروفیسر محمد ارشد کیانی، علمی کتب خانہ لاہور سن اشاعت ندارد ص۔ ۱۸۶

۳۳۔ ریحانہ خانم ''آپ بیتی کیا ہے؟''مشمولہ: ماہ نامہ نقوش، ادارہ فروغ اُردو لاہور جون ۱۹۶۴ء ص۔ ۸۸

۳۴۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، ہیلن ہمنگوے ٹین پبلشر جلد دوم، شگاگو ۱۹۷۳ء ص۔ ۱۰۰۹

۳۵۔ ایضاً، ص۔ ۱۰۱۳

۳۶۔ اُردو میں سوانح نگاری، ڈاکٹر سید شاہ علی، گلڈ پبلشنگ ہاؤس لاہور ۱۹۶۱ء ص۔ ۶۵

۳۷۔ ایضاً، ص ۶۷۔ ۹۶

۳۸۔ تحقیق کے لاشعوری محرکات، ڈاکٹر سلیم اختر، سنگ میل پبلیکشنز لاہور ۱۹۸۳ء ص۔ ۸۲

۳۹۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، ہیلن ہمنگ وے ٹین پبلشر جلد دوم، شگاگو ۱۹۷۳ء، ص۔ ۱۰۱۸

۴۰۔ علم الدین سالک، آپ بیتیوں کے بعض نمایاں پہلو''مشمولہ: نقوش لاہور جون ۱۹۶۴ء ص۔ ۴۱

۴۱۔ پس نوشت اور پس پس نوشت، ڈاکٹر پرویز پروازی، نیا زمانہ، سن اشاعت ندارد، ص۔ ۱۷

۴۲۔ ایضاً، ص ۱۹۔ ۲۰

۴۳۔ داستان غدر (۱۸۵۷ء کے چشم دید واقعات)، سید ظہیر دہلوی، مکی دار الکتب لاہور ۲۰۰۲ء۔

۴۴۔ آپ بیتی، خواجہ حسن نظامی دہلوی، نظامی پریس دہلی ۱۹۱۴ء۔

۴۵۔ اُردو خود نوشت فن و تجزیہ، وہاج الدین علوی، شعبہ اُردو جامعہ ملیہ دہلی ۱۹۸۹، ص۔۱۷

۴۶۔ کشاف تنقیدی اصطلاحات، ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، مقتدرہ قومی زبان لاہور ۱۹۸۵ء، ص۱۸۶۔۱۸۷

۴۷۔ یوسف جمال انصاری ''آپ بیتی اور اس کی مختلف صورتیں''مشمولہ: نقوش لاہور جون ۱۹۶۴ء ص۔۷۳

۴۸۔ ایضاً، ص۔۷۵

۴۹۔ کشاف تنقیدی اصطلاحات، ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، مقتدرہ قومی زبان لاہور ۱۹۸۵، ص۔۱۰۰

۵۰۔ اُردو خود نوشت فن و تجزیہ، وہاج الدین علوی، شعبہ اُردو جامعہ ملیہ دہلی ۱۹۸۹ء ص۔۲۱

۵۱۔ غدار کون؟ (نواز شریف کی کہانی اُن کی زبانی)، سہیل وڑائچ، ساگر پبلشرز لاہور ۲۰۰۶ء۔

۵۲۔ آپ بیتی، ڈاکٹر سید عبداللہ، مشمولہ: ماہنامہ نقوش آپ بیتی نمبر ادارہ فروغ اُردو لاہور ص ۶۲۔۶۳

۵۳۔ اُردو میں سوانح نگاری، ڈاکٹر شاہ علی، گلڈ پبلشنگ ہاؤس لاہور ۱۹۶۱ء ص ۷۲۔۷۳

۵۴۔ سوانح نگاری کیا ہے؟ ڈاکٹر عبدالقیوم، مشمولہ: اُردو نثر کا فنی ارتقاء الوقار پبلیکیشنز لاہور ۲۰۰۳ء ص۔۳۲۹

۵۵۔ اُردو جنرل، عارف متین، علمی کتب خانہ لاہور، ۱۹۸۲ء ص۔۴۱

۵۶۔ اسلوبیاتی تنقید، طارق سعید، ایجوکشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۹۳ء، ص۔۷۶

۵۷۔ ایضاً، ص۷۶۔۷۷

۵۸۔ پس نوشت اور پس پس نوشت، ڈاکٹر پرویز پروازی، نیاز مانہ لاہور، سن اشاعت ندارد، ص۔۴۵

۵۹۔ آپ بیتی، ڈاکٹر سید عبداللہ، مشمولہ: ماہ نامہ نقوش لاہور جون ۱۹۶۴ء ص۔۶۵

۶۰۔ اپنی تلاش میں، کلیم الدین احمد، کلچرل اکیڈمی گیا، جنوری ۱۹۷۵ء، ص۔۲۰

۶۱۔ آپ بیتی کے توانا لہجے، قدرت اللہ شہزاد، ناشر و سن اشاعت ندارد ص۔۶۱

۶۲۔ پس نوشت اور پس پس نوشت، ڈاکٹر پرویز پروازی، نیاز مانہ لاہور، سن اشاعت ندارد، ص۲۶۔۲۷

۶۳۔ یوسف جمال انصاری ''آپ بیتی اور اس کی مختلف صورتیں، مشمولہ: نقوش لاہور شمارہ جون ۱۹۶۴ء ص۔۸۱

۶۴۔ پس نوشت اور پس پس نوشت، ڈاکٹر پرویز پروازی، نیاز مانہ لاہور، سن اشاعت ندارد، ص۔۳

۶۵۔ اُردو میں سوانح نگاری، ڈاکٹر سید شاہ علی، گلڈ ہاؤس لاہور اشاعت اول ۱۹۶۱ء ص۵۶۔۵۷

۶۶۔ ایضاً، ص۔۵۷

۶۷۔ مسرت بانو،ڈاکٹر،''ایک نڈر اور بے باک خاتون کی نوٹ بک''، مشمولہ: الحمرا لاہور،۲۰۱۹ء،ص۱۲۷،۱۲۶

۶۸۔ اُردو خود نوشت فن و تجزیہ، وہاج الدین علوی، شعبہ اُردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ۱۹۸۹ء ص۔۵۷۔۶۱

۶۹۔ یوسف جمال انصاری ''آپ بیتی اور اس کی مختلف صورتیں''،مشمولہ: نقوش لاہور جون ۱۹۶۴ء، ص۔۸۰

۷۰۔ اُردو خود نوشت فن و تجزیہ، وہاج الدین علوی، شعبہ اُردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ۱۹۶۴ء ص ۴۲۔۴۵

۷۱۔ ایضاً، ص ۴۲۔۴۳

دوسرا باب

مکمل آپ بیتیاں

مکمل آپ بیتیاں:

مکمل آپ بیتیوں سے مراد وہ آپ بیتیاں ہیں جس میں مصنف نے پیدائش سے لے کر آپ بیتی لکھنے کے زمانے تک اپنی زندگی اور اپنے سماج کے اہم اور چیدہ چیدہ واقعات بیان کیے ہوں۔ مکمل آپ بیتی کے لیے ضروری ہے کہ مصنف نے اپنی کہانی ایک خاص منطقی ترتیب سے تحریر کی ہو اور جس میں اُس کی زندگی کے خاص خاص ادوار امتیازی خصوصیات کے ساتھ دیکھے جا سکتے ہوں۔ مکمل آپ بیتیاں فن خود نوشت نگاری کے اُصولوں کی روشنی میں تحریر ہوتی ہیں۔اِس قسم کی خود نوشتوں میں مصنف، اُن کا عہد اور سماج پوری طرح جیتا جاگتا نظر آتا ہے۔ مکمل آپ بیتیوں میں مصنف کی ذاتی معاملات، گھریلو حالات، خانگی اُمور، پسند و ناپسند، خارجی و داخلی شخصیت، ثقافتی جھلکیاں غرض بہت کچھ شامل ہوتا ہے۔اِس قسم کی آپ بیتیوں میں مصنف اپنے تجربات، مشاہدات، جذبات، احساسات، معلومات، نفسیات اور افکار و اقدار کے مطابق اپنی کہانی پیش کرتا ہے۔انتخاب واقعات کے سلسلے میں البتہ مصنف آزاد ہے کہ وہ کس قسم کے واقعات کو تحریر میں لاتا ہے۔تاہم اِس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ مصنف کے تحریر کردہ واقعات کی روشنی میں اُس کی شخصیت کے داخلی اور خارجی تمام پہلو اُجاگر ہو جائیں۔

سیاسی آپ بیتیوں میں درج ذیل آپ بیتیاں مکمل آپ بیتیوں میں شامل ہیں:

(۱) پردے سے پارلیمنٹ تک (بیگم شائستہ اکرام اللہ) (۲) جرم سیاست (منظور احمد وٹو) (۳) ہاں میں باغی ہوں (جاوید ہاشمی) (۴) چاہ یوسف سے صدا (یوسف رضا گیلانی) (۵) ایوانِ اقتدار کے مشاہدات (گوہر ایوب خان) (۶) میری تنہا پرواز (کلثوم بیگم) (۷) فرزند پاکستان (شیخ رشید احمد) (۸) اور بجلی کٹ گئی (سیدہ عابدہ حسین) (۹) سچ تو یہ ہے (چوہدری شجاعت حسین)۔

پردے سے پارلیمنٹ تک (بیگم شائشہ اکرام اللہ)

معروف خاتون سیاست دان بیگم شائستہ اکرام اللہ کی آپ بیتی کو اُردو زبان و ادب میں خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ ایک قدامت پسند خاندانی پس منظر سے تعلق رکھنے والی بیگم شائستہ اُس وقت میدان سیاست میں آئی جب مسلمان گھرانوں کی عورتوں کو گھر کی چار دیواری سے باہر قدم رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ آپ متحدہ ہندوستان کے اولین مسلمان سیاستدانوں کے قبیلے سے تعلق رکھتی ہیں۔ آل انڈیا مسلم وومن سٹوڈنٹ فیڈریشن آپ کے آنگن میں بنا اور آپ فیڈریشن کی پہلی کنونیر اور پھر صدر منتخب ہوئیں۔ آپ کو یہ منفرد اعزاز بھی حاصل ہے کہ آپ پاکستان کی پہلی دستو ساز اسمبلی کی رکن منتخب

ہوئیں اور مسلسل سات سال تک پارلیمنٹ کی ممبر رہیں۔ بنگال کے وزیر اعظم اور مسلم لیگ کے سر کردہ لیڈر حسین شہید سہر وردی آپ کے کزن تھے۔ بیگم شائستہ اکرام اللہ کا شمار بر صغیر کی مدبر سیاسی عورتوں میں ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ کلکتہ کے مشہور اور معروف نواب خاندان سے تعلق رکھتی تھی لیکن تعلیم اور پھر سیاست میں آنے کے لیے انہیں سخت پاپڑ بیلنے پڑے۔ آپ نے خاندان کے اندر اور باہر تمام مخالفین کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور اپنی زندگی اپنے اصولوں اور اپنی خواہش پر گزاری۔ مذکورہ آپ بیتی سیاسیات سے ہٹ کر سماجی، تہذیبی اور زبان و بیان کے نقطہ نظر سے بھی خاص اہمیت رکھتی ہے۔ بیگم شائستہ نے پیدائش سے لے کر آخر تک کے حالات زندگی ترتیب وار مرتب کیے ہیں۔ آپ نے زندگی کے ہر مرحلے پر ناقدانہ اور فن کارانہ اظہار خیال کیا ہے چونکہ اس آپ بیتی کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں اور زندگی کے واقعات ترتیب وار درج کیے گئے ہیں اس لیے اس آپ بیتی کا شمار مکمل آپ بیتیوں میں ہوتا ہے۔ یہ آپ بیتی پہلے اُردو میں لکھی گئی تھی اور پہلی مرتبہ محدود تعداد میں ڈھاکہ سے چھاپی گئی تھی تاہم اپنے دوستوں کے کہنے پر آپ نے اس کو معمولی ردوبدل کے ساتھ انگریزی زبان میں منتقل کر کے اکسفورڈ یونیورسٹی پریس سے شائع کیا۔ اس لیے ہم نے اس کو اُردو آپ بیتیوں میں شمار کیا ہے۔ محمد اسلم ڈوگر اس آپ بیتی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''پردے سے پارلیمنٹ تک ایک معروف خاتون سیاست دان کی آپ بیتی ہے جس میں قدامت سے جدت کی طرف بڑھنے کا تزکرہ ہے۔ یہ ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جو اپنی قوت ارادی کے بل پر منزل تک پہنچی۔ اس کے بارے میں یہ مغالطہ ہے کہ یہ انگریزی زبان کی آپ بیتی ہے حالانکہ یہ پہلی مرتبہ اُردو میں لکھی گئی تھی'' (۱)

پیدائش، خاندانی حالات اور تعلیم:

اپنی پیدائش، خاندانی پس منظر، قدامت پرستی اور سخت خاندانی روایات کے بارے میں بیگم شائستہ لکھتی ہیں:

> ''کلکتہ میں اپنے نانا کے گھر میں پیدا ہوئی۔ میرے نانا کا گھر انیسویں صدی کے مسلم گھرانوں کی مانند تھا۔ عمارت کی قدامت کے ساتھ ساتھ اس کے مکین بھی قدیم اقدار کو سینے سے لگائے جی رہے تھے۔ ہمارا خاندان مغلیہ دور کے آخری ایام میں ایران سے آیا تھا۔ اس کی اپنی روایات تھیں انگریزوں کی آمد نے ان روایات پر کوئی اثر نہیں ڈالا تھا۔ ہمارے بزرگ فخر سے کہا کرتے تھے کہ ہندوستان میں اُن

کی نسلوں میں سے کسی بھی فرد نے خاندان سے باہر شادی نہیں کی تھی یہ لوگ
بنگال کے لوگوں سے سماجی طور پر علیحدہ تھے۔"(۲)

بیگم شائستہ کے والد اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ وہ ہندوستان کے دوسرے مسلمان ڈاکٹر تھے جس نے ایف آر سی ایس کی ڈگری حاصل کی تھی۔ انگریزوں نے ہندوستان میں بڑے شہروں کے باہر اپنی الگ بستیاں بنا رکھی تھیں۔ جنہیں سول لائنز یا چھاونیاں کہا جاتا تھا۔ یہ جگہیں عام ہندوستانی زندگی سے یکسر عاری تھیں اس لیے عام لوگوں کے لیے بڑی عجیب محسوس ہوتی تھیں۔ بیگم شائستہ کے باپ ایسٹ انڈیا ریلوے میں ڈسٹرکٹ میڈیکل آفیسر تھے یہی وجہ ہے کہ بیگم صاحبہ کی پیدائش اور ابتدائی زندگی چھاونیوں میں گزری۔ عجیب اتفاق یہ ہے کہ انگریز کی ملازمت قبول کرنے کے باوجود اس خاندان نے جدید اقدار سے خود کو بچائے رکھا۔ سخت گیر معاشرے میں بیگم شائستہ اکرام اللہ کو تعلیم حاصل کرنے کے سلسلے میں کتنے پاپڑ بیلنے پڑے۔ اُن کے باپ نے کس طرح سارے خاندان سے جھگڑا مول کر انہیں ۱۹۲۷ء کو کلکتہ کے کانوینٹ سکول میں داخل کروایا۔ اس بارے میں بیگم شائستہ بڑی صاف گوئی سے کہتی ہیں:

"اسے میری خوش قسمتی کہیے کہ ۱۹۲۷ء میں ہم ایک لمبے عرصے کے لیے کلکتہ آ گئے تو میرے والد صاحب نے مجھے ایک کانوینٹ سکول میں داخل کروایا۔ میرے والد کے اس فیصلے پر خاندان بھر میں تہلکہ مچ گیا۔ میری ماں کے رشتے دار آتے اور مختلف طریقوں سے میری ماں کو قائل کرنے کی کوشش کرتے کہ مجھے سکول سے اُٹھوالیا جائے۔ رشتے دار کہتے کہ لڑکی کو فرنگیوں کے دیس لے جایا جائے گا۔ ایسی باتیں سن کر میری ماں کا رنگ زرد ہو جاتا۔"(۳)

مشرقی ممالک خصوصاً ہندوستان کے شریف خاندانوں میں لڑکیوں کا نشست و برخاست انداز و برتاؤ، اُٹھنا بیٹھنا، گفتار، لباس غرض ایک ایک بات کا خصوصی خیال رکھا جاتا تھا۔ خاندان کی بڑی عورتیں یا مائیں لڑکیوں کو خاص طور پر تیار کرتیں تاکہ وہ پرائے گھر میں خاوند، سسرال اور بچوں کی مناسب انداز سے دیکھ بھال کر سکیں۔ انہیں مذہبی تعلیم، معمولی لکھائی پڑھائی، سلائی کڑھائی، کھانے پکانے یا اس قسم کے گھریلو کاموں کے لیے تیار کیا جاتا تھا۔ شادی کے معاملے میں فیصلہ والدین کرتے تھے۔ وہ اپنی اولاد کی شادیاں خوب سوچ سمجھ کر کرتے علاوہ ازیں لڑکیوں کو بچپن میں بیاہنے کا رواج تھا۔

بیگم شائستہ نے ایک مشرقی لڑکی کے جزبات اور احساسات کی بڑی عمدہ عکاسی کی ہے۔ لڑکیاں شادی سے پہلے اپنے ہونے والے شوہر کے متعلق مطلق لاعلم ہوتی ہیں۔ لڑکیوں کا آپس میں نوک جھونک، سہیلیوں کے درمیان ہلکے پھلکے

مکالمے اور اس قسم کے دیگر رواجوں کو بیگم شائستہ نے بہت عمدگی سے بیان کیا ہے جو دراصل ہمارے مشرقی گھرانوں کی لڑکیوں کا مشترکہ طرزِ عمل تھا۔ چنانچہ اپنے ہونے والے شوہر کی تصویر کے متعلق اپنی سہیلیوں کے ساتھ ہونے والی گفتگو درج کی جاتی ہے:

> ''مشرقی گھرانوں میں لڑکیاں ہونے والے شوہر کے متعلق باتیں کر کے چھیڑتی ہیں۔ ایسا ہی میرے ساتھ ہوا۔ یہ دراصل ہونے والے سسرال کے متعلق ایک اچھا ذریعہ ہوتا ہے۔ مجھے یاد ہے جب میری کزنز کو میرے شوہر کی تصویر ملی تو وہ میرے پاس آئیں اور تصویر کی جھلک دکھا کر ایک دوسرے سے کہنے لگیں۔ تمہارا کیا خیال ہے یہ اُس میں دلچسپی لیتی ہے؟ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں، میں نے اپنی نظریں ایک رسالے پر مرکوز کرتے ہوئے کہا۔'' (۴)

مشرقی لڑکیوں کے لیے سب سے بڑا مسئلہ شادی کے بعد نئے گھر میں ایڈجسٹ ہونے کا ہے۔ اگر شادی غیر خاندان میں ہو جائے تو نئے ماحول کے ساتھ انطباق پیدا کرنا قدرے مشکل ہو جاتا ہے۔ آج سے نصف صدی پہلے تعلیم یافتہ لڑکیوں کو غیر تعلیم یافتہ گھرانوں میں شادی کے بعد سخت دشواریوں سے گزرنا پڑتا تھا۔ بیگم شائستہ اکرام اللہ کی شادی ایک ایسے شخص سے ہوئی جس کا تعلق انڈین سول سروس سے تھا۔ وہ ایک روشن خیال آدمی تھے۔ اس لیے بیگم صاحبہ کو نئے ماحول اور نئے گھر میں زیادہ مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اُن پر اپنی ماں کی تربیت کا گہرا اثر تھا۔ ویسے بھی ہمارے معاشرے میں لڑکیوں کو شادی کے بعد کی زندگی گزارنے کے لیے باقاعدہ تربیت دی جاتی ہے بقول بیگم شائستہ کے ایسی ہی تربیت اُن کے کام آئی اور انہیں نئے گھر میں زیادہ مشکلات کا سامنانہ کرنا پڑا۔

اس آپ بیتی کی سیاسی اہمیت کے ساتھ ساتھ معاشرتی اہمیت بھی ہے۔ اپنے عہد کے سماجی اور اُونچے گھرانوں کے رواج، رسومات اور سماجی تقریبات کے بارے میں اُس نے بڑی تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ سول سروسز کے اعلیٰ افسروں کے درمیان گارڈن پارٹیاں منانے کا رواج تھا جن میں مرد اور عورتوں کا آزادانہ اختلاط ہوتا تھا۔ چنانچہ اس بارے میں بیگم شائستہ تحریر کرتی ہیں:

> ''دہلی میں سماجی تقریبات منعقد ہوتی رہتی تھیں ان میں گارڈن پارٹیاں زیادہ اہم تھیں۔ ان میں عام طور پر ایک مخصوص رینک کے افسروں اور اُن کی بیگمات کو مدعو کیا جاتا تھا۔ میں ایسی چیزوں سے نفرت کرتی تھی۔ جب میرے شوہر کا عہدہ

بڑھ گیا تو میں نے ایک گارڈن پارٹی میں شرکت کی۔ اس پارٹی میں، میں نے پردہ
اُتار کر شرکت کی تھی۔ سینکڑوں مردوں کے سامنے ہونا مجھے بہت اذیت ناک لگا
اور میری ساری شام پریشان رہی۔'' (۵)

جب سے عورتوں میں تعلیم اور شعور آیا ہے پردے کی مخالفت میں کافی زور شور سے آوازیں بلند ہو گئی ہیں بلکہ آج کل تو عورتوں کی آزادی کے حوالے سے بات بہت آگے تک پہنچ گئی ہے اس بارے میں بیگم شائستہ کا مؤقف عین مشرقی روایات کے مطابق ہے انہیں بے پردہ عورتیں اور پردے کے باہر کی زندگی زیادہ پرکشش نہیں لگی:

''پردے کے باہر کی زندگی کو میں نے زیادہ دلچسپ نہیں پایا۔ میرا خیال تھا کہ جب
مرد اور خواتین مل بیٹھے ہوں گے تو علمی و ادبی موضوعات پر بحث ہوتی ہو گی مگر
میری توقعات کے برعکس عام طور پر ایسے موقعوں پر بے معنی باتوں پر بحث ہوتی
ہے۔'' (۶)

علم و ادب سے شوق انہیں وراثت میں ملا تھا۔ اُس نے ایک ایسے ماحول میں آنکھ کھولی تھی جہاں ہر طرف علمی اور ادبی فضا تھی۔ اپنے خاوند کے ساتھ دہلی آنے کے بعد انہیں دہلی کے ادبی فضا کو بھی بہت قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ دہلی علم و ادب کا شاندار مرکز تھا، خواجہ حسن نظامی، علامہ راشد الخیری، آصف علی اور دیگر زعما کا اُن کے خاوند کے ساتھ قریب کا تعلق تھا۔ اُس زمانے میں انہیں اپنے وقت کے بڑے ادبی اور سماجی کارکنوں سے میل جول پیدا ہوا۔ چنانچہ لکھتی ہیں:

''مسٹر آصف خان اور اُن کی بیگم اَرونا آصف علی سے ہمارے ذاتی تعلقات تھے
اَرونا جنہیں میں بھابی کہتی تھی انہوں نے مجھے سماجی کاموں کے لطف سے روشناس
کروایا۔ انہوں نے مجھے دہلی وومن لیگ کا رکن بنوایا۔ میں نے سماجی کاموں میں
زیادہ حصہ تو نہ لیا تاہم اُس دور کی مشہور عورتوں کے لیکچر سننے کا موقع ضرور ملا۔
ان میں مشہور ترکی مقرر، ادیب اور سیاست دان خاتون خالدہ ادیب خانم کا لیکچرر
بھی شامل ہے۔ اُس دور میں جس سب سے دلچسپ اور اہم شخصیت سے میرے
تعلقات قائم ہوئے وہ مسز سروجنی نائیڈو تھیں۔ وہ نئی دہلی کے پتھر ایوانوں میں
بھی جان پیدا کر دیتی تھیں اُن کی گفتگو بہت دلچسپ اور پر مزاح ہوتی تھی''(۷)

عملی سیاست اور مسلم لیگ سے وابستگی :

بیگم شائستہ سہروردی اپنے خاوند کے ساتھ انگلستان چلی گئیں، جب اُن کا وہاں تبادلہ ہوا۔ قیام انگلستان اُن کی زندگی کا خوشگوار تجربہ تھا۔ برطانیہ میں وہ عملی طور پر سیاست اور سماجی کاموں کی طرف آئیں۔ اب وہ زیادہ سوشل زندگی میں قدم رکھ چکی تھیں۔ لہٰذا اُن کا حلقہ احباب بڑھا اور خاندان سے ہٹ کر اُس نے اپنی الگ ایک پہچان بنائی۔ تعلیم کا سلسلہ آگے بڑھایا اور انہیں زیادہ ذہنی آزادی میسر آئی۔ قیام لندن کے زمانے کو یوں بیان کرتی ہیں:

"میں نے برطانوی زندگی کا بہت قریب سے مطالعہ کیا۔ دوران قیام میں نے ایسے ایسے کام بھی کیے جن کا میں ہندوستان میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ لندن میں گزرے ہوئے دنوں نے میرے کردار کو مضبوط کیا۔ مجھ میں خود اعتمادی پیدا ہوئی اور میرے خیالات میں انقلاب آیا۔ اس دور میں، میں اس خوشی سے آگاہ ہوئی جو تھیٹر دیکھ کر یا کتابیں خرید کر ہوتی ہے۔ میرے اس وقت تین بچے تھے۔ اس کے باوجود میں مطالعے کے لیے وقت نکال ہی لیتی۔ میں نے اُردو ناول اور افسانے پر مقالہ لکھا اس پر لندن یونیورسٹی نے مجھے پی ایچ ڈی کی ڈگری دی۔" (۸)

اکتوبر ۱۹۴۱ء میں بیگم صاحبہ کی قائداعظم محمد علی جناح اور اُن کی بہن فاطمہ جناح سے ملاقات ہوئی۔ فاطمہ جناح کے کہنے پر بیگم شائستہ نے ہندوستانی طالبات کے لیے وومن سٹوڈنٹ فیڈریشن بنائی تاکہ ہندو لڑکیاں مسلمان لڑکیوں کے ساتھ جو زیادتیاں کرتی تھیں اُن کا سدباب کیا جاسکے۔ چنانچہ مسلم وومن سٹوڈنٹ فیڈریشن کے پلیٹ فارم سے آپ نے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ قائداعظم اور محترمہ فاطمہ جناح سے آپ کی مسلسل ملاقاتیں رہیں۔

آپ نے اپنی آپ بیتی میں قائداعظم اور اُن کی ہمشیرہ کی ملنساری، ہمدردی اور خلوص کا ذکر کیا ہے۔ قائداعظم کی ذاتی زندگی لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہے کیونکہ وہ اپنی نجی زندگی میں کسی کو شریک نہیں کرتے تھے علاوہ ازیں وہ تاریخ میں بڑے مغرور اور منہ پھٹ مشہور ہیں لیکن بیگم صاحبہ کا استدلال یہ ہے کہ یہ سب ہندوؤں کا پروپیگنڈہ ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۷ء تک بیگم شائستہ نے ہندوستان کی سیاست، معاشرت، فلاحی اداروں اور دیگر سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیا۔ آپ نے آپ بیتی کے اس حصے میں ان سب موضوعات پر خوب تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ آپ نے مس فاطمہ جناح کے ساتھ مل کر مسلم وومن سٹوڈنٹ فیڈریشن کو آل انڈیا مسلم لیگ کا خاتون ونگ

بنایا، کانفرنسیں منعقد کیں، عورتوں میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کے لیے گھر گھر تک کا سفر کیا، ہندو سیاست دانوں کا عوامی اجتماعات اور اخباری مضامین میں مقابلہ کیا۔ اس آپ بیتی میں بیگم صاحبہ نے قراداد پاکستان (۱۹۴۰ء) سے قیام پاکستان (۱۹۴۷ء) تک کے زمانے کی سیاسی تحریکوں، ہندوستان کے لوگوں کی سیاسی بیداری اور ہندو مسلم اختلافات کی بہترین عکاسی کی ہے۔ بیگم شائستہ اکرام اللہ کا تجزیہ ہے کہ ہندو مسلم فسادات اور دونوں قوموں کے درمیان ہر روز بڑھتا ہوا خلیج تقسیم ہند کی بنیاد بنی :

''ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان سماجی اختلافات کی خلیج وسیع ہو گئی۔ مثلاً ہندوستان کے اکثر حصوں میں ہندو اور مسلمان ''خدا حافظ'' اور آداب کے الفاظ استعمال کرتے تھے۔ تنگ نظر ہندوؤں نے ان الفاظ کا استعمال ترک کر دیا اس طرح ''ٹیکہ'' جو کہ خوبصورتی کے لیے لگایا جاتا تھا۔ تنگ نظر مسلمانوں نے اسے بھی ترک کر دیا۔'' (۹)

ہندو مسلم فسادات کا آغاز اعلان آزادی سے بہت پہلے ہو چکا تھا۔ اس اعلان نے تو اسے اور تیز کر دیا۔ بعض تاریخ دانوں کا یہ خیال کہ اگر ہندوستان کا بٹوارہ نہ ہوتا تو اتنے بڑے پیمانے پر فسادات نہ ہوتے غلط فہمی پر مبنی ہے۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں ہندو مسلم کشیدگی کس طرح تقسیم کے لیے راہ ہموار کر رہی تھی، بیگم شائستہ اکرام اللہ کی زبانی سنیے :

''کلکتہ کے فسادات ختم ہو گئے تو صوبہ بہار میں ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے۔ بہار میں مسلمانوں کی آبادی صرف آٹھ فی صد تھی۔ بہار کے لوگ اپنی خوش اخلاقی کی وجہ سے سارے ہندوستان میں مشہور تھے۔ یہ فسادات ایک ماہ تک جاری رہے۔ اس کے بعد دریائے جمنا کے کنارے ہندوؤں نے ایک تہوار کے دوران مسلمانوں کا قتل عام کیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دریائے جمنا میں پانی کی بجائے خون بہہ رہا ہو۔ پھر بنگال کے ایک ضلع نواکھالی میں فسادات شروع ہو گئے۔ یہاں مسلمان اکثریت میں تھے۔ یہاں ہندوؤں کو بے دریغ قتل کیا گیا۔ ان فسادات نے برطانوی حکومت کو لرزا دیا اور اُنہوں نے جلد از جلد اقتدار ہندوستانیوں کے ہاتھ دے کر ہندوستان چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔'' (۱۰)

آپ سترہ ستمبر ۱۹۴۷ء کو ہجرت کر کے کراچی پہنچی اور فروری ۱۹۴۸ء کو پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کی رکن منتخب

ہوئیں۔ پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کا قائدِاعظم محمد علی جناح (گورنر جنرل) سے حلف لینے کے تقریب کو خوبصورت انداز سے بیان کیا ہے۔اسلوب جزئیات کی حد تک مکمل ہے پورا منظر آنکھوں کے سامنے محسوس ہوتا ہے:

''جب سیکرٹری نے قائدِاعظم کی آمد کا اعلان کیا تو ہال میں خاموشی چھا گئی چپڑاسی نے پردہ ہٹایا تو قائدِاعظم نمودار ہوئے۔ ہم تمام آراکین اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ قائدِاعظم کے کرسی صدارت پر بیٹھنے کے بعد سب آراکین بیٹھ گئے اس کے بعد ایک ایک رکن کا نام پکارا گیا۔ ہر ممبر پلیٹ فارم پر جاتا حلف اُٹھاتا اور واپس آجاتا۔ جب میری باری آئی تو میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا ٹانگیں کانپ رہی تھیں تاہم میں پلیٹ فارم پر آئی۔ سیکرٹری نے وہ کارڈ جس پر میرا حلف لکھا ہوا تھا میرے حوالے کیا۔ جب میں نے حلف اُٹھالیا تو اُس کے بعد قائدِاعظم میری طرف دیکھ کر مسکرائے، ہاتھ ملایا اور کچھ باتیں کیں اور پھر میں پلیٹ فارم سے نیچے اُتر کر اپنی سیٹ پر آکر بیٹھ گئی۔'' (۱۱)

ہندوستان کے ہندو گھرانوں میں بالعموم اور مسلمان گھرانوں میں بالخصوص سخت سماجی رسومات کا سامنا تھا۔ مشترکہ خاندانی نظام تھا جس میں ایک بزرگ فرد کو تمام فیصلوں کا اختیار ہوتا۔ عورتوں کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ گھر کے اندرونی اور بیرونی چھوٹے بڑے فیصلوں میں انہیں شریک نہیں کیا جاتا تھا۔ آج بھی ہماری دیہی اور قبائلی معاشروں میں وہی رواج ہے البتہ بڑے شہروں میں تعلیم آنے کے بعد حالات بڑی حد تک تبدیل ہو چکے ہیں چنانچہ بیگم شائستہ کا کھینچا ہوا یہ نقشہ صرف اُن کے گھر کا نقشہ نہیں ہندوستان کے تقریباً ہر گھر کا نقشہ ہے :

''انگریزی ملازمت قبول کرنے کے بعد انہوں (میرے نانا) نے جدید اقدار سے اپنے خاندان کو بچائے رکھا۔ گھر میں کوئی اجنبی عورت داخل نہیں ہو سکتی تھی۔ اگر کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو ملازم لا دیتا یا چیزیں بیچنے والی عورتیں دے جاتیں۔ میرے نانا خاندان کی عورتوں کا کلکتہ کی نئی تہذیب کے دلدادہ عورتوں سے ملنے کو بھی سخت ناپسند کرتے تھے چنانچہ کسی کو مدعو کرنے یا کسی کے گھر جانے کی جرات نہیں ہوتی تھی۔ میرے نانا کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون ہوتا تھا۔ جس چیز کو وہ منظور کرتے وہ کوئی مسترد نہیں کر سکتا تھا اور جسے وہ مسترد کریں اُسے

کوئی منظور نہیں کر سکتا تھا۔" (۱۲)

پاکستان کے وجود میں آتے ہی اس کے سامنے بڑے بڑے مسائل تھے سب سے بڑا مسئلہ انڈیا سے آنے والے لٹے پٹے مسلمانوں کا تھا۔ ہندوستان اور پھر پاکستان میں بیگم شائستہ نے ہجرت کرنے والوں کے کیا دلدوز مناظر دیکھے اُن ہی کی زبان میں:

"اس دوران کلکتہ میں ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے ہندوؤں نے ان فسادات کا ذمہ دار مسلمانوں کو قرار دیا حالانکہ یہ بات بالکل غلط تھی مجھے وہ لٹے پٹے لوگ اب بھی یاد ہیں ان میں سے کئی اپنے عزیزوں کی موت کے صدمے سے بولنا تک بھول گئے تھے۔ وہ ہر وقت خلا میں تکتے رہتے تھے ہمارے گھر میں متاثرین کی ایک بڑی تعداد نے پناہ لے رکھی تھی ہم نے اُن کے کھانے پینے کا بندوبست کر رکھا تھا لیکن پھر بازار بند ہو گئے اور اشیائے خوردونوش نایاب ہو گئیں بہرحال پھر ہم چاولوں پر گزارہ کرتے رہے۔" (۱۳)

پاکستان کی ابتدائی مشکلات کو دیکھ کر ہر کوئی فکر مند تھا کہ یہ ملک کس طرح حالات کا مقابلہ کر کے کھڑا رہے گا۔ انڈیا تو جان بوجھ کر اس نئے مملکت کو ناکام کرنے کی کوشش کر رہا تھا تاہم دیگر کئی ممالک بھی ہندوستان سے پیچھے نہیں تھے۔ وطن عزیز نے تمام مصائب کا کس طرح ڈٹ کر مقابلہ کیا اور تمام مشکلات سے کیونکہ باہر آیا؟ بیگم شائستہ نے بہت تفصیل کے ساتھ اپنا آنکھوں دیکھا حال بیان کیا ہے:

"غیر ملکی حیران ہوتے ہیں کہ پاکستان بننے کے بعد اتنی تیزی سے سنبھل کیسے گیا۔ یہ حقیقت ہے کہ افسروں نے قیام پاکستان کے بعد چوبیس چوبیس گھنٹے کام کیا۔ کاغذوں کی کمی تھی۔ ٹائپ رائٹر نہیں تھے۔ فرنیچر نہیں تھا لیکن پاکستان سے محبت کے جزبے نے ان تمام مشکلات پر قابو پالیا۔ ریلوے سٹیشنوں پر ٹکٹ نہیں تھے ایندھن ختم ہو چکا تھا لیکن جوانوں کی ہمت نے ریلوے کے نظام کو بھی چلائے رکھا۔ وہ خواتین جنہوں نے کبھی معمولی کام بھی نہیں کیے تھے وہ زخمیوں کی مرہم پٹی اور دیکھ بھال کرتی تھیں۔ پھر سردیوں کا موسم نزدیک آگیا تو ہر امیر گھر سے گرم کپڑے لیے گئے۔ اُس سال شاید ہی کراچی کے کسی امیر گھر میں اُس

کی ضروریات سے زیادہ کپڑے ہوں گے۔“ (۱۴)

مختصر یہ کہ اس آپ بیتی میں بیگم شائستہ اکرام اللہ نے بڑی سچائی کے ساتھ ہمارے ایک خاص تہذیبی عہد کی تبدیلیوں کو بیان کیا ہے۔ ثقافتی لحاظ سے یہ آپ بیتی بے حد اہم ہے۔ انگریز کا غلغلہ، فرنگی حکومت کی کمزوری، دوسری جنگ عظیم کے بعد کی صورتحال، ایک عہد کا خاتمہ، قیام پاکستان کے بعد بدلا ہوا منظر نامہ، ملکی اور بین الاقوامی تغیرات، نئی اسلامی مملکت کی تشکیل، سماجی تغیرات، ہمارے رسوم و رواج میں تبدیلیوں کی وجوہات غرض وہ کونسا موضوع ہے جو آپ نے نہیں چھوا۔ آسان، عام فہم اور رواں اسلوب میں لکھی گئی یہ آپ بیتی ہماری ثقافتی، سماجی، معاشرتی اور ادبی تاریخ میں ایک اہم مقام کی حامل ہے اور رہے گی۔

جُرم سیاست (منظور احمد وٹو)

مشہور سیاست دان اور پنجاب کے سابق وزیر اعلیٰ منظور احمد وٹو نے اپنی مذکورہ آپ بیتی ''جرم سیاست'' زمانہ اسیری میں لکھی اور اس وقت مکمل کی جب وہ کارڈیالوجی انسٹی ٹیوب لاہور میں زیر علاج تھے۔ اُن کے کمرے کو سب جیل قرار دیا گیا تھا۔ یہ آپ بیتی اُن کی پیدائش، زندگی کے ابتدائی حالات، تعلیم، کالج کے زمانے اور پھر 1964ء میں اُن کے سیاسی سفر سے شروع ہو کر دسمبر 2002ء تک زندگی کے اہم ادوار پر مشتمل ہے۔ ہمارے ملک میں پڑھے لکھے سیاست دانوں میں کتابیں لکھنے کا رواج نہ ہونے کے برابر ہے۔ برطانیہ اور امریکہ میں صدیوں سے سیاسی برادری میں یہ کلچر چلا آرہا ہے کہ سیاسی لوگ ملک کے سیاسی، سماجی، تعلیمی اور ادبی موضوعات پر کچھ نہ کچھ آرٹیکل یا کتابوں کی شکل میں لکھتے رہتے ہیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انہیں ''تھنک ٹینک'' میں شامل کیا جاتا ہے۔ کالجوں، یونیورسٹیوں، نوجوانوں کی مجالس اور مختلف سمیناروں میں اُن کے مقالوں کو خصوصی اہمیت دی جاتی ہے۔ ہمارے ملک میں اب یہ روایت پروان چڑھ رہی ہے۔ یہاں بھی بے نظیر بھٹو، عمران خان، یوسف رضا گیلانی، ایوب خان اور پرویز مشرف کی کتابوں کو بڑی شہرت ملی۔ ملک کے کئی ممتاز سیاستدانوں کی لکھی ہوئی کتابیں اب حوالہ جاتی کتابوں کے طور پر کام میں لائی جاتی ہیں۔ آج کل چونکہ ابلاغ کا زمانہ ہے اس لیے سیاسی خود نوشتوں کو خاص اہمیت دی جارہی ہے۔'' جُرم سیاست'' سیاسی آپ بیتیوں میں خاصے کی چیز ہے۔ منظور وٹو 1964ء میں میدان سیاست میں آئے اور 2000ء میں اپنی آپ بیتی مکمل کی وہ اس عرصے میں مسلسل سیاست میں رہے۔ منظور وٹو کوئی سیاسی یا جاگیردارانہ پس منظر نہیں رکھتے تھے۔ ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھنے والے منظور وٹو نے اپنی زندگی آپ بنائی۔ نہ تو وہ سونے کا چمچ منہ میں لے کر پیدا ہوئے تھے نہ جاگیردار تھے، نہ پیر و مخدوم تھے اور نہ سرمایہ دار طبقے کے فرد تھے۔ ایک معمولی زمیندار کا بیٹا اپنی محنت، لگن اور قابلیت کی بنا پر پسماندہ گاؤں سے وزارت کے ایوانوں تک کیسے پہنچ سکتا ہے؟ جرم سیاست کی سرگزشت میں اس سوال کا جواب بھی ہے اور نوجوانوں کے لیے سبق بھی۔ وہ 2002ء تک پانچ مرتبہ قومی اسمبلی اور تین مرتبہ صوبائی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ اپنے گاؤں کے ایک یونین کونسل سے ممبر منتخب ہونے والے وٹو پنجاب کے سپیکر رہے۔ کل پانچ مرتبہ صوبہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ رہے۔ دو مرتبہ منتخب اور تین مرتبہ نگران۔ یہ آپ بیتی ہماری سماجی، سیاسی اور معاشرتی تاریخ کا شان دار ریکارڈ ہے۔ اُس نے پاکستان کے سیاسی واقعات کے کئی خفیہ گوشوں کو بے نقاب کر کے تاریخی فریضہ سرانجام دیا ہے۔ آپ نے کئی حکومتوں کے ٹوٹنے اور بننے کی اندرونی کہانیاں بیان کی ہیں، ملکی مسائل پر بات کی ہے، سیاست کس طرح سودے بازی کا روپ دھار لیتی ہے اور سیاست دان کس طرح سول یا فوجی بیوروکریسی کے ہاتھ کھلونا بنتے ہیں سب کے بارے میں چشم کشا حقائق سامنے لائے ہیں۔ پاکستان کی سیاست

کے عروج وزوال کا قریب سے مشاہدہ کرنے والے منظور وٹو کی سیاسی بصیرت، برداشت، تحمل اور دانش مندی کا سب اعتراف کرتے ہیں۔

پیدائش،ابتدائی زندگی اور آغاز سیاست :

14 اگست 1939ء کو گاؤں معظم ضلع فیروز پور میں پیدا ہونے والے منظور احمد وٹو نے سات سال کی عمر میں اپنے والدین کے ساتھ انڈیا سے پاکستان ہجرت کی اور تقسیم ہند کا خونچکاں منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا، چنانچہ ہجرت کے واقعے کو مختصر مگر جامع انداز سے اس طرح بیان کرتے ہیں :

> ''جب پاکستان بن گیا تو ہم نے اپنا آبائی گاؤں، اپنی زرعی جائیداد اپنا گھر اور اپنی آباؤ اجداد کی قبریں چھوڑ کر پاک سر زمین پر بڑی آرزؤں اور خوشگوار مستقبل کی اُمیدیں لے کر قدم رکھا۔اُس وقت ہمیں محسوس ہوا کہ دنیا جہاں کی دولت ہمارے حسین خوابوں کی تعبیر کی شکل میں ہمارے سامنے آگئی ہے۔ قیام پاکستان کی جدوجہد میں میرے والد صاحب اور پورے خاندان نے بھرپور حصہ لیا اور مسلم لیگ کا ساتھ دیا۔''(۱۵)

فیروز پور سے ہجرت کرنے کے بعد اس خاندان نے پنجاب میں اکاڑہ کے قریب ''وساوے والا'' نامی ایک چھوٹے سے گاؤں میں پناہ لی۔ اسی گاؤں سے وٹو نے پرائمری اور قریبی گاؤں ''حویلی لکھا'' سے میٹرک اور اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔

وٹو نے اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں انتہائی اختصار سے لکھا ہے، بچپن کے مشاغل، مصروفیات، دیہی زندگی جیسے موضوعات پر زیادہ نہیں لکھا اور نہ وہ واقعات درج کیے ہیں جن سے اُن کا بچپن سے سیاست کی طرف میلان کا پتہ چلے۔ البتہ اپنے والد اور والدہ کے کردار اور شخصیت کے بارے میں قدرے تفصیل سے لکھا ہے جس سے اُن کی اپنے والدین سے بے پایاں محبت ظاہر ہوتی ہے۔ آپ نے 1964ء میں ایوب خان کے بنیادی ممبر (B.D) کی حیثیت سے ضلع کونسل کا پہلا الیکشن لڑا مگر ناکام رہا تاہم 1977ء کو اصغر خان کی پارٹی تحریک استقلال میں شمولیت اختیار کی۔ حیران کن امر یہ ہے کہ اصغر خان خود تو کبھی ملک کے صدر، وزیراعظم یا وزیر اعلیٰ رہے نہ ملک کے چوٹی کی سیاست دان رہے لیکن اُن کے سیاسی پلیٹ فارم تحریک استقلال نے ملک کے کئی نامور سیاست دان نواز شریف، شیخ رشید احمد وغیرہ پیدا کیے۔

منظور احمد وٹو نے اپنی خودنوشت ''جرم سیاست'' میں ہمارے ملک کے سیاسی مزاج، سیاسی کلچر، سیاستدانوں کے

طرز عمل جوڑ توڑ اور سیاست دانوں کا بطور مہرے استعمال ہونے پر خوب روشنی ڈالی ہے۔ ہماری سیاسی پارٹیاں اور سیاسی گہما گہمی کارکنوں کی وجہ سے ہے۔ ہر پارٹی کے پاس جذباتی اور مخلص کارکن ضرور ہوتے ہیں جن پر پارٹیوں کو ناز ہوتا ہے۔ سیاسی لیڈر اُن کے لیے ''جیالے'' ''شیر'' اور ''سونامی'' جیسی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں۔ پارٹی کے وزیر اور مشیر بددل ہو کر پارٹیاں تبدیل کرتے ہیں لیکن سیاسی کارکن پارٹیوں کا ساتھ نہیں چھوڑتے۔ حیران کن طور پر سیاسی رہنما اُن کی وہ قدر نہیں کرتے جن کے وہ حقدار ہیں تاہم منظور وٹو کی بات اور ہے۔ وہ اپنے کارکنوں کو دل کھول کر داد دیتے ہیں ۔اُن کا ساتھ دینے والے، قربانی کرنے والے، اُن کے لیے الیکشن مہم چلانے والے اور سردی گرمی برداشت کرنے والے ساتھیوں کو وہ نہ صرف یاد کرتے ہیں بلکہ ایک ایک کا نام لے انہیں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔(۱۶) اپنی آپ بیتی کا انتساب بھی ایک سیاسی کارکن اعجاز عرف "بجی" کے نام سے کیا ہے جس نے اُن کے لیے جان کا نذرانہ پیش کیا تھا۔ یہ خوبی کم کم سیاست دانوں اور سماجی کارکنوں کے حصے میں آتی ہے۔ وٹو پبلک لائف (عوامی زندگی) کو اپنا عشق اور سیاست کو دوسرا مذہب کہتے ہیں۔ وہ جس سیاست دان میں کوئی خوبی دیکھتے ہیں تو اُن کی دل کھول کر تعریف بھی کرتے ہیں چنانچہ محمد خان جونیجو کی شرافت اور جمہوریت نوازی کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''محمد خان جونیجو نے اپوزیشن کے معاملے میں انتقامی کاروائی سے گریز کیا بے نظیر بھٹو کے تاریخی استقبال کو فری ہنڈ دیا اور مسئلہ افغانستان پر خود آل پارٹیز کانفرنس کا انعقاد کر کے ملک میں رواداری اور سیاست میں وضع داری کو فروغ دیا اور بے نظیر بھٹو کو بھی کل جماعتی کانفرنس میں مدعو کر کے بیٹی کہہ کر اپنے ساتھ بٹھایا۔'' (۱۷)

دیگر سیاست دانوں کے برعکس منظور وٹو نے کھلے الفاظ میں اس بات کا ذکر کیا ہے کہ کس طرح فوج اور دیگر قوتیں ملک میں سیاسی نظام بار بار پٹڑی سے اُتار دیتی ہے۔ اپنے تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں وہ خفیہ طاقتوں کی نشان دہی کرتا ہے اور بغیر کسی لگی لپیٹی کے وہی بات کرتا ہے جو اُسے سچ لگے:

> ''میری جنرل اسلم بیگ (چیف آف آرمی سٹاف) سے ملاقات ہوئی جس میں جنرل حمید گل بھی شامل تھے۔ اُنہوں نے وفاقی حکومت (بے نظیر بھٹو کی حکومت) کا شکوہ کیا اور پنجاب حکومت (نواز شریف کی وزات اعلیٰ کی) کی تعریف کی اور مجھے بھی نواز شریف کا بھرپور ساتھ دینے پر میرے کردار کو سراہا۔

اس میٹنگ کالب لباب جو میں سمجھ پایا وہ مجھے مضبوطی سے نواز شریف کا ساتھ
دینے کی تلقین کرنا چاہتے تھے۔'' (۱۸)

منظور وٹو نے دوٹوک الفاظ میں بیان کیا ہے کہ کس طرح سول اور ملٹری اسٹیبلشمنٹ حکومت کی اُکھاڑ بچھاڑ کرتی ہے۔ عوام کے ووٹوں سے منتخب لوگوں کو گھر بھیجتی ہے اور براہ راست یا پردے کے پیچھے سے حکومتیں چلاتی ہیں۔ وٹو نے یہ انکشاف کیا ہے کہ بیرونی طاقتیں خصوصاً امریکہ سیاست دانوں کو اپنے ساتھ نہیں ملا سکتیں اس لیے وہ بیوروکریسی اور فوج کی سرپرستی میں حکومتیں گراتی اور بناتی ہیں۔ اُس وقت کے آئی جے آئی کے قیام میں ایجنسیوں کے کردار کے بارے میں لکھتے ہیں:

''پاک فوج سے منسلک کچھ ایجنسیوں نے جنرل ضیاء الحق کے زمانے سے باقاعدہ
سیاسی رول اختیار کر لیا تھا اور پیپلز پارٹی کے متوقع ردعمل کی صورت میں آئی جے
آئی کا ایک پلیٹ فارم بنا کر مسلم لیگ، جماعت اسلامی اور دیگر جماعتوں کو اس میں
شامل کر کے 1988ء کے انتخاب میں پی پی پی کا مقابلہ کرنے کے لیے اُن کو تیار
کیا گیا۔'' (۱۹)

وٹو نے یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ کس طرح نواز شریف کے والد میاں محمد شریف ملکی معاملات میں بے جا مداخلت کرتے تھے۔ نواز شریف اور شہباز شریف اس معاملے میں بالکل بے بس تھے:

''پارٹی معاملات، انتظامی معاملات اور قومی اُمور میں میاں محمد شریف کی بے جا
مداخلت نے ایک طرف نواز شریف میں خود اعتمادی کو مجروح کیا۔ ملکی معاملات
میں فیصلوں کے لیے اُن کا انحصار اُن کے والد کی ذات پر بڑھتا چلا گیا۔ بالآخر
پارلیمانی جمہوریت شخصی فیصلوں کے تابع ہو گئی۔'' (۲۰)

منظور وٹو سیاست میں رواداری اور تحمل کے قائل ہیں۔ آپ بیتی میں شامل کئی واقعات گواہی دیتے ہیں کہ وہ مسلکی اختلافات اور فرقہ وارانہ خیالات سے دور دور رہتے ہیں۔ وسیع المشرب ہیں۔ وہ زندگی کے تمام رنگوں، انسانوں اور مذاہب سے پیار کرتے ہیں۔ اپنی آپ بیتی میں چھوٹے چھوٹے واقعات کو بھی اہمیت دیتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ارد گرد کی چھوٹی سی چھوٹی بات پر بھی نظر رکھتے ہیں مثلاً مہران بینک سکنڈل، ملی یکجہتی کونسل، پنجاب کا میلہ مویشاں، پنجاب میں گورنر راج، قید میں خوفناک تشدد جیسے واقعات پر بھی تفصیل سے لکھا ہے۔ امریکہ کا سرکاری دورہ ہو یا جیل کی زندگی،

سیاسی رہنماؤں سے ملاقات کاذ کرہو یاگاؤں کے شب وروز کاحال احوال وٹو نے اپنے تجربات اور مشاہدات کو بے کم وکاست قلم بند کیاہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ہماراملک ایک پولیس سٹیٹ ہے۔ حکمران ہمیشہ سے پولیس کواپنے سیاسی مخالفین کو قابو میں کرنے کے لیے استعمال کرتے آئے ہیں۔اپنے آقاؤں کو خوش کرنے کے لیے پولیس کتنا بھیانک کردار ادا کرتی ہے،وٹو صاحب کی زبانی سنیے:

> ''۹فروری۱۹۹۹ءکو خواجہ صدیق اکبر کی سربراہی میں پنجاب گورنمنٹ کے احکامات پر پولیس اور اینٹی کرپشن نے مجھے،احمد شجاع اور مظہر احمد کواحاطہ عدالت عالیہ سے گرفتار کر لیا۔ 10 فروری 1999ء کو میرے بیٹے معظم خان کو کیمرہ چوری کے مقدمے میں گرفتار کرکے حکمرانوں کی طرف سے بھینس چوری کے مقدمے کی یادتازہ کردی گئی۔'' (۲۱)

منظور وٹو فروری 1999ء سے 2001ء کے اوائل تک ملک کے مختلف جیلوں میں رہے۔ احتساب کمیشن نے انہیں کرپشن کے الزام میں گرفتار کیا لیکن دو سال تک قید رکھنے کے باوجود وہ کچھ ثابت نہیں کر سکے۔ دوران اسیری وہ تواتر سے اپنی ڈائری لکھتے رہے چنانچہ آپ بیتی کا آخری باب اسی ڈائری پر مشتمل ہے جس میں جیل کے شب وروز کی تفصیلات لکھے ہیں نیز آپ نے اپنی آپ بیتی میں مستقبل کی کچھ پیشن گوئیاں بھی درج کی ہیں جو حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئیں۔(۲۲)

وٹو نے اپنی آپ بیتی تاریخی اور زمانی ترتیب سے لکھی ہے جواس قدر مکمل ہے کہ کوئی بے ترتیبی یاانتشار نہیں ملتا۔ اگرچہ وٹو نے تو کہیں ذکر نہیں کیالیکن اندازہ ہوتاہے کہ انہیں ڈائری لکھنے کی عادت ہے اور اپنی آپ بیتی لکھتے وقت ان ڈائریوں کو کام میں لایا گیاہے۔ 1988ء سے لے کر 1997ء تک کاوقت پاکستانی سیاسی تاریخ کا مشکل ترین دور تھاجب حکومتوں کااُکھاڑ بچھاڑ، غیر سیاسی عناصر کی سرگرمیاں،اندرونی اور بیرونی سازشیں، لڑائی جھگڑے، بے روزگاری، مہنگائی اور غیر یقینی صورتحال عروج پر تھی۔اپنی آپ بیتی میں منظور وٹو نے ہماری سیاسی تاریخ کے اُس دور کے بارے میں بھی چشم کشاواقعات بیان کیے ہیں۔ وہ چونکہ اِن واقعات کے ایک اہم کردار تھےاِس لیےاُن کے بیان کردہ واقعات کی روشنی میں سارامنظر نامہ قاری کی سمجھ میں آجاتاہے۔

جرم سیاست کااسلوب اور مجموعی جائزہ:

''جرم سیاست'' اپنے سادہ اسلوب، بے باک لہجے اور صداقت کی وجہ سے خود نوشت کے اُصولوں پر بڑی حد

تک پورا اُترتی ہے۔ پھر بھی اِس آپ بیتی میں کئی خامیاں ہیں۔ خود نوشت نگار نے صفحہ نمبر ۱۲۱ سے صفحہ نمبر ۱۴۸ تک کے حصے میں صدر ضیاء الحق اور نواز شریف کے واقعات اور اپنے خطبات کو شامل کر کے آپ بیتی کو بوجھل بنایا ہے جس کا اصل متن سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وٹو نے آپ بیتی کے اس حصے میں زیادہ زور نواز شریف کے بے اُصولیوں، اقربہ پروری اور بدانتظامی پر صرف کیا ہے۔ اِس آپ بیتی کے گیارہویں باب میں چالیس صفحات میں اپنے وزارت اعلیٰ کے زمانے میں صوبہ پنجاب میں کی گئی مختلف اصلاحات کو بیان کیا ہے۔ یہاں اپنے کارناموں اور سیاسی اصلاحات کو خوب بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے۔ آپ بیتی کے اِس حصے کی اِتنی اہمیت بہر حال ہے کہ آپ کے مزاج، مشاغل، پسند و ناپسند اور سیاسی فکر پر روشنی پڑتی ہے۔ سیاسی لوگوں کی خود نوشتوں پر جو سب سے بڑا الزام لگایا جاتا ہے کہ ''اِس میں خود نوشت کم اور سیاسی ہنگامہ آرائی زیادہ ہوتی ہے اور یہ کہ سیاسی حضرات ذاتی پروپیگنڈے کے لیے آپ بیتیاں لکھتے ہیں''، کافی حد تک وزنی معلوم ہوتا ہے۔

یہ ہمارا عمومی رویہ ہے کہ ہم لوگ اپنی غلطیوں کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ اہل سیاست اور فوجی جرنیل تو غلطی ماننے کو اپنی بے عزتی خیال کرتے ہیں حالانکہ ہونا تو یہ چاہیے کہ ہر طبقے کے لوگ اپنی غلطیوں کا اعتراف کریں۔ اگر کسی سیاستدان نے عدم برداشت کا مظاہرہ کیا ہے تو اُنہیں تسلیم کر لینا چاہیئے اِس طرح اگر فوجی جرنیلوں نے کہیں ماورائے آئین کوئی کام کیا ہے تو اِس کا اعتراف بھی ہونا چاہیے تاکہ آئندہ غلطیوں کا اعادہ نہ ہو۔ قومیں اِس طرح سے آگے بڑھتی ہیں۔ منظور وٹو نے بڑی جرأت مندی سے اپنی آپ بیتی میں غلطیوں کا اعتراف کیا ہے جو کسی بھی اچھی آپ بیتی کی ایک اہم خصوصیت ہے۔

جہاں تک اِس آپ بیتی کے اسلوب کا تعلق ہے تو مصنف نے ایک اچھے اسلوب نگار کا ثبوت دیا ہے۔ اشعار کے بر محل استعمال سے وہ عبارت کو چار چاند لگاتے ہیں۔ منظور وٹو کے بارے میں اپنے معاصرین کی رائے ہے کہ ایک حاضر جواب، دلچسپ اور شیریں گفتار آدمی ہے۔ نیز بات بات پر اشعار سنانا بھی اُس کی عادت ہے۔ اُن کی یہ خصوصیت اُن کی آپ بیتی میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ وہ واقعے کے درمیان میں اور کبھی کبھی آخر میں شعر لاتے ہیں گویا مذکورہ شعر شاعر نے خاص اِس واقعے کے لیے لکھا تھا۔ کتاب کا آغاز ہی فیض کے اشعار سے کرتے ہیں:

> ''سیف الرحمٰن کے احتساب بیورو نے مجھ سمیت میرے خاندان کے چیدہ چیدہ افراد کو پس زندان بھیج دیا اور میں جیل میں وقت ضائع کرنے کے بجائے اپنی سیاسی اور ذاتی یادداشتوں پر مشتمل یہ کتاب لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ شاید ایسے ہی موقع پر فیض احمد فیض نے یہ خوبصورت اشعار کہے تھے:
>
> متاع لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
>
> کہ خونِ دِل میں ڈبو لی ہیں اُنگلیاں میں نے

زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقہ زنجیر میں زباں میں نے'' (۲۳)

وٹو کا اسلوب مائل بہ اختصار ہے۔ وہ طویل مباحث اور لمبے چوڑے واقعات کو انتہائی مختصر مگر جامع انداز سے لکھتے ہیں۔ گویا وٹو ''کفایت الفاظ'' کے اُصول پر کار بند لگتے ہیں۔ وٹو اپنی آپ بیتی میں اکثر واقعات کسی ماہر قلم کار کی طرح ذیلی عنوانات کے تحت لکھتے ہیں۔ جب ذیلی عنوان ختم ہوتا ہے تو خاتمہ کسی شعر، قول یا انگریزی کے چھوٹے سے اقتباس پر کرتے ہیں۔ اُس نے بعض جگہوں پر پورے پورے انگریزی اقتباسات درج کیے ہیں جو اُن کے مطالعے اور عمدہ ذوق کی غمازی کرتے ہیں۔ (۲۴)

وٹو اکثر عنوان اور ذیلی عنوان کسی شعر سے مستعار لیتا ہے:

''ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے''، ''لمحوں نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی''، ''اگر فردوس بر روئے زمین است''۔ (۲۵)

اس آپ بیتی میں کئی جگہوں پر واعظانہ اور خطیبانہ اسلوب بھی ملتا ہے۔ مثلاً میرے نزدیک، میں سمجھتا ہوں اور میرے خیال میں جیسے الفاظ کی تکرار اُن کی امارت اور برتری کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ایک سیاسی رہنما خواہ کتنے ہی غریب خاندان سے ہو بڑے عہدوں پر براجمان ہو کر عام لوگوں کو خاص فاصلے سے دیکھتا اور برتتا ہے۔ آپ بیتی کا تیسرا باب ''امریکہ کا پارلیمانی دورہ'' کے نام سے ہے جس میں کئی مہینے پر مشتمل اپنے امریکی دورے کی تفصیلات دی ہیں۔ یہاں اس نے امریکی قوانین کا مطالعہ کیا، وہاں کے سینیٹرز سے ملے، وہاں کے بازار، عجائب گھر اور تعلیمی ادارے دیکھے۔ غرض امریکی دورے کے مشاہدات اور تاثرات کو رقم کیا ہے۔ امریکی لوگوں میں من حیث القوم بے گانگی پائی جاتی ہے۔ اُن میں نہ تو اخلاص ہے اور نہ مہمان نوازی۔ آپ نے امریکہ کے ایک ریاست کولمبیا کے کئی زمینداروں سے ملاقات کی اور اُن سے کاشتکاری کے جدید طریقے سیکھے تاہم وہاں کے زمیندار بھی وٹو صاحب کو غیر مہمان نواز اور لوگوں سے الگ تھلگ رہنے والے نظر آئے۔ یہاں ''وٹو'' کسی ماہر سفر نامہ نگار کی طرح اپنے ملک کے کاشتکاروں اور امریکہ کے کاشتکاروں کا موازنہ کر کے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں:

''ہمارے ہاں تو دیہاتی زندگی میں یہ بات بے حد ضروری سمجھی جاتی ہے کہ اگر کوئی مہمان دیہات میں چلے جائیں تو میزبان بڑی تواضع کرتے ہیں لیکن امریکہ میں ہمیں یہ منفرد تجربہ ہوا کہ دیہات میں کسان بھی مہمانوں کی تواضع پر اپنا وقت صرف کرنا یا اُن کی تواضع کرنا مناسب خیال نہیں کرتے۔'' (۲۶)

اپنے امریکی دورے کی داستان ایک باب پر محیط کر کے مصنف نے بد ذوقی کا ثبوت دیا ہے۔اِس دورے کی اِتنی تفاصیل کی ضرورت نہیں تھی۔ خود نوشت نگار کا مسئلہ یہ ہے کہ جہاں قاری کے لیے تفصیل ضروری ہوتی ہے وہاں وہ خاموشی اختیار کر جاتے ہیں اور جہاں اختصار کی ضرورت ہو وہاں بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں۔ یہ اُردو آپ بیتیوں کا ایک بڑا عیب ہے۔آپ بیتی لکھنے کا یہ ایک اہم اُصول بلکہ خوش ذوقی کا تقاضا ہے کہ اسفار کی روداد کو اپنی خود نوشت کا حصہ نہیں بنانا چاہیئے یا جتنا مناسب ہو وہ بیان میں آئے۔آپ بیتی میں خوامخواسفر کی داستان پھیلا کر لکھنا کم مائیگی کا احساس دِلاتا ہے۔ بڑے اچھے اچھے اور مشہور قلم کار اپنی خود نوشت میں سفر نامے کے پیوند لگاتے ہیں۔ منظور احمد وٹو سے کیا گلہ کہ وہ انشا پرداز نہیں ہیں۔

اِس آپ بیتی میں مصنف نے انگریزی کے الفاظ بھی کثیر تعداد میں استعمال کیے ہیں۔ بعض جگہوں پر تو اُردو حروف تہجی میں لکھنے کا تکلف بھی گوارہ نہیں کیا:

"محمد خان جونیجو کی حکومت کو Dismiss کر دیا۔"(۲۷)

منظور وٹو نے اپنی آپ بیتی میں جگہ جگہ خوبصورت اشعار بھی لکھے ہیں جو اُن کی شعر و شاعری سے شغف کی غمازی کرتے ہیں۔ نثر میں موقع و محل کے مطابق شعر لکھنا انگوٹھی میں نگینہ جڑنے کے مترادف ہے۔(۲۸)

اِس آپ بیتی میں بعض مقامات پر مصنف نے دِلچسپ اسلوب اختیار کیا ہے۔اپنے جگری یار اور بچپن کے ساتھی میاں سردار علی خان کی وفات پر جو کچھ لکھا پُر سوز اسلوب کی عمدہ مثال ہے:

"میاں سردار علی خان کے بغیر زندگی کتنی بے کیف اور سونی ہو جائے گی۔ یہ تصور ہی کتنا روح فرسا ہے۔ پبلک لائف میں بے حد نشیب و فراز آئے۔ کبھی اقتدار کی بلندیاں اور کبھی مشکلات کی گھاٹیاں۔ دیہاتی زندگی کی محرومیاں اور دریائے ستلج کے کنارے بے فکر ملاقاتیں اور زندگی کے منصوبے وہ ہر جگہ میرا ہمدم اور مخلص ساتھی رہا۔"(۲۹)

وٹو مرقع نگاری اور منظر نگاری پر بھی قدرت رکھتے ہیں(۳۰) گو کہ میدان سیاست کی بے کیف زندگی کے بیان میں اِس قسم کے اسلوب کا سہارا نہیں لیا جا سکتا تاہم جہاں جہاں اُنہیں موقع ملتا ہے وہ اپنی اِس خوبی کا جادو ضرور جگاتے ہیں:

"مجھے ہلکی بارش کے بعد گاؤں کی مٹی سے پیدا ہونے والی خوشبو بے حد بھلی لگتی ہے اور گہرے ہل چلے کھیت کی مٹی سے گزرنا میرا محبوب مشغلہ ہے۔ کھیتوں کی

ہریالی کا پُر لطف نظارہ اور تخلیق کے عمل میں کلی کے چٹکنے سے لے کر اِس کا ہر پہلو
کھیت کے ہر ہر قدم پر آپ کو دعوت نظارہ دیتا ہے۔ انسانوں کی سادا زندگی اور
قناعت پسندی نے اِس (گاؤں کی زندگی) کو مزید حُسن عطا کیا ہے۔"(۳۱)

غرض وٹو کی داستان پنجاب کی دھرتی سے تعلق رکھنے والے ایک بڑے قومی سطح کے سیاستدان کی عروج و زوال کی داستان ہے۔ جُرم سیاست ہر لحاظ سے ایک کامیاب آپ بیتی ہے جو قاری پر انکشافات کے کئی دروازے کھلتی ہے۔ وٹو نے اپنی آپ بیتی میں محسن احسان کے دو خوبصورت شعر لکھے ہیں ہم ان اشعار پر اُن کی سرگزشت ختم کرتے ہیں:

اُسے گنوا کے میں زندہ ہوں اِس طرح محسنؔ
کہ جیسے تیز ہوا میں چراغ جلتا ہے
بچھڑ کے مجھ سے کبھی تُو نے یہ بھی سوچا ہے
ادھورا چاند بھی کتنا اُداس لگتا ہے (۳۲)

ہاں! میں باغی ہوں (جاوید ہاشمی)

جاوید ہاشمی ملک کے وہ سیاست دان ہیں جن کی سچائی، ایمانداری، وضعداری اور جمہوریت کے لیے دی جانے والی قربانیوں کی اپنے پرائے سب معترف ہیں۔ اصول پسندی، بے خوفی سچا اور کھرا پن جاوید ہاشمی کی شخصیت کے ممتاز اوصاف ہیں۔ جب بھی ایمانداری، حق گوئی، قومی سلامتی، وطن دوستی، جدیدیت، پارلیمنٹ کی بالادستی، ووٹ کی حرمت اور عوام کی ترقی وخوشحالی کی بات آتی ہے جاوید ہاشمی کا چہرا ذہن میں اُبھرتا ہے۔ زمانہ طالب علمی سے سیاست میں آنے والے مخدوم جاوید ہاشمی کا اسلامی جمعیت طلباء، تحریک استقلال، ضیاءالحق کی کابینہ مسلم لیگ ن اور پی ٹی آئی میں شمولیت تک ایک طویل سیاسی سفر رہا ہے۔ اپنی 65 سالہ زندگی میں نظری، فکری، سیاسی اور عملی طور پر حالت جنگ میں رہے۔ آپ ہمیشہ فوجی جرنیلوں اور مطلق العنان حکمرانوں کے آگے چٹان بن کر کھڑے رہتے اس لیے ہمیشہ قید وبند کی صعوبتیں برداشت کیں اور باغی کہلائے۔ آج ملک کے طول وعرض میں اس باغی کا نام عزت واحترام سے لیا جاتا ہے۔ گوکہ آج جاوید ہاشمی بڑھاپے اور بیماری کے باعث عملی سیاست سے تقریباً کنارہ کش ہو چکے ہیں لیکن آپ کا نام پروقار، شائستہ، شریف اور جمہوریت پسند سیاست دان کے طور پر ہمیشہ احترام سے لیا جائے گا۔

جاوید ہاشمی کا تعلق ضلع ملتان کے روحانی پیشواؤں کے ایک قدیم خاندان سے ہے۔ آپ کا خاندان پچھلے ہزار سال سے ملتان میں لوگوں کی عقیدت اور احترام کا محور رہا ہے۔ اس طرح آپ نے مداحوں، عقیدت مندوں اور پیروکاروں کے درمیان اپنی زندگی شروع کی چنانچہ اپنی پیدائش اور خاندان کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''میں ملتان سے 12 کلومیٹر مشرق کی طرف ملتان دہلی روڈ پر واقع قصبہ مخدوم رشید میں جولائی 1949ء میں پیدا ہوا۔ یہ قصبہ تقریباً ایک ہزار سال قبل ہمارے جد امجد حضرت مخدوم عبدالرشید حقانی نے آباد کیا اور اُن ہی کے نام سے معنون ہو گیا۔ مخدوم رشید پاکستان کے عام قصبوں جیسا ہے یہاں کوئی بڑا جاگیر دار ہے اور نہ کوئی سردار۔ صلاحیت اور قابلیت ہی کی بنیاد پر یہاں ہر کوئی معتبر ہوتا ہے۔ مجھ سمیت وہ کسی کے منصب سے مرعوب نہیں بلکہ منہ پر سخت بات کرنے والے کی یہاں زیادہ عزت ہے''۔ (۳۳)

جاوید ہاشمی نے اُردو آپ بیتی کی عام روایت کے مطابق اپنے خاندان اور نزدیک ترین رشتہ داروں کا حال تفصیل سے قلمبند نہیں کیا۔ اپنے بچپن کے واقعات سے بھی زیادہ تر پہلو تہی کی ہے، البتہ جو چند واقعات درج کیے ہیں اُن سے اندازہ

ہوتا ہے کہ وہ کون سے عوامل تھے جن سے ہاشمی صاحب کی شخصیت کا خمیر تیار ہوا۔ ''میری پہلی شعوری خواہش'' ''اللہ کے گھر سے پیغام'' اور ''میرا پہلا احتجاج'' (۳۴) کے عنوان سے درج کیے گئے چھوٹے چھوٹے واقعات اُن کے مستقبل کی زندگی کی نشاندہی کرتے ہیں۔اس ضمن میں '' پہلا سرکاری بلاوہ'' کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے تو اس بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ بچپن سے میرا مزاج باغیانہ ہے:

''میں تیسری جماعت میں تھا۔ بچوں کے درمیان جھگڑا ہوا۔ ایس ایچ او مخدوم رشید کے بھائی سے ہاتھا پائی تک نوبت پہنچی تو اس نے تھانے میں اطلاع کر دی کانسٹبل مجھے بلانے فوراً سکول پہنچ گیا۔ میں روزے سے تھا میں نے افطاری کا سامان منگوالیا اور چل پڑا یہ پہلا سرکاری بلاوہ تھا۔'' (۳۵)

جاوید ہاشمی نے نجی زندگی کی تفصیلات، پسند و مشاغل، سماجی اور معاشرتی تبدیلیوں کا بیان زیادہ صراحت سے نہیں کیا ہے۔

جاوید ہاشمی نے ملکی سیاسی اُتار چڑھاؤ اور عروج و زوال کا گہرا مطالعہ کیا ہے بلکہ 1978ء سے آج تک کے پر آشوب دور کے عینی شاہد رہے ہیں۔ اُس نے کئی سیاسی تبدیلیوں کا براہ راست مشاہدہ کیا ہے اس لیے وہ حالات و واقعات کو مؤثر طریقے سے بیان کر کے ان کا متوازن تجزیہ کرتے ہیں۔اکتوبر 1971ء میں پنجاب یونیورسٹی کے جس وفد نے پروفیسر وارث میر کی قیادت میں مشرقی پاکستان کا دورہ کیا۔ وہ مغربی پاکستان کی طرف سے کسی بھی سرکاری وفد کا آخری باضابطہ دورا ثابت ہوا۔ پاکستان نے جس طرح مشرقی پاکستان کو نظر انداز کیا تھا اور ہندوستان وہاں پر جو دلچسپی لے رہا تھا اس کے بارے میں سائیکل رکشے والے نے اُس وقت جاوید ہاشمی کی آنکھیں کھولیں جب اُس نے سائیکل رکشے والے کو پیچھے بٹھا کر خود رکشہ چلانے کی خواہش ظاہر کی:

''میں نے اُس سے پوچھا تم ڈر کیوں رہے ہو؟ اُس نے کہا یہ سائیکل رکشہ ہندو مہاجن کی ملکیت ہے اگر اسے نقصان پہنچا تو میرے بچے بھوکے مر جائیں گے۔ مشرقی پاکستان کی ترقی کے نعرے کھوکھلے تھے۔ بنگالی معیشت پر ہندو کے اثرات کو سمجھنے کے لیے اب مجھے کسی دانشور، کسی کتاب کی ضرورت نہیں تھی''۔(۳۶)

مشرقی پاکستان میں فوج نے عوام پر کیا ظلم ڈھائے(جس کی وجہ سے بنگالیوں میں فوج کے خلاف عام نفرت پھیل گئی تھی) جب وہ انسانی لاش کو گدھ اور کتے بھنبھوڑتے ہوئے دیکھتا ہے تو جاوید ہاشمی لکھتے ہیں:

''میں نے ایک افسر سے پوچھا تو وہ ہنسا اور اُس نے کہا یہ ایک چالاک بنگالی تھا ہمارے بیٹ مین نے کہا کہ کئی دن ہو گئے ہیں ہم نے کوئی بنگالی نہیں مارا۔ یہ شخص کشتی پر جارہا تھا ہم نے پکارا تو اس نے کشتی تیز کر کے بھاگنا چاہا میں نے نشانہ لے کر گولی چلائی اس نے پانی میں غوطہ لگایا۔ بڑی مشکل سے اس کی ٹانگ پر گولی لگی تو یہ قابو آگیا خیر آپ اس قصے کو چھوڑیں ہم کافی دیر سے کھانے پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں بنگالنیں بہت اچھا کھانا بناتی ہیں اور ہر قسم کی خدمت کے لیے حاضر ہیں''۔(۳۷)

جنرل ایوب خان نے کراچی سے ملک کا دارالخلافہ اپنے بسائے ہوئے نئے شہر اسلام آباد منتقل کیا۔ جاوید ہاشمی کو ایوب خان کے اس فیصلے سے شدید اختلاف ہے اور اس کے وہ کئی وجوہات بتاتے ہوئے ''پتھر کا شہر...... اسلام آباد'' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

''میں سمجھتا ہوں دارالحکومت کراچی سے تبدیل ہونے سے پاکستان کے استحکام کو نقصان پہنچا ہے۔ کراچی سے دارالحکومت اسلام آباد لانے سے مشرقی پاکستان مغربی پاکستان سے ایک ہزار میل کی بجائے 2ہزار میل کے فاصلے پر چلا گیا۔ کراچی شہر میں آج بھی 15 لاکھ بنگالی موجود ہیں۔ کراچی میں بنگالی خوش تھے۔ یہاں کا موسم (بھی) ڈھاکہ سے ملتا جلتا ہے''۔(۳۸)

مولانا مودودی کو پیر روشن ضمیر کہنے والا جاوید ہاشمی نیو ورلڈ آرڈر کو نیا سامراج اور ابلیسی طاقتوں کا نیا سردار کہتا ہے وہ امریکہ کے نیو ورلڈ آرڈر پر یوں تبصرہ کرتے ہیں :

''جب امریکہ کو اپنی پالیسیوں کی حمایت امریکی توقعات سے بڑھ کر ملی تو یوں محسوس ہوتا ہے بش صاحب جنرل پرویز مشرف کے مشورے کے بغیر ایک قدم بھی نہیں چلتے اب وہ عراق میں جمہوریت چاہتے ہیں اور پاکستان میں پرویز مشرف۔ اگر یہی نیو ورلڈ آرڈر ہے تو جولیس سیزر سے پہلے رومن بادشاہوں کی جمہوریت کیا بُری تھی''۔(۳۹)

جاوید ہاشمی نے بڑی سچائی اور صداقت سے وہ کچھ قلمبند کیا ہے جو اُس نے محسوس کیا ہے، دیکھا ہے یا سُنا ہے۔ اُس

نے اہم قومی رازوں، اندرونی کہانیوں، اقرباپروری، رشوت ستانی اور بیوروکریسی کی مچائی ہوئی تباہی کے چشم کشا حقائق بیان کیے ہیں۔ چنانچہ اس ضمن میں تحریر کرتے ہیں:

''اپنے اندرونی حالات پر نظر ڈالیں تو ظاہر ہوگا کہ قیام پاکستان سے اب تک اصل اقتدار فوج اور بیوروکریسی کے پاس رہا ہے۔ انتقال اقتدار انگریز سے فوج، بیوروکریسی اور جاگیردار کو ہوا، عوام کو نہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی قومی سطح کے فیصلے کرنے کی تربیت ہوتی ہے اور نہ صلاحیت۔'' (۴۰)

جاوید ہاشمی نے اپنی جدوجہد کے پانچ سال 12 اکتوبر 1999ء سے 12 اکتوبر 2005ء تک کا عرصہ اپنی آپ بیتی میں بہت تفصیل اور ایک خاص جذبے کے ساتھ لکھا ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب وہ صحیح معنوں میں تمام ملک میں فوجی حکمرانوں کے خلاف جدوجہد، جمہوریت کی بحالی، فوجی حکمرانوں کے خلاف تحریک چلانے اور اپنے سیاسی لیڈر محمد نواز شریف کے ساتھ وفاداری نبھانے کی وجہ سے ہماری سیاسی تاریخ میں اہم مقام حاصل کر گئے۔ جیل سے انتخاب لڑا اور کامیاب ہوئے، اے آر ڈی بنانے، بحالی جمہوریت کی مہم چلانے اور بار بار جیل جانے یا مقدمات کا پامردی سے مقابلہ کرنے جیسے واقعات خوب مزے سے بیان کیے ہیں۔ بین الاقوامی تبدیلیوں پر بھی ہاشمی صاحب کی گہری نظر رہتی ہے۔ نائن الیون کے واقعے کو بیان کرتے ہوئے کتنی بیداری اور سیاسی بصیرت کا ثبوت فراہم کرتے ہیں اُن ہی کے الفاظ میں سنیے:

''میرے سامنے سارا منظر نامہ واضح تھا، اتنے بڑے واقعے کے بعد پوری دنیا کی سیاست کو بدل جانا تھا میں نے کہا امریکہ پہلے ہی ہماری حکومت پر اُسامہ بن لادن کی گرفتاری کے لیے دباؤ بڑھا رہا تھا اب اس کا ہدف افغانستان ہوگا۔'' (۴۱)

جمہوریت کو اپنا دوسرا مذہب قرار دینے والے جاوید ہاشمی پر 40 سال کی سیاست میں سات سو سے زائد مقدمات قائم ہوئے جو ایک ریکارڈ ہے (۴۲) لیکن حکومت اس درویش صفت سیاستدان کے خلاف کچھ ثابت نہیں کر سکی۔ کیونکہ اُس نے کبھی پلاٹوں، پرمٹوں، کارخانوں اور جاگیروں کی سیاست نہیں کی تھی:

''میں نے ساری زندگی کبھی بجلی یا ٹیلی فون کے بل جمع کرنے میں بھی کوتاہی نہ کی۔ پوری زندگی میں نے ٹریفک کے اشارے کی خلاف ورزی کبھی نہیں کی۔ اپنے خاندان میں کسی کو ملازمت نہیں دلائی''۔ (۴۳)

ہماری قومی سیاست کے جدید عہد میں مخدوم جاوید ہاشمی اُن چند گنے چنے سیاست دانوں میں سے ہیں جو سیاست کو

عبادت کا درجہ دیتے ہیں۔ جمہوریت کو حقیقی معنوں میں عوام کی حکومت تسلیم کرتے ہیں۔ ناقدری عالم کا گلہ نہیں کرتے بلکہ قوم پر اعتماد کر کے گندے نظام کو جڑ سے اُکھاڑنے کی بات کرتے ہیں۔ درج ذیل اقتباس اُس کی فکر، عقیدے اور نظریے کا غماز ہے:

''ایک گلے سڑے نظام کو میں نے تبدیل کرنے کا عزم کیا تھا۔ میں نے سیاست دانوں کو حویلیوں سے نکال کر عوام کے دروازے پر لا کھڑا کیا یہی میرا صلہ تھا اور یہی میرا اطمینان قلب، صعوبتوں نے مجھے رنج کا خوگر کر دیا۔ میں کوئی بہادر آدمی نہیں بس ایک مجنون ہوں اور دشت لیلیٰ میں ہوں۔ مجھے ناقدری عالم کا گلہ بھی کبھی نہیں رہا۔ میری قوم نے ہمیشہ مجھے اعتماد سے نوازا ہے۔ بہادر تو وہ گمنام سیاسی کارکن ہیں جو صلہ کی تمنا و ستائش کے بغیر رات دن جدوجہد کرتے ہیں اور قربانیاں پیش کرتے ہیں۔ جن کی قربانیوں کے بغیر نہ پاکستان معرض وجود میں آسکتا تھا اور نہ آج جمہوریت کی جنگ فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو سکتی۔'' (۴۴)

مخدوم جاوید ہاشمی کی آپ بیتی ''ہاں! میں باغی ہوں'' دلچسپ بھی ہے اور پر تاثیر بھی۔ یہ ایک ایسی آپ بیتی ہے جس میں اول سے آخر تک پڑھنے والے کے لیے دلچسپی موجود ہے اور ہر قسم کا قاری خواہ اُس کا تعلق سیاست سے ہو یا سیاست میں دلچسپی نہ رکھتا ہو اسے شوق سے پڑھ سکتا ہے اور یہی وہ خصوصیت ہے جو اس آپ بیتی کو تمام سیاسی آپ بیتیوں میں ممتاز بناتی ہے۔ آپ بیتی میں تیرا باب ہیں تاہم پہلے نو باب میں ہاشمی صاحب نے اپنی زندگی کی سرگزشت سنائی ہے باقی چار ابواب اُن کے خطوط، قومی اسمبلی میں اُن کی تقاریر، عدالتی بیانات اور مقدمات کی تفاصیل پر مشتمل ہیں۔ یہ دور بھی چونکہ اُن کی زندگی کا اہم دور ہے۔ اس کا ذکر بھی ضروری تھا لیکن مصنف نے غیر ضروری تفاصیل ڈال کر آخری حصے کو خواہ مخواہ غیر دلچسپ بنا دیا ہے۔ اس آپ بیتی کو مکمل آپ بیتی اس لیے کہہ سکتے ہیں کہ بچپن اور پیدائش سے تحریر کے وقت تک تمام ضروری واقعات اور زندگی یا سیاسی زندگی کی ارتقائی منازل کو فنکارانہ انداز سے موضوع بحث بنایا گیا۔ جاوید ہاشمی نے زندگی کے واقعات ترتیب وار اور زمانے کے لحاظ سے نہیں لکھے علاوہ ازیں بیانیے میں بے ترتیبی سی ہے۔ انداز بیان میں بھی کافی خامیاں ہیں۔ بعض اوقات واقعے کی تفصیل میں درمیانی کڑیاں چھوڑ دیتا ہے جس سے بات واضح نہیں ہوتی۔ بہر حال یہ آپ بیتی حب الوطنی کے جذبے سے لکھی گئی ہے اور ادھوری یا یک رخی آپ بیتی نہیں۔ یہ آپ بیتی معلومات اور اسلوب دونوں کے لحاظ سے بہت اہم ہے۔ آپ کی تحریر پر پنجابی زبان کا اثر زیادہ ہے۔ پنجابی افعال، ضمائر اور محاورات کا زیادہ استعمال

کیا گیا ہے۔ جگہ جگہ پنجابی اشعار اور ضرب الامثال ملتے ہیں۔ یہ جگ بیتی کم اور آپ بیتی زیادہ نظر آتی ہے اور مصنف کی شخصیت ہر جگہ جلوہ گر ملتی ہے۔

''ہاں میں باغی ہوں''اسلوب اور طرز تحریر کے لحاظ سے بھی ایک اہم آپ بیتی ہے۔ مصنف کا زبان و بیان پر عبور نظر آتا ہے۔ سیاسی آپ بیتیوں کے بارے میں یہ تاثر عام ہے کہ وہ سپاٹ، دلچسپی سے عاری اور ایک خاص کھردار پن رکھتی ہیں۔ (۴۵) تاہم جاوید ہاشمی کی آپ بیتی کی خاص بات اس کا دلکش اور شگفتہ اسلوب ہے۔ آپ نے روزمرہ کی زبان استعمال کی ہے اور انگریزی یا فارسی کے مشکل الفاظ کا سہارا نہیں لیا۔اِس آپ بیتی کا اسلوب سنجیدہ اور سلیس ہے۔ جاوید ہاشمی بعض اوقات استعاراتی اسلوب اور ڈرامائی عناصر لاتے ہیں :

> ''جب کسی قبیلے کا سردار اُس قبیلے کے محروم و مقہور شخص کی کٹیا کے باہر کشکول گدائی لے کر اپنی لیے عزت وو قار کی بھیک مانگ رہا ہوتا ہے، جب کوئی نواب اپنی ریاست کے سرسوں کے کھیت کے کنارے اپنی سابقہ رعایا کے سامنے تاج شاہی اُتار کر دستار فضیلت کے لیے ہاتھ پھیلائے کھڑا ہوتا ہے۔ جب کوئی مرشد یا مخدوم شہروں اور بستیوں کی خاک چھان رہا ہوتا ہے اور عزت سادات بھی داؤ پر لگی ہوتی ہے...... تو سلطانی جمہور کا یہ منظر قابل دید ہوتا ہے۔'' (۴۶)

مصنف ضرورت کے مطابق منظر نگاری اور مرقع نگاری بھی خوب کرتا ہے ۔ وہ موقع و محل کے مطابق خوبصورت شعر لاتے ہیں اور بعض اوقات پورے پورے صفحے کا کام ایک شعر بلکہ ایک مصرعے سے لیتے ہیں۔ عدالت میں جج کے سامنے طویل تقریر کے بجائے فیض کے دو شعر پیش کر دیے۔(۴۷) بھٹو کی شہادت کے بعد اور ضیاءالحق کی طویل امرانہ دور کی تفصیل صرف ایک شعر میں بیان کرتے ہیں:

منیر مجھ کو ایک اور دریا کا سامنا تھا
میں ایک دریا کے پار اُترا تو میں نے دیکھا (۴۸)

اس طرح قفس، زندان، پاسبان، چکی، مشقت اور قید کی تکالیف کو طویل نثری پیرایوں میں بیان کرنے کی بجائے دو مصرعوں میں داستان سناتے ہیں:

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری تھی جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو(۴۹)

غرض فارسی اور پنجابی اشعار کی بھرپور اور برمحل استعمال سے اسلوب کو تازہ اور دلچسپ بنایا ہے۔ یہ اسلوب جان بوجھ کر یا کسی کمزوری کو چھپانے کے لیے نہیں بلکہ بے ساختہ اور پر خلوص جذبوں کی مرہون منت ہے۔ صرف اتنا نہیں مختلف ابواب میں چھوٹے چھوٹے عنوان اور ذیلی عنوان بھی اشعار کے مصرعے یا ٹکڑوں پر مشتمل ہیں اس سے انداز ہوتا ہے کہ شاعرانہ اسلوب آپ کے دل و دماغ پر کتنا طاری ہے۔ مثلاً ''پاسبان مل گئے کعبے کو صنم خانے سے''، ''در کعبہ وا ہوتا ہے''، ''تیری بربادیوں کے تذکرے ہیں آسمانوں میں''، ''برق گرتی ہے۔'' (۵۰)

غرض تیرا ابواب اور چار سو صفحات پر مشتمل مخدوم جاوید ہاشمی کی آپ بیتی ''ہاں میں باغی ہوں'' ایک معیاری آپ بیتی ہے جو فن خود نوشت نگاری اور اُصول خود نوشت پر پورا اُترتی ہے یہ مصنف کی زندگی کے اُن تمام حالات و واقعات کا احاطہ کرتی ہے جس نے ان کی شخصیت بنانے، اُٹھانے اور تشکیل دینے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ انتخاب واقعات میں بھی مصنف نے ماہرانہ چابک دستی کا ثبوت دیا ہے۔ اس آپ بیتی کے متعلق پروفیسر سجاد میر کا تبصرہ حقیقت پر مبنی ہے:

> ''میں گواہی دے سکتا ہوں کہ اس آپ بیتی کا ایک ایک حرف سچ ہے۔ ہو سکتا ہے اسے میں لکھتا تو اس کا پیرائیہ مختلف ہوتا یا واقعات کے انتخاب و ترجیح کا حوالہ الگ ہوتا۔ میں اسے پڑھ پڑھ کر ماضی میں کھو جاتا ہوں اور جب واپس نکلتا ہوں تو میں ایک روشن مستقبل کو طلوع ہوتے دیکھتا ہوں صرف اس لیے کہ جب تک جاوید ہاشمی جیسے جرأت مند، سر پھیرے ہم میں موجود ہیں یہ معاشرہ کبھی مردہ نہیں ہو سکتا۔'' (۵۱)

چاہ یوسف سے صدا (یوسف رضا گیلانی)

پاکستان کے سابق وزیر اعظم، قومی اسمبلی کے سابق سپیکر، کئی اہم وزارتوں پر فائز رہنے والے، پانچ سے زیادہ مرتبہ قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہونے والے اور پاکستان پیپلز پارٹی کے سرکردہ رہنما یوسف رضا گیلانی ملکی سیاست میں ایک اہم حیثیت رکھتے ہیں۔ یوسف رضا گیلانی اِس ملک کے وزیر اعظم، سپیکر قومی اسمبلی، وفاقی وزیر ریلوے، وفاقی وزیر سیاحت و ثقافت، وفاقی وزیر ہاؤسنگ و تعمیرات رہے۔ ضیاء الحق کی مارشل لاء کے چھتری تلے بنائی گئی کابینہ ہو یا نوے کی دہائی کا پُرآشوب اور اکھاڑ بچھاڑ کی سیاست، بے نظیر کا دَور حکومت ہو یا نواز شریف کی وزرات عظمیٰ، پرویز مشرف کا اقتدار ہو یا مشرف کی بنائی ہوئی سیاسی پارٹی مسلم لیگ ''ق'' کا عروج تقریباً تین عشروں کی سیاست کو گیلانی صاحب نے نہ صرف قریب سے دیکھا بلکہ اِس طویل سیاسی ہنگامے کا حصہ بھی رہے۔ یہی وجہ ہے کہ یوسف رضا گیلانی کی آپ بیتی ''چاہ یوسف سے صدا'' کو کافی شہرت ملی۔ سیاست کے سربستہ رازوں، محلاتی سازشوں، جونیجو حکومت کے اندر خانہ واقعات، بے نظیر بھٹو کی طرز حکمرانی، نواز شریف کے عروج و زوال، ریاستی اداروں کی من مانیوں، سماجی تغیرات، اقتصادیات، معاشرتی تبدیلیوں، سیاسی حوادث کا ملک کے دیگر شعبوں پر پڑنے والے خراب اثرات اور اہم قومی انکشافات کے حوالے سے مذکورہ آپ بیتی خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔

۹ جون ۱۹۵۲ء کو پیدا ہونے والے یوسف رضا گیلانی کا تعلق ملتان کے مشہور روحانی پیشواؤں کے خاندان سے تھا جو مغل بادشاہوں کے دَور میں شام سے ہندوستان آئے اور ملتان کو اپنا مستقر قرار دیا۔ ملتان کو بزرگوں اور اولیاء کی سرزمین کہا جاتا ہے جہاں صوفیاء کے کئی مشہور سلسلے سینکڑوں سالوں سے لوگوں کی روحانی، فکری اور دینی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔ اِن میں یوسف رضا گیلانی کے خاندان کو کئی لحاظ سے ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ ملتان کے دیگر گدی نشین سلسلوں کی طرح مصنف کا خاندان یعنی گیلانی خاندان بھی سیاست میں آیا۔ اب اِن صوفیاء خاندانوں کی شہرت تصوف اور پیری مریدی سے زیادہ سیاست کی وجہ سے ہے۔ پاکستان کے موجودہ وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی اور نامور سیاستدان جاوید ہاشمی کا تعلق بھی ملتان کے ان خاندانوں سے ہے جو زمانہ قدیم میں دین، فقہ، تصوف اور آج کل سیاست میں لوگوں کی رہنمائی کا فرض پورا کر رہے ہیں۔ یوسف رضا گیلانی کا خاندان اُن کے دادا کے زمانے سے سیاست میں ہے۔ اُن کے دادا نے مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے قائدِاعظم محمد علی جناح کی قیادت میں قیام پاکستان کی کامیاب تحریک چلائی۔ پھر آپ کے والد بھی قیام پاکستان کے بعد کئی بار پاکستان کے دستور ساز اسمبلی کے ممبر رہے۔ خود یوسف رضا گیلانی ضلع ملتان کے ڈسٹرکٹ چیئرمین اور پھر قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ آپ نے اپنی سیاست کا آغاز گلی محلے اور ٹاؤن کی سیاست سے کیا تھا اور

ہوتے ہوتے ملک کے وزارت عظمیٰ کے عہدے تک پہنچے۔ چونکہ آپ نے نچلی سطح سے اپنے سیاسی کیریئر کاآغاز کیا تھااِس لیےآپ کا ملکی سیاست میں وسیع تجربہ ہے۔ لہٰذاوہ جس موضوع پر بات کرتے ہیں خواہ وہ سیاسی موضوع ہو یاغیر سیاسی آپ کی بات میں تفکر، سنجیدگی، گہرائی اور بصیرت پائی جاتی ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے ساتھ تعلق رکھنے کے باوجود تمام سیاسی پارٹیوں کے رہنماؤں کے ساتھ آپ کے مثالی تعلقات رہے۔

یوسف رضا گیلانی کی یہ آپ بیتی اُن کے جیل کے دِنوں کی یادگار ہے جب پرویز مشرف نے اُنہیں ۲۰۰۱ء میں گرفتار کرکے ملک کے مختلف جیلوں میں رکھا۔ آپ اِس عرصے میں مسلسل اپنی یادداشتیں قلمبند کرتے رہے اور جیل ہی سے اپنی آپ بیتی کو شائع کردیا۔ آپ نے اعتراف کیا ہے کہ مولانا الطاف حسین حالی کے ایک شعر

آرہی ہے چاہ یوسف سے صدا
دوست یہاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت

کے پہلے مصرعے کو اپنی آپ بیتی کا نام اور عنوان بنایا۔ کتاب کے دیباچے میں اپنی آپ بیتی لکھنے کے اغراض و مقاصد کا ذکر کرتے ہوئے یوسف رضا گیلانی لکھتے ہیں:

> ''اِس کتاب میں درج یادداشتیں بالواسطہ یا بلاواسطہ مجھ سے متعلق ہیں جن کا مقصد قارئین کو واقعات و حقائق کے ساتھ اُن کے پیش منظر اور پس منظر سے آگاہ کرنا ہے نہ کہ کسی کی دِل شکنی کرنا۔ دوران تحریر روانی اور دلچسپی کو قائم رکھنے کے لیے میں نے اپنے قابل عزت بزرگوں، عزیز و اقارب، احباب اور ساتھیوں کے القابات کی تکرار سے پرہیز کیا ہے۔ میں نے حتی الامکان آسان اور عام فہم الفاظ کا استعمال کیا ہے۔'' (۵۲)

مصنف کے اِس بیان سے پانچ باتیں سامنے آتی ہیں:

۱۔ مصنف نے صرف اپنی یادداشتوں پر انحصار کیا ہے۔

۲۔ اِس آپ بیتی کا مقصد اہم تاریخی واقعات کا سچائی سے بیان ہے تاکہ ملک کے اہم تاریخی اور سیاسی واقعات کو درست جگہ پر رکھا جاسکے۔

۳۔ اِس سرگزشت کا مقصد کسی کی دِل آزاری نہیں بلکہ اہم سیاسی واقعات، سیاست کے اہم موڑ اور جمہوری اور غیر جمہوری ادوار میں ہونے والے مختلف سنگ میل کی نشان دہی کرنا ہے تاکہ سیاسی ریکارڈ کو درست کیا جاسکے۔

۴۔ مصنف نے آسان اور عام فہم زبان کا استعمال کیا ہے۔

۵۔ مصنف نے کسی اور کے بیان، روایت، تاریخی کتاب یا تاریخی بیان پر تکیہ کرنے کے بجائے صرف ذاتی مشاہدے پر انحصار کیا ہے اور اُن واقعات کا انتخاب کیا ہے جو براہ راست اُن کے تجربے سے گزرے۔

علاوہ ازیں مصنف نے اِس آپ بیتی کا سب سے بڑا مقصد ایوان اقتدار کی سرگوشیوں کو خاموش اکثریت کی سماعتوں تک پہنچانا بتایا ہے (مراد یہ ہے کہ عام لوگوں کو حکومتوں کے مختلف رازوں سے باخبر کرانا)۔(۵۳) جو ایک بڑی بات ہے۔ اب تک ہم نے جتنی سیاسی آپ بیتیوں کا مطالعہ کیا زیادہ تر آپ بیتیوں میں ذاتی تشہیر کر کے اپنے دورِ اقتدار میں کیے گئے کاموں کا ڈھنڈورا پیٹا گیا تھا یا اپنی پالیسیوں کا دفاع کیا گیا تھا یہ پہلی سیاسی آپ بیتی ہے جس کے دیباچے میں مصنف نے نہ صرف اپنے مقاصد کا تعین کیا ہے بلکہ اپنے لیے اُصول بھی وضع کیے ہیں۔ آگے ہم ''چاہ یوسف سے صدا'' کا تنقیدی اور تحقیقی مطالعہ کر کے یہ ڈھونڈنے کی کوشش کریں گے کہ مصنف نے اپنے اُصولوں کی کس حد تک پاسداری کی ہے۔

یوسف رضا گیلانی کو اپنے خاندانی عظمت و حشمت پر بڑا افتخار ہے۔ وہ اپنی آپ بیتی میں بہانے بہانے سے اپنے خاندان، آباؤاجداد اور عوام وخواص کا اپنے خاندان کے ساتھ احترام کا ذکر کرتے ہیں اور اِس پر نازاں نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے اپنی آپ بیتی میں اپنے خاندانی پس منظر کو بیس سے زیادہ صفحات پر پھیلا کر لکھا ہے۔ ویسے بھی گیلانی صاحب اختصار کی جگہ طوالت کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ کوئی بھی واقعہ نہ تو اختصار سے بیان کر سکتے ہیں اور نہ اُن کی طبیعت تلخیص نگاری کی طرف مائل نظر آتی ہے۔ حیران کن طور پر عام زندگی میں صلح کل، سنجیدہ اور خاموش طبع یوسف رضا گیلانی اپنی سرگزشت سناتے ہوئے ایک بدلے ہوئے گیلانی نظر آتے ہیں۔ آپ نے دیگر واقعات کی طرح اپنے خاندان، آباؤاجداد اور خاندان کا پس منظر بھی بڑی وضاحت سے تحریر کیا ہے۔ یوسف رضا گیلانی لکھتے ہیں کہ اُن کا سلسلہ نسب عراق کے مشہور صوفی بزرگ حضرت شیخ عبدالقادر گیلانیؒ سے جا ملتا ہے۔ اُن کے جد امجد شیخ عبدالقادر حضرت امام حسینؓ کی اولاد میں سے تھے اِس لیے اُن کا خاندان ''حسن الحسینی سید'' کہلاتا ہے۔ شیخ عبدالقادر جیلانی کا ایک پوتا عراق سے شام جا کر آباد ہو گیا۔ چنانچہ یوسف رضا گیلانی کے خاندانی سلسلے کے ایک بزرگ حلب (شام) سے تبلیغ دین کے سلسلے میں آئے اور اُوچ میں سکونت اختیار کر لی۔ اُن کے ایک بیٹے حضرت موسیٰ پاک شہید نے اُوچ چھوڑ کر ملتان کو اپنا مرکز بنایا۔ اِس کے بعد یوسف رضا گیلانی کا خاندان اور ملتان آپس میں لازم وملزوم ہو گئے۔ حضرت موسیٰ پاک اور اُس کے بیٹے رُشد و ہدایت کے سرچشمے تھے جن کے ہاتھوں پر ہزاروں لوگوں نے بیعت کی۔ تھوڑے ہی عرصے میں ریاضت، پرہیز گاری، مہمان نوازی، خدمت خلق اور تبلیغ دین کے حوالے سے اِن لوگوں کی شہرت پنجاب اور سندھ کے دُور دراز علاقوں تک ہو گئی اور یہ خاندان ''پیرِ

پیراں موسیٰ پاک شہید'' کے نام سے مشہور ہو گیا۔اِس سلسلے میں یوسف رضا گیلانی ''چاہِ یوسف سے صدا'' میں رقمطراز ہیں:

> ''حضرت موسیٰ پاک شہید کی وفات پر آپ کے بڑے بیٹے حامد گنج بخش ثانی گیلانی المعروف شیخ حامد نے ملتان میں مستقل سکونت اختیار کی اور دربار عالیہ حضرت پیر پیراں موسیٰ پاک شہید ملتان کے سجادہ نشین مقرر ہوئے۔آپ کی تمام عمر درس و تدریس اور ہدایت خلق میں بسر ہوئی۔آپ کے بعد آپ کے فرزند حضرت نواب موسیٰ پاک دین المعروف شیخ موسیٰ سجادہ نشین قرار پائے۔ وہ علم و فضل میں یکتا ہونے کے علاوہ روحانیت میں بھی اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔ میرے پردادا سید محمد صدر الدین شاہ گیلانی سجادہ نشین درگاہ پیرِ پیراں شیخ موسیٰ کے بیٹے تھے۔اُن کے زمانے تک ہمارے خاندان کے نہ تو کسی فرد نے دنیاوی عہدہ قبول کیا تھا اور نہ سیاست میں آئے تھے۔''(۵۴)

اِس موقع پر مصنف نے اپنے خاندان کی تاریخ لکھتے لکھتے ملتان کی تاریخ، ثقافت، زبان اور آب و ہَوا کو بھی اختصار سے بیان کیا ہے۔

یوسف رضا گیلانی، اُن کے والد، چچا، بھائی، ماموں اور چچا زاد بھائی سب پاکستانی سیاست میں کافی متحرک رہے۔اِس خاندان کے لوگ قیامِ پاکستان سے لے کر آج تک تقریباً ہر حکومت کا حصہ رہے ہیں۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ درس و تدریس، علم و فضل، تصوف، ریاضت اور لوگوں کی روحانی تربیت کرنے والے یہ لوگ کوچہ سیاست میں کب اور کیسے آئے؟ اِس کا جواب مصنف نے اپنی آپ بیتی میں یہ دیا ہے کہ اُن کے پردادا پیر صدر الدین شاہ گیلانی (۱۸۶۸ء۔۱۹۴۶ء) اُن کے خاندان کے پہلے فرد تھے جو باقاعدہ سیاست میں آئے اور کئی سیاسی عہدوں پر فائز رہے۔اِس طرح اُس دِن سے لے کر آج تک آپ کے خاندان میں بڑے بڑے سیاسی رہنما، آئی سی ایس آفسر، وکیل، نامور جج اور زندگی کے دیگر شعبوں میں بڑے بڑے لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں۔ یوسف رضا گیلانی کے دادا ڈویژنل مجسٹریٹ تھے جبکہ والد نے ۱۹۴۱ء میں بی اے کی ڈگری حاصل کر کے سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ وہ مسلم لیگ میں شامل تھے اور ملتان کے دُور دراز علاقوں میں مسلم لیگ کو اُس نے متعارف کرایا تھا۔ یوسف رضا گیلانی ایک کٹر صوفی اور قدامت پسند خاندان کا سیاست میں آنے کو اِن الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"پیر صدر الدین شاہ گیلانی ۱۸۷۸ء میں پیدا ہوئے۔ ابھی آپ کی عمر چھ ماہ تھی جب آپ کے والد وفات پا گئے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا اور ۱۹۰۳ء سے لے کر زندگی بھر یعنی تنتیس سال بلا مقابلہ میونسپل کمیٹی ملتان کے رکن منتخب ہوتے رہے۔ آپ ۱۹۱۳ء میں میونسپل کمیٹی ملتان کے وائس پریذیڈنٹ جبکہ ۱۹۱۶ء میں قانون ساز کونسل کے رکن منتخب ہوئے۔ آپ قائداعظم کی انڈیپنڈنٹ پارٹی سے بھی منسلک رہے۔ وہ میونسپل کمیٹی ملتان کے پہلے مسلمان پریذیڈنٹ (میئر) تھے۔ اُنہوں نے تحریک خلافت میں بھی اہم کردار ادا کیا تھا۔ اُن کی وفات ۱۰ محرم الحرام ۱۹۴۶ء کو بروز جمعہ ہوئی۔"(۵۵)

یوسف رضا گیلانی نے اپنی آپ بیتی میں اعتراف کیا ہے کہ تعلیم، سیاست، کاروبار اور سرکاری عہدوں میں آجانے کے باوجود اُن کے خاندانی روایات بے حد سخت ہیں۔ اُن پر قدامت پسندی کا غلبہ ہے اور جدیدیت کی ہَوائیں اُن کے خاندان مین ابھی تک نہیں آسکیں۔ کئی باتوں میں آج بھی اُنہیں سخت گیر خاندانی رواجوں کا سامنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے ہاں خاندان سے باہر شادی کرنے کا رواج نہیں۔ چنانچہ آپ کی شادی اپنے رشتہ داروں سجادہ نشین دربار پیر قطبیہ سندیلیانوالی کی صاحبزادی سے کر دی گئی۔ آپ نے بتایا ہے کہ مشہور روحانی پیشوا اور اپنی سیاسی پیشن گوئیوں کے لیے شہرت رکھنے والے پیر صاحب پگاڑو آپ کے خالو ہیں۔ یوسف رضا گیلانی نے یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ سیاسی خاندانوں کی طرح ملک کے تقریباً تمام بڑے سجادہ نشین خاندانوں کے بھی آپس میں رشتے داریاں ہیں۔ حیران کن طور پر گدی نشین خاندانوں کی اکثریت عرصہ دراز سے سیاست میں ہے۔ چنانچہ گیلانی صاحب نے تفصیل سے بتایا ہے کہ پگاڑو خاندان، لغاری خاندان، دولتانہ خاندان، گولڑہ شریف، اُوچ شریف، کھڈ شریف اور دیگر نامور دینی خاندانوں کے ساتھ آپ کی رشتہ داریاں ہیں جو اتفاق سے عرصہ دراز سے سیاست میں بھی چلے آرہے ہیں۔(۵۶)

یوسف رضا گیلانی کے والد سُنی اور والدہ اہل تشیع تھیں تاہم اُن کے عقائد پر شعیت کا اثر زیادہ ہے۔ آپ کے خاندان میں سُنی اور شیعہ کے ساتھ رشتے کرنے کی آزادی ہے۔ وہ بہت فخر سے اقرار کرتے ہیں کہ پورے پنجاب میں اُن کا گھرانہ سُنی اور شیعہ اتحاد کی ایک بڑی علامت سمجھا جاتا ہے۔ وسیع المشربی، دریادلی، سخاوت اور تمام فرقوں یا مسلکوں کے ساتھ گھل مل کر رہنے اور احترام کرنے کا جذبہ اُنہیں اپنے خاندان سے عطا ہوا ہے۔ علاوہ ازیں یوسف رضا گیلانی کی مادری

زبان سرائیکی ہے۔آپ نے سرائیکی زبان پر بھی اظہارِ خیال کر کے بتایا ہے کہ اِس زبان میں زیادہ تر ذخیرہ الفاظ سندھی زبان کا ہے کیونکہ ملتان کسی زمانے میں سندھ کا دارالخلافہ ہوا کرتا تھا اور سرائیکی ملتان میں سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان تھی۔ سرائیکی زبان کی اہمیت، انفرادیت اور تاریخی آن بان کا ذکر گیلانی صاحب یوں کرتے ہیں :

''بلا شبہ سرائیکی زبان برصغیر کی سب سے میٹھی اور نفیس زبان ہے۔ یہ زبان پاکستان کے چاروں صوبوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔اِس سے یہ بات واضح ہے کہ ملتان کی تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی اقدار کا پنجابی، سندھی، بلوچی اور پشتون تہذیب و ثقافت پر گہرا اثر ہے۔''(۵۷)

دیگر سیاستدانوں کی طرح یوسف رضا گیلانی بھی سارا زور سیاسی واقعات، سیاست کا اُتار چڑھاؤ اور سیاسی ماحول پر دیتے ہیں۔اُس نے ذاتی حالات، نجی واقعات، پسند و مشاغل کا نہ تو زیادہ ذکر کیا ہے اور نہ وہ سیاسی حوادث کو ذاتی زندگی کے ساتھ لف کرتا ہے۔یوسف بڑی مشینی اور میکانیکی انداز سے اپنی کہانی سناتا ہے۔ایک معیاری آپ بیتی کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ اُس میں مصنف داخل سے خارج کی طرف کا سفر کرے۔ کہانی سنانے والا خود کو کہیں نظروں سے اُجھل نہ ہونے دے۔مزکورہ آپ بیتی میں مصنف نے اِس کے برعکس اُصول اپنایا ہے۔ وہ خارجی واقعات اور سیاسی سرگزشت سنائے گا اور کہیں ضمنی طور پر اپنی ذات کو بھی درمیان میں شامل کرے گا۔البتہ جہاں جہاں مصنف نے کہانی میں خود کو محور و مرکز بنایا ہے وہاں کہانی کی صداقت، واقعیت اور اہمیت میں اضافہ ہوا ہے۔

یوسف رضا گیلانی ۹ جون ۱۹۲۰ء کو کراچی میں اپنے نانا کے گھر پیدا ہوئے۔(۵۸) وہ اپنے والدین کی پہلی اولاد ہیں۔اُس زمانے میں آپ کے خاندان میں یہ دستور تھا کہ شادی شدہ جوڑہ پہلے بچے کی پیدائش بیوی کے ماں باپ (میکے) میں کراتے۔اُن کا عقیدہ تھا کہ اِس طرح سے نومولود نہ صرف نظر بد سے محفوظ رہتا ہے بلکہ وہ صحت مند اور بلند اقبال بھی ہو جاتا ہے۔چنانچہ آپ نے اپنے تعلیمی سفر کا آغاز ملتان کے سینٹ میریز کانوینٹ سکول سے کیا جو آپ کے گھر کے قریب تھا۔وہ اپنے دیگر کزن کے ساتھ اپنے چچا رحمت حسین کے خوبصورت گھوڑا تانگے پر بیٹھ کر سکول جایا کرتے تھے۔اپنے ابتدائی جماعتوں کی خوبصورت یادیں بیان کرتے ہوئے پڑھنے والوں کو اپنے ساتھ ماضی میں لے جاتا ہے۔ جب وہ وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی نہیں پرائمری سکول کا ایک ننھا مُنا شرارتی طالب علم تھا:

''اُن دِنوں سکول میں دوران پڑھائی کھانے کا وقفہ ہوا کرتا تھا۔ہم اپنے سکول بیگ میں کھانا ساتھ لے کر جاتے تھے۔کندورے (رومال) میں لپٹے دیسی گھی کے

پراٹھے اور دیسی مرغی کے انڈوں سے بنا املیٹ بیگ میں پڑا رہنے کی وجہ سے اِتنے
خستہ ہو چکے ہوتے تھے کہ لذت دوبالا ہو جاتی تھی۔ میں اس کا ذائقہ اور کلاس
فیلوز کے ساتھ مل جل کر کھانے کا لطف آج تک نہیں بھولا۔ پرنسپل سسٹر بینیڈکٹا
جو طویل عرصے سے اِس سکول میں پڑھا رہی تھیں، اُن کا چہرہ آج بھی میری
یادداشت میں محفوظ ہے۔" (۵۹)

یوسف رضا گیلانی اِتنا عرصہ گزرنے کے باوجود اپنے کلاس فیلوز اور اساتذہ کو بھولا نہیں بلکہ اب بھی اُنہیں اس زمانے کے زیادہ تر ہم جماعتوں اور اساتذہ کے نام یاد ہیں جن کا اِس موقع پر آپ نے خصوصی ذکر کیا ہے۔ یہاں مصنف نے کچھ یادیں اور باتیں تفصیل سے قلمبند کی ہیں۔ گیلانی صاحب نے بتایا ہے کہ وہ کافی شرارتی لڑکے تھے۔ اساتذہ اور والدین اُن کی شرارتوں سے تنگ تھے بلکہ بعض اوقات تو وہ اپنی شرارتوں سے خود یا دوسروں کا نقصان بھی کر لیتے تھے:

"میں ایک دِن اِسی گھر کے باہر بندر کا تماشا دیکھنے میں محو تھا کہ ہمارے گھر کے
گارڈز مجھے اندر لے جانے کے لیے لپکے تو میں بھاگ کھڑا ہوا۔ آگے لوہے کی خاردار
باڑ تھی جو مجھے بھاگتے ہوئے نظر نہ آئی اور میں اُس پر گر پڑا جس سے میرے سر پر
چوٹیں آئیں اور خون بہنے لگا۔ مجھے فوری طور پر مرہم پٹی کے لیے ہسپتال لے جایا
گیا۔ میرے سر پر کئی ٹانکے لگے جن کے نشانات اب بھی موجود ہیں۔" (۶۰)

یوسف رضا گیلانی نے لکھا ہے کہ "ولایت حسین اسلامیہ کالج ملتان" سے آپ نے ایف ایس سی کی سند حاصل کی تاہم وہ بہت کم نمبروں سے میڈیکل کالج میں داخل ہونے سے رِہ گئے۔ اُن دِنوں جاگیرداروں اور قومی اسمبلی یا صوبائی اسمبلی کے ممبروں کے بچوں کے لیے میڈیکل کالجوں میں خصوصی نشستیں ہوا کرتیں تھیں تاہم آپ کے والد نے اپنا یہ حق استعمال کرنے سے یہ کہتے ہوئے انکار کیا کہ اگر ایک لڑکا خود میرٹ پر کسی پروفیشنل کالج نہیں جا سکے اور کوٹے سے داخل کیا جائے تو یہ اُن کے ساتھ اور عام لوگوں کے ساتھ بڑی زیادتی ہے۔ گیلانی صاحب نے بتایا ہے کہ اُن کا تعلق کالج کے ذہین اور پڑھاکو طلبا میں ہوتا تھا۔ اِس کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں بی اے میں داخلہ لیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور اور پنجاب یونیورسٹی میں گزارہ گیا وقت اُن کی زندگی کا یادگار زمانہ ہے۔ یہ گیلانی صاحب کی زندگی میں بڑی بے فکری اور عیش کے دِن تھے۔ آپ نے اُس زمانے کی خاص خاص باتیں تحریر کی ہیں مثلاً یہ کہ وہ ریل کے ذریعے لاہور سے ملتان جاتے جو اُن کے لیے بڑا خوشگوار تجربہ تھا، اپنے والدین، رشتہ داروں اور دوستوں کو خطوط بھجواتے جس سے اُنہیں عجیب ذہنی مسرت

حاصل ہوتی۔ گورنمنٹ کالج ایک اقامتی ادارہ تھا جس میں ہاسٹل کے قوانین بڑے سخت تھے۔ طلبا کو پڑھنے کے لئے چند گھنٹے مخصوص تھے جن کی سختی سے پابندی کرنی پڑتی تھی اور اپنے کمروں کی صفائی خود کرنی پڑتی تھی۔ مصنف نے لاہور کی یادیں اور باتیں ذہن کی پٹاری سے نکال کر صفحۂ قرطاس پر بکھیر دی ہیں۔ نیز آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ اکثر لاڈلے امیر زادوں کی طرح آپ نے بھی اُس زمانے میں مہنگے شوق پالے تھے جیسے کہ ہل سٹیشن پر جانا، نئی نئی ریس گاڑیاں لینا، تیز ڈرائیونگ کرنا، دوستوں کے ساتھ پکنک منانا اور موسیقی کے پروگرام کرنا۔ اپنے ان مشاغل کو یاد کر کے لکھتے ہیں:

''مری میں ہمارا گھر مین روڈ سے کافی گہرائی میں تھا۔ چڑھائی اِتنی زیادہ تھی کہ بارش میں گھر تک کار میں اُترنا یا بھوکے پیٹ مین روڈ تک چڑھنا خاصا دُشوار ہوتا تھا۔ مری میں ہم بچوں کا پسندیدہ مشغلہ اپنی یا مہمانوں کی کار کو مین روڈ تک لے جانا اور پھر واپس لانا ہوتا تھا۔ ہر بچہ اپنی کار اور اس کی انجن کی طاقت پر ناز کرتا تھا۔ ہمارے پاس ایک امریکن کار پلی متھ تھی۔ میں اِس کار کو فُل ریس دے کر کلچ چھوڑتا تو وہ ٹائروں سے دُھواں نکالتی، پتھروں پر سیاہ لائن چھوڑتی ہوئی گولی کی طرح تیزی سے اُونچائی پر چڑھ جاتی تھی۔''(۶۱)

بی۔ اے کرنے کے بعد یوسف رضا گیلانی نے پنجاب یونیورسٹی کے ایم اے صحافت میں داخلہ لیا۔ پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ صحافت اور ابلاغیات میں اُن دِنوں نامور اساتذہ تھے۔ اِن سے گیلانی نے فیض حاصل کیا۔ چنانچہ یونیورسٹی اساتذہ کا ذکر گیلانی صاحب بہت عقیدت اور احترام سے کرتے ہیں:

''شعبہ صحافت میں میرے اساتذہ میں محترم پروفیسر وارث میر، محترم مسکین علی حجازی، محترم فاروق نثار اور محترم ڈاکٹر عبدالسلام خورشید شامل تھے۔ یہ تمام اساتذہ نہایت ہی بُردبار، وضعدار اور علم کی روشنی سے منور اپنے اپنے شعبے میں مکمل مہارت رکھتے تھے۔ جب میں ایم اے صحافت کا طالب علم تھا تو میری مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سے اپنے خالو پیر صاحب پگاڑو کے ہمراہ کئی بار منصورہ میں ملاقات ہوئی تھی۔ اُن دِنوں پی این اے کی تحریک چل رہی تھی۔ وہ کم گو اور شیرین شخص تھے۔''(۶۲)

اُن دِنوں یوسف رضا گیلانی نے فرانسیسی زبان سیکھنے کے لیے شام کی کلاسز میں داخلہ لیا۔ یہ زبان اُنہیں فارسی اور سرائیکی کی طرح نفیس اور میٹھی لگتی تھی۔ اِس موقع پر گیلانی صاحب نے ایک فرانسیسی اُستانی کے حوالے سے کہا ہے کہ

تعجب کی بات یہ ہے کہ لوگ فرانسیسی جانے بغیر اپنے جذبات کا اظہار کیسے کرتے ہیں۔۱۹۷۸ء کو اُن کے والد کا انتقال ہوا اور ۱۹۷۹ء کو اُن کی شادی ہوئی۔ گیلانی صاحب نے یونیورسٹی کے زمانے اور شادی کے ابتدائی دِنوں کے حالات و واقعات تفصیل سے بیان کیے ہیں۔آپ کو یہ بھی یاد ہے کہ آپ کی شادی کے ولیمے میں کن کن لوگوں نے شرکت کی تھی۔لاہور میں زمانہ طالب علمی میں گزارہ گیا وقت اُن کی زندگی کا قیمتی سرمایہ ہے۔لاہور کی یادیں آج بھی اُن کے ذہن کو معطر کیے ہوئے ہیں۔اُنہیں لاہور کے بارے میں شبنم شکیل کا یہ شعر اکثر یاد آتا ہے:

"لاہور پیچھے رِہ گیا ہم باوفا مگر
اِس شہر بے مثال سے آگے نہیں گئے" (۶۳)

یوسف رضا گیلانی کا خاندان اگرچہ ایک طویل روحانی، صوفی اور پیری مریدی کا پس منظر رکھنے والا خاندان ہے تاہم اُن کے دادا پیر صدر الدین کے زمانے سے سیاست میں اِس خاندان کی آمد ہوئی۔اب گیلانی خاندان سیاسی حوالے سے پہچانا جاتا ہے۔"چاہ یوسف سے صدا" میں یوسف رضا گیلانی نے جو سیاسی سر گزشت سنائی ہے اس کے چیدہ چیدہ واقعات، حادثات، اعترافات، اور انکشافات نیچے درج کرتے ہیں۔

ا۔ یوسف رضا گیلانی اپنے والد کی وفات کے بعد ۱۹۷۹ء کو سیاست میں آئے اور پاکستان مسلم لیگ سے اپنی سیاست کا آغاز کیا۔(۶۴)۔وہ ۱۹۸۳ء کے بلدیاتی انتخابات میں پہلی بار اقتدار میں آئے جب ضلع کونسل ملتان کا الیکشن لڑا اور کامیاب ہوئے۔یہ ایک تاریخی الیکشن تھا جس میں ضلع ملتان کے بلدیاتی انتخابات میں حصہ لینے والے ملک کے چوٹی کے تین سیاسی رہنما اُٹھے یعنی جاوید ہاشمی، شاہ محمود قریشی اور یوسف رضا گیلانی۔تینوں بعد میں ملکی سیاست کے چمکتے ستارے بنے۔اِس زمانے میں یوسف رضا گیلانی نے محمد نواز شریف سے مل کر ضیاء الحق کے لیے صدارتی ریفرنڈم کی مہم چلائی جس کا اپنی آپ بیتی میں بہت فخر سے ذکر کیا ہے۔وہ یہ لکھتے ہوئے ذرا ندامت محسوس نہیں کرتے کہ بطور ایک سیاستدان اور جمہوریت کے علمبردار یہ اُن کی زندگی کا شرمناک واقعہ تھا۔ یوسف رضا گیلانی نے اپنی سر گزشت میں اپنے اِس ابتدائی سیاسی دَور کے مجادلے، مناظرے، مقابلے تفصیل سے بیان کیے ہیں اور اپنی سیاسی کامیابیوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے۔شرافت، مدھم لہجہ، مزاج کا ٹھہراؤ اور غیر جذباتی انداز گیلانی کی شخصیت کے نمایاں پہلو ہیں۔یہ تمام خصوصیات اُن کی تحریر میں بھی آسانی سے تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ گیلانی نے اپنے سیاسی حریفوں سید فخر امام، شاہ محمود قریشی، جاوید ہاشمی اور دیگر کا ذکر نہایت احترام اور عزت سے کیا ہے حتیٰ کہ اپنے کٹر سیاسی مخالف نواز شریف کو بھی انتہائی احترام سے یاد کرتا ہے اور اُن کے حق میں کلمہ خیر کہتا ہے۔یہ دراصل یوسف رضا گیلانی کے صلح کل طبیعت، شرافت اور خاندانی وقار کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

یوسف رضا گیلانی نے بتایا ہے کہ جب وہ پہلی مرتبہ عملی سیاست میں آیا تو اُس نے بلدیاتی انتخابات میں بیک وقت تین حلقوں سے انتخابات لڑنے کا فیصلہ کیا۔ اِس موقع پر آپ نے تسلیم کیا ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی روزمرہ چیزوں سے شگون اور فال بھی نکالتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

> ''میں نے ضلع کونسل ملتان کی نشست جو کہ تین یونین کونسل شیر شاہ، حامد پور اور کھوکھر پر مشتمل تھی، سے انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ اِس دوران میری ملاقات چچا حامد رضا سے ہوئی۔ اِس ملاقات کے دوران اُن کے پرانے گھر ''الرضا'' میں اچانک چھت کا پنکھا گرنے سے اُن کے دفتر کی میز کا شیشہ ٹوٹ گیا۔ پنکھے کے پَر بکھر گئے اور ہم بال بال بچ گئے۔ چچا نے کہا کہ شیشہ ٹوٹنا نیک شگون ہے لہٰذا آپ انتخابات جیت جائیں گے۔ پھر ایسا ہی ہوا۔ میں تینوں نشستوں سے کامیاب ہوا۔ بلدیاتی الیکشن کی اِس کامیابی سے مجھے جو خوشی حاصل ہوئی وہ بعد میں بڑے بڑے انتخابی معرکے سر کرنے سے بھی نہ مل سکی۔''(۶۵)

۲۔ ضیاء الحق نے ۱۹۸۵ء کو ملک میں غیر جماعتی انتخابات کرانے کا اعلان کر دیا۔ یوسف رضا گیلانی نے پہلی مرتبہ اِس الیکشن میں لودھراں سے حصہ لیا اور قومی اسمبلی کے رُکن منتخب ہوئے۔ اِس لحاظ سے یوسف رضا گیلانی ملک کے سنیئر ترین پارلیمنٹرین میں سے ہیں۔ ۱۹۸۵ء کے عام انتخابات میں بننے والی اسمبلی میں سندھ سے تعلق رکھنے والے محمد خان جونیجو کو وزیراعظم بنایا گیا اور یوسف رضا گیلانی وفاقی وزیر ریلوے بن گئے۔ مصنف نے اپنی آپ بیتی میں اِس عرصے میں اپنی وزارت کی کارکردگی، وفاقی کابینہ پر صدر کا دباؤ، جونیجو مرحوم کی شرافت اور دیگر معاملات پر کھل کر اظہار خیال کیا ہے۔ محمد خان جونیجو نے وزارت عظمیٰ کا حلف اُٹھانے کے فوراً بعد ایوان میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''جمہوریت اور مارشل لاء ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے''۔ اُس نے اِس بیان سے جرنیلوں کے ذہنوں میں خطرے کی پہلی گھنٹی بجائی تھی۔ آپ چونکہ پہلی مرتبہ اقتدار کے ایوانوں میں آئے تھے اِس لیے اُنہیں معلوم ہو گیا کہ ریاستی ادارے اور خفیہ طاقتیں کس طرح حکومتیں بلیک میل کرتی ہیں۔ خوشامدیں، چاپلوسیاں، سازشیں، رقابتیں اور ریشہ دوانیوں نے کیونکر سارے سیاسی نظام کو یرغمال بنایا ہوا ہے۔ آپ کو پہلی مرتبہ اِس بات کا بھی تجربہ ہوا کہ بیوروکریسی خصوصاً سیکرٹری، ایڈیشنل سیکرٹری اور چیف سیکرٹری نئے بننے والے وزراء کو کیسے غلط راہ پر ڈالتے ہیں۔ جب وزراء کو اپنے محکمے کی سمجھ آتی ہے تب تک یا تو اسمبلی ٹوٹ چکی ہوتی ہیں یا وزرائے اعظم اپنی کابینہ میں اُکھاڑ پچھاڑ کر چکے ہوتے ہیں۔

اوجڑی کیمپ کا حادثہ ایک اندوہناک حادثہ تھا جس میں ہزاروں لوگ لقمہ اجل بنے۔ جڑواں شہروں یعنی اسلام آباد اور راولپنڈی پر سارا دِن مارٹر گولے اور میزائل گرتے رہے۔ اب تک ہم نے جتنی سیاسی آپ بیتیاں پڑھیں تقریباً سب نے اپنے اپنے طور پر اِس حادثے پر ضرور اظہارِ خیال کیا ہے۔ گیلانی صاحب بھی اِس واقعے کے عینی شاہد ہیں لیکن اُس نے اِس حادثے پر ایک اور زاویے سے روشنی ڈالی ہے۔ اُن کا تجزیہ یہ ہے کہ یہی واقعہ محمد خان جونیجو کی حکومت اور جنرل ضیاء الحق کی موت کا سبب بنا۔ حکومت نے اِس واقعے کی تحقیقات کے لیے دو کمیٹیاں بنائیں۔ ایک فوجی اور دوسرا سویلین۔ فوجی کمیٹی نے جنرل اختر عبدالرحمٰن اور دیگر سنیئر فوجی سربراہوں کی کورٹ مارشل کی تجویز پیش کی جبکہ سویلین کمیٹی جس کے سربراہ اسلم خٹک تھے نے جو نتیجہ نکالا وہ بڑا مضحکہ خیز تھا۔ یوسف رضا گیلانی صاحب کے الفاظ میں سنیے :

''کوئی ذمہ دار نہیں تھا یہ اللہ کی طرف سے ہوا ہے۔''(٦٦)

۳۔ یوسف رضا گیلانی نے ۱۹۸۷ء میں بے نظیر بھٹو سے ملاقات کر کے پاکستان پیپلز پارٹی میں باقاعدہ شمولیت اختیار کی اور پھر اِس پارٹی کے ہو کے رہے۔ ۱۹۸۸ء کے عام انتخابات میں آپ نے آئی جے آئی کے سربراہ نواز شریف کو ملتان سے شکست دے کر ممبر قومی اسمبلی کا اعزاز حاصل کر لیا۔ یوسف رضا گیلانی کا تعلق اگرچہ پیپلز پارٹی سے ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ تقریباً تمام پارٹیوں کے سرکردہ رہنماؤں سے اُن کے ذاتی تعلقات ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی پارٹی کا جب بھی دیگر پارٹیوں کے ساتھ معاملات طے کرنے ہوتے ہیں گیلانی کو مصالحت کے لیے بھیجا جاتا ہے۔ اکثر موقعوں پر نواز بے نظیر صلح نامے میں آپ ہی دونوں طرف سے ضامن مقرر ہوئے۔

یوسف رضا گیلانی کی خودنوشت میں ایک بڑی خامی یہ ہے کہ وہ جب واقعہ سناتے ہیں تو ابھی ایک واقعہ پورا نہیں ہوتا کہ دوسرا شروع کر دیتے ہیں۔ کبھی کبھی تو کئی واقعات آپس میں عجیب طرح سے گڈمڈ کر جاتا ہے جس سے نہ صرف قصے کی روانی متاثر ہوتی ہے بلکہ ابلاغ پر بھی آنچ آتا ہے۔ یہ اِس آپ بیتی کی ایک بڑی خامی ہے۔ گیلانی صاحب نے انکشاف کیا ہے کہ انتخابات سے پہلے پارٹی ٹکٹ دینے کے دوران پارٹی رہنما میرٹ، لیاقت، قابلیت کو مد نظر نہیں رکھتے بلکہ یہاں بھی رشوت اور سفارشیں چلتی ہیں۔ آپ نے اِس بات کا بھی برملا اظہار کیا ہے کہ لوگ انتخابات کے موقع پر پارٹی ٹکٹ کے حصول کے لیے اپنی عزت، شرافت اور وقار سب کچھ قربان کر لیتے ہیں (سیاسی پارٹیوں میں آج بھی انتخابات کے لیے پارٹی ٹکٹ دینے کا کوئی اُصول نہیں)۔ یوسف رضا گیلانی اپنا آنکھوں دیکھا حال یوں لکھتے ہیں :

''عام انتخابات کے موقع پر محترمہ نے مجھے کراچی مدعو کیا۔ جب میں ۷۰ کلفٹن کے گیٹ پر پہنچا تو وہاں پارٹی ٹکٹ کے خواہش مند افراد کا جم غفیر تھا۔ یہ لوگ صبح سے یہاں کھڑے تھے کہ کس طرح اُنہیں پارٹی ٹکٹ مل سکے۔''(٦٧)

۴۔ یوسف رضا گیلانی نے اپنی آپ بیتی میں کھل کر یہ اعتراف کیا ہے کہ بڑی سیاسی پارٹیوں کے اندر حسد، بُغض، سازشوں کا بازار گرم رہتا ہے اور اگر کوئی سیاستدان پارٹی صدر کے قریب جانا چاہے تو دوسرے اُس کی ٹانگ کھینچتے ہیں۔ آپس کی چپقلش اور ناراضگیوں سے پارٹی صدور بھی سخت مضطرب رہتے ہیں۔ ہمارے ملک میں جو سیاسی پارٹی جتنی بڑی ہوگی اُتنی ہی وہ اندرونی طور پر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگی۔(۶۸) آج کل تو میڈیا کی آزادی کا دَور دورہ ہے۔اب سوشل میڈیا نے اِس قسم کے راز طشت از بام کر دیے ہیں تاہم اُس وقت اِس قسم کی باتیں لوگوں کے لیے حیرانی اور تعجب کا باعث ہوتی تھیں۔

یوسف رضا گیلانی نے اِس بات کا بھی انکشاف کیا ہے کہ کیسے فوج اور دیگر انٹلی جنس ایجنسیاں ہمارے ملک میں حکومتیں بناتی اور بگاڑتی ہیں۔ اگرچہ فوج ہمیشہ اِس بات سے انکار کرتی آئی ہے تاہم معاصر سیاسی آپ بیتیاں اُن کا دعویٰ ردّ کر کے اور اپنے چشم کشا واقعات بیان کر کے اپنے دعوے کا ثبوت مہیا کرتی ہیں۔ ملک میں خفیہ ایجنسیاں کیسے اور کیونکر حکومتیں بناتی اور بگاڑتی ہیں۔ گیلانی صاحب کے الفاظ میں ملاحظہ کیجئے:

> ”۱۹۹۰ء میں جب بے نظیر بھٹو کی حکومت تھی مجھے ایک تقریب میں آئی ایس آئی کے سربراہ لیفٹیننٹ جنرل حمید گل ایک طرف لے گئے اور کہا کہ آپ کو مسلم لیگ نہیں چھوڑنی چاہیئے تھی کیونکہ ہم آپ کو وزیر اعلیٰ پنجاب بنانے کا سوچ رہے تھے مگر آپ نے جلد بازی کی اور پیپلز پارٹی میں شامل ہوگئے۔ اُنہوں نے مزید کہا کہ آپ کی حکومت پر بدعنوانی کے کئی الزامات ہیں۔آپ کے بُرے دِن آنے والے ہیں۔“(۶۹)

سیاست بڑا عجیب کھیل ہے۔ بعض اوقات خونی رشتے بھی سیاست کے بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ چچا، بھانجے، بھتیجے، بھائی اور باپ بیٹے میں اِتنی دُوری آجاتی ہے کہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں۔ گیلانی نے اعتراف کیا ہے کہ انھیں اپنے حقیقی چچا ”سید رضا گیلانی“، جس نے اُنہیں اپنے بیٹوں کی طرح پالا تھا سے ایسی ناراضگی ہوگئی کہ دونوں نے مختلف سیاسی پارٹیوں سے ایک دوسرے کے خلاف الیکشن لڑا۔اِس طرح اُن کے سسر مخالف پارٹی کے ساتھ مل گئے اور اُنہیں زک پہنچائی۔ مدت گزرنے کے بعد دونوں قریب ترین رشتہ داروں کے ساتھ گیلانی کے تعلقات اُس طرح نہیں جو پہلے کبھی تھے بلکہ تناؤ اور تلخی کو آج بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔اس سے بڑی کمبختی اور کیا ہو سکتی ہے۔ یوسف رضا گیلانی نے اِس کے لیے یہ فقرہ استعمال کر کے جان چھڑانے کی کوشش کی ہے:

''گندا ہے پَر دھندا ہے''۔(۷۰)

۵۔ آپ کو بے نظیر بھٹو کے دوسرے دَور حکومت میں قومی اسمبلی کا سپیکر بنایا گیا جو آپ کے لیے ایک بڑا اعزاز تھا۔ اکثر قومی اسمبلی کا سپیکر ایک ایسے شخص کو بنایا جاتا ہے جو غیر متنازعہ، سنجیدہ اور بُرد بار ہو۔ ایوان کو کامیابی سے چلا سکتا ہو اور ہر کسی کے لیے قابل قبول ہو۔ سینٹ اور قومی اسمبلی کے سپیکر کو بیک وقت دو دھاری تلوار پر چلنا پڑتا ہے کیونکہ اُنہیں حزب اقتدار اور حزب اختلاف دونوں کو راضی کرنا ہوتا ہے۔ اپنے سپیکر شپ کے زمانے میں گیلانی صاحب نے جو کارنامے کیے یا اُن سے جو غلطیاں سرزد ہوئیں کا برملا اظہار کیا ہے۔ اپنی پارٹی کی قائد اور اُس وقت کی وزیر اعظم بے نظیر بھٹو مرحومہ کے ساتھ اختلافات کو تفصیل سے بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''بے نظیر بھٹو نے غصیلے انداز میں جواب دیا یہ قاضی جمیل اٹارنی جنرل آف پاکستان ہیں۔ میں نے کہا میں آپ سے علیٰحدگی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ وہ اور غصہ ہوئی اور سخت لہجے میں کہا مسٹر اٹارنی جنرل میرے سپیکر کو آپ کی موجودگی پسند نہ آئی۔ وہ اُٹھ کر چلے گئے۔ اُن کے جانے کے بعد میں نے وزیر اعظم سے کہا کہ میں آپ کی وزراء کی مشاورت سے اپنی رولنگ دے چکا ہوں جس کا بدلنا میرے بس میں نہیں۔ آپ مہربانی فرما کر میرا سپیکر قومی اسمبلی کے عہدے سے استعفیٰ منظور کر لیں۔ میں پارٹی کے ایک ادنیٰ کارکن کی حیثیت سے کام کرتا رہوں گا۔ اِس پر وہ نرم پڑ گئیں اور کہا یوسف! آپ میرے بھائی ہیں۔ میں پہلے ہی مشکلات میں ہوں۔ آپ مہربانی فرما کر استعفیٰ کی باتیں نہ کریں۔''(۷۱)

اِس موقع پر یوسف رضا گیلانی نے میر مرتضیٰ بھٹو اور بے نظیر بھٹو کے اختلافات کو بھی بین السطور بیان کیا ہے۔ یہاں پر آپ بیتی نویس نے اخفا اور مصلحت سے کام لیا ہے۔ اُنہیں کھل کر اس عنوان پر لب کشائی کرنی چاہیئے تھی۔

۱۹۸۸ء سے ۲۰۰۸ء تک ملک میں جتنی حکومتیں بنیں وہ حقیقی معنوں میں آزاد اور خود مختار نہیں تھیں۔ ایک اَن دیکھا خوف اور جبر اُن کے سروں پر مسلط رہا۔ ملک کے کئی اہم ادارے اُنہیں کام کرنے کے لیے اور آزادانہ پالیسیاں تشکیل دینے کا موقع فراہم نہیں کر رہی تھیں۔ اِس بارے میں یوسف رضا گیلانی نے بھی اظہار خیال کیا ہے بلکہ اِتنا تک کہا ہے کہ اِس پورے عرصے میں وزیر اعظم، قائد حزب اختلاف، چیف جسٹس، اٹارنی جنرل اور سپیکر کے فون ٹیپ کیے جاتے تھے۔

۶۔ یوسف رضا گیلانی کو ۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں قومی اسمبلی کی نسشت پر پہلی مرتبہ شکست ہوئی۔ اِن انتخابات

میں پنجاب سے پیپلز پارٹی کو ایک نشست بھی نہ مل سکی۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فوج اور سول اسٹبلشمنٹ بے نظیر سے خوش نہیں تھے اور وہ نواز شریف کو آخری بار بھاری اکثریت دینا چاہتی تھی۔ یہاں مصنف نے یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ خفیہ طاقتوں کے ساتھ نواز شریف نے وعدہ کیا تھا کہ برسرِ اقتدار آکر وہ عمران خان کو مرکز اور صوبہ پنجاب میں کچھ وزارتیں دے گی تاہم بھاری اکثریت سے کامیاب ہونے کے بعد اُس نے یہ وعدہ پس پشت ڈال دیا۔(۷۲)

۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں پاکستان پیپلز پارٹی کی شکست فاش کے اسباب گیلانی نے بڑی صداقت سے قلمبند کیے ہیں:

"۱۔ پیپلز پارٹی کے اپنے ہی صدر کے ہاتھوں حکومت کی برطرفی کا عوام میں بڑا غلط تاثر پیدا ہوا۔
۲۔ میر مرتضیٰ بھٹو کے قتل سے پیپلز پارٹی سے سندھ کارڈ چھین چکا تھا۔
۳۔ پارٹی کی حکومت اُس وقت برطرف کی گئی جب اس کا گراف بہت گر چکا تھا۔
۴۔ ہماری پارٹی کے خلاف الیکٹرانک اور سرکاری وسائل کا بے دریغ استعمال کیا گیا۔
۵۔ انتخابات سے قبل نیشنل سیکورٹی کونسل کے قیام کا اعلان پیپلز پارٹی کے لیے نقصان دِہ ثابت ہوا۔"(۷۳)

۷۔ ۱۹۹۸ء میں مسلم لیگ "ن" کی حکومت ختم ہوئی اور پرویز مشرف برسر اقتدار آئے۔ تقریباً تمام سیاسی رہنماؤں کو مختلف بہانوں سے پکڑ کر جیلوں میں ڈالا گیا۔ نیب یعنی قومی احتساب بیورو کا ادارہ عمل میں لایا گیا جس نے چُن چُن کر سیاستدانوں کو اندر کیا۔ چنانچہ ۱۰ فروری ۲۰۰۱ء کو یوسف رضا گیلانی کو بھی نیب نے لوگوں کو غیر قانونی نوکریاں دینے کے جرم میں گرفتار کیا۔ اُنہیں چار سال تک ملک کے مختلف جیلوں میں رکھا گیا۔ اِس پورے عرصے میں گیلانی نے صبر، استقامت اور پامردی سے تمام سختیوں کا مقابلہ کیا۔ حکومت تمام سیاسی پارٹیوں سے لوگ توڑ کر مسلم لیگ "ق" کے نام سے ایک نئی سیاسی جماعت بنا رہی تھی۔ آپ نے اعتراف کیا ہے کہ اِس سلسلے میں کئی بریگیڈیئر اور جنرل آپ سے جیل میں ملاقات کے لیے آئے اور اُنہیں مشرف کا خصوصی پیغام پہنچایا کہ مشرف کے ساتھ شامل ہو کر اُنہیں کئی اہم وزارتیں دیے جا سکتے ہیں بصورتِ دیگر زندان ہی اُس کا مقدر رہے گا۔ گیلانی نے دوسرے راستے کا انتخاب کیا اور اپنی پارٹی قائد، عوام اور

سیاسی تاریخ میں سرخرو ٹھہرے۔آپ نے یہ بھی لکھاہے کہ نیب نے شروع دِن سے اغوا برائے تاوان وصول کرنے والے ڈاکو کا کردار ادا کیا ہے۔آج کل " پلی بار گین " کے چرچے ہیں۔اِس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مجرم جس نے قومی وسائل کو بے دردی سے لوٹا ہو اُن سے کچھ رقم وصول کر کے اُن کا کھایا پیا معاف کر و اور اُنہیں چھوڑ دو۔یوسف رضا گیلانی نے سب سے پہلے نیب کے اِس ناروا سلوک پر احتجاج کیا تھا اور اپنی مذکورہ آپ بیتی کے توسط سے لوگوں کی توجہ اِس جانب مبذول کرائی تھی۔آپ نے تفصیل سے لکھا ہے کہ مخالف پارٹیوں خصوصاً مسلم لیگ ''ن'' میں جاوید ہاشمی اور چودھری نثار سے اُن کی گہری دوستی اور گھریلو تعلقات ہیں۔یوسف رضا گیلانی کو طویل دورانیے کے لیے جیل جانے کے بعد ہمارے ملک کے جیلوں کی حالت زار کا قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔اِس موقع پر گیلانی نے جیلوں میں اصلاحات لانے کی تجاویز دی ہیں:

''طویل عرصہ پابند سلاسل رہنے کی بنا پر مجھے جیلوں کے حالات بہت قریب سے دیکھنے اور جاننے کا موقع ملا۔ جیل کرپشن میں بدنام چند محکموں میں سے ایک ہے۔ جیل میں پولیس کی بھرتی کے بعد کوئی تربیت نہیں کی جاتی۔ جیلوں میں ہر رنگ و نسل کے لوگ موجود ہوتے ہیں جن کی معاشرتی قدریں، مذہبی رجحانات، ذہنی سطح اور سوچ کے انداز مختلف ہیں۔ جیلوں میں بڑا مسئلہ گنجائش سے زیادہ اسیران کو رکھے جانے کا ہے۔ جیل میں ناقص خوراک، غیر معیاری ادویات اور ناتجربہ کار عملہ دوسرا بڑا مسئلہ ہے۔جیلوں میں اصلاحات کی سخت ضرورت ہے اور اسیران کے لیے تعلیمی ماحول کی بہتری، صحت مندانہ سرگرمیوں کا فروغ، ڈیپارٹمنٹل سٹورز، پی سی او کی تنصیب اور قانونی امداد کی فراہمی جیسے اقدامات کرنا ضروری ہیں۔''(۷۴)

حیران کن بات یہ ہے کہ بعد میں خود ملک کے وزیر اعظم بنے لیکن اُنہیں کبھی جیلوں کی اصلاحات کا خیال نہ آیا۔

۸۔ یوسف رضا گیلانی نے اپنی آپ بیتی میں غیر ممالک کے دوروں کی تفصیلات بھی بھر دی ہیں۔ بعض مقامات پر تو اپنی سرگزشت کو بیرونی دوروں سے بوجھل بنایا ہے بلکہ ایسی غیر ضروری تفصیلات دی ہیں جن کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ آپ نے اپنی آپ بیتی میں کھلے عام اعتراف کیا ہے کہ اُن کے کئی انڈین سیاستدانوں سے ذاتی مراسم ہیں جن میں شیوراج پٹیل بھی شامل ہیں:

''ہندوستان کے چوٹی کے سیاستدان شیوراج پٹیل سے میرے گہرے دوستانہ مراسم ہیں۔ جس وقت میں ۱۹۸۸ء میں وفاقی وزیر سیاحت تھا اُس وقت ہندوستان

میں شیو راج پٹیل بھی وفاقی وزیر سیاحت اور سول ایوی ایشن تھے۔ جب میں ۱۹۹۳ء میں سپیکر قومی اسمبلی منتخب ہوا اُس وقت وہ سپیکر لوک سبھا تھے۔ چند دِن پہلے ہی وہ ہمارے مشترکہ دوست جلیل عباس سے ملے اور میرے بارے میں دریافت کیا۔ میرے جیل میں ہونے کا سن کر وہ بہت حیران ہوئے۔ اُنہوں نے جلیل عباس سے کہا کہ کچھ عرصہ پہلے میں بھی جیل میں رہ چکا ہوں۔ میرا سیاسی کیریئر یوسف رضا گیلانی کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔"(۷۵)

یوسف رضا گیلانی نے سیاسی موضوعات سے ہٹ کر غیر سیاسی، سماجی، معاشرتی اور دیگر عنوانات پر جو خامہ فرسائی کی ہے وہ بھی ان کی آپ بیتی کا ایک اہم باب ہے۔

۱۔ اِس خودنوشت کو پڑھنے کے بعد معلوم ہو جاتا ہے کہ یوسف رضا گیلانی کافی توہم پرست، وہمی اور جادو ٹوٹکوں پر اندھا یقین رکھنے والے آدمی ہیں۔ کوئی منصوبہ شروع کرنے سے پہلے فال نکالتے ہیں، استخارہ کرتے ہیں بلکہ صبح گھر سے باہر نکلنے سے پہلے نیک شگون یا بد شگونی کے واسطے مختلف قسم کے اعمال وغیرہ کرتے ہیں۔ صرف گیلانی صاحب نہیں گھر کے اکثر افراد اس قسم کے توہمات کا شکار ہیں۔ جدید تعلیم یافتہ اور آزاد خیال طبقے میں اُٹھنے بیٹھنے والے یوسف رضا گیلانی کا اِس قسم کے عقائد رکھنا باعث تعجب ہے۔ ذیل کے واقعے سے اُن کے اعتقاد کا اندازہ ہو جاتا ہے:

"جن دِنوں میرا مقابلہ چچا حامد رضا کے ساتھ ہو رہا تھا تو والدہ خاصی پریشان تھیں۔ ایک دِن کہنے لگیں کہ بھائی حامد رضا میرے پیر کا پوتا اور تم میرے بیٹے ہو۔ میں بہت پریشان ہوں کہ حکومت آپ کو آپس میں لڑا رہی ہے۔ میں نے دریافت کیا اب کیا کرنا چاہیئے۔ اُنہوں نے جواباً کہا کہ میں تسبیح دیکھ کر بتاتی ہوں۔ تسبیح دیکھنے کے بعد اُنہوں نے کہا کہ انتخاب تو تم جیت جاؤ گے مگر وہ بھی کچھ بن رہے ہیں۔ اُن کی بات درست ثابت ہوئی۔ انتخاب تو میں نے جیتا مگر کچھ عرصے بعد چچا سینیٹ کے رکن منتخب ہو گئے۔"(۷۶)

۲۔ یوسف رضا گیلانی وہ پہلے خودنوشت نگار ہیں جس نے سفارتکاروں اور فارن سروس کے لوگوں کی زندگیوں پر گفتگو کر کے اُن کی عیاشیوں اور شاہ خرچیوں کی داستانیں بیان کی ہیں۔ آپ نے یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ سفارتی عملے کے اکثر لوگ بیرون ممالک میں خفیہ شادیاں رَچاتے ہیں۔ حکومت پاکستان نے سفارتکاروں پر غیر ملکی عورتوں سے شادیاں

کرنے پر پابندی لگائی تھی تاکہ غیر ممالک اِس واسطے سے قومی راز اور اہم خفیہ ریکارڈوں تک رسائی حاصل نہ کر سکیں۔ گیلانی نے یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ بطورِ سپیکر قومی اسمبلی اُن کی بے نظیر بھٹو پر مسلسل اِس حوالے سے دباؤ ڈالنے کے بعد اُن کی حکومت نے یہ قانون پاس کیا کہ سفارتخانے کا عملہ غیر ملکی عورتوں سے شادیاں کر سکتے ہیں۔اِس کے بعد بڑی تعداد میں نئی اور پرانی شادیاں منظر عام پر آگئیں۔(۷۷)

۳۔ پاکستان سے عموماً لوگ سرکاری دوروں پر باہر ممالک جاتے رہتے ہیں۔ وفاقی وزراءاور وزرائے اعظم سینکڑوں لوگوں کے قافلے کے ساتھ سرکار کے پیسوں پر بیرونی دورے کرتے ہیں۔ یہ سرکاری وفود بیرون ملک پاکستان کا امیج بُری طرح خراب کر رہے ہیں۔ ہوٹلوں سے چیزیں چراتے ہیں، کلبوں میں ہنگامے کرتے ہیں اور میزبان ممالک کے قوانین کو پامال کرتے ہیں۔جواباً انہیں کس طرح ذلیل کیا جاتا ہے گیلانی صاحب اپنی رام کہانی یوں سناتے ہیں:

> ''ہمارا وفد پہلے نائیجیریا گیا جہاں ہمیں ایک ہوٹل میں ٹھہرایا گیا۔ میں صبح سویرے باتھ روم میں شیو کر رہا تھا کہ اچانک ہوٹل انتظامیہ کا ایک آدمی دروازہ توڑ کر کمرے میں داخل ہوا۔ میں نے اُس سے دریافت کیا کہ آپ کو دروازہ توڑنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟آپ کو دروازہ کھٹکھٹانا چاہیئے تھا۔ اُس نے کہا میں کمرے کی اشیاءچیک کرنا چاہتا ہوں کہ کیا ہر چیز اپنی جگہ پر موجود بھی ہے یا نہیں۔اُس نے مزید کہا کہ میں آپ کے کمرے سے دوسرے کمرے میں جانا چاہتا ہوں۔ اُس کمرے میں گوہر ایوب اور اُن کی اہلیہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں نے اُنہیں وہاں جانے سے روکا۔وہ بڑی مشکل سے قائل ہوا۔''(۷۸)

۴۔ ادب، فن اور آرٹ کی نہ تو سرحدیں ہوتی ہیں اور نہ اِسے سرحدوں میں مقید کیا جا سکتا ہے۔ہندوستان اور پاکستان دو الگ الگ ملک ہیں۔ دونوں ممالک میں ہر وقت تناؤ اور کشیدگی کی صورتحال رہتی ہے۔اِتنا عرصہ دشمنی کی فضا نے دونوں ممالک کے عوام کو بھی ایک دوسرے سے پَرے دھکیلا ہے تاہم ادب اور فن وہ میدان ہے جہاں دونوں ممالک کے عوام کا آپس میں ملاپ، یگانگت اور قربت قائم ہے۔ یہاں فاصلے مٹ جاتے ہیں اور دوریاں ختم ہو کر لوگ ایک بندھن میں بندھ جاتے ہیں جو محبت کا بندھن ہے۔ پیار کا بندھن ہے، امن کا بندھن ہے اور آرٹ کا بندھن ہے۔ سرحد کے اِس طرف کے لوگ وہاں کی موسیقی، مصوری اور شاعری میں دلچسپی لیتے ہیں اور سرحد کے اُس طرف کے لوگوں میں یہاں کے آرٹ میں کشش نظر آتی ہے۔ چنانچہ گیلانی صاحب لکھتے ہیں کہ جب ۱۹۸۹ء کو راجیو گاندھی پاکستان تشریف لائے تو خاص طور پر

میڈم نور جہاں سے فیض احمد فیض کی ایک نظم سننے کی خواہش ظاہر کی:

"صدر غلام اسحاق خان نے راجیو گاندھی کے اعزاز میں ایوان صدر میں عشائیہ دیا۔ عشائیے کے دوران وزیر اعظم نے مجھے چٹ بھجوائی کہ راجیو گاندھی میڈم نور جہاں سے فیض احمد فیض کی ایک نظم، مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ سننا چاہتے ہیں۔ میڈم نور جہان اور میں ایک ہی میز پر بیٹھے ہوئے تھے۔ جب میں نے اُن سے گانے کی فرمائش کی تو وہ مجھ سے خفا ہو گئیں کہ آپ نے مجھے گانے کا پہلے کیوں نہیں بتایا۔ ساز کے بغیر گانا کتنا مشکل ہے۔ بالآخر میں نے اُنہیں رضا مند کیا اور اُنہوں نے وہ نظم سنائی جسے راجیو گاندھی نے محو ہو کر سنا۔"(۷۹)

۵۔ محترمہ بے نظیر بھٹو اپنے والد ذوالفقار علی بھٹو کی وفات پر اپنی پارٹی کی صدر بنیں۔ آپ نے بڑی مشکل وقت میں پارٹی کو متحد کیا۔ تمام اندرونی اور بیرونی مخالفتوں کا تن تنہا مقابلہ کیا۔ وہ بیک وقت کئی محاذوں پر لڑ رہی تھیں۔ مردوں کے غالب اکثریت والے معاشرے میں اُس نے وہ کامیابیاں حاصل کیں جن کا تصور بھی کوئی نہیں کر سکتا۔ وہ بڑی ہمت اور استقامت والی خاتون تھیں۔ یوسف رضا گیلانی کا اُن سے برسوں سے قریبی تعلق تھا۔ گیلانی نے اُنہیں بارہا خلوتوں اور جلوتوں میں دیکھا تھا۔ بظاہر فولاد سے بنی ہوئی بے نظیر بھٹو اندر سے موم کی گڑیا تھیں۔ اپنی آپ بیتی میں کئی مقامات پر مصنف نے ہمارے سامنے نرم و نازک اور دُکھی بے نظیر بھٹو کی تصویر پیش کی ہے۔(۸۰)

یوسف رضا گیلانی ہمارے سیاسی قبیلے کے ایک لکھے پڑھے سیاستدان ہیں۔ ایک ایسے وقت میں جب اَن پڑھ، نیم خواندہ اور انگوٹھا چھاپ سیاستدان اسمبلیوں میں آ کر اِس قوم کی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیتے تھے آپ گورنمنٹ کالج لاہور کے گریجویٹ اور جامعہ پنجاب سے ماسٹر کی ڈگری حاصل کرنے والے سیاستدان تھے۔ آپ نے اپنی کتاب میں جو کہانی سنائی ہے وہ سیدھی سادھی، عام فہم اور ہر قسم کی اُلجھن سے پاک ہے۔ گیلانی مشکل الفاظ سے پرہیز کرتے ہیں۔ اُن کے فقرے بالعموم چھوٹے چھوٹے اور مختصر ہوتے ہیں۔ اُن کے ہاں دقیق اور فلسفیانہ عبارت آرائی نہیں ملتی اِس لیے اُن کی تحریر میں پیچیدگی یا ابہام موجود نہیں البتہ کہیں کہیں گہرا تفکر نظر آتا ہے:

"جب ہم جیل بس میں سوار ہو کر ہسپتال میں اپنے عزیزوں کے ساتھ چند گھنٹے گزارتے تو وہ لمحے تپتے صحرا میں خوشگوار ہوا کا جھونکا معلوم ہوتے۔"(۸۱)

یا مثلاً یہ اقتباس:

> ''جیل میں پھولوں کی کیاریوں کو بڑے شوق اور محنت سے سینچتا ہوں۔ جب میرے جیل کے ساتھیوں کی فیملیز ملاقات کے لیے آتی ہیں تو اُن کے لیے پھولوں کا تحفہ اِسی باغیچے سے لے کر جاتے ہیں اور یوں جیل کے ملاقاتوں میں پھولوں اور محبت کی مہک آتی رہتی ہے۔''(۸۲)

علاوہ ازیں یوسف رضا گیلانی نے خوبصورت اشعار یا مصرعوں سے اپنی تحریر کو خوبصورت، رواں، دلکش اور سادہ بنایا ہے۔ شعر و شاعری کے ساتھ گیلانی کا خصوصی لگاؤ ہے۔ اعلیٰ پائے کے اشعار اور کلاسیکی شعراء کی شاعری آپ کے حافظے نے قبول کی ہے جن کا وہ بر محل استعمال کر کے عبارت کی خوبصورتی اور شیرینی کو چار چاند لگا لیتے ہیں۔ مثلاً جب خود غرض اور وفاداریاں تبدیل کرنے والے سیاسی کارکنوں کی بات آتی ہے تو پکار اُٹھتے ہیں:

> ''ہم سفر چاہیے ہجوم نہیں
> اِک مسافر بھی قافلہ ہے مجھے'' (۸۳)

اِس طرح ایک موقع پر جب نیب نے اُنہیں حکومت کے کہنے پر گرفتار کیا اور اُن کے خلاف کوئی کیس نہیں بن رہا تھا تو ایک سرکاری سرکٹ ہاؤس لاہور میں چند دِن کے لیے کمرہ بک کرانے کے الزام میں گرفتار کیے گئے۔ یہاں اپنی صفائی پیش کرتے کرتے جب الفاظ اُن کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں تو بے اختیار چیخ اُٹھتے ہیں:

> ''سارے فسانے میں جس کا زکر نہ تھا
> وہ بات اُن کو بہت ناگوار گزری ہے'' (۸۴)

یوسف رضا گیلانی کی تحریر کی نمایاں خصوصیت سنجیدگی اور ظرافت کا حسین امتزاج ہے۔ اکثر موضوع سنجیدہ ہوتا ہے مگر اندازِ بیان شگفتہ اور ظریفانہ اختیار کرتے ہیں۔ ایک مغربی نقاد کا مشہور قول ہے کہ ''اسلوب میں شخصیت خود بول رہی ہوتی ہے''اِس قول کی روشنی میں ہم تجزیہ کر سکتے ہیں کہ بظاہر خاموش اور سنجیدہ لگنے والے یوسف رضا گیلانی ہنس مکھ اور حاضر جواب سیاست دان ہیں:

> ''جب میں چھٹی جماعت کا طالب تھا تو میں نے ایک مرتبہ اپنے تایا زاد بھائی شفاعت مصطفٰی کی کرسی اُس کی پشست سے اُس وقت کھینچ لی جب وہ اس پر بیٹھنے ہی والا تھا۔ وہ جیسے ہی زمین پر گرا اُس کے پیچھے قطار میں رکھی خالی کرسیاں دھڑام سے

گرتی چلی گئیں۔اِس حرکت پر مجھے خوب سزا ملی۔ کرسی کھینچنے کی اِس حرکت کو
بڑے عرصے بعد شفاعت نے میرے خلاف استعمال کیا مگر وہ سیاست کا کھیل
تھا۔"(۸۵)

ایک اور جگہ گیلانی صاحب کا طنزیہ اور مزاحیہ انداز ملاحظہ ہو جہاں سنجیدہ اور عام گفتگو کرتے کرتے بیچ میں پھلجھڑی چھوڑ دیتے ہیں۔اِس وصف سے اگر ایک طرف مصنف اپنے بیان کو مربوط بناتے ہیں تو دوسری طرف پڑھنے والوں کے مزاج کا بھی خیال رکھتے ہیں تاکہ خشک سیاسی سرگزشت پڑھتے ہوئے قاری کی دلچسپی کو برقرار رکھا جا سکے:

"شدید گرمی اور دھوپ سے بچنے کے لیے میں نے اپنے اور بیگم نصرت بھٹو کے
سر پر چھتری تان رکھی تھی۔اس حلقے سے صوبائی اسمبلی کے لیے آزاد اُمیدوار شیخ
خلیل احمد گورنر پنجاب کے چھوٹے بیٹے بھی مقابلہ کر رہے تھے۔ شیخ صاحب سے
میری دوستی تھی اِس وجہ سے اُنہوں نے عوام سے کہا کہ یوسف رضا میرے لیے
ووٹ مانگ رہے ہیں۔واضح رہے کہ اُن کا انتخابی نشان چھتری تھا۔"(۸۶)

ہنسی مزاح پیدا کرنے کے اپنے گر ہیں۔ بعض لوگ مزاحیہ واقعے سے ظرافت پیدا کرتے ہیں، بعض مزاحیہ کرداروں کے ذریعے اور بعض الفاظ کے اُلٹ پھیر سے۔ سنجیدہ اور متین گفتگو میں پہلا تکنیک زیادہ تر کامیاب رہتا ہے۔ یوسف رضا گیلانی بھی زیادہ تر پہلے اور دوسرے طریقے کا استعمال کرتے ہیں۔گیلانی کا مزاج اور مذاق سلجھا ہوا ہے جس میں بناوٹ یا جھنجھلاہٹ کا شائبہ تک نہیں۔اِس قسم کی ظرافت کا ایک نمونہ بھی ملاحظہ کیجئے:

"میں ایک مرتبہ اپنے دوستوں کے ساتھ کرن سنیما ملتان میں فلم دیکھ رہا تھا کہ
کسی نے فائر بریگیڈ کو فون کیا کہ کرن سینما میں آگ لگی ہوئی ہے۔ایمرجنسی میں
فائر بریگیڈ کا عملہ گاڑیاں لے کر آگ بجھانے پہنچ گیا۔ہال کے اندر فلم بینوں میں
کھلبلی مچ گئی۔بعد میں معلوم ہوا کہ سنیما میں فلم آگ لگی ہوئی تھی۔"(۸۷)

ہمارے معاشرے کی عورتیں اپنے خاوند کے منہ سے کسی دیگر خاتون کی خوبصورتی، ذہانت اور قابلیت کا ذکر نہیں سن سکتیں خواہ اُن کا خاوند وزیر اعظم اور صدر ہی کیوں نہ ہو جائے۔اِس سلسلے میں یوسف رضا گیلانی نے انتہائی کڑوا سچ لکھا ہے لیکن اپنے مخصوص ظریفانہ انداز میں:

"فلمی ایکٹریسوں میں، مجھے ہندوستانی ایکٹریس ایشوریا رائے پسند آئیں۔ بیگم کو

میری اِس پسند پر اعتراض تھا۔ ایک مرتبہ میں ذوالفقار علی بھٹو کی برسی کے موقع
پر لاڑکانہ میں تھا۔ مجھے رات تین بجے ڈیوٹی پر مامور چوکیدار نے جگا کر فون دیا کہ
آپ سے آپ کی اہلیہ کوئی ضروری بات کرنا چاہتی ہیں۔ میں پریشان ہو گیا مگر
میرے استفسار پر میری اہلیہ نے بتایا۔ آج خبروں میں آیا ہے کہ شوٹنگ کے دوران
ایشوریا رائے کی ٹانگ زخمی ہو گئی ہے ہم نے سوچا آپ سے افسوس کر لیں۔ یہ کہہ
کر اُس نے زور سے فون کریڈل پر پٹخ دیا۔ مجھے بے اختیار ہنسی آئی۔"(۸۸)

یوسف رضا گیلانی کا اندازِ بیان بڑا بے تکلفانہ ہے جو کچھ دل میں ہوتا ہے سپرد قلم کر دیتے ہیں۔ کبھی کبھی تو یوں محسوس ہوتا ہے گویا ایک بے تکلف دوست اپنے بے تکلف دوستوں کی صحبت میں بیٹھ کر اپنی کہانی سنا رہا ہے۔ اُن کے بیان میں کہیں بناوٹ اور تصنع نہیں جو کسی بھی کامیاب آپ بیتی کے لیے ضروری ہے۔ اِس مقام پر "چاہ یوسف سے صدا" کی ادبی قدر و منزلت بڑھ جاتی ہے۔:

"حضر حیات میرے پرائیویٹ سیکرٹری تھے۔ میں ایک مرتبہ اُن سے ناراض
ہو گیا تو وہ روٹھ کر چلے گئے۔ چند روز بعد جب مجھے وزارت ریلوے کا قلمدان
سونپ دیا گیا تو میں اُنہیں منانے کے لیے اُن کی رہائش گاہ غازی علم دین شہید
ہوسٹل اسلام آباد گیا۔ میں نے اُنہیں کہا کہ میں آج ہی ریلوے کا وفاقی وزیر بنا ہوں
اور آپ کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آیا ہوں۔ یہ سن کر وہ جذباتی ہو گئے اور
کہنے لگے کہ آپ میرے رویے سے ناراض نہ ہوا کریں کیوں کہ جب سے آپ نے
مجھے اپنا خون دیا ہے اِس وقت سے مجھے غصہ بہت آنے لگا ہے۔"(۸۹)

یوسف رضا گیلانی اکثر ایک کہانی شروع کر دیتا ہے۔ ابھی وہ ختم نہیں ہوتی کہ دوسری، کبھی کبھی کوئی تیسرا واقعہ بھی درمیان میں لاتا ہے۔ پھر آخر میں گتھی سلجھا نہیں سکتا۔ یہ وہ واحد مقام ہے جہاں اُن کا اسلوب بوجھل ہو جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ گیلانی کے دِل و دماغ میں واقعات کا بھرمار ہے جس کو بہتر طریقے سے منتخب نہیں کر سکتا۔

یوسف رضا گیلانی کی تحریر پر انگریزی زبان و ادب کے واضح اثرات ملتے ہیں۔ اُن کے تحریر میں سلیقہ، توازن، لوچ، گھلاوٹ، لطف اندوزی اور مسرت آمیزی انگریزی زبان و ادب ہی کے اثرات کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ اِس آپ بیتی کے مصنف کے طرز تحریر میں ایک قباحت یہ ہے کہ وہ انگریزی زبان کے پورے پورے جملے تحریر کرتا ہے۔ یہاں یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ سب کچھ اُن کا انگریزی ماحول میں اُٹھنے بیٹھنے کا اثر ہے یا اپنی انگریزی دانی جتانے کا؟ ذیل کے جملے لکھتے ہوئے

قوسین میں اُردو ترجمہ کرنے کی زحمت بھی گوارہ نہیں کرتے:

۱۔ "You were speaking from a high Pedestal" (آپ کی باتوں سے تکبر ظاہر ہورہا تھا)"۔(۹۰)

۲۔ "No one was responsible. It was an act of Allah" (کوئی بھی ذمہ دار نہیں تھا۔ یہ اللہ کی طرف سے ہوا)۔(۹۱)

۳۔ "With all back benefits" (سود سمیت)۔(۹۲)

جہاں مصنف غیر ملکی یا کسی دوسرے شخص کی بات یا جملہ ہو بہو دُہرا رہا ہو وہاں اصل انگریزی عبارت کی گنجائش ہو سکتی ہے لیکن اپنی تحریر میں خوامخواہ انگریزی کے الفاظ اور جملے کھپانا ذہنی پسماندگی اور احساس کمتری کی نشانی ہے۔ ہماری اردو زبان آج اِتنی تنگ دامن نہیں کہ چاہِ یوسف سے اُٹھنے والی صداؤں کو اپنی اصل احساسات اور مکمل کیفیات کے ساتھ رقم نہ کر سکے۔

اِس آپ بیتی کو پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ یوسف رضا گیلانی انگریزی میں تھوڑی بہت شاعری بھی کیا کرتے تھے۔ سیاست نے البتہ اُنہیں دیگر مشاغل سے دُور کر دیا۔ اگر وہ کوچہ سیاست میں نہ آتے تو ایک اچھے صحافی، ادیب یا شاعر ہو سکتے تھے۔ درج ذیل انگریزی قطعہ گیلانی کے ذوق اور ادبی مرتبے کا بین ثبوت ہے:

"What little life I know
Is full of colours of a rainbow
on the horizon it appears for few hours
who knows where, then it goes."

ترجمہ: ''وہ مختصر زندگی جس کا مجھے علم ہے، وہ قوس وقزاح کے رنگوں سے بھری ہوئی ہے۔ جو اُفق پر چند گھنٹوں کے لیے نمودار ہوتی ہے۔ کون جانے پھر یہ کہاں چلی جاتی ہے۔''(۹۳)

یوسف رضا گیلانی کی زبان پر سرائیکی کا غلبہ بھی دیکھائی دیتا ہے۔ وہ سرائیکی زبان کو چاروں صوبوں کا نچوڑ کہتا ہے۔ اُس کا یہ بھی تجزیہ ہے کہ سرائیکی زبان میں ہمارے چاروں صوبوں کی ثقافت، لطافت اور مٹھاس جمع ہو گیا ہے۔ گیلانی کی مادری زبان سرائیکی ہے اِس لیے وہ بہت فخر سے نہ صرف اِس زبان کی ترویج واشاعت کی طرف ہماری توجہ دِلاتا ہے بلکہ عملی طور پر اپنی تحریر میں سرائیکی زبان کے الفاظ بھی بے تابانہ استعمال کرتا ہے۔

۱۔ مرن (انتھک محنت کرنے والا)۔(۹۴)

۲۔ کندورے (رومال)۔(۹۵)

۳۔ جگ ڈوالی تے ووٹ چاہلی (اپنے ہی گھر میں صرف چالیس ووٹوں کی برتری)۔(۹۶)

کبھی کبھی روانی اور موج میں آکر سرائیکی کے اشعار درج کرتا ہے:

''پردیسی نال یاری نہ لا جڑا لکھ سونے داہووے
پَر ایک گلو پردیسی چھنگا جڑا یاد آوے تا روے''

(خبردار کسی پردیسی کو دِل نہ دینا۔ خیر ایک لحاظ سے پردیسی سے محبت اچھی بات ہے۔ وہ جب بھی یاد آئے گا ساتھ رونا بھی آئے گا)۔(۹۷)

یوسف رضا گیلانی کوئی بڑے دانشور، شاعر، عالم دین اور بزرگ نہیں جس کے پند و نصائح مشہور ہوں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ آپ ایک منجھے ہوئے سیاستدان اور سیاسی رہنما ہیں۔ رہنما کا مطلب ہے رہنمائی کرنے والا۔ علاوہ ازیں آپ نے زمانے کے سرد و گرم دیکھے تھے اور تحصیل کونسلر، ضلع کونسلر کی سطح سے اعلیٰ وزارتوں تک پہنچے تھے اِس لیے جب وہ بولتے ہیں تو صرف وہ نہیں بولتے بلکہ اُس کے پیچھے برسوں کا تجربہ بولتا ہے۔ اپنی آپ بیتی میں آپ نے زرین اقوال، اچھی باتیں اور دانائی کے نقاط جگہ جگہ بکھر رکھے ہیں۔ جن میں چند ایک یہ ہیں:

۱۔ ''دُنیا میں آپ کو تین طرح کے لوگ ملیں گے عزت و احترام چاہنے والے، علم و فراست چاہنے والے اور دولت چاہنے والے۔ اوّل الذکر گروہ کی تاریخ حساب کتاب رکھتی ہے باقی گردش ایام کے ٹوکری کی نظر ہو جاتے ہیں۔''(۹۸)

۲۔ ''کوئی شخص شکست کھانے سے ختم نہیں ہوتا بلکہ میدان چھوڑنے سے ہوتا ہے۔''(۹۹)

۳۔ ''دوسروں کو دیا ہوا مشورہ کبھی کبھی آپ کے لیے شرمندگی کا باعث بن سکتا ہے۔''(۱۰۰)

۴۔ ''مجبوریوں کی مسافت میں قیمت کچھ معنی نہیں رکھتی۔''(۱۰۱)

۵۔ ''ترقی یافتہ ممالک میں سیاستدانوں کی تقدیر کا فیصلہ عوام کرتے ہیں جبکہ ترقی پذیر ممالک میں فوج اور عدلیہ۔''(۱۰۲)

۶۔ ''افسر جتنا دُور رہے اُتنا ہی بہتر ہے۔''(۱۰۳)

بحثیت مجموعی ''چاہ یوسف سے صدا'' اعلیٰ پائے کی آپ بیتی نہیں بلکہ ایک دوسرے درجے یا اوسط درجے کی ایک سیاسی خود نوشت ہے لیکن پھر بھی اگر دیکھا جائے تو ایک پُر عزم شخص کی جد و جہد کی داستان ہے۔ ایک ایسا شخص جو اپنی سیاسی ساکھ

اور مقام بنانے کے لیے ہمہ وقت کوشاں رہا جو اپنی تعلیم اور شعور کو نہ صرف انفرادی ترقی بلکہ سماجی بیداری، معاشرتی اصلاح اور سیاسی فضا بنانے کے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ یہ ترقی کے دوڑ میں شامل ایک سیاستدان کی نجی زندگی کا نوحہ ہے جو سیاست کی چکی میں پستے پستے اس قدر مضبوط ہو گیا ہے کہ وقت اور حالات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کا عادی ہو چکا ہے۔ ۲۰۱۳ء کے عدلیہ کے ایک فیصلے کے نتیجے میں عمر بھر میدان سیاست سے باہر ہو جانے والے سیاسی رہنما یوسف رضا گیلانی کی زندگی عوام و خواص کے لیے عبرت کی نشانی بھی ہے اور نیا سیاسی سفر شروع کرنے والے نوجوانوں کے لیے نشانِ راہ بھی۔

ایوان اقتدار کے مشاہدات (گوہر ایوب خان)

نام کی حد تک تو یہ کتاب ''ایوان اقتدار کے مشاہدات'' ہیں لیکن اصل میں یہ صرف ایوان اقتدار ہی کی نہیں بلکہ مصنف کی ساٹھ سالہ زندگی کے مشاہدات پر مشتمل سر گزشت ہے۔ انتہائی دھیمے زبان اور شائستہ اسلوب میں لکھی ہوئی یہ ایک مکمل آپ بیتی ہے جو نہ صرف مصنف کی ذاتی زندگی کے کئی گوشے بے نقاب کرتی ہے بلکہ انتخاب واقعات، تسلسل اور انداز بیان کی بدولت ایک معیاری آپ بیتی کی صورت میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ گوہر ایوب نے دیگر سیاستدانوں کے برعکس اپنی زندگی اور اپنے عہد کی مکمل سیاسی سر گزست رقم کی ہے۔ اس آپ بیتی کی تاریخ اور سیاست سے ہٹ کر عقائد و نظریات، سماجی تبدیلیوں، تہذیبی، معاشرتی اور سفارتی نقطہ نظر سے بھی خصوصی اہمیت ہے چونکہ مصنف نے زندگی کے ہر گوشے پر خامہ فرسائی کی ہے اس لیے پوری آپ بیتی میں کہیں بھی تشنگی کا احساس نہیں ہوتا۔ ایک فوجی افسر کی حیثیت سے عملی زندگی کا آغاز کرنے والے گوہر ایوب خان کئی اہم فوجی اور سول عہدوں پر رہے۔ کمانڈر انچیف کے اے ڈی سی رہے۔ قومی اسمبلی کے سپیکر رہے۔ پاکستان کے وزیر خارجہ کے طور پر کام کیا اور پانی و بجلی کے وفاقی وزیر بھی رہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی آپ بیتی میں اہم ترین قومی اور بین الاقوامی رازوں کا پردہ فاش کرتے ہیں۔ صدر ایوب کے بیٹے ہونے کی وجہ سے بھی آپ نے ملکی تاریخ کے ابتدائی ادوار کا مشاہدہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس آپ بیتی میں مشاہدے کی تیزی اور بے لاگ تبصرے کی خصوصیت نظر آتی ہے۔

گوہر ایوب صدر ایوب کے بیٹے تھے لیکن بہت جلد آپ نے ایک کامیاب صنعت کار اور سیاست دان کے طور پر نہ صرف اپنی پہچان بنائی بلکہ بڑی حد تک اپنے خاندان سے الگ اپنا ایک ذاتی تشخص پیدا کیا۔ اس آپ بیتی کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں اپنے والد فیلڈ مارشل ایوب خان کے دور حکومت اور اُن کی پالیسوں کا دفاع کیا گیا ہے اور اُن پر مختلف حلقوں کی طرف سے لگائے گئے الزامات کا جواب دیا گیا ہے جبکہ آپ بیتی کا دوسرا حصہ بہت دلچسپ، فکر انگیز اور معلومات افزا ہے۔ اپنی پیدائش یعنی 8 جنوری 1937ء سے اکتوبر 1999ء یعنی پرویز مشرف کے فوجی بغاوت تک تقریباً ساٹھ سالہ زندگی کے اہم واقعات پر مشتمل یہ سر گزشت مصنف کی زندگی کے اُن نشیب و فراز اور تجربات کی سر گزشت ہے جس میں ہم پاکستان کی تاریخ، مصنف کی ذاتی زندگی اور اقتدار کی غلام گردشوں میں ظہور پزیز ہونے والے واقعات کی جھلکیاں دیکھ سکتے ہیں۔

گوہر ایوب خان عسکری خاندانی پس منظر رکھتے ہیں۔ اُن کے دادا میر داد خان انگریزوں کے زمانے میں رسالے میں رسالدار میجر تھے۔ جو مقامی ہندوستانیوں کے لیے بہت بڑا فوجی عہدہ تھا اور اُن کے والد ایوب خان پاکستان کے پہلے

مسلمان کمانڈر انچیف تھے جو بعد میں پاکستان کے صدر بنے۔ گوہر ایوب نے اپنی آپ بیتی کی ابتدا اپنے قبیلے کی مختصر تاریخ سے کی ہے حتیٰ کہ اپنے دادا اُس کے بھائیوں اور بچوں اور اپنے گاؤں ''ریحانہ'' کا پس منظر اور تفصیل درج کی ہے۔ اپنی پیدائش لکھتے ہوئے عجیب منظر کشی کرتا ہے۔ شاید یہ تفصیلات اُس نے ماں سے سنی ہوں:

''میری پیدائش جمعہ المبارک کے دن 8 جنوری 1937ء کو ریحانہ میں ہمارے نئے تعمیر شدہ بنگلے کے پہلو میں واقع مٹی کی دیواروں والی ڈیوڑھی میں ہوئی۔ گاؤں کی ایک دائی نے عالم وجود میں آنے میں میری مدد کی۔۔۔ پیدائش کے بعد سرخ رنگ کے مخمل سے بنی ہوئی سنہرے نقش و نگار والی ٹوپی سے میرا سر اور کان ڈھانپ دیئے گئے۔'' (۱۰۴)

اپنے سات بہن بھائیوں میں دوسرے نمبر پر گوہر ایوب کا بچپن ہندوستان کے مختلف جگہوں پر گزرا۔ چونکہ اُن کے والد فوج میں تھے۔ اس لیے اُن کی گھریلو زندگی بڑی متاثر ہوئی اُس زمانے میں فوجی افسروں کے لیے رہائشی سہولتیں کم ہی ملتی تھیں لیکن ایوب خان اپنے خاندان کو زیادہ تر اپنے پاس رکھتے تھے تاکہ بچوں کی تعلیم میں کوئی خلل نہ آئے چنانچہ گوہر ایوب کا بچپن بنگلور، پشاور، سری نگر، ایبٹ آباد اور ڈیرہ دون میں گزرا۔ آپ نے عملی زندگی کا آغاز پاکستانی فوج میں آرمی آفیسر کی حیثیت سے کیا اور اپنے والد کی بٹالین 5 پنجاب شیر دل میں شمولیت سے فوجی کیریئر کا آغاز کیا۔ ہندوستان اور پاکستان کے قیام کا اعلان ہوتے ہی سرحد کے دونوں طرف قتل عام کا بازار گرم ہو گیا۔ ہندو اور سکھ مسلمانوں کو چُن چُن کر مار رہے تھے اور پاکستان میں مسلمان ہندوؤں اور سکھوں کے گھر جلا کر حساب برابر کر رہے تھے۔ انسان خوفناک بھیڑیا بن گیا تھا۔ اس سفاکی کے دلدوز مناظر ہم اپنے افسانوں اور ناولوں میں تلاش کر سکتے ہیں تاہم اُس کو مبالغہ کہہ کر جھٹلایا جاتا ہے۔ لیکن آپ بیتیوں میں تو چشم کشا واقعات ہوتے ہیں اس لیے ان کو جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ 1947ء کے ہندو مسلم فسادات کی سب سے معتبر گواہی آپ بیتیوں نے دی ہے۔ گوہر ایوب خان نے بھی تقسیم ہند کے وقت اس خون ریزی کا آنکھوں دیکھا حال کچھ یوں بیان کیا ہے:

''ہم نے راستے میں تباہی و بربادی کے دل ہلا دینے والے منظر دیکھے۔ مردوں عورتوں اور بچوں کی لاوارث لاشیں سڑکوں کے کنارے پڑی ہوئی تھیں۔ چیل، کوے اور گدھ ان لاشوں کو نوچ کر کھا رہے تھے۔ بعض لاشوں کو کتے بھنبھوڑنے کے بعد اُن کے پہلو ہی میں سو رہے تھے۔ علاقے کے تمام کنویں بھی

انسانی لاشوں سے اٹ چکے تھے۔ دوپہر کا وقت اور شدید گرمی پڑ رہی تھی۔ ہمیں پانی کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔ اگلے کنویں کے قریب ہم رُکے اور پانی نکالنے کے لیے بالٹی کنویں میں ڈال دی جب اس کو اوپر کھینچا تو پانی کی جگہ بالٹی میں خون بھرا تھا۔" (۱۰۵)

پاکستان نے اپنی زندگی کا آغاز انتہائی کسمپرسی کی حالت میں کیا۔ متحدہ ہندوستان کا سارا خزانہ، بڑی بڑی صنعتیں، مشنری، بحری اور بری جہاز، اسلحہ اور سارا انفراسٹرکچر انڈیا کے پاس چلا گیا۔ ابتدا میں ملک چلانے کے لیے بنیادی ضروریات تک نہیں تھیں۔ انگریزوں اور ہندوؤں کا خیال تھا کہ اس طریقے سے نوزائیدہ ملک کے سامنے ایسے مسائل کھڑے کیے جائیں گے کہ یہ مسائل کے بھنور سے نہیں نکل سکے گا۔ تاہم اُس وقت جذبے جوان تھے اور نامساعد حالات میں بھی حکومت چلانے والوں نے بڑی پامردی سے مقابلہ کیا اور مایوس نہ ہوئے۔

الطاف گوہر، قدرت اللہ شہاب اور سر رضا علی جیسے بیوروکریٹس اور حکمرانوں کی آپ بیتیوں میں وہ سب حالات تفصیل سے درج ہیں۔ تقسیم کے فوراً بعد فوج کی کیا صورتحال تھی؟ دفاعی ساز وسامان کی کیا پوزیشن تھی اور نئے ملک پاکستان کے حصے میں آنے والے مختلف بٹالین کی بے سروسامانی کا کیا حال تھا۔ اس سے زیادہ واضح اور تفصیلی بیان شاید ہی کہیں ہو۔ ملاحظہ ہوں گوہر ایوب کے مشاہدات:

"جب ہندوستان کو دو الگ الگ ریاستوں میں تقسیم کیا گیا تو پاکستان کے حصے میں چھ انفنٹری ڈویژن اور ایک آرمڈ بریگیڈ آیا۔ اسی اثنا میں فوجیں مشرق بعید، شمالی افریقہ اور جنگ کے دوسرے محاذوں سے واپس آ رہی تھیں۔ پاکستان کو جو یونٹ دیئے گئے وہ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں پر مشتمل تھے۔ کوئی بھی ایک مکمل رجمنٹ یا بٹالین پاکستان کو نہیں دیا گیا۔ پاکستان کو ملنے والا فوجی ساز و سامان بھی پرانا تھا۔ ٹینکوں کے انجن جواب دے چکے تھے اور ان سب کو آز سرنو بنانے کی ضرورت تھی تمام رائفلوں، لائٹ مشین گنوں اور ایمونیشن فیکٹریوں کے علاوہ ٹرک اور طیارے بنانے والے پلانٹوں پر بھی بھارت نے قبضہ جما لیا۔ چند اہم تربیتی مراکز اور چھاونیوں کے سوا پاکستان کو کچھ بھی نہیں دیا گیا۔ تینوں مسلح افواج کے سربراہان اور متعدد دیگر افسران بھی انگریز ہی رہے۔" (۱۰۶)

کمانڈرانچیف کے اے ڈی سی کی حیثیت سے گوہر ایوب بے شمار فوجی، تاریخی، ثقافتی، سیاسی اور غیر سیاسی واقعات سے نہ صرف باخبر رہے بلکہ اکثر ان کا براہ راست حصہ رہے۔ وہ جب کسی واقعے کی تفصیل بتاتے ہیں تو تجربہ کار انسٹر یکٹر کی طرح واقعے کا پس منظر بتاتے ہیں اور تفصیل سے بات رقم کرتے ہیں۔ آپ نے سپیشل سروسز گروپ (SSG) کی تشکیل، امریکہ سے دفاعی ساز و سامان کا معاہدہ، 1965ء کے انتخابات اور اُس زمانے کے مختلف قومی اور تاریخی واقعات کو تفصیلاً بیان کیا ہے۔ دسمبر 1964ء کے صدارتی انتخابت میں محترمہ فاطمہ جناح نے صدر ایوب کا مقابلہ کیا جو کانٹے کا مقابلہ ثابت ہوا۔ ہماری تمام تاریخی کتابیں، ملکی اور بین الاقوامی میڈیا نے اُن انتخابات میں دھاندلی کے الزام لگائے ہیں۔ صدر ایوب کے اپنے سیکرٹری اور عملے کے لوگوں نے (الطاف گوہر اور قدرت اللہ شہاب) اُن انتخابات میں بدترین دھاندلی کرنے کی بات کی ہے تاہم گوہر ایوب چند سطروں میں اتنے بڑے اور اہم واقعے کا ذکر کرتے ہیں گویا کچھ ہوا ہی نہیں بلکہ اپنے باپ کا دفاع کرتے نظر آتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ الیکشن میں دھاندلی، ججز کو ڈرانا دھمکانا، سیاست دانوں کو اپنے ساتھ ملانا، لوٹا کریسی اور جمہوری اداروں کی جڑیں کاٹنے کی روایت سب سے پہلے ایوب خان نے شروع کی۔ اُس نے پہلی بار فوج کو اقتدار کا راستہ دکھایا اور اُن کی باقیات ہم آج بھی کسی نہ کسی شکل میں دیکھ سکتے ہیں۔ اپنی آپ بیتی کے اس حصے میں گوہر ایوب خان نے زیادہ سچائی سے کام نہیں لیا ہے۔ البتہ اپنا فوج چھوڑنے کے واقعے کو صداقت سے بیان کیا ہے۔ بحیثیت مجموعی سچائی اور صداقت اس آپ بیتی کا خاصہ ہے:

> ''اگر میں فوج میں رہ کر اپنی زبان بند رکھتا تب بھی سیکورٹی وجوہات کی بناء پر مجھے کبھی ادھر بھیجا جاتا کبھی اُدھر بھیجا جاتا اور ان حالات میں تنگ آکر میں فوجی ملازمت چھوڑ دیتا۔ جب حالات سے دلبرداشتہ ہو کر میں فوج کی ملازمت چھوڑ دیتا تو کوئی نیا کیریئر شروع کرنے میں بہت تاخیر ہو چکی ہوتی۔'' (۱۰۷)

1965ء کی پاک بھارت جنگ نے ہماری قومی زندگی پر نہ صرف اہم اثرات مرتب کیے بلکہ اس جنگ نے مستقبل کے کئی تاریخی واقعات کو جنم دیا۔ اگر 1965ء کی مذکورہ جنگ نہ ہوتی تو اعلان تاشقند کے تناظر میں نہ تو ذوالفقار علی بھٹو کی اُٹھان ہوتی اور نہ پیپلز پارٹی ایک بڑی مقبول عوامی جماعت بنتی۔ 1965ء کی پاک بھارت جنگ بذات خود ہماری تاریخ کا ایک غیر معمولی واقعہ ہے۔ گوہر ایوب نے اس جنگ کے اسباب و عوامل کا اپنے مشاہدات کی روشنی میں طویل تجزیہ کیا ہے۔ اس باب میں مصنف نے جنگ کے اُن چشم کشا واقعات کا ذکر کیا ہے جو کسی تاریخی کتاب وغیرہ میں موجود نہیں۔ (۱۰۸)

اس آپ بیتی میں مصنف نے سقوط مشرقی پاکستان کے حوالے سے بھی ایک ناظر کی حیثیت سے تفصیل لکھی ہے۔ سترہ صفحات میں لکھے گئے اس حادثے کو آپ نے مختلف زاویوں سے بیان کیا ہے۔ یہ سقوط ڈھاکہ کے اہم کرداروں سے گفتگو اور ذاتی تجربے سے گزرے ہوئے واقعات کی سرگزشت ہے بلکہ جنگ میں وہ رضاکارانہ طور پر شریک رہے اور اپنے بٹالین ''شیر دل'' کے ساتھ رہے حالانکہ وہ اس وقت فوج چھوڑ چکے تھے۔ اس طرح اُس کی معلومات سنی سنائی نہیں بلکہ چشم دید واقعات پر مشتمل ہیں۔

خود نوشت کا حصہ دوم ''اقتدار کے ایوانوں میں'' مصنف کی ۱۹۹۰ء سے ۱۹۹۸ء تک کی یادداشتوں پر مشتمل ہے۔ اکتوبر 1990ء کے انتخابات میں ''مسلم لیگ ن'' بھاری اکثریت سے اقتدار میں آئی تو گوہر ایوب خان اُس اسمبلی کے سپیکر منتخب ہوئے اس دن سے وہ پاکستانی سیاست میں نہ صرف عملی طور پر داخل ہوئے بلکہ وزیر اعظم صدر، چیف آف آرمی سٹاف اور ملک کے دیگر اعلیٰ ترین عہدوں پر تعینات لوگوں سے اُن کا ذاتی تعلق رہا۔ اس پورے عرصے میں قومی اسمبلی کی تحلیل اور بحالی، اندرون خانہ واقعات، تنازعہ کشمیر، پاکستان کے جوہری دھماکے، ہندوستان کے ساتھ تعلقات اور دیگر اہم معاملات پر اپنے تجربے کی روشنی میں تبصرے کیے ہیں۔ پاکستان کے ایٹمی دھماکوں کے وقت حکومت پر کتنا دباؤ تھا اور تو اور انڈیا اور اسرائیل نے چاغی یعنی دھماکوں کے سائٹ کو ہوائی حملوں کے ذریعے اُڑانے کا منصوبہ بھی تیار کیا تھا اور اس کے لیے اسرائیلی جہاز انڈیا میں موجود تھے۔ اس بارے میں گوہر ایوب نے وزیر خارجہ کی حیثیت سے جو واقعہ اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے۔ اس کی تردید فوجی یا حکومتی حلقوں کی جانب سے کسی نہیں کی:

> ''ہمیں رپورٹ ملی کہ اسرائیل نے اپنے پندرہ ایف سولہ اور ایف پندرہ قسم کے جنگی طیارے بھارت روانہ کر دیے ہیں میں نے یہ رپورٹ مارک کر کے اپنے ذرائع کو یہ کھوج لگانے کی ذمہ داری سونپ دی کہ بھارت کے کسی سرحدی ہوائی اڈے پر کوئی اسرائیلی طیارہ تو دکھائی نہیں دے رہا یہ رپورٹ موصول ہونے کے چند دن بعد 28 مئی 1998ء کو رات کے 12 بج کر 30 منٹ پر مجھے اپنے سیکرٹری کی ٹیلی فون کال ملی کہ بھارت اور اسرائیل چاغی میں جوہری دھماکوں کی سائٹ پر حملے کی تیاری کر رہے ہیں اور چنائی کے ہوائی اڈے سے یہ طیارے اُڑ کر چاغی پر حملہ کریں گے۔'' (۱۰۹)

اپنی آپ بیتی کے اس حصے میں گوہر ایوب خان نے مسلم لیگ نون کے صدر اور سابق وزیر اعظم محمد نواز شریف کو

اُن کی امرانہ پالیسوں کی وجہ سے خوب آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ مصنف کی سر گزشت سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ پارٹی کی اندرونی میٹنگوں میں اور کابینہ کے ملاقاتوں میں نواز شریف کی پالیسوں پر کھل کر تنقید کرتے تھے۔ پارٹی کے ایک مشاورتی اجلاس کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"پارٹی کے اجلاس میں وزیر اعظم اپنے واسکٹ کی جیب سے فیصلوں کی پرچیاں نکالتے جارہے تھے۔ جن کے بارے میں وہ مشاورت سے پہلے ہی فیصلہ کر چکے تھے حالانکہ پارٹی کا اجلاس ان تجاویزاور سفارشات پر غور کے لیے خصوصی طور پر بلایا گیا تھا۔" (۱۱۰)

اس طرح معرکہ کارگل، افغان جنگ کے بعد افغانستان میں طوائف الملوکی اور پاکستان پر اس کے تباہ کن اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ایوان اقتدار کے مشاہدات اس لحاظ سے ایک معیاری آپ بیتی ہے کہ اس میں مصنف نے اپنی ذات کے حوالے سے واقعات کو قلمبند کیا ہے نیز ہر واقعے کے ساتھ وہ ایک جذباتی وابستگی رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہر اقتباس بلکہ ہر سطر میں مصنف بولتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ بھرپور معلومات، علمی بصیرت، ماحول اور اشخاص کا بے لاگ تذکرہ، انتخاب واقعات، زمانی ترتیب، واقعات کا چناؤ اور ترتیب، شائستہ اور پر وقار انداز وہ خصوصیات ہیں جو اس آپ بیتی کو کامیاب آپ بیتی بناتے ہیں۔ سیاست اور معاشرت دونوں کو یکساں اہمیت دے کر یہ خود نوشت سیاسی خود نوشت ہو کر بھی ایک معاشرتی خود نوشت لگتی ہے۔

گوہر ایوب خان عسکری اور کاروباری پس منظر رکھتے ہیں۔ مطالعہ کے از حد شوقین ہیں تاہم اُن سے کرشماتی اسلوب یا منفرد اسلوب کی توقع نہیں رکھی جاسکتی۔ ایک سیدھے سادھے فوجی کی طرح لگی لپٹی کے بغیر بات کرتے ہیں۔ استعاراتی، تشبیہاتی اور علامتی اسلوب نہیں جانتے۔ سادا، سپاٹ، روزمرہ اور گھریلو انداز تحریر سے کام لیتے ہیں۔ طنزیہ، مزاحیہ، پر شکوہ یا خطیبانہ اسلوب کا استعمال پوری خود نوشت میں نہیں کیا۔

گوہر ایوب خان واقعے کی منظر کشی بہت خوب کرتے ہیں بعض موقعوں پر تو یوں لگتا ہے کہ اگر مصنف اپنے اسلوب پر توجہ دیتے تو مرقع نگاری میں کمال حاصل کر سکتے تھے۔ اپنے والد کی موت کا ذکر یوں کرتے ہیں:

"ایک بجے اردلی نے والد کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا لیکن اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ اردلی نے دروازہ خود کھولا اور والد کے بیڈ کے قریب گیا۔ ریڈیو سرہانے بج رہا تھا۔ والد دو چھوٹے اور ایک لمبا گول تکیہ سر کے نیچے رکھے سو رہے تھے۔ دونوں ہاتھ پہلو میں تھے۔ اردلی نے انہیں جگانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں

ہوا۔ کیونکہ والد نیند کی حالت میں پر سکون طور پر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے
تھے۔" (۱۱۱)

مجموعی طورپر گوہر ایوب خان کا انداز بیان سادہ اور بے تکلف ہے ۔ وہ جلدی جلدی ایک بات ختم کر کے دوسرے واقعے کا آغاز کرتا ہے تاہم کبھی کبھی ماحول اور منظر پر بھی توجہ مرکوز رکھتا ہے:

"سارک کانفرس کے اختتام پر غیر ملکی وفود کو ٹرین کے ذریعے کولمبو سے باہر ایک تفریحی مقام پر لے جایا گیا۔ ٹرین سمندر کے ساتھ ساتھ کوکونٹ اور پام کے کھیتوں سے سرعت کے ساتھ گزر رہی تھی۔ تفریحی مقام پر مہمانوں کے لیے ظہرانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ وہاں سے سمندر کا نظارہ بھی بہت خوشگوار تھا۔ وزیر اعظم نواز شریف کے اے ڈی سی میرے پاس آئے اور بتایا کہ وزیر اعظم آپ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ جب میں وہاں پہنچا تو وزیر اعظم نے مجھ سے پوچھا سکندر اعظم نے کب ہندوستان پر حملہ کیا تھا؟ میں نے جواب دیا 326 قبل مسیح میرا جواب سن کر واجپائی کافی متاثر ہوئے اور نواز شریف کے چہرے پر اطمینان کی مسکراہٹ عیاں تھی۔" (۱۱۲)

جہاں ضرورت محسوس کرتے ہیں وہاں تفصیل بھی دیتے ہیں۔ اُن کی خود نوشت سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ زندگی میں سب سے زیادہ اپنے باپ ایوب خان سے متاثر ہیں۔ اس لیے جب بھی اُن کا ذکر آتا ہے اختصار پسندی کی جگہ تفصیل سے کام لیتے ہیں:

"میرے والد ایک سیدھے سادے آدمی تھے۔ وہ عام طور پر اُردو گانے گنگنایا کرتے تھے۔ اپنی شخصیت کو نکھارنے کے لیے بھی وہ صرف بالوں کا ٹانک استعمال کرتے اور بالوں کو آگے یا پیچھے کی طرف برش کرنے پر اکتفا کرتے تھے۔ وہ صبح جاگتے ہی چھوٹا حاضری (بیڈ ٹی) لے لیتے۔ اس کے بعد ناشتہ کرتے کبھی ناشتے میں پھلوں کا رس، آدھی مکئی کی روٹی، دہی اور کبھی کبھار پھل کھاتے تھے۔ میں نے انہیں اپنے لیے مخصوص طعام پکانے کی فرمائش کرتے نہیں دیکھا"۔ (۱۱۳)

غرض، وقار، سنجیدگی، متانت اور رواں انداز اس آپ بیتی کی تحریر کی شان ہے بات سے بات نکالنے میں بھی مصنف مہارت رکھتے ہیں اور موضوع پر اُن کی گرفت کبھی ڈھیلی نہیں ہوتی۔

اپنی خود نوشت میں بعض مقامات پر مبالغے سے بھی کام لیا ہے۔ جو واقعات آپ نے مبالغہ آمیزی سے بیان کیے ہیں وہاں آپ بیتی کا فطری انداز شدید مجروح ہوا ہے۔ مثلاً پشاور جیل میں سارے جیل کو آگ لگانے کا منصوبہ اور جیل کے ٹاور پر دیگر قیدیوں کی مدد سے حملہ کرنے کا واقعہ حقیقت سے بعید لگتا ہے۔ اسی پشاور جیل میں اسفند یار ولی اور عبدالخالق خان کے حوالے سے بیان کیے گئے واقعے پر بھی سچائی کا گمان نہیں ہوتا:

''جیل سپرنٹنڈنٹ کے دفتر میں، آئی جی(انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات) اپنی بات ختم کرنے ہی والے تھے کہ عبدالخالق خان نے اُن کے ہاتھ سے چھڑی چھین لی اور چھڑی سے اُن کی دُھلائی شروع کر دی۔ جیل سپرنٹنڈنٹ یہ سارا ماجرا دیکھتا رہا۔ انہوں نے کوئی مداخلت نہیں کی۔ آئی جی جیل خانہ جات کی جیل کے اندر ایسی پٹائی کبھی نہیں ہوئی ہو گی۔'' (۱۱۴)

دیگر سیاست دانوں کے برعکس گوہر ایوب کا لہجہ اور تحریر زیادہ شائستہ ہے اپنی تعلیم یافتہ ماحول، مثبت سوچ اور فوجی پس منظر رکھنے کی وجہ سے آپ سیاست دانوں میں الگ تھلگ نظر آتے ہیں۔ اپنی خود نوشت میں بحیثیت مجموعی کوئی سلینگ(Slang) یعنی عامیانہ محاورہ استعمال نہیں کیا۔ البتہ ایک دو جگھوں پر باقاعدہ گالیاں تحریری شکل میں درج کی ہیں جو پڑھنے والے کی طبیعت پر گراں گزرتی ہیں۔ اتنے معیاری اور سنجیدہ تحریر میں اگر یہ بھی نہ ہوتیں تو بہتر ہوتا:

''اب تو فوج بھی ہمارے ساتھ ہے ہم اس حرامی کو نہیں چھوڑیں گے۔''(۱۱۵)

جنرل یحییٰ خان سے اُن کے معاشقوں کے بارے میں جب پوچھا گیا تو یحییٰ خان کا جواب تھا:

''جب اُن سے الطاف قادر نے پوچھا کہ جن خواتین کے ساتھ تمہارا تعلق رہا ہے انہیں آپ خود بلاتے تھے یا آپ کو پیش کی جاتی تھیں۔ جنرل یحییٰ خان نے پلکیں جھپکائے بغیر کہا، ٹافی (الطاف قادر فوج میں ٹافی کے نام سے مشہور تھے) میں نے اُن میں سے کسی ایک کو بھی نہیں بلایا۔ اُن کے شوہر خود لا کر مجھے پیش کرتے تھے۔ تم بتاؤ اس میں میری کیا غلطی ہے۔'' (۱۱۶)

مختصر یہ کہ ایوان اقتدار مشاہدات ایک حد تک کامیاب آپ بیتی ہے جس میں عسکری، سیاسی اور صنعتی پس منظر سے تعلق رکھنے والے گوہر ایوب خان نے اپنی متحرک اور مصروف زندگی کے مشاہدات اور تجربات میں لوگوں کو اپنے ساتھ شریک کیا ہے۔ اس لیے آپ بیتی کی اہمیت تادیر کئی حوالوں سے اُردو زبان وادب میں برقرار رہے گی۔

میری تنہا پرواز (کلثوم سیف اللہ خان)

''میری تنہا پرواز'' بارہ ابواب اور 370 صفحات پر مشتمل صوبہ سرحد کی مشہور سیاسی اور صنعتی خاندان کی ایک جرأت مند خاتون بیگم کلثوم سیف اللہ خان کی زندگی کی سچی اور حقیقی کہانی ہے۔ سیف اللہ خاندان ملک کے ایک بڑے سیاسی اور کاروباری خاندان کے طور پر جانا جاتا ہے اور اس ترقی میں بیگم کلثوم کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ جوانی میں بیوہ ہونے والی کلثوم سیف اللہ پر بھاری ذمہ داریاں آن پڑیں۔ بچوں کو پالنا، کاروبار کو سنبھالنا، سیاست کے میدان میں بزرگوں کا بنایا ہوا مقام برقرار رکھنا، فلاحی کام کرنا، علاقے کے پسماندہ عوام کی ترقی کے منصوبے بنانا غرض انہیں زندگی میں سخت جدوجہد کرنی پڑی۔ مردوں کے اس معاشرے میں خاتون کیا کچھ کرتی ہے یا کرسکتی ہے اور بیگم صاحبہ نے حالات کا کس قدر پامردی سے مقابلہ کیا یہ آپ بیتی اس کی بہترین مثال ہے۔ کلثوم صاحبہ کافی مدت تک عملی سیاست میں رہیں۔ وہ کئی دفعہ وفاقی وزیر بھی رہیں۔ آپ ذوالفقار علی بھٹو کی کابینہ میں بھی شامل تھیں اور بیگم نصرت بھٹو سے اُن کے دیرینہ تعلقات تھے چنانچہ یحییٰ خان کے اقتدار سے لے کر بے نظیر بھٹو کی دوسری بار وزیر اعظم بننے تک آپ نے سیاست میں بلواسطہ یا بلاواسطہ حصہ لیا یہی وجہ ہے کہ کلثوم سیف اللہ ہماری چالیس سالہ سیاسی اور معاشرتی تاریخ کی چشم دید گواہ رہی ہیں۔ آپ نے اپنی آپ بیتی میں جتنے واقعات بیان کیے ہیں اُس میں آپ بطور ناظر شریک تھیں۔ وہ ایک طویل عرصے تک اپنی مصروفیات، مشاہدات اور تاثرات کو ڈائری کی شکل میں لکھتی رہیں اُن کی یہ یاداشتیں ان ڈائریوں سے ماخوذ ہیں۔ اُس نے کسی واقعے کے بیان میں حافظے پر زور نہیں ڈالا ہے۔ اُن کے واقعات جزئیات کی حد تک مکمل ہیں۔ موضوع کے ساتھ جذباتی وابستگی، تاریخی ترتیب، انتخاب واقعات اور اسلوب کے حوالے سے ''میری تنہا پرواز'' ایک مکمل اور معیاری خودنوشت ہے۔ اس کی اہم خصوصیات نیچے درج کی جاتی ہیں۔

فن آپ بیتی کی روایت کے مطابق کلثوم سیف اللہ اپنی پیدائش، خاندانی پس منظر، ابتدائی زندگی، بچپن، آباؤ اجداد اور پسند و مشاغل سے آغاز کرتی ہیں۔ بچپن کے خاص خاص واقعات، سکول کی زندگی اور میکے کی زندگی اتنی ترتیب اور اچھے طریقے سے بیان کرتی ہیں کہ ایک مکمل نقشہ قاری کے ذہن میں بیٹھ جاتا ہے۔ وہ بچپن ہی سے غیر معمولی صلاحیتوں کی مالک تھیں چنانچہ لکھتی ہیں:

> ''مجھے یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی کہ جو ہندو یا سکھ اپنے گھر بار چھوڑ کر بھارت چلے گئے ہیں اُن کی پراپرٹی بھارت سے آنے والے مہاجرین کو الاٹ کرنے کا بندوبست کروں۔ ظاہر ہے اس کے لیے مفصل سروے اور جائزے کی ضرورت تھی میں

نے یہ کام بڑی محنت سے کیا لیکن کبھی کسی مکان یا دکان کا تالا نہیں توڑا۔ مجھے یہ
بیان کرتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ ایسے وقت میں بھی چند خواتین نے اپنے طور
پر بعض گھروں کے تالے توڑ کر وہاں سے حسب منشا سامان اُڑا لیا تب ان خواتین کی
ایسی غیر ذمہ دارانہ حرکات کے سبب ان کو تالا توڑ پارٹی کا نام دیا گیا۔'' (۱۱۷)

اس آپ بیتی کی خاص بات یہ ہے کہ بچپن سے اپنی شادی کے زمانے تک یعنی زندگی کے نئے سفر، سسرال، خاوند سیف اللہ خان کی زندگی، مشاغل، ہنی مون کے لیے کشمیر جانا حتیٰ کہ اپنے بچوں کی پیدائش کی تفصیلات تک بیان کی ہیں۔ اپنے بڑے بیٹے ہمایون سیف اللہ خان کی پیدائش کا واقعہ بیان کر کے آخر میں کہتی ہیں:

''آج بھی جب میں ہمایون خان کو دیکھتی ہوں تو اچانک اس کی پیدائش کا دن یاد آ
جاتا ہے۔ پیدائش کے وقت وہ بے حد خوبصورت اور گول مٹول سا تھا۔ اُس کے
سنہرے بال تھے اور اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی۔'' (۱۱۸)

۱۴اپریل ۱۹۶۴ء کو سیف اللہ خان کے اچانک انتقال کے بعد بیگم کلثوم گھریلو ذمہ داریوں اور گھر کی چار دیواری سے نکل کر عملی زندگی میں آئیں۔ سیاست میں آنے سے پہلے انھوں نے بزنس کی طرف توجہ دی، اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت، کاروبار کی دیکھ بھال، رشتہ داریاں نبھانا اور کاروبار کو وسعت دینا اور وہ بھی مردوں کے معاشرے میں خصوصاً پٹھان علاقے میں۔ یہ مردانگی اور دلیری صرف کلثوم سیف اللہ ہی کر سکتی تھی۔ اس سلسلے میں آپ نے چھوٹے چھوٹے واقعات بھی بیان کیے ہیں جس سے آپ کی محنت، صداقت اور پر خلوص لگن کا اظہار ہوتا ہے:

''مجھے ہر صبح پانچ بچوں کو سکول کے لیے تیار کرنا ہوتا تھا لہٰذا میں ان کو رات کے
وقت ہی غسل کرا دیتی۔ اقبال کو تو میں اس کا یونیفارم اور جرابیں تک پہنا دیتی تھی
تاکہ صبح وقت ضائع نہ ہو۔'' (۱۱۹)

اپنا بزنس جمانے اسے وسعت دینے اور معیار کے حوالے سے کلثوم سیف اللہ کو کتنے پاپڑ بیلنے پڑے اور اس نے کتنے طاقتور لوگوں سے ٹکر لیے، درج ذیل واقعہ اس کا شاہد ہے۔ اس واقعے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کتنی بے خوف اور اُصول پسند عورت تھیں۔ یحییٰ خان سے وقت لے کر اُن سے ملاقات کے لیے گئیں کیونکہ آپ آرمی کو ڈرائی راشن سپلائی کرتی تھیں اور جنرل ٹکا خان نے وہ راشن ضبط کر لیا تھا:

''میں نے کہا جناب جو مال ہم سپلائی کرتے ہیں میں وہ نمونے اپنے ساتھ لائی ہوں
آپ اپنے فوجی جوان سے can کھول کر خوراک کا ذائقہ اور معیار چیک کر سکتے

ہیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ ٹکا خان نے ہمارے 5 لاکھ روپے مالیت کے مال کی سپلائی بلاوجہ اور اچانک روک دی ہے اور میں یہ نقصان برداشت کرنے کے قابل نہیں ہوں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے (یحییٰ خان نے) ٹکا خان کو بھی طلب کر لیا جو تھوڑی دیر کے بعد حاضر ہوا مجھے دیکھ کر اُن کو حیرت ضرور ہوئی ہو گی''۔(۱۲۰)

وہ ''کامیابی کا راز'' کے عنوان سے سیاست، کاروبار، نوکری حتیٰ کہ مذہبی امور میں بھی محنت، خلوص اور لوگوں پر بھرپور اعتماد کرنے کے حوالے سے بتاتی ہیں:

''میرا خیال ہے کہ اپنے والدین کی طرف سے مجھے پیدائشی طور پر وہ جرأت، اعتماد اور دلیری ملی جس کی مدد سے میں نے بزنس انڈسٹری ہی نہیں بلکہ سیاست میں بھی قابل ذکر خدمات سرانجام دیں ورنہ مجھ ایسی عورت جو صوبہ سرحد ایسے پسماندہ اور روایت پسند معاشرے سے تعلق رکھتی تھی بھلا یہ سب کام کیسے کر سکتی تھی؟'' (۱۲۱)

اپنے بڑے بھائی جنرل ریٹائرڈ حبیب اللہ کے کہنے پر کلثوم سیف اللہ میدان سیاست میں آئی۔ وہ پہلی مرتبہ عوامی نیشنل پارٹی میں شامل ہوئیں اور اُن ہی کی ٹکٹ پر صوبائی اسمبلی میں وزیر منتخب ہوئیں تاہم تھوڑا عرصہ بعد پاکستان پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کی اور آخری دم تک پیپلز پارٹی میں رہیں۔ جنرل فضل حق کی رعونت، ضیاء الحق کے مارشل کے بُرے اثرات، بیگم نصرت بھٹو سے دوستی اور پیپلز پارٹی میں ہونے کی سزا ملنے وغیرہ کو خوب تفصیل سے بیان کیا ہے۔ وہ کئی مرتبہ مارشل لا کے زمانے میں جیل بھی گئی اور انہیں کئی سال اپنے گھر میں بھی نظر بند ہونا پڑا۔ اپنی اسیری اور سیاسی مشکلات کے زمانے سے وہ کیا سبق حاصل کرتی ہیں۔ ملاحظہ ہو:

''میں نے اسیری اور نظربندی سے ایک سبق یہ بھی حاصل کیا کہ انسان پر اچھے اور بُرے دن تو آتے ہیں لیکن اگر انسان اپنے اُصول پر قائم رہے اور اُس کا ضمیر مطمئن ہو تو آخر کار وہی فتح منداور کامیاب ہوتا ہے۔ مجھے بخوبی معلوم تھا کہ مجھے بیگم نصرت بھٹو کی میزبانی کی سزا دی جارہی ہے چنانچہ میں نے ہر مرحلے پر دوٹوک اور واضح الفاظ میں کہا کہ مجھے جب بھی موقع ملا میں بیگم نصرت بھٹو کو اپنے گھر ضرور خوش آمدید کہوں گی اور اس کے لیے میں ہر قیمت ادا کرنے کو تیار ہوں'' ۔(۱۲۲)

سیاست میں اُن کا آنا اتفاقیہ تھا تاہم سیاست کی پرُ خار اور پرُ خمار وادی انہیں ایسی بھائی کہ نہ صرف وہ بلکہ اُن کے تین بیٹے ہمایون سیف اللہ، انور سیف اللہ اور سلیم سیف اللہ سیاست کے ہو کر رہ گئے۔ بیگم کلثوم نے اپنی آپ بیتی میں اپنے بچوں کے سیاسی اندازِ فکر پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ وہ اپنے سیاسی فیصلوں میں کتنی آزاد تھیں اور ضمیر کی آواز پر خاموش نہیں رہ سکتی تھیں۔ اس کی گواہی اُس واقعے سے ہوتی ہے جب اقوامِ متحدہ میں پاکستان کی نمائندگی کرتے ہوئے اسرائیلی مندوب عورت کے ساتھ دوستی کر لی۔ عرب ممالک کے سفارت کاروں کی طرف سے شدید اعتراض کے باوجود پاکستانی مندوب اقبال اخوند صاحب کو کیا کھرا جواب دیا ہے:

> ''میرے خیال میں، میں جو کچھ کر رہی ہوں وہ درست ہے ایک خاتون کا کسی دوسرے خاتون سے ملنا میرے نزدیک کوئی غلط بات نہیں میرا اُس سے ملنا میری مجبوری ہے کیونکہ یہاں کوئی دوسری خاتون موجود نہیں لہٰذا میرا جواب یہی ہے کہ میں اُس خاتون سے ملاقات کرنا ختم نہیں کروں گی'' ۔(۱۲۳)

اپنی آپ بیتی کے باب نمبر 9 میں کلثوم بیگم نے صراحت سے اپنے سیاسی کارنامے اور فلاحی کاموں کی فہرست دی ہے۔ علاقے کی ترقی، لکی مروت کے بنجر اور پسماندہ علاقے میں جینے کی سہولیات، خواتین میں سیاسی بیداری، سیف اللہ خان ٹرسٹ کے نیچے ذہین طلباء کو وظائف کی ادائیگی، آل پاکستان ویمن ایسوسی ایشن (اپو) سے وابستگی، دخوبندو کور (بہنوں کا گھر) بے سہارا بچیوں کی کفالت کا بندوبست، گرلز ہاسٹل کے قیام، وہ کاوشیں تھیں جس کے سبب نہ صرف بیگم کلثوم بلکہ اُن کے پورے خاندان کا نام ہمارے صوبے کے جنوبی اضلاع میں عزت و وقار سے لیا جاتا ہے۔

بیگم کلثوم سیف اللہ نے ملک کے آئینی بحرانوں، فوجی حکومتوں اور بیوروکریسی کے ظلم و زیادتیوں کے حوالے سے کوئی خاص تبصرہ نہیں کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ زیادہ لکھی پڑھی نہیں تھیں اور ملکی یا غیر ملکی سیاست اور ثقافتی تبدیلیوں کا بھی اُس نے ژرف نگاہی سے مطالعہ نہیں کیا تھا۔ اُن کا تعلق ایک نیم جاگیردارانہ اور نیم صنعت کار گھرانے سے تھا۔ بزنس کمیونٹی میں وہ مجبوری سے آئی تھی اور سیاست میں حادثاتی طور پر۔ ''میری تنہا پرواز'' میں پرواز کا تو مشاہدہ کیا جا سکتا ہے بلندی سے کیے گئے مشاہدات و تاثرات سے مذکورہ آپ بیتی عاری ہے۔ یہاں تک تو درست ہے کہ ملک کے وہ چھوٹے بڑے حادثات یا واقعات جنہوں نے ہمارے قومی دھارے تبدیل کیے کا ذکر کرتی ہیں لیکن سرسری طور پر۔ دلی لگاؤ سے واقعہ قلمبند کرنا اور پھر اپنی ذات کے حوالے سے اُس واقعے کا تجزیہ کر کے نتائج اخذ کرنا ایک بڑے فن کار اور دانشور کی خصوصیت ہے ہم بیگم کلثوم سیف اللہ سے یہ توقع بھی نہیں کرتے لیکن سماجی تغیرات، ثقافتی تصادم اور سوشل میڈیا کے

برپا کیے گئے انقلاب سے پہلو تہی کرنا باعث حیرت بھی ہے اور باعث افسوس بھی البتہ کہوٹہ، ڈاکٹر عبدالقدیر خان، اقوام متحدہ اور ممتاز سیاسی شخصیات کے بارے میں جو چشم کشا واقعات درج کیے ہیں وہ ہماری سیاسی، معاشی اور معاشرتی تاریخ کے حوالے سے خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ سانحہ اوجڑی کیمپ کے بارے میں لکھتی ہیں:

''میں نے اُس وقت بھی ایوان میں تقریر کرتے ہوئے برملا کہا تھا کہ یہ سب کچھ فوج کے چند جرنیلوں نے خود کیا ہے۔ میں اب بھی وثوق سے کہتی ہوں کہ جرنل ضیاءالحق کی ہدایت پر اوجڑی کیمپ کے اسلحہ ڈپو سے کچھ اسلحہ سٹنگر میزائل نکال کر ایران کو فراہم کیا گیا۔ امریکہ کو خبر ہو گئی تو انہوں نے اپنی ٹیم بھیجی تاکہ پڑتال کر سکیں تاہم امریکی ٹیم کے آنے سے پہلے ہی جنرل ضیاءالحق کے حکم پر اوجڑی کیمپ کا وہ اسلحہ ڈپو دھماکے سے اُڑا دیا گیا'' ۔(۱۲۴)

بیگم صاحبہ نہ صرف امریکی دوستی کو ناقابل اعتبار سمجھتی ہیں بلکہ ملک کے زیادہ تر مسائل کا ذمہ دار امریکہ کو قرار دیتی ہیں۔ پاکستان میں ہونے والے دہشت گرد واقعات کو بھی بھارتی امریکی اور افغانستان کی گٹھ جوڑ بتاتی ہیں۔ دہشت گردی کے اسباب اور روک تھام کے بارے میں کہتی ہیں:

''دہشت گردی اور انتہا پسندی نے ہمارے معاشرے کو تباہی کے دھانے پر لا کھڑا کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہمارے معاشرے اور سیاست میں دہشت گردی اور انتہا پسندی کیوں آ گئی؟ میرا خیال ہے کہ اس کا اصل سبب غربت ہے لیکن اس کو ایک دوسرے پہلو سے بھی دیکھیے، جلال آباد اور پشاور میں فاصلہ ہی کتنا ہے وہاں افغانستان میں بھارت نے 15 قونصلیٹ قائم کیے ہیں کیا بھارت کو افغانستان سے اتنی محبت ہو گئی ہے کہ وہ یہ افغان عوام کی بہتری کے لیے قائم کرے گا۔ دراصل ان قونصلیٹوں سے لوگوں کو تیار کر کے پاکستان بھیجا جاتا ہے۔'' (۱۲۵)

میری تنہا پرواز بیگم کلثوم سیف اللہ کی وہ کامیاب آپ بیتی ہے جو اُن کی زندگی کے کئی اہم ادوار کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ ہم اس کتاب کو سرگزشت نہیں آپ بیتی کہیں گے کیونکہ اس کی خصوصیات زیادہ تر فن آپ بیتی کے قریب قریب ہیں۔ مصنفہ نے صرف اُن لوگوں پر قلم اُٹھایا ہے جن کا اُن سے قریب کا تعلق رہا ہے۔ مصنفہ نے کہیں بے جا خوستائی سے کام نہیں لیا وہ اُس مقام پر بھی اپنی کامیابیاں اللہ رب العزت کی خصوصی فضل خیال کرتی ہیں جب خاوند کی ناگہانی موت کے بعد اُس نے تنکا تنکا جمع کر کے ملک کے نامور صنعت کاروں اور سیاست دانوں میں اپنی جگہ بنالی۔ آپ نے واقعات براہ

راست اور بے کم و کاست بیان کیے ہیں۔ جہاں تک اسلوب کا تعلق ہے یہ آپ بیتی معلومات کے لحاظ سے تو اہم ہے لیکن اسلوب کے لحاظ سے زیادہ اہم نہیں۔ زبان و بیان میں کئی نقص ہیں۔ روز مرہ کے استعمال پر مصنفہ کو بالکل قدرت نہیں۔ محاورات میں بھی رد بدل کر کے زبان کا حلیہ بگاڑا ہے۔ مصنفہ نے اکثر موقعوں پر پشتو سے اُردو میں براہ راست ترجمہ کیا ہے بلکہ بعض مقامات پر تو پشتو کے ضرب الامثال کا بھی براہ راست (direct) ترجمہ کیا ہے حالانکہ وہاں اُردو کے متبادل ضرب الامثال لکھنے چاہیے تھے۔ کتاب کے بعض حصوں پر خطیبانہ انداز چھایا ہوا ہے۔

''ہم اور امریکہ'' کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے گویا سٹیج سے سامعین اور حاضرین سے داد سمیٹنے کے لیے اُن کا اور اپنا لہو گرما رہی ہیں:

> ''آپ کیوں ہمارے مسائل اور معاملات میں دخل اندازی کرتے ہیں؟ کیا ساری دنیا میں آپ کو پاکستان کی ہی فکر لاحق ہے؟ آپ کو پاکستان کے سوا کوئی دوسرا ملک کیوں نظر نہیں آتا۔'' (۱۲۶)

پوری کتاب میں اپنے بیٹوں کی قابلیت، صلاحیت، خوبصورتی اور فرمانبرداری کی داستانیں بیان کی ہیں۔ جب اس سے جی نہیں بھرا تو ایک باب الگ اُن کے لیے مختص کر کے دل کا بوجھ ہلکا کیا۔ مزید یہ کہ مصنفہ کی علمی بصیرت، انسانی نفسیات سے آگاہی اور بین الاقوامی حالات و واقعات سے عدم واقفیت یا عدم دلچسپی کا تاثر جگہ جگہ محسوس ہوتا ہے۔ واقعات کے انتخاب میں تو فنی تدبر سے کام لیا ہے لیکن بیان میں تنقیدی شعور سے کام نہیں لیا۔ بیگم کلثوم سیف اللہ کا اسلوب سادہ، سپاٹ اور رواں ہے۔ بات گھوم پھیر کے پھر وہی آجاتی ہے کہ مصنفہ کا تعلق ایک کٹر پشتون گھرانے سے ہے اُن کی تعلیم بھی واجبی سی ہے۔ ایک امیر گھرانے سے تعلق ہونے کی بدولت اُس نے زندگی کو شیوہ ہزار رنگ سے نہیں برتا تھا۔ اس لیے جو سادگی، خلوص، مٹھاس، روایت پسندی، اخفا اور فطری حیا اُس کی ذات کا حصہ تھی وہ اُن کے اسلوب میں بھی واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔ جو کچھ اُس نے تحریر کیا وہ بھی غنیمت ہے۔ سچائی، خلوص، رواداری اور حب الوطنی وہ عناصر ہیں جن کے بغیر انسانی شخصیت پروان چڑھتی ہے اور نہ ادبی پیش کش کبھی کامیاب ہوسکتی ہے اور یہ عناصر '' میری تنہا پرواز'' کی جان ہیں۔ مصنفہ کی اپنی ثقافت، دین، وطن اور عقائد و نظریات سے اٹوٹ تعلق کو درج ذیل اقتباس میں دیکھا جاسکتا ہے؛

> ''کم و بیش ساری دنیا گھومنے اور مختلف ملکوں کے عوام اُن کے رہن سہن اور ماحول کو قریب سے دیکھنے کے بعد میں نہایت وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ مجھے ساری دنیا میں صرف دو ممالک ہی میں ذہنی سکون اور آسودگی میسر آئی یہ دو ممالک میرا پیارا پاکستان اور حجاز مقدس ہیں۔ پاکستان میری جان ہے اور سعودی عرب میرا ایمان''۔(۱۲۷)

فرزند پاکستان (شیخ رشید احمد)

فرزند پاکستان ایک غریب سیاسی کارکن اور قومی لیڈر شیخ رشید احمد کی سرگزشت ہے۔ شیخ رشید احمد کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ کسی امیر کبیر، سیاسی خانوادے یا صنعت کار خاندان سے تعلق نہ ہونے کے باوجود ایک معمولی سیاسی کارکن سے بڑی سطح کے قومی اور عوامی لیڈر بنے۔ شیخ رشید احمد پاکستانی سیاست کے وہ مقبول نام ہیں جن کے نام سے ملک کا ہر وہ شخص واقف ہے جو ذرا بھی سیاسی سوجھ بوجھ رکھتا ہے۔ راولپنڈی کے بھابھڑے بازار کے ایک خستہ اور تنگ مکان سے لال حویلی تک سفر کرنے والا یہ انقلابی لیڈر 1950ء میں ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوا۔ طالب علمی کے زمانے میں سیاست میں قدم رکھا ساٹھ کی دہائی میں انہیں اُس وقت ملک گیر شہرت ملی جب صدر ایوب کے خلاف عوامی تحریک زوروں پر تھی۔ آپ نے اِس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ گورڈن کالج راولپنڈی سے سیاسیات میں ایم اے کرنے کے بعد اصغر خان کے ''تحریک استقلال''میں شمولیت اختیار کی۔ 1985ء سے اب تک قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوتے آئے ہیں۔ وہ آٹھ مرتبہ اپنے حلقے سے ممبر قومی اسمبلی منتخب ہو چکے ہیں اُن کا یہ ریکارڈ ثابت کرتا ہے کہ وہ راولپنڈی کے معروف سیاسی شخصیت ہیں۔ شیخ رشید اپنی شعلہ بیانی اور پُرزور عوامی خطابت کے بل پر مخالف سیاسی جماعتوں کے لیے ہمیشہ پریشانی کا باعث بنے رہے۔ نواز شریف کے دونوں ادوار میں کابینہ کے رکن رہے اسمبلی کے اندر اور اسمبلی سے باہر مخالفین پر سخت تنقید کرنے کی وجہ سے وہ کئی بار جیل بھی گئے۔ سیاسی مخالفین نے اُن کی زبان بندی کے لیے قسم قسم کے حربے استعمال کیے لیکن وہ شیخ رشید کو خاموش کرانے یا خریدنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ شیخ رشید کی وجہ شہرت ان کا عوامی انداز، جوش خطابت، لال حویلی اور سیاسی پیش گوئیاں ہیں۔

یوں تو شیخ رشید احمد نے صدر ایوب، یحییٰ خان، ذوالفقار علی بھٹو اور ضیاءالحق کے زمانے میں بارہا قید و بند کی تکلیفیں برداشت کیں لیکن ایک جمہوری دور یعنی بے نظیر بھٹو کی وزارت عظمیٰ کے زمانے میں انہیں پانچ ماہ میں ۹ مرتبہ پنجاب کے مختلف جیلوں میں ڈالا گیا۔ آخری مرتبہ اکتوبر 1993ء کو سات سال قید بامشقت کی سزا سنائی گئی۔ یہ آپ بیتی شیخ رشید احمد کے جیل کے دنوں کی تحریر ہے۔ فرزند پاکستان بظاہر سرسری اور نامکمل آپ بیتی لگتی ہے لیکن بغور مطالعہ کرنے سے اس کی یہ خصوصیات اس کو مکمل اور کامیاب آپ بیتیوں کی فہرست میں شامل کرتی ہیں۔(۱) مربوط انداز(۲) وحدت تاثر (۳) تاریخی ترتیب(۴) ذاتی مشاہدہ (۵) حق گوئی اور صداقت۔ اس لیے ہم نے فرزند پاکستان کو مکمل آپ بیتیوں کے باب میں جگہ دی ہے۔

۷ افروری 1950ء کو پیدا ہونے والے شیخ رشید نے اپنے بچپن، گھر، خاندان، آباؤاجداد اور بچپن کی ہلکی پھلکی

شرارتوں سے اپنی خود نوشت کا آغاز کیا ہے۔ ابتدائی حصے میں شیخ صاحب نے زندگی کی چھوٹی چھوٹی تفصیلات بھی تحریر کی ہیں جس سے پورا نقشہ ذہن میں خود بخود آ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بہن بھائیوں کی تعداد، روزگار اور پسند و مشاغل کی مکمل تفصیلات بتائی ہیں۔ سکول کے ابتدائی سالوں اور اوائل بچپن کے واقعات سے انداز ہوتا ہے کہ وہ ایک خود سر، ضدی، جھگڑالو، اپنی بات دوسروں پر منوانے والا اور حد درجہ سوشل بچے تھے بلکہ بقول اُن کے سیاست اور پارٹی بازی تیسری جماعت سے اُس نے شروع کرلی تھی۔ پرائمری سکول کے ابتدائی جماعتوں کے ان واقعات کو پڑھیے اور آج کے شیخ رشید سے موازنہ کیجئے آپ کو خوشگوار حیرت ہو گی:

''ابتدا سے کچھ ایسے دوستوں کی صحبت ملی کہ تیسری جماعت ہی میں پارٹی بازی شروع کر دی تھی۔ ہر دوسرے روز چھٹی کے بعد لڑائی مار کٹائی معمول بن گیا۔ اکثر گھر آتے ہوئے کپڑے پھٹے ہوتے یا تختی ٹوٹی ہوئی ہوتی دوسرے بچوں کی طرح مجھے گھر سے لنچ بکس نہیں ملتا تھا اس لیے دوسروں کی لنچ بکس پر گزارہ کرتا تھا۔ (اس لیے) چھٹی جماعت سے میں سکول کے نامور لڑکوں میں شامل ہو چکا تھا۔'' (۱۲۸)

محلے کی ہر چھوٹی سی چھوٹی بات سے باخبر رہنا حتیٰ کہ اگر کوئی بکری بچہ جنے تو اُس کو اطلاع مل جانا، گلی کے نلکے پر سب کے بعد آنا اور سب سے پہلے بالٹی رکھنا، مرغیاں پالنا، محلے کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شیخ رشید کے محبوب مشغلے تھے۔ اُن کی آپ بیتی سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بچپن ہی سے جذباتی تھے اور شور و ہنگامہ پسند کرتے تھے اور یہ ساری باتیں انہیں مستقبل کے سیاسی ورکر کے طور پر انہیں تیار کر رہی تھیں۔ سیاست سے انہیں لگاؤ بچپن سے تھا۔ سیاسی جلسوں میں شرکت کرنا، اپنے حلقے کے کونسلر کے لیے ووٹ مانگنا اور بلدیاتی سیاست میں حصہ لینا شیخ رشید نے اس عمر سے شروع کیا تھا جب بچے جھجک کی وجہ سے بڑوں کے سامنے بول بھی نہیں سکتے چنانچہ لکھتے ہیں:

''تیرہ یا چودہ سال کی عمر ہو گی کہ میں نے سیاست کے خار زار میں قدم رکھ دیا تھا۔ بنیادی جمہوریت کے انتخاب میں محمد اکمل کی حمایت کی اور گھر گھر اُن کے لیے ووٹ مانگے۔ ایوب خان کے خلاف میں مادر ملت کا انتخابی نشان لالٹین کرائے کی سائیکل سے لٹکائے پھرتا تھا۔''(۱۲۹)

اپنی خود نوشت کے اس پہلے حصے میں اگرچہ زندگی کے تمام اہم حالات اختصار سے لکھے ہیں لیکن اُن کا زیادہ تر

جھکاؤ سیاسی واقعات کی طرف ہے۔ شیخ رشید سیاست کے بغیر کسی اور ایشو پر بات کرنا گوارہ ہی نہیں کرتے۔ اگر وہ بچپن کے حالات، تقریبات، سماجی حالات، رسوم و رواج اور تہذیب و معاشرت کو بھی تفصیل سے لکھتے تو اُن کی آپ بیتی کی اہمیت دو چند ہوتی۔ شیخ رشید بچپن ہی سے سیاست میں آئے تھے اور یہ کہ اُس نے اپنی آپ بیتی خالص سیاسی نقطہ نگاہ سے لکھی اس لیے فوراً سیاسی موضوع کی طرف رجوع کرنا اُن کی مجبوری تھی۔

شیخ رشید پاکستان کے اُن سیاسی ورکروں میں سے ہیں جو انتہائی غریب خاندانی پس منظر رکھنے کے باوجود اپنی محنت اور سیاسی سوجھ بوجھ کی بدولت ملکی سیاست میں مرکزی مقام بنانے میں کامیاب ہوگئے۔ آپ قومی سطح کے اُن سیاسی رہنماؤں میں شامل ہیں جو طالب علمی کے زمانے سے سیاست میں آئے اور ایک ممتاز مقام حاصل کر گئے۔ سیاست کو اُنھوں نے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ اس طرح انہوں نے ہر رنگ اور ہر زاویے سے زندگی کا مشاہدہ کیا۔ انہیں پہلی جیل ہائی سکول کے زمانے میں پندرا سال کی عمر میں اُس وقت ہوئی جب 1965ء کی پاک بھارت جنگ کے بعد لوگوں نے اعلان تاشقند کے بعد غم و غصے کا اظہار کر کے ایوب خان حکومت کے خلاف تحریک شروع کی۔ سکول اور کالج کے لڑکے بھی اس تحریک میں پیش پیش تھے۔ ایک جلوس میں شامل ہو کر شیخ رشید نے پہلی گرفتاری دے دی لیکن کم عمری کی وجہ سے مقدمہ بنائے بغیر پولیس نے انہیں رہا کر دیا اس بارے میں شیخ رشید کہتے ہیں:

> ''اُس دن میں نے دل کھول کر نعرے لگائے۔ آج بھی جب اُس واقعے کا خیال آتا ہے تو عجیب سا نشہ محسوس کرتا ہوں۔ کیا شان تھی۔ اُس روز کالج کے لڑکوں نے مجھے کندھوں پر اُٹھا رکھا تھا اور میں نعرے لگوا رہا تھا۔ اعلان تاشقند مردہ باد، ہندوستان کا جو یار ہے وہ غدار ہے غدار ہے، کشمیر کا سودا نا منظور۔'' (۱۳۰)

پولی ٹیکنکل کالج راولپنڈی میں داخل ہونے کے بعد شیخ صاحب نے سٹوڈنٹ یونین اور کالج کی سیاست میں بھر پور حصہ لیا۔ اس آپ بیتی سے عیاں ہے کہ پولی ٹیکنکل کالج ہو یا گورڈن کالج راولپنڈی ہر سیاسی یونین میں آپ پیش پیش ہوتے بلکہ پنجاب کے جن سر پھیرے طلباء نے صدر ایوب کے خلاف بھر پور تحریک کا آغاز کیا جو بالآخر ایوب خان کے استعفے پر ختم ہوئی، میں راولپنڈی سے شیخ رشید ہر اول دستے کے انچارج تھے۔ اس پر انہیں ایک سال قید کی سزا بھی ہوئی تاہم یہاں سے وہ قومی سیاسی افق پر ایسے نمودار ہوئے کہ پچاس سال کے بعد بھی ہمارا سیاسی نقشہ شیخ رشید کے بغیر نامکمل نظر آتا ہے۔ لوگ ایوب خان کے دور کو معاشرتی اور صنعتی اعتبار سے ملک کا سنہری دور کہتے ہیں لیکن شیخ رشید اُس دور پر کچھ اور تبصرہ کرتے ہیں:

''نوجوان طبقہ خصوصاً طلباء یہ محسوس کر رہے تھے کہ اُن کی محرومیوں کی بنیادی وجہ ایوب خان کا صدارتی نظام ہے۔ متوسط طبقہ بھی ایوب خان سے بیزار تھا کیونکہ اس طبقے کے لوگ بھی ایوب خان کی اصلاحات سے کچھ حاصل نہیں کر سکے تھے اس زمانے میں ایوب خان کی عشرہ ترقی کی جو تقاریب ہوئیں اس کے خلاف بھی شدید ردعمل ہوا تھا لوگوں میں یہ تاثر عام تھا کہ اُن کو تو درحقیقت پیٹ بھر کر کھانے کو کچھ نہیں ملتا اور حکومت عشرہ ترقی منا رہی ہے۔'' (۱۳۱)

شیخ رشید احمد نے ایوب کے آخری دور اور یحییٰ خان کے عہد کی تفصیلات بڑے اچھے انداز سے پیش کی ہیں۔ چند سالوں پر مشتمل اس دور کی آپ بیتی اگرچہ شیخ رشید کی ذات کے ارد گرد گھومتی ہے لیکن یہ دراصل ہمارے ملک کی تاریخ کا نہایت اہم باب ہے۔ 1965ء سے 1971ء کا زمانہ فوجی آمروں کی اُٹھان، بیوروکریسی کی لامحدود طاقت، جمہوری لوگوں کی بے بسی اور عوام کی بدحالی کی داستان ہے۔ یہ وہ دور ہے جہاں مشرقی پاکستان کے رہنے والوں کی احساس محرومی میں اضافہ ہوا، بلوچستان میں شورش بڑھی اور نتیجے کے طور پر وطن عزیز سیاسی، معاشی اور معاشرتی تنزلی کی طرف گامزن ہوا۔ صدر ایوب کے خلاف اُٹھائی گئی تحریک، ذوالفقار علی بھٹو کی وزارت عظمیٰ کا پُر آشوب زمانہ، بنگلہ دیش نامنظور تحریک، ختم نبوت کی تحریک، لیاقت باغ کی خونریزی، طلباء تحریکیں، اساتذہ، وکلا اور علماء کی تحریک غرض ہر سیاسی یا نیم سیاسی تحریک میں شیخ رشید نہ صرف شامل رہے بلکہ سب سے آگے آگے رہے۔ اس پاداش میں وہ بارہا گرفتاری کے عمل سے گزرے، ڈنڈے کھائے، پولیس کے سخت تشدد کا نشانہ بنے، عزیزوں اور رشتہ داروں کا لعن طعن برداشت کیا، لیکن زندگی میں سیاست کا جو پرخار راستہ اس نے اختیار کیا تھا اس پر شیخ رشید کے قدم آگے ہی آگے بڑھتے رہے اور سٹوڈنٹ سیاست سے عملی سیاست میں آئے۔ شیخ رشید پہلی مرتبہ 1985ء کی غیر جمہوری انتخابات میں راولپنڈی اپنے آبائی حلقے سے قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے، نچلے طبقے اور غریب پس منظر سے تعلق رکھنے والے اور سفید پوش لوگ قومی اسمبلی یا صوبائی اسمبلی کا الیکشن لڑنے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ یہاں لاکھوں کروڑوں الیکشن پر لٹانے والا اُمیدوار ہی کامیاب ہوتا ہے تاہم شیخ رشید صاحب نے یہ ثابت کر دیا کہ اگر انسان محنت کرے، لگن ہو اور عوام کے ساتھ قریب کا تعلق پیدا کیا جائے تو غربت، غیر سیاسی پس منظر اور بڑے لوگوں کی پشت پناہی کے بغیر بھی ایک اُمیدوار کامیابیاں سمیٹ سکتا ہے چنانچہ لکھتے ہیں :

''پیسے ختم ہو چکے تھے۔ میں نے اپنے حامیوں سے کہا کہ وہ خود ٹینٹ جھنڈیوں اور گاڑیوں کا بندوبست کریں۔ کم و بیش 200 پولنگ سٹیشن تھے۔ اگر ایک پولنگ

سٹیشن پر خواتین کے لیے دو دو گاڑیاں نکالی جاتیں تو دو سوزوکی وینوں کی ضرورت تھی جس کا کوئی بندوبست نہ تھا۔ رات ممتاز کالج کے پھٹے پر سوتا تھا۔"(۱۳۲)

بدقسمتی سے ہماری سیاسی تاریخ ذاتی مفادات،اقتدار اور لوٹا کریسی سے عبارت رہی ہے۔ نظریاتی سیاست ہندوستان کے بٹوارے کے بعد ختم ہو گئی۔ نظریے اور قیادت سے وفاداری کا یہ عالم ہے کہ جس شخص کو پارٹی الیکشن کے لیے ٹکٹ نہیں دیتی وہ پارٹی چھوڑ کر دوسری پارٹی میں چلا جاتا ہے یا آزاد اُمیدوار کے طور پر انتخابات میں حصہ لے کر پارٹی سے بغاوت کر لیتا ہے۔ بے وفائی، طوطا چشمی، حالات کے مطابق وفاداری کی تبدیلی ہمارے ہاں عمومی رویے ہیں جس کو "سیاست" کہا جاتا ہے تاہم شیخ رشید صاحب سیاست کے ابتدائی دنوں میں روایتی سیاست دانوں سے الگ نظر آتے تھے (گو کہ بعد میں اُس میں اور دیگر سیاست دانوں میں زیادہ فرق نہیں رہا) جب محمد خان جونیجو کو ضیاء الحق نے وزارت سے الگ کر کے اسمبلیاں توڑ دیں اور اکثر سیاست دان جونیجو کو چھوڑ کر دوسری پارٹی سے مل گئے شیخ رشید نے ضیاء الحق کی پروا کیے بغیر راولپنڈی میں جونیجو کے حق میں ایک بڑا جلسہ منعقد کروایا اس موقع پر وہ اپنے مزاج، دلی کیفیت اور اُصول پرستی کا ان الفاظ میں اظہار کرتے ہیں:

"میں اقتدار کے وقت تو کسی کو چھوڑ سکتا ہوں لیکن امتحان کے وقت چھوڑنا میری شان کے خلاف ہے۔ سفید پوش لوگوں کی قیادت جو قیام پاکستان کی جدوجہد میں ان سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور نوابوں کا سیاست میں مقابلہ کرتی رہی لیکن پاکستان بننے کے بعد اس مقابلے کے بعد دستبردار ہو گئی اور میدان اُن لوگوں کے ہاتھ آیا جو قیام پاکستان کے وقت انگریزوں کے ساتھ تھے۔ میں اگر حکومت کے سامنے لچک دکھاتا تو میری کلاس کے لوگوں کے لیے ایک طعنہ ہوتا کیونکہ میں تنکا تنکا جوڑ کر برادری ازم، جاگیرداری اور سرمایہ داری کے خلاف آواز بلند کر کے یہاں تک پہنچا ہوں۔" (۱۳۳)

انداز خطابت، تقریر کا عوامی انداز، ذومعنی جملے، سگار اور لال حویلی شیخ رشید کے ساتھ لازم وملزم ہو گئے ہیں۔ "فرزند پاکستان "،میں شیخ رشید نے لال حویلی پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے کہ کس طرح یہ ایک ہندو ساہوکار کی ملکیت میں تھی، قیام پاکستان کے بعد کئی لوگوں نے اسے خریدا اور پھر شیخ رشید کے قبضے میں آئی۔ یہ الیکشن آفس، عوامی رابطے کی جگہ، جلسے کرنے کا مقام، سیاسی پبلک سیکرٹریٹ، کئی نامور لوگوں کی ٹھہرنے کی جگہ بنی۔ سیاسی لیڈروں نے یہاں خطاب

کیا، کشمیر کی آزادی کی تحریک کے سر کردہ رہنماؤں نے نہ صرف یہاں قیام کیا بلکہ یہاں تقریریں کیں۔ خود شیخ رشید لال حویلی کو ظالموں کے خلاف مظلوم کی آواز کہتے ہیں:

> ''متعدد مرتبہ پاکستان کی قومی اسمبلی اور بھارت کی لوک سبھا میں اِس کا ذکر آیا۔ میں نے قومی اسمبلی میں ایک ہی جواب دیا کہ یہ ظالموں کے خلاف مظلوموں کی آواز ہے اور یہ وہ قلعہ ہے جو آخری گولی اور خون کے آخری قطرے تک ملک دشمن اور جمہوریت دشمن طاقتوں سے لڑتا رہے گا۔''(۱۳۴)

ہمارے ملک میں انٹیلی جنس ایجنسیاں کیا کردار ادا کر رہی ہیں۔ جمہوری نمائندوں پر زندگی کس طرح تنگ کر دی جاتی ہے۔ حکمرانوں کے سامنے فوجی اور سول اسٹبلشمنٹ کون کون سے روڑے اٹکاتی ہیں۔ ہماری تاریخی کتابوں میں اس کا ذکر ہو یا نہ ہو لیکن معاصر آپ بیتیوں میں کافی مواد پڑا ہوا ہے۔ فرزند پاکستان بھی اِس حوالے سے ایک اہم آپ بیتی ہے جس میں مصنف نے بیورو کریسی اور خفیہ ایجنسیوں کے اصل چہرے بے نقاب کیے ہیں:

> ''کہنے کو تو میں وفاقی وزیر تھا۔ نواز شریف کے قریبی ساتھیوں میں شامل تھا لیکن میرا فون بھی محفوظ نہ تھا اور میرے کمرے کو بگ کیا جا رہا تھا۔''(۱۳۵)

''فرزند پاکستان'' کی خاص بات اِس کی سچائی اور کھرا پن ہے۔ شیخ رشید کی یہ پہچان ہے کہ وہ لگی لپٹی کے بغیر سچی بات کہتا ہے۔ اُن کی یہ آپ بیتی بھی اُس کی صداقت کی غماز ہے۔ اُن ہی کے الفاظ میں:

> ''ایک بات اچھی یا بُری مجھ میں رہی ہے کہ جب میں کوئی فیصلہ کر لیتا تو اِس میں تبدیلی نہیں کرتا۔''(۱۳۶)

سیاسی لوگوں میں جہاں جہاں وہ کمزوریاں، جھوٹ اور بے ایمانی دیکھتے ہیں اِس پر بے لاگ تبصرہ کرتے ہیں۔ بعض اوقات اُن کا لہجہ بہت سخت ہو جاتا ہے۔ صوبہ سرحد کے ایک سیاسی خاندان یعنی سیف اللہ خاندان کا یوں ذکر کرتے ہیں:

> ''میرے خیال میں محمد خان جونیجو کی یہ بھی ایک بڑی غلطی تھی کہ اُنہوں نے اسلم خٹک جیسے شخص کو ایسے حساس واقعے (سانحہ اوجڑی کیمپ) کی تحقیقات کمیٹی کا سربراہ بنایا جبکہ اُس کا سارا خاندان ایجنسیوں کی تابعداری کی سیاست کرتا ہے۔ جس خاندان سے اُس کا تعلق تھا اُنہوں نے وقت کی مصلحت اور مفادات کے لیے کبھی ضمیر کی آواز کو نہیں ٹٹولا۔ یہ سارا خاندان تحریک آزادی سے لے کر آج تک

صرف اپنی مفادات کے لیے سیاست کرتا آیا ہے۔"(۱۳۷)

آزاد کشمیر کے سابق وزیر اعظم اور سیاسی لیڈر سردار قیوم کی شخصیت پر اپنے تجربے کی روشنی میں یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں:

"سردار قیوم نے مجھے بہت مایوس کیا۔ شاید میں غلطی پر ہوں لیکن بہت قریب سے یہ میرا مشاہدہ ہے کہ سردار قیوم نے کشمیر کی آزادی کے لیے اِتنا کام نہیں کیا جتنا وہ اپنے اقتدار کی خاطر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔"(۱۳۸)

تقریباً تمام سیاسی رہنماؤں، لیڈروں اور حکمرانوں پر کڑی تنقید کرنے والا شیخ رشید بعض سیاسی مخالفین کا اچھے الفاظ میں ذکر بھی کرتے ہیں۔ پرویز رشید کے بارے میں اُن کا تجزیہ ہے:

"ہارنے کے بعد پرویز رشید جس طرح کھلے دِل سے مجھے ملا اور جس طرح اُس نے مجھے مبارکباد دی وہ میں ساری زندگی نہیں بھول سکوں گا۔ اِتنے اچھے دِل کا خوبصورت سیاسی حریف مجھے ساری زندگی میں پھر کبھی نہیں ملا۔"(۱۳۹)

"فرزند پاکستان" کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ یہ آپ بیتی کم اور سیاسی سرگزشت زیادہ ہے۔ مصنف نے اپنے سیاسی مشاہدات بیان کرکے مختلف حادثات و واقعات سے اپنی وابستگی تو دیکھائی ہے تاہم اکثر مختلف واقعات سے آز خود نتائج بھی اخذ کیے ہیں۔ ایک اچھی آپ بیتی کی یہ نشانی ہے کہ مصنف واقعے سے کوئی نتیجہ نہیں نکالتا بلکہ قاری پر چھوڑ دیتا ہے۔ اِس وصف کی پوری آپ بیتی میں کمی محسوس ہو رہی ہے۔ مصنف نے سیاسی اور سماجی تبدیلیوں، بین الاقوامی منظر نامے، اقربا پروری اور بدعنوانیوں کی چشم کشا رپورٹ درج نہیں کیں۔ سیاسی واقعات کے اصل حقائق کا تفصیلی تجزیہ بھی نہیں کیا۔ اکثر بہت زیادہ اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ اِس آپ بیتی میں کئی جگہوں پر شدید تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔

"فرزند پاکستان" ایک سیاسی خودنوشت ہے جس میں مصنف نے اپنی کہانی اور سیاسی کارنامے بیان کیے ہیں۔ یہ اعلیٰ پائے کے اسلوب میں لکھی گئی خودنوشت نہیں بلکہ سادہ، سلیس اور عوامی انداز میں لکھی گئی آپ بیتی ہے۔ اِس آپ بیتی کی ایک خصوصیت اِس کا بے تکلفانہ انداز ہے۔ شیخ رشید بنیادی طور پر عوامی خطیب ہیں اور خطابت میں اُن کی برابری کرنے والے سیاستدان کم کم ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی خودنوشت میں جگہ جگہ خطیبانہ اسلوب پایا جاتا ہے:

"جس طرح ہمیں عادت پڑ گئی ہے کہ ہم ہر چیز باہر سے منگوانے کا شوق رکھتے ہیں۔ جس طرح ہمیں عادت پڑ گئی ہے کہ ہم اپنے ملک کی اشیاء سے مطمئن نہیں ہوتے۔ ہم غریب ملک کے شہری ہیں۔ ہمیں اپنی قوم کے مسائل سے بخوبی آگاہ

ہونا چاہیئے۔ ہم ٹینٹوں میں کام کر سکتے ہیں، ہم بھوکے رِہ سکتے ہیں، ہم پیاسے رِہ سکتے ہیں لیکن ہم اپنے ملک کی خودداری اور غیرت کا سودا نہیں کر سکتے۔"(۱۴۰)

شیخ رشید احمد تقریر کی طرح تحریر میں بھی نازیبا الفاظ استعمال کرنے سے نہیں کتراتے۔ عامیانہ محاورے سیاسی جلسے میں تو قابل قبول ہو سکتے ہیں لیکن تحریر خصوصاً آپ بیتی میں کسی صورت قابل برداشت نہیں۔ کتابیں لکھے پڑھے لوگ پڑھتے ہیں۔ اِس کے علاوہ سیاسی لیڈروں کی لوگ پیروی کرتے ہیں اِس لیے اُنہیں شائستہ زبان استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔ "فرزند پاکستان" کے چند عامیانہ محاورے (Slang) ملاحظہ ہوں:

"گورڈن کالج میں رات والے پھڈے کی خبر ہو چکی تھی۔"(۱۴۱)

"اُن مشوروں نے فائدہ کم "پھڈا" زیادہ ڈالا۔"(۱۴۲)

لکی مروت کے سیف اللہ خاندان کے بارے میں لکھتے ہوئے کتنی بازاری زبان استعمال کی ہے:

"جنرل فضل حق نے اِس خاندان کا پیچ ٹائٹ کیا تھا۔ تب اُنہوں نے ۹۰ زاویے سے ناکیں رگڑیں۔"(۱۴۳)

شیخ صاحب اکثر محاورات میں اپنی مرضی کے مطابق ردوبدل کرتے ہیں۔ روزمرہ کے استعمال پر اُنہیں نہ تو عبور ہے اور نہ درست روزمرہ کے استعمال میں سنجیدہ نظر آتے ہیں۔ اُن کے بعض جملے انتہائی نامانوس اور عجیب انداز میں سامنے آتے ہیں:

"جیل کے حالات خوفناک حد تک خراب ہونے کے قریب تھے۔"(۱۴۴)

یا مثلاً:

"اور پھر سینیٹ کے اجلاس میں صدر اسحاق کے خلاف اعلانِ جنگ کا بگل بجا دیا۔"(۱۴۵)

شیخ رشید نے بعض جگہوں پر دلکش اسلوب بھی استعمال کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر وہ اس طرف سنجیدگی سے دھیان دیتے تھے تو "فرزند پاکستان" اسلوبیاتی نقطہ نظر سے بھی اہمیت کی حامل ہوتی:

"یہ نہیں ہو سکتا کہ کیمرہ حکومت کا ہو، کیمرہ مین ایم کیو ایم کا۔"(۱۴۶)

شیخ رشید ایک جملے سے کئی کئی صفحات کا کام لیتے ہیں۔ اُس نے لمبے چوڑے اقتباس کو صرف ایک آدھ جملے میں بیان کر دیا ہے:

"جام صادق اپنوں کو بانٹتے تھے اور مخالفوں کو ڈانٹتے تھے۔ سندھ کے خزانے کو اُس نے ایسے لٹایا جیسے اندھا ریوڑیاں بانٹتا ہے۔"(۱۴۷)

سچ تو یہ ہے (چودھری شجاعت حسین)

معروف سیاستدان چودھری ظہور الٰہی کے بیٹے چودھری شجاعت حسین ہمارے ملک کے ایک نامی گرامی سیاستدان ہیں جو نہ صرف پچھلے تین دہائیوں سے عملی سیاست میں متحرک ہیں بلکہ ایک عرصے سے پاکستانی سیاست کے مرکز و محور ہیں۔ گجرات کی سیاست سے آغاز کرنے والے چودھری شجاعت حسین پہلے پنجاب کی سیاست اور پھر بعد میں وفاقی سیاست میں ایک اہم مقام حاصل کر گئے۔ حکومتیں بنانے، گرانے، فوجی حکمرانوں کے دست و بازو بننے اور پاکستانی سیاست کا گرو جاننے والے چودھری شجاعت حسین کو کاروبار اور سیاست اپنے والد چودھری ظہور الٰہی سے وراثت میں ملی۔ چودھری ظہور الٰہی بھی پنجاب سے ایک بڑے سیاسی لیڈر رہتے۔ جس نے ایوب خان اور ضیاء الحق کے ساتھ مل کر ملک میں آمرانہ دور کو مضبوط کرنے میں بڑا کردار ادا کیا تھا۔ اپنے باپ کے اچانک انتقال کے بعد چودھری شجاعت حسین نے نہ صرف اپنے کاروبار اور سیاست کو سنبھالے رکھا بلکہ اِس کو اور بھی ترقی دی۔

وطن عزیز میں ۱۹۹۰ء سے ۲۰۱۰ء تک کے زمانے میں چودھری شجاعت اور اُن کے کزن چودھری پرویز الٰہی کے بغیر کوئی حکومت نہیں بن سکتی تھی۔ ہمیشہ اُس پارٹی کا پلڑا بھاری رہتا جس میں چودھری برادران اپنا وزن ڈالتے۔ پنجاب کی سیاست میں ان کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۴۶ء کو ضلع گجرات میں پیدا ہونے والے چودھری شجاعت حسین پانچ مرتبہ ممبر پاکستان قومی اسمبلی اور دو مرتبہ سینیٹ کے ممبر منتخب ہوئے۔ اِس کے علاوہ ممبر پاکستان مجلس شوریٰ، قومی اسمبلی میں پارلیمانی لیڈر، وفاقی وزیر صنعت و پیداوار، وفاقی وزیر اطلاعات و نشریات اور وزیر اعظم پاکستان کے بلند ترین عہدوں پر فائز رہے۔ علاوہ ازیں وہ پاکستانی تاریخ کے اہم وقعات، سماجی اور ثقافتی تبدیلیوں، اقتدار کے غلام گردشوں اور اہم سیاسی تبدیلیوں کے چشم دید گواہ رہے ہیں۔ اِس لیے سیاسی طبقے میں آپ کی آپ بیتی کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ ''سچ تو یہ ہے'' چودھری شجاعت حسین کی پیدائش ۱۹۴۶ء سے لے کر ۲۰۰۸ء کے عام انتخابات تک آپ کی تقریباً باسٹھ سالہ زندگی پر محیط ہے۔ چودھری صاحب نے اپنی آپ بیتی میں کئی انکشافات کیے ہیں اور کئی قومی رازوں سے پردہ اُٹھایا ہے۔ وہ چونکہ صوبہ پنجاب اور وفاق میں بڑے عہدوں پر فائز رہے اور ہمارے ملک کے ایک اہم تاریخی باب کے بڑے کردار رہے وہ تاریخی دور جس میں ہمیں ہمارے معاشرے کے جمہوری اقدار کی مضبوطی، سیاسی آزادی، شخصی آزادی، تیز رفتار معاشرتی تبدیلیوں اور سوشو کلچرل تبدیلیوں کی طرف قدم تیزی سے اُٹھتے نظر آتے ہیں۔

۱۹۸۰ء سے ۲۰۱۰ء تک کا زمانہ ہمارے ملک کا کئی لحاظ سے اہم دور تسلیم کیا جاتا ہے۔ آنے والے وقت میں اِن دو دہائیوں کی خصوصی سیاسی اور تاریخی اہمیت ہو گی۔ ساری دنیا اِس دور میں کائناتی گاؤں (Global Village) کا روپ

اختیار کر گئی جس کے اثرات وطن عزیز میں بھی آ گئے۔ یہاں بھی جمہوری اقدار کی مضبوطی، انسانی آزادی اور معاشی استحکام کے لیے باقاعدہ تحریکیں اُٹھیں۔ اِس کے بعد کمپیوٹر، انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کی برق رفتار ترقی نے ہمارے بیشتر بنیادی اقدار کو تبدیل کر کے رکھ دیا۔ لازمی طور پر اِس عہد میں جتنے باشعور لوگ تھے خواہ اُن کا تعلق سیاست سے تھا یا تجارت سے، وکالت سے تعلق رکھتے تھے یا صحافت سے یا کسی اور میدان کے لوگ تھے اُنہوں نے اپنی زندگیوں میں بے شمار چیزوں کا مشاہدہ کیا اور ان تمام تبدیلیوں کو اپنے طور پر محسوس کیا۔ اِس تناظر میں جب ہم چودھری شجاعت حسین کی آپ بیتی ''سچ تو یہ ہے'' کو دیکھتے ہیں تو اِس بات کے قائل ہو جاتے ہیں کہ آج اِس آپ بیتی کی اہمیت اِتنی نہ سہی تاہم مستقبل میں اِس آپ بیتی اور اِس عہد کے دیگر آپ بیتیوں کو تاریخی اور ادبی حوالے کی کتابوں کے طور پر پڑھا یا جائے گا۔

''سچ تو یہ ہے'' کے موضوعات، مباحث، اعترافات، انکشافات اور ادبی خوبیوں اور خامیوں کو درج ذیل سطور میں بیان کیا جاتا ہے۔

چودھری شجاعت حسین کا خاندان صدیوں سے گجرات میں دریائے چناب کے کنارے ''نت وڑائچ'' نامی ایک چھوٹے سے گاؤں میں آباد چلا آ رہا ہے۔ یہ چھوٹے موٹے چودھریوں کا خاندان تھا جو گاؤں کی زمینوں اور مال مویشی پال کر گزر بسر کرتے تھے اور متوسط لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ یہ خاندان اپنی درویشانہ صفات، علم پروری، ادب دوستی اور مہمان نوازی کے لیے سارے علاقے میں مشہور تھا اور ان کی اپنی روایات تھیں۔ چودھری شجاعت حسین کے پردادا چودھری حیات محمد خان اور دادا چودھری سردار خان کو تصوف اور علم وادب سے خصوصی لگاؤ تھا۔ چودھری شجاعت حسین کے بقول اُن کے پردادا حیات محمد خان کی فرمائش پر مشہور صوفی شاعر میاں محمد قادری نے ''داستان مرزا صاحبان'' منظوم کی تھی جو پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف لینگوئج میں آج بھی محفوظ ہے۔ گاؤں ''نت وڑائچ'' میں چودھری شجاعت حسین کی پیدائش ہوئی۔ اپنی پیدائش اور بہن بھائیوں کے حوالے سے چودھری صاحب اپنی آپ بیتی میں لکھتے ہیں:

> ''گاؤں نت وڑائچ میں ہی میرے والد چودھری ظہور الٰہی پیدا ہوئے اور ۲۷ جنوری ۱۹۴۶ء میں میری پیدائش بھی یہی ہوئی۔ ہم تین بھائی اور چھ بہنیں ہیں۔ میرے ایک چھوٹے بھائی چودھری وجاہت حسین ہیں۔ دوسرے چودھری شفاعت حسین ہیں۔ پرویز الٰہی میرے تایا زاد بھائی ہیں اور روز اوّل سے ہی میرے ساتھ سیاست میں ہیں اور میرے دست و بازو ہیں۔ میری اہلیہ چودھری پرویز الٰہی کی ہمشیرہ ہیں۔ اِس طرح چودھری پرویز الٰہی کی اہلیہ میری چھوٹی ہمشیرہ ہے۔''(۱۴۸)

چودھری شجاعت حسین کے والد چودھری ظہور الٰہی پہلے پولیس میں کانسٹیبل بھرتی ہوئے۔ پھر پولیس کی نوکری چھوڑ کر ٹیکسٹائل انڈسٹری میں آئے۔اِس کاروبار میں اُس نے بڑی محنت کی اور پھر ٹیکسٹائل انڈسٹری میں پنجاب بھر کے نامی گرامی صنعتکاروں میں شمار ہونے لگے۔ چودھری شجاعت حسین بڑی فخر سے اِس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ وہ ایک سپاہی کے بیٹے ہیں۔ باہر کی دنیا میں تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں لیکن ہمارے ملک میں ایسی مثالیں بہت کم ہیں کہ پولیس کانسٹیبل کا بیٹا ملک کا وزیر اعظم رہا ہو۔ ''نت وڑائچ'' کے ایک غریب زمیندار گھرانے سے تعلق رکھنے والے چودھری ظہور الٰہی نے اپنی محنت اور لگن سے ملک میں کاروباری اور سیاسی برادری میں اپنے لیے ایک اونچا مقام حاصل کیا تھا۔ یہاں یہ قول سچ ثابت ہوتا ہے کہ ''محنت وہ عظیم چیز ہے جس کا پھل صرف آپ نہیں آپ کی آنے والی نسلیں کھاتی ہیں''۔

چودھری ظہور الٰہی صدر ایوب خان کے دَور میں سیاست میں آئے۔ صدر ایوب نے ملک میں صنعت کاروں کو بے تحاشا مراعات سے نوازا تھا۔اِس کے علاوہ اُس کی کوشش تھی کہ ملک میں صنعتوں کا جال بچھایا جاسکے۔اِس طرح چودھری ظہور الٰہی کو بھی وہ سیاست میں آگے لے آئے۔ چودھری ظہور الٰہی پر یہ بڑا الزام ہے کہ وہ ایوب خان کی توسط سے سیاست میں آئے اور چھا گئے۔ تاہم چودھری شجاعت حسین اِس الزام کو مسترد کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میرے والد ہی نے تو ایبڈو (Elected bodies disqualification order) جیسے کالے قانون کو عدالت میں چیلنج کیا تھا اور وہ ایوب خان کے مخالف سیاستدانوں میں شامل تھے:

> ''میرے والد جنرل ایوب سے پہلے سیاست میں تھے۔ ون یونٹ سے پہلے ۱۹۵۵ء میں وہ نواب زادہ اصغر علی خان کو جنہیں فیروز خان نون حکومت کی پشت پناہی حاصل تھی چیئرمین شپ کے الیکشن میں ہرا چکے تھے۔ ۱۹۵۷ء میں وہ گجرات ڈسٹرکٹ بورڈ کے الیکشن میں بلا مقابلہ کامیاب ہونے والے واحد اُمیدوار تھے۔''(۱۴۹)

چودھری شجاعت حسین نے اپنی آپ بیتی کے دوسرے باب میں اپنے بچپن، کالج اور برطانیہ جا کر ٹیکسٹائل انجینئرنگ میں ایک سالہ ڈپلومہ لینے کے بارے میں بتایا ہے تاہم اِس مقام پر اُن کا بیان اِتنا سرسری ہے کہ اُن کے بچپن کے بارے میں نہ کوئی خاص معلومات ملتی ہیں نہ کوئی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ چودھری شجاعت نے اپنی ابتدائی زندگی، سکول کے حالات و واقعات، شرارتیں اور کارناموں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ وہ نجی زندگی کے بارے میں چند سطریں لکھ کر فوراً گفتگو کا رُخ سیاست کی طرف موڑ دیتے ہیں۔ صرف اِتنا بتایا ہے کہ اُس نے انٹر کا امتحان ایف سی کالج لاہور سے پاس کیا اور یہ

دلچسپ انکشاف بھی کیا ہے کہ سابق صدر جنرل پرویز مشرف اور اُن کے پرنسپل سیکرٹری طارق عزیز اُن کے ہم مکتب تھے۔ طارق عزیز تو کالج سٹوڈنٹس یونین کے صدر تھے اور اُن کے گروپ میں تھے تاہم پرویز مشرف کے ساتھ اُن کی کوئی جان پہچان نہیں تھی۔ چودھری شجاعت حسین اور اُن کے چچازاد بھائی چودھری پرویز الٰہی نے بھی دیگر سیاسی رہنماؤں کی طرح سیاست کی ابتدا کالج سٹوڈنٹ یونین سے کی۔ وہ ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں پیپلز پارٹی کے مقابلے میں ہار گئے کیونکہ وہ مسلم لیگ کی طرف سے الیکشن میں حصہ لے رہے تھے۔ ۱۹۷۱ء تا ۱۹۷۷ء گجرات کے اِن چودھریوں کے خاندان کے لیے بڑا مشکل وقت تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو کا سارے ملک میں طوطی بولتا تھا۔ وہ اپنے کسی سیاسی مخالف کو برداشت نہیں کر سکتے تھے جبکہ پنجاب میں چودھری ظہور الٰہی اور اُن کی پارٹی پیپلز پارٹی کے لیے کافی مشکلات پیدا کر رہی تھیں۔ اِس زمانے میں چودھری ظہور الٰہی پر ذوالفقار علی بھٹو نے ایسے ایسے مقدمات بنائے جن کی وجہ سے ساری دنیا میں ملک کی جگ ہنسائی ہوئی جن میں بھینس چوری کا مقدمہ، عراقی اسلحہ کا مقدمہ اور باغیانہ تقریر کے مقدمے کو زیادہ شہرت ملی۔ اُس دَور میں اپنے خاندان کے مالی اور سیاسی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے چودھری شجاعت حسین بیان کرتے ہیں:

> ''پیپلز پارٹی کے اِس پہلے دَور میں ہمارے خاندان کے خلاف سو کے قریب مقدمات قائم کیے گئے۔ میرے والد نے پانچ سال سے زیادہ کا عرصہ جیل میں گزارا۔ ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو میرے والد جیل میں تھے۔ اُن کی رہائی چند دِن بعد اُس وقت عمل میں آئی جب جنرل ضیاء الحق کے حکم پر سیاسی قیدیوں کی رہائی کا سلسلہ شروع ہوا۔''(۱۵۰)

چودھری شجاعت حسین کی پہلی گرفتاری بھی ذوالفقار علی بھٹو کی خواہش پر ہوئی کیونکہ وہ قومی اسمبلی سے چوتھی آئینی ترمیم پاس کرنا چاہتا تھا۔ اسمبلی میں اپوزیشن لیڈر ولی خان اور اُن کے دست راست چودھری ظہور الٰہی یہ بل منظور کرنے میں رکاوٹ تھے۔ چودھری منظور الٰہی پر دباؤ ڈالنے کے لیے حکومت نے چودھری شجاعت حسین اور چودھری پرویز الٰہی کو جیل میں ڈالنے کا فیصلہ کیا۔ اِس واقعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے یہاں سیاست میں لوگ سیاسی مخالفین کو دبانے کے لیے کیا کیا حربے استعمال کرتے ہیں۔ سیاست کا پاکیزہ کاروبار خود سیاسی لوگوں نے گندہ کر دیا ہے۔ مصنف اپنی پہلی گرفتاری اور جیل کی حالت زار کو اِن الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> ''ہمیں سول لائن تھانہ لے جا کر بند کر دیا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک نشئی کو بھی اندر دھکیل دیا گیا۔ وہ آتے ہی چرس کے کش لگانے لگا۔ اُس کے دھویں سے سانس لینا

بھی مشکل ہو گیا۔ ہم سمجھ گئے کہ پولیس کی یہ حرکت ہمیں تنگ کرنے کے لیے
ہے لہٰذا ہم خاموش رہے۔ رات سونے کا وقت آیا تو اوڑھنے کے لیے جو کمبل دیے
گئے اُن سے بدبو کے بھبکے اُٹھ رہے تھے۔ ان کمبلوں کو اوپر اُڑنا تو در کنار پاس رکھنا
بھی ناممکن تھا۔ کمرے میں ٹائلٹ بھی نہیں تھا۔ جنگلے کے باہر ایک نالی بہہ رہی
تھی اور ہمیں کھڑے ہو کر جنگلے کے اندر سے ہی پیشاب کرنا پڑتا تھا۔"(۱۵۱)

آپ نے اپنی آپ بیتی میں اس بات کا بھی انکشاف کیا ہے کہ قوم پرست سیاستدان خان عبدالغفار خان اور ولی خان کے اُن کے باپ چودھری ظہور الٰہی کے ساتھ گہرے دوستانہ روابط تھے اور وہ جب بھی اسلام آباد آتے اُن کے گھر میں ٹھہرتے۔ عوامی نیشنل پارٹی کو پنجاب مخالف پارٹی تصور کیا جاتا ہے اور اُن کی سیاست کا سارا زور پنجاب دشمنی پر رہا ہے۔ ایک کٹر اور پنجابی قوم پرست لیڈر کے ساتھ تعلق بنانا اور عوامی اجتماعات میں کوئی اور بات کرنا آخر کیا معنی رکھتا ہے؟ اور یہ بھی کہ ہمارے سیاسی رہنما اندر سے ایک دوسرے سے ملے ہوتے ہیں تاہم لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لیے قسم قسم کے سیاسی پینترے بدلتے ہیں۔

"سچ تو یہ ہے" کے ابتدائی چند ابواب یعنی آغاز سے صفحہ نمبر ۷٦ تک میں مصنف نے اپنے باپ چودھری ظہور الٰہی کی سر گزشت بیان کی ہے۔ مصنف کا اپنا ذکر ضمناً آیا ہے۔ اِس سے ایک طرف تو یہ نقصان ہوا کہ آپ بیتی فن آپ بیتی نگاری سے ہٹ گئی ہے لیکن دوسری طرف یہ فائدہ ہوا ہے کہ ہمیں اُن کے والد کے عادات و خصائص، اُن کے شب و روز اور سیاسی سر گرمیوں کے بارے میں قیمتی معلومات ملی ہیں۔ چودھری ظہور الٰہی، چودھری شجاعت حسین کے آئیڈیل تھے اِس لیے اُن کی زندگی پر والد کا اثر نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ سیاست اور کاروبار میں اپنے والد کی وجہ سے آئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر اُن کا باپ سیاست میں نہ ہوتا تو اُنہیں بھی کبھی سیاست کی وادی میں داخل ہونے کا موقع نہ ملتا۔

چودھری شجاعت حسین اپنے والد کی وفات کے بعد عملی سیاست میں آئے۔ اگرچہ وہ پچھلے ایک دہائی سے باپ کے سیاسی مشاغل میں اُن کے شریک تھے۔ ۲۵ دسمبر ۱۹۸۱ء کو اُن کے والد کو اُس وقت گولی مار دی گئی جب وہ لاہور میں اپنے گھر ماڈل ٹاؤن جا رہے تھے۔ چودھری شجاعت کے بقول یہ دہشت گرد کاروائی "الذوالفقار" نے کی تھی اور قاتل رزاق عرف "جھرنا" کو افغانستان سے بطور خاص اِس مقصد کے لیے بھیجا گیا تھا جو بعد میں گرفتار ہوا۔ چودھری شجاعت حسین اِس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ باپ کی موجودگی میں انھیں عملی سیاست میں آنے کی خواہش نہیں تھی اور اگر باپ کی موت اِتنی اچانک نہ ہوتی تو شاید وہ کبھی سیاست میں نہ آتے کیونکہ اُنہیں سیاست سے زیادہ کاروبار میں دلچسپی تھی۔

سیاست میں آنے کی وجوہات چودھری شجاعت حسین اپنی آپ بیتی میں یوں تحریر کرتے ہیں:

''بہر حال والد کی شہادت کے بعد میرے لیے سب کچھ بدل گیا اور مجھے عملی سیاست میں آنا پڑا۔ عملی سیاست کے ہر موڑ پر میرے لیے میرے والد کا کردار مشعل راہ رہا ہے۔ اُن کے اُصول سیاست ہر موڑ پر میری رہنمائی کرتے رہے ہیں۔ اُن کا ایمان تھا کہ زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے اور اُن کا یہ پختہ ایمان میری زندگی میں چراغِ راہ کا کام دیتا رہا ہے۔ اُن کی تقلید میں، میں نے بھی اپنی زندگی میں کلمہ حق کی سربلندی اور مخلوقِ خدا کی خدمت کو اپنا نصب العین بنایا ہے۔''(۱۵۲)

نواز شریف اور چودھری برادران کا آپس میں گہرا تعلق رہا ہے۔ پنجاب کی سیاست کو جس طرح اِن لوگوں نے مل کر متحرک کیا اِس کی مثال ملکی تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ ایک وقت ایسا تھا کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم تھے۔ پیپلز پارٹی کو پنجاب سے ختم کرنے کے لیے دونوں نے سخت جدوجہد کی اور بڑی حد تک کامیاب بھی رہے۔ ابتدا میں نواز شریف نے چودھری شجاعت حسین کے ساتھ مل کر ''جاگ پنجابی جاگ'' کا نعرہ لگایا اور سندھ بالخصوص بے نظیر بھٹو کے خلاف پنجابی قومیت کا کارڈ خوب استعمال کیا۔ نواز شریف اور چودھری شجاعت نے ایک دوسرے کے لیے بڑی قربانیاں دیں اور سیاست میں ایک دوسرے کے دست و بازو رہے لیکن پھر پرویز مشرف کے ساتھ مل کر چودھری برادران نے نواز شریف کو تنہا چھوڑ دیا جس کا آج بھی نواز شریف کو دُکھ ہے تاہم چودھری شجاعت حسین نے اپنی آپ بیتی میں بے وفائی کا الزام نواز شریف پر لگایا ہے جس کا ذکر آگے چل کر کیا جائے گا۔ یہاں ہم چودھریوں کے ساتھ نواز شریف کے پہلے تعارف کی بات کرتے ہیں کہ کس طرح نواز شریف اپنے باپ میاں محمد شریف کی طرف سے یہ پیغام چودھری ظہور الٰہی کے پاس لائے کہ وہ یعنی میاں محمد شریف ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف اُن کی مالی امداد کرنا چاہتے ہیں (۱۹۷۷ء میں چودھری ظہور الٰہی نے لاہور سے ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف انتخاب لڑا تھا جس نے ملک بھر میں شہرت حاصل کی تھی) ظہور الٰہی نے شکریے کے ساتھ یہ پیشکش مسترد کر دی۔ یہ چودھری برادران کی نواز شریف کے ساتھ پہلی ملاقات تھی۔ چودھری شجاعت حسین کے الفاظ میں:

''پرویز الٰہی باہر آئے تو ایک گورا چٹا کشمیری نوجوان برآمدے میں بیٹھا تھا۔ اُس نے پرویز الٰہی کو اپنا وزٹنگ کارڈ دیتے ہوئے کہا کہ اُسے اُس کے والد میاں محمد شریف نے بھیجا ہے اور کہا ہے کہ وہ چودھری ظہور الٰہی کی الیکشن مہم میں فنڈز دینا چاہتے

ہیں۔ پرویز الٰہی نے اُس نوجوان کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ الیکشن مہم کے لیے ہم کسی
سے فنڈز نہیں لیتے اور یوں یہ سرسری سی ملاقات ختم ہو گئی۔"(۱۵۳)

جنرل ضیاء الحق نے اقتدار سنبھالنے کے بعد پاکستانی دستور اور اسلامی شریعت کا ایک عجیب آمیزہ تیار کیا تھا۔ وہ شریعت کی آڑ میں دراصل اپنے سیاسی مخالفین کو کوڑوں کی سزا دیتے تھے۔ اُس کے عہد کے تقریباً تمام سیاسی آپ بیتیوں میں ضیاء الحق کے اِس فعل کی شدید مذمت کی گئی ہے۔ چودھری شجاعت حسین نے بھی اپنے تجربے کی روشنی میں بتایا ہے کہ جنرل صاحب کا اسلامی دفعات کی آڑ میں لوگوں کو کوڑے مارنا محض ڈھونگ تھا۔ وہ سفارشیوں اور بڑے مجرموں کو تو چھوڑ دیتے تھے اور غریب سیاسی ورکرز کی چمڑی اُدھیڑتے تھے۔ مصنف نے ملک کے نامی گرامی سیاستدانوں کی نجی زندگی، دلچسپ عادات، ہنسی مزاح اور لطائف کو بیان کیا ہے۔ اِن میں سے کچھ ایسے لطائف بھی ہیں جن کا ذکر ہمیں کہیں اور نہیں ملتا اور مل بھی نہیں سکتا کیونکہ یہ انفرادیت صرف آپ بیتیوں کو حاصل ہے کہ وہ اپنے اندر انکشافات کا ذخیرہ رکھتی ہیں۔ مصنف نے سیاستدانوں سے ہٹ کر بعض شاعروں اور ادیبوں کی شخصیت کے دلچسپ پہلو کو بھی اپنی خود نوشت میں بحث کا موضوع بنایا ہے۔ اُستاد دامن اور حبیب جالب ملک کے نامور شعرا تھے۔ دونوں کا مصنف کے ساتھ گہرا تعلق تھا اور اُن کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا کیا ہے۔ چودھری شجاعت حسین اُستاد دامن کی انانیت اور استغنا کے بہت معترف ہیں اور اِس بارے میں کئی واقعات بیان کیے ہیں جن میں موصوف کے اخلاق اور عظمتِ کردار پر روشنی پڑتی ہے۔ اُستاد دامن کا اپنا نام چراغ دین تھا وہ ایک درویش صفت انسان تھے۔ چودھری صاحب اُن کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ایک مرتبہ میرے والد نے اُستاد دامن کے لیے راوی روڈ پر واقع ہماری فیکٹری کے ساتھ ہی ایک جگہ پر رہائشی مکان بنانے کا حکم دے دیا۔ اُستاد دامن روزانہ اُسی راستے سے گزر کر دریا راوی کی سیر کے لیے جاتے تھے۔ واپسی پر وہ ان معماروں اور مزدوروں کو ہدایات بھی دیتے جو اُن کے لیے کمرے تعمیر کر رہے تھے۔ جب دونوں کمرے تیار ہو گئے بلکہ سفیدی کا کام بھی مکمل ہو گیا تو اُستاد دامن کہنے لگے کہ مجھے تو جواہر لال نہرو نے عیش کی زندگی گزارنے کی پیشکش کی تھی اور میں نے انکار کر دیا تھا۔ میرا فیصلہ اب بھی یہی ہے کہ میں اُس کٹیا میں مروں گا جہاں میں نے اپنی زندگی گزاری ہے۔"(۱۵۴)

چودھری صاحب نے بعض واقعات کو بیان کرتے ہوئے افراد کے نام صیغہ راز میں رکھے ہیں جو فن آپ بیتی

نگاری کے خلاف ہے۔ خود نوشت لکھنے کا اُصول یہ ہے کہ پہلے تو کسی واقعے پر قلم نہ اُٹھاؤ اور اگر وہ واقعہ لکھنا ناگزیر ہے تو پھر پوری ایمانداری سے واقعہ قلم بند کرو جس طرح آپ کے مشاہدے میں آیا تھا۔ جونیجو حکومت، ضیاء الحق کی موت اور آئی جے آئی کی تشکیل وہ واقعات ہیں جنہوں نے ہماری قومی تاریخ کے دھارے موڑے ہیں۔ یہ محض حادثات نہیں تھے بلکہ سوچ سمجھ کر تخلیق کیے گئے منصوبے تھے جن کا اثر ہم نے ملک کی تاریخ میں کئی عشروں تک مخصوص کیا۔افسوس ہے کہ چودھری شجاعت نے قومی تاریخ کے اِن اہم موضوعات کا سرسری ساذکر کیا ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ وہ ان واقعات کی اہمیت سے بے خبر تھے یا کسی مصلحت کی وجہ سے اِن کا تجزیہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ دونوں صورتوں میں موردِ الزام ٹھہرتے ہیں کہ یہ آپ بیتی کے فن سے مکمل روگردانی ہے۔ آپ نے اِس بات کا االبتہ کھلے بندوں اعتراف کیا ہے کہ ہمیشہ سے ہمارے ملک میں سیاسی حکومتیں فوج اور دیگر خفیہ ادارے بناتی اور بگاڑتی رہیں ہیں۔ مزید یہ کہ ہمارے ملک میں سِول حکومتوں کی ناکامی میں فوج اور ذیلی داروں کا اہم کردار ہے (حالانکہ وہ خود بھی فوج اور جنرل مشرف کی طویل اقتدار کا سہارا رہے۔ سیاستدان خود بھی بڑے مجرم ہیں۔ ان کی مدد کے بغیر جمہوریت مخالف قوتیں غالب نہیں آسکتیں)۔

چودھری شجاعت حسین ۱۹۸۳ء سے ۱۹۰۶ء تک حکومتوں میں مختلف عہدوں پر رہے۔ پہلی مرتبہ وہ جنرل ضیاء الحق کے پاکستان مجلس شوریٰ کے ممبر رہے۔ اِس کے بعد نواز شریف کے دونوں ادوار اور پرویز مشرف کے زمانے میں اہم عہدوں پر تعینات رہے جن میں وزارت عظمیٰ کا عظیم منصب بھی شامل ہے۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی پاکستان کی سیاست، معاشرت اور معیشت کے حوالے سے ایک عجیب دہائی تھی جس میں اگر ایک طرف جمہوری اقدار اور غیر ریاستی عناصر کے درمیان جنگ جاری تھی تو دوسری طرف تہذیب و ثقافت، جدیدیت اور دیگر محاذوں پر بھی ملک بر سرپیکار تھا۔اِس سارے عرصے میں چودھری شجاعت حسین کئی سارے سیاسی حادثات اور معاشرتی تبدیلیوں کے چشم دید گواہ رہے ہیں۔ آپ نے کہیں ڈھکے چھپے اور کہیں تفصیل سے اہم قومی رازوں سے پردہ اُٹھایا ہے۔ وہ ۱۹۹۴ء میں دوسری مرتبہ بے نظیر بھٹو کے دور حکومت میں جیل گئے۔ یہاں اُس نے اپنے اور دیگر سیاسی قیدیوں کے جیل کے واقعات دلچسپی سے بیان کیے ہیں۔ اپ نے جیل کی سختیوں اور جیل کی خراب حالت کا نقشہ کھینچا ہے۔ خان عبدالولی خان بھی اُن کے ساتھ اڈیالہ جیل میں تھے۔ وہ نہ تو کسی سے اُلجھتے تھے اور نہ جیل کی سختیوں کی شکایت کرتے تھے بلکہ جیل قوانین کا پوری طرح سے پابندی کرتے تھے۔ ولی خان کے متعلق جیل کا ایک واقعہ بیان کیا ہے جس سے ولی خان کے کردار کی عظمت پڑھنے والوں کے دِلوں میں مزید بڑھ جاتی ہے:

> ''ایک رات شدید طوفان آیا۔ موسلادھار بارش سے اُن کی کوٹھڑی کی چھت اُڑ گئی
> اور پانی ٹپکنے لگا۔ خان صاحب ساری رات ایک کونے میں کمبل اوڑھ کر بیٹھے رہے۔

صبح عملے کو پتہ چلا کہ رات کو اُن کی کوٹھڑی کی چھت گر گئی تھی۔ اہل کاروں نے کہا خان صاحب! آپ رات ہی کو بتا دیتے ہم آپ کو دوسری کوٹھڑی میں منتقل کرتے۔ خان صاحب نے کہا میں نے رات گئے آپ لوگوں کو پریشان کرنا مناسب نہ سمجھا۔"(۱۵۵)

"نادرا"، یعنی نیشنل ڈیٹا بیس سنٹر مشرف حکومت کا ایک بڑا کارنامہ ہے جس کے ذریعے ملک بھر کے خواتین، مرد اور بچوں کا کمپیوٹرائزڈ ریکارڈ بنایا گیا۔ آج مردم شماری، موبائل سم، شناختی کارڈ، پاسپورٹ اور افراد کے ہر قسم کی تصدیق کے لیے یہ نظام انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ چودھری شجاعت "نادرا" قائم کرنے کا کریڈٹ خود کو دیتے ہیں۔ چودھری صاحب اُس وقت وفاقی وزیر داخلہ تھے اور یہ محکمہ اُن کے ماتحت آتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ نادرا کا قیام اور کامیابی جنرل پرویز مشرف کے ایک ساتھی جنرل شاہد عزیز کی کوششوں کا ثمرہ ہے۔ ایک آپ بیتی لکھنے والے کو سوچ سمجھ کر دعویٰ کرنا چاہیئے کیونکہ آج کل حقیقتیں چھپتی نہیں۔ جھوٹ پر مبنی دعوے کرنے سے نہ صرف انسان کی اپنی ساکھ مشکوک ہو جاتی ہے بلکہ قاری کی نظر میں ساری آپ بیتی قابل وقعت نہیں رہتی۔ جنگ کارگل اور پاکستان کے ایٹمی دھماکے تاریخی اور سیاسی نقطہ نظر سے خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ اُردو کے تقریباً ساری سیاسی اور غیر سیاسی آپ بیتیاں جو اِس مدت میں لکھی گئیں تفصیل سے اِن دو واقعات کا تجزیہ پیش کرتی ہیں۔ حیرت ہے کہ چودھری شجاعت حسین نے اِن دونوں واقعات کا سرسری سا تذکرہ کیا ہے حالانکہ وہ اُس وقت نواز شریف کے خلوت اور جلوت کے ساتھی تھے اور اگر چاہتے تو اِن واقعات کا پس منظر بتا سکتے تھے لیکن نہیں معلوم کہ وہ کن مصلحتوں کا شکار ہوئے۔ چودھری برادران اور نواز شریف کا آپس میں گہرا تعلق رہا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم تھے لیکن پھر اُن کی سیاسی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ ایک دوسرے کا نام سننے کے روادار نہ تھے۔ نواز شریف اور شہباز شریف اپنے اخباری انٹرویوز میں چودھریوں پر بے وفائی کا الزام لگاتے ہیں۔ نواز شریف نے تو اِتنا تک کہا تھا:

"ہماری پارٹی کو اِن دونوں نے ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ اُنہوں نے پارٹی کو توڑا میرے لوگوں کو ورغلایا اور پرویز مشرف کو اِتنے عرصے تک حکومت کرنے کا موقع فراہم کیا۔ یہ میرے لیے برادران یوسف ثابت ہوئے۔ اگر بحالی جمہوریت کے لیے چلائی گئی کلثوم نواز کی تحریک میں یہ لوگ شریک ہوتے اور پرویز مشرف کے دست و بازو نہ بنتے تو مشرف ایک سال بھی حکومت نہیں چلا سکتا تھا۔ اِن کا

جرم ناقابل معافی ہے۔ مسلم لیگ "ن" میں ہر آدمی کے لیے دروازے کھولے
ہیں سوائے اِن دونوں کے۔"(۱۵۶)

چودھری شجاعت حسین البتہ اِن تمام الزامات کی تردید کرتے ہیں بلکہ وہ اُلٹا نواز شریف پر بے وفائی کا الزام لگاتے ہیں۔ اُس نے اپنی آپ بیتی میں بڑی تفصیل سے لکھا ہے کہ ۱۹۸۵ء سے ۱۹۹۸ء تک نواز شریف نے اُن کے ساتھ آٹھ مرتبہ بے وفائی کر کے اُنہیں دھوکہ دیا ہے۔ مزید یہ کہ نواز شریف نے تو پرویز مشرف کے ساتھ ڈیل کی اور جدہ چلا گیا اور ہمیں فوجی حکومت کے خلاف لڑنے کے لیے بالکل تنہا چھوڑ دیا۔ اگر وہ جلاوطنی اختیار نہ کرتے بلکہ ڈٹ کر قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے تو ہم بھی مشرف کے ساتھ نہ ملتے۔ مشرف کے ساتھ سیاسی ڈیل کرنا ہماری مجبوری تھی۔(۱۲۸) چودھری شجاعت حسین نے مشرف کے ساتھ مل کر پاکستان مسلم لیگ قائدِاعظم نامی نئی سیاسی جماعت بنائی۔ فوجی حکمرانوں نے چُن چُن کر مسلم لیگ ن، پاکستان پیپلز پارٹی، جمعیت علماءاسلام اور دیگر سیاسی جماعتوں سے لوگوں کو نکال کر اِس پارٹی میں جمع کروایا۔ چودھری شجاعت حسین نے مسلم لیگ "ق" کی تشکیل، مارشل لاء کو دوام بخشنے کے عوامل اور دیگر غیر سیاسی سرگرمیوں پر لب کشائی نہ کر کے گویا سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ خودنوشت سوانح عمری، عمر کے اُس حصے میں لکھی جاتی ہے جب انسان دنیا کے ہنگاموں سے الگ تھلگ ہو کر اپنے ضمیر کے آگے جواب دہ ہوتا ہے۔ اِس وقت بھی اپنی غلطیوں کا اعتراف نہ کرنا اور اپنے جرائم کے غلط تاویل پیش کرنا بڑی بدقسمتی ہے۔ ویسے بھی غلطی تسلیم کرنا بڑا پن ہے اور موجودہ ملکی سیاسی نظام میں بڑے نہیں بونوں کی اکثریت ہے۔ پرویز مشرف نے ۲۰۰۲ء میں ملک بھر میں انتخابات کرائے جس میں چودھری شجاعت حسین کی جماعت مسلم لیگ "ق" کو اسمبلی میں اکثریت حاصل ہوئی۔ پرویز مشرف نے اِس جماعت سے چھوٹے صوبے بلوچستان سے تعلق رکھنے والے میر ظفر اللہ خان جمالی کو وزیرِاعظم منتخب کیا لیکن وہ دو سال تک بھی وزیرِاعظم نہ رہے اور مشرف نے اُنہیں معزول کر کے اپنے ہم پیالہ و ہم نوالہ شوکت عزیز کو وزیرِاعظم مقرر کر دیا۔ البتہ درمیان میں دو مہینے کے لیے چودھری شجاعت کو بھی وقتی اور نگران وزیرِاعظم بنائے رکھا۔ چودھری شجاعت حسین نے یہ انکشاف کیا ہے کہ پرویز مشرف نے جمالی کو دو وجوہات کی بنا پر معذول کیا۔ ایک اُن کی سُستی اور غفلت اور دوسرا اُن کا امریکی دورہ۔

ڈاکٹر عبدالقدیر کی نظربندی اور اکبر بگٹی قتل کیس پرویز مشرف کے وہ اقدامات تھے جن سے اُن کی حکومت نہ صرف کمزور ہوئی بلکہ اِن کے اثرات ہم آج بھی سیاسی ماحول میں محسوس کر سکتے ہیں۔ چودھری شجاعت حسین اِن دونوں واقعات کے چشم دید گواہ تھے لیکن اپنی آپ بیتی میں اِس حوالے سے کوئی قابل قدر بات نہیں کی بلکہ سر سے بوجھ اُتارا ہے۔

البتہ لال مسجد کے واقعے پر کھل کر اپنے مشاہدات بیان کیے ہیں۔

سانحہ لال مسجد اور بے نظیر بھٹو کا قتل پرویز مشرف اور اُن کے اتحادیوں چودھری برادران وغیرہ کے لیے نہ صرف ساری دنیا میں جگ ہنسائی اور رسوائی کا سبب بنے بلکہ مشرف صاحب آج بھی مذکورہ کیسوں کی وجہ سے عدالتی مفرور ہیں۔ چودھری شجاعت حسین کو لال مسجد کے معاملے پر حکومت نے اپنا ترجمان اور نگران بنایا۔ اُس نے مسجد کے انتظامیہ سے کئی طویل ملاقاتیں کیں لیکن حکومت نے پختہ ارادہ کیا تھا کہ مسجد اور مدرسے کا آپریشن کیا جائے گا۔ چودھری صاحب نے یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ ایک اعلیٰ سطح کے اجلاس میں جب کئی لوگوں نے اِس آپریشن کی مخالفت کی اور افہام و تفہیم کے ذریعے معاملہ سلجھانے کی بات کی تو اُس وقت کے وزیراعظم شوکت عزیز نے اُن کی اس رائے کو مسترد کرتے ہوئے کہا کہ اِس آپریشن کی وجہ سے لوگوں اور میڈیا کی توجہ چودھری افتخار اور عدالتی بحران سے ہٹ جائے گی۔ آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ اِس سانحے میں مرنے والی بچیاں آج بھی اُنہیں خواب میں پریشان کرتی ہیں:

> ''میں گھر واپس آگیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا (لال مسجد کے آپریشن کے فوراً بعد)۔ کچھ دیر بعد میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ میرے کانوں میں بچوں کے رونے اور چیخنے کی آوازیں آرہی ہیں۔ آج بھی جب میں اِس واقعے کے بارے میں سوچتا ہوں تو جذبات پر قابو نہیں رکھ پاتا۔'' (۱۵۷)

چودھری شجاعت حسین نے اپنی آپ بیتی میں این آر او (N.R.O) کے بارے میں کھل کر وہ باتیں لکھی ہیں جو ہمیں کسی اور ذریعے سے معلوم نہیں ہوسکتی تھیں۔ این آر او پرویز مشرف، بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کے درمیان خفیہ ڈیل کا نام تھا جس کے ذریعے سے اِن دونوں سیاسی لیڈروں کا پاکستان میں آنا ممکن ہوا۔ یہاں مصنف نے یہ الزام لگایا ہے کہ ۲۰۰۸ء کا الیکشن فکس ہو چکا تھا جس میں پیپلز پارٹی کو کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ حالانکہ عالمی مبصرین اور آزاد ذرائع اُس الیکشن کو پاکستان کا سب سے صاف ستھرا الیکشن قرار دیتے ہیں۔ جب اِس بارے میں پرویز مشرف سے پوچھا جاتا ہے تو وہ چودھری صاحب کے الزام کو مسترد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر یہ دھاندلی والے الیکشن ہوتے تو مسلم لیگ ''ق'' جیت جاتی جو اُن کی اپنی جماعت تھی۔ اپنی آپ بیتی کے آخری باب میں وہ اپنے مربی، دوست، محسن اور ہم پیالہ و ہم نوالہ پرویز مشرف پر سخت تنقید کرتے ہیں۔ اِس مقام پر وہ پھر پاکستان کے اُن روایتی سیاستدانوں کے صف میں کھڑے نظر آتے ہیں جو چڑھتے سورج کے پجاری کے نام سے شہرت رکھتے ہیں۔ جب ایک آدمی طاقت میں ہوتا ہے بااختیار ہوتا ہے اُس وقت تو آپ کے منہ کو تالہ لگا ہوتا ہے لیکن جب وہ اقتدار کی کرسی سے اُتر جاتا ہے تو آپ کو اُس میں خامیاں ہی خامیاں نظر آتی ہیں۔ یہ

ہمارے معاشرے کے لوگوں کا عمومی رویہ ہے۔ جب تک ہم موقع پر حق کو حق اور باطل کو باطل نہیں کہیں گے ہم زندگی کے کسی میدان میں آگے نہیں جا سکیں گے۔ علاوہ ازیں مصنف نے اس آپ بیتی میں بے نظیر بھٹو کی موت پر ایک سطر تک نہیں لکھا ہے۔ حالانکہ بے نظیر بھٹو مرحومہ نے اپنی زندگی میں جن لوگوں کو اپنے ممکنہ قاتل قرار دیا تھا۔ اُن میں ایک چودھری پرویز الٰہی بھی تھے۔اِس طرح آپ بیتی میں کئی مواقعوں پر شدید تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔

انانیت اور اظہارِ ذات کا جذبہ انسانی سرشت میں شامل ہے۔ وہ دوسروں کو اپنی کامیابیوں اور ناکامیوں، خوشیوں، غموں، کارناموں اور سرگرمیوں کی روداد سنا کر خوشی اور اطمینان محسوس کرتا ہے۔ زندگی کے اچھے دِنوں اور کامیابیوں کے بیان سے اُس کے جذبہ انانیت کی تسکین ہوتی ہے تو دکھوں اور غموں کے بیان سے اُس کے دِل کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے۔ دونوں صورتوں میں اظہار ذات بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔آپ بیتی میں مصنف کے خارجی حالات وواقعات کے بیان کے ساتھ ساتھ اُس کی داخلی کیفیات اور احساسات وجذبات کا بیان بھی ملتا ہے جس سے بالواسطہ طور پر اُس کے اعتقادات، نظریاتی وابستگی، نفسیات، رجحانات اور تہذیبی میلانات بھی ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ واقعات کا انتخاب ہی فنی اعتبار سے آپ بیتی نگار کے لیے ایک اہم اور مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔اِس معاملے میں اگر وہ مہارت کا ثبوت نہ دے تو آپ بیتی بے جا طوالت کا شکار ہو کر دلچسپی سے عاری ہو جاتی ہے۔

جب ہم ''سچ تو یہ ہے'' کو اِس اُصول پر پرکھتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ مصنف نے زیادہ تر غیر اہم موضوعات پر قلم اُٹھایا ہے جس کا اُن کی زندگی کے حوالے سے زیادا اہم کردار نہیں تھا۔ آپ نے اُن واقعات کو نظر انداز کیا ہے جو آپ کی زندگی خصوصاً سیاسی زندگی کی اُٹھان کا سبب بنے۔ آپ بیتی کی دوسری اہم خوبی خارجیت اور داخلیت کا تناسب ہے کیونکہ محض خارجی حالات وواقعات کے بیان سے آپ بیتی سوانحی معلومات پر مبنی کوائف نامہ قرار پاتی ہے جبکہ صرف داخلی جذبات واحساسات کے بیان سے یہ فلسفے کی کتاب بن کر رِہ جاتی ہے۔آپ بیتی کے پیش لفظ سے پتہ چلتا ہے کہ اِس کتاب سے چودھری شجاعت حسین کا مقصد ہی پاکستان کے ایک پُرآشوب سیاسی زمانے کے حالات وواقعات کو سچائی کے ساتھ اس طرح بیان کرنا تھا جس طرح وہ ظہور پذیر ہوئے تھے۔ چنانچہ اُن یادوں کو دہراتے ہوئے اُس نے اپنے آباؤاجداد، والدین، دوست احباب اور دیگر سیاست دانوں کا تذکرہ اِس انداز سے کیا ہے کہ خود اُن کی اپنی زندگی کے حالات تفصیل سے سامنے آئے ہیں۔

سوانحی حوالے سے ''سچ تو یہ ہے'' میں کافی تشنگی پائی جاتی ہے کیونکہ اُس نے اپنے نجی کوائف اور خاندانی حالات پر کم لکھا ہے۔ چودھری شجاعت نے اپنی تعلیم، سکول، کالج اور اساتذہ کے بارے میں بھی تفصیل سے نہیں لکھا اور نہ ہی اپنی

نجی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو زمانی ترتیب سے بیان کیا ہے اس لیے قاری کو کسی حد تک جھنجھلاہٹ محسوس ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں واقعات کا انتہائی اختصار سے بیان بھی اس آپ بیتی کا ایک بڑا نقص بن گیا ہے۔ جہاں طوالت کی ضرورت ہو وہاں چودھری صاحب اختصار سے کام لیتے ہیں اور جہاں اختصار مقصود ہو وہ آپ اپنا بیان بے جا طویل کر دیتے ہیں۔ ایوب خان کا دور حکومت، بھٹو کا دور حکومت اور محمد خان جونیجو کے دور حکومت پر لمبے چوڑے ابواب قلم بند کرنا اِس آپ بیتی کا ایک بڑا عیب ہے چونکہ وہ خود اُس زمانے میں موجود نہ تھے لہٰذا چشم دید واقعات کے بغیر بیانات آپ بیتی کی قدر و قیمت کو گرا دیتی ہے۔

چودھری شجاعت حسین مذکورہ آپ بیتی میں اپنے والد، دیگر عزیزوں اور دوستوں کو اس دلی وابستگی اور شیفتگی سے یاد کرتے ہیں کہ آپ بیتی کے آغاز ہی سے اُن کا جذباتی اور تاثراتی انداز نظر واضح ہو جاتا ہے۔ فنی اور موضوعاتی اعتبار سے ''سچ تو یہ ہے'' کو آپ بیتی کے بجائے یادداشتیں کہنا چاہیے مصنف خود بھی اس کے لیے یہی لفظ استعمال کرتا ہے:

> ''خدائے بزرگ و برتر کی تعریف و توصیف کے بعد میں اپنے اُن تمام دوستوں اور احباب کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے مجھے اپنی یادداشتوں کو مرتب کرنے کی ترغیب دی اور اس کی یاد دہانی کرواتے رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ترغیب و اصرار نے ہی مجھے اپنی یادداشتیں قلم بند کرنے پر آمادہ کیا ہے اور آج یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔''(۱۵۸)

''سچ تو یہ ہے'' پڑھ کر پتہ چلتا ہے کہ یہ ایک حساس اور زود رنج انسان کی یادداشتیں ہیں جسے زندگی میں بیشتر دکھوں کا سامنا رہا۔ باپ کے بے وقت موت نے اُنہیں جدائی کا کبھی نہ ختم ہونے والا دُکھ دیا۔ اِس ساری آپ بیتی میں چودھری شجاعت حسین کی شخصیت دبی دبی محسوس ہوتی ہے۔ خصوصاً اپنے کزن چودھری پرویزالٰہی کا اُن کی زندگی میں بڑا کردار رہا ہے۔ وہ ساری آپ بیتی میں سائے کی طرح چودھری شجاعت حسین کے ساتھ ساتھ رہے ہیں۔ یہ اُن کی شخصیت کی کمزوری بھی ہے کہ وہ زندگی میں کوئی بھی چھوٹا یا بڑا فیصلہ پرویزالٰہی کے بغیر نہیں کر سکتے ہیں۔

''سچ تو یہ ہے'' میں شجاعت حسین کے مذہب سے لگاؤ اور عقائد پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اُن کی زندگی کی کہانی سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ وہ فرقہ ورانہ اختلافات اور بنیاد پرستی، شدت پسندی سے دُور دُور نظر آتے ہیں۔ شام کے ایک دورے میں جب اُنہیں جمعہ کی نماز پڑھنے کے لیے اہل سنت کا کوئی مسجد نہیں ملتا تو اہل تشیع کی مسجد میں نماز پڑھ لیتے ہیں۔ اِس موقع پر اپنے خیالات یوں پیش کرتے ہیں:

''اگلے روز جمعہ تھا۔ نماز جمعہ کے مقامی وقت کا ہمیں صحیح اندازہ نہیں تھا۔ جب ہم تیار ہو کر نکلے تو دیر ہو چکی تھی۔ ہم اہل سنت والجماعت کی مسجد نہیں پہنچ سکتے تھے۔ میں نے پوچھا قریب کون سی مسجد ہے۔ کہنے لگے یہ اہل تشیع کی ہے۔ میں نے کہا مسجد اہل سنت کی ہو یا اہل تشیع کی اللہ کا گھر ہے۔ یہ مسجد قریب ہے تو ہم اسی مسجد میں نماز پڑھتے ہیں۔ میری اس بات پر وہاں موجود سب لوگ حیران بھی ہوئے اور خوش بھی ہوئے۔ شام کے حکام کو ہماری طرف سے یہ ایک اچھا پیغام دیا گیا تھا۔''(۱۵۹)

واقعات کے بیان میں چودھری شجاعت زیادہ تر صرف چشم دید واقعات کو ہی آپ بیتی میں جگہ دیتے ہیں نیز اُن کا انداز بیان بے لاگ اور تصنع سے یکسر پاک ہے۔ تاہم بعض شخصیات کا ذکر کرتے ہوئے اُن کا غیر جذباتی انداز جانبداری کی حدود میں داخل ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ اُس نے محمد خان جونیجو، مخدوم جاوید ہاشمی، پرویز رشید اور ولی خان کا ذکر نہایت محبت اور عقیدت سے کیا ہے۔ علاوہ ازیں اپنے محرم راز، خلوت و جلوت کے ساتھی اور کزن چودھری پرویز الٰہی کی تعریف میں بھی بہت مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے۔ خود نوشت اپنی خوبیوں، خامیوں اور کوتاہیوں کی داستان ہوتی ہے۔ کوئی بھی شخص فرشتہ نہیں ہوتا اور پھر سیاستدانوں سے تو قدم قدم پر غلطیاں ہوتی رہتی ہیں جس کا اعتراف کیا جانا چاہیئے۔ پرویز مشرف حکومت کے کئی اقدامات غلط تھے جن میں چودھری صاحب براہ راست اُن کے ساتھ شریک تھے تاہم اُن پر خاموش رہنا جرم کے مترادف ہے۔

بعض واقعات کے بیان میں چودھری شجاعت حسین کی تحریر میں ایک خاص قسم کی خارجیت پائی جاتی ہے۔ جب وہ کسی سیاسی، تاریخی یا سماجی واقعے کو بیان کرتے ہیں تو اس کا منطقی طریقے سے داخلی اور خارجی تجزیہ نہیں کرتے بلکہ اس پر اپنے مخصوص غیر جذباتی اور غیر تاثراتی انداز میں اظہار خیال کرتے ہیں خواہ وہ واقعہ سیاسی ہو یا غیر سیاسی۔ جنرل ضیاء الحق کے مارشل کا ذکر ہو یا بے نظیر بھٹو کا دور حکومت، ظفر اللہ خان جمالی کا استعفیٰ ہو یا پاکستان میں ۲۰۰۵ء کا قیامت خیز زلزلہ، اُن کے غیر جزباتی انداز سے تصنع پیدا ہو گیا ہے جس سے آپ بیتی کا فنی حسن مجروح ہوا ہے۔ عام زندگی اور روزمرہ معاملات میں بھی وہ غیر جذباتی انداز رکھتے ہیں اور یہ انداز اُن کے طرز تحریر میں بھی آیا ہے۔ آٹھ اکتوبر ۲۰۰۵ء کو پاکستان میں ایک ہولناک زلزلہ آیا تھا جس نے آن کی آن میں لاکھوں لوگوں کی زندگیاں ختم کر دیں۔ اِس اہم واقعے کو بھی چودھری صاحب بڑی یک رُخی اور غیر جذباتی انداز میں پیش کرتے ہیں گویا کوئی اخباری خبر پڑھ رہے ہیں۔ اِس واقعے کے بیان سے اُن کی قلبی

واردات اور جذبات واحساسات کا بالکل اندازہ نہیں ہوتا:

''مظفر آباد مکمل طور پر تباہ ہو گیا جیسے جنگ میں بمباری سے مسمار شدہ شہر کا منظر پیش کر رہا ہو۔ باغ، راولاکوٹ اور دوسرے کئی شہروں اور قصبوں میں اکا دُکا عمارتیں ہی بچی ہیں باقی سب منہدم ہو گئی ہیں۔ بچوں کے سکول مع بچوں اور اساتذہ کے زمین بوس ہو گئے ہیں۔''(۱۶۰)

ہمارے ہاں زیادہ تر مشرقی آپ بیتی نگار مبالغے اور خود نمائی سے خود کو نہیں بچا سکتے۔ سیاسی خود نوشتوں کے بارے میں تو یہ عام تصور ہے کہ یہ نرگسیت، مبالغہ آرائی، خود نمائی اور ذاتی تشہیر کا سامان ہوتی ہیں۔ جب ہم اِس پہلو سے چودھری شجاعت حسین کی آپ بیتی ''سچ تو یہ ہے'' کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اکثر و بیشتر تو اُس کا بیان متوازن ہوتا ہے لیکن جہاں اپنے وزارت عظمیٰ یا دیگر وزارتوں کا ذکر آتا ہے وہ اپنے کارنامے بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں باب نمبر ۱۷ اُن کے کزن چودھری پرویز الٰہی کا پنجاب میں وزارت اعلیٰ کے زمانے کے حوالے سے ہے۔ یہاں پر مصنف نے چودھری پرویزالٰہی کے کارنامے اور اقدامات کو نہایت بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے۔ اِس آپ بیتی میں اکثر جگہوں کی طرح اِس باب میں بھی یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ چودھری شجاعت حسین کی سر گزشت ہے یا چودھری پرویزالٰہی کی سوانح ہے۔ یہ بھی فن آپ بیتی نگاری کے حوالے سے ایک بڑی خامی ہے۔

چودھری شجاعت حسین کی شخصیت میں شوخی و شرارت کا عنصر بھی زیادہ ہے۔ وہ اپنی چھوٹی موٹی شرارتوں اور ہنسی مزاح کی باتوں کو بھی اپنی آپ بیتی میں مزے سے سناتے ہیں۔ سنجیدہ ماحول میں بھی چودھری شجاعت کے کا حِس مزاح بیدار رہتا ہے اور وہ تناؤ والے ماحول میں ایک آدھ لطیفہ کہہ کر ماحول کو دوستانہ بناتے ہیں۔ اُس نے اپنی آپ بیتی میں جگہ جگہ ایسی ہی ہنسی مزاح اور شرارت بھری باتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ وزارت عظمیٰ سے استعفیٰ دیتے وقت حکومت کے کئی اہم لوگوں، غیر ملکی مبصرین اور اخباری نمائندوں کی موجودگی میں اپنی مذاق سے لوگوں کو کچھ یوں ورطہ حیرت میں ڈالا:

''اِسی اثنا میں ٹائپسٹ ڈرافٹ لے کر اندر داخل ہوا، اُسے دیکھتے ہی دوبارہ اِن لوگوں نے جلدی کریں جلدی کریں کی رَٹ لگانا شروع کر دی۔ میں نے دستخط کرنے کے لیے قلم اُٹھایا لیکن یہ سننے کے بعد قلم نیچے رکھ دیا اور کہا، اگر میں یہ دستخط نہ کر دوں تو آپ میرا کیا بگاڑ لیں گے۔ اِس پر سب لوگ خاموش ہو گئے۔ وہ سمجھے کہ یہ بات سنجیدگی سے کر رہا ہوں۔ اِس پر میں نے مسکراتے ہوئے کہا آپ پریشان نہ ہوں۔ میں مذاق کر رہا ہوں۔''(۱۶۱)

چودھری شجاعت حسین کی آپ بیتی کا ایک اور بڑا نقص انگریزی الفاظ کا ضرورت سے زیادہ استعمال ہے۔۔ جہاں اُردو کے اچھے بھلے اور خوبصورت الفاظ موجود ہوں وہاں خواہ مخواہ انگریزی کے سخت اور نامانوس الفاظ لانا نہ صرف عبارت کو خراب کرنا ہے بلکہ قاری کے ذہن پر بے جا بوجھ بھی ڈالنا ہے۔ معلوم نہیں کیوں ہمارے اکثر سیاستدان، بیوروکریٹ اور کھلاڑی اپنی تحریر اور تقریر میں انگریزی کے الفاظ اور جملے لا کر علمی برتری جتانے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ عموماً وہ خواتین و حضرات ایسا کرتے ہیں جو انگریزی زبان میں زیادہ مہارت نہیں رکھتے۔ نیچے فقروں میں استعمال کیے گئے انگریزی الفاظ سے چودھری شجاعت حسین کی بد ذوقی کا اندازہ ہوتا ہے۔ چودھری صاحب نے یوں تو ہر دوسرے صفحے پر یہ روش اپنائی ہے لیکن ہم چند مثالوں پر اکتفا کریں گے۔

"۱۔ میاں نواز شریف نے بھی اپنا نام فلوٹ(Float) کر دیا۔(۱۶۲)

۲۔ یہ آپ کے لیے خطرہ بن سکتا ہے اس کو کٹ ٹو سائز(Cut to size) کریں۔(۱۶۳)

۳۔ اُس روز اُن کی باڈی لینگویج(Body language) بتا رہی تھی کہ وہ سخت غصے میں ہیں۔(۱۶۴)

۴۔ ہم محترمہ کو ائیر پورٹ سے ہی پک(Pick) کریں گے۔(۱۶۵)

۵۔ وزارت داخلہ نے قومی شناختی کارڈ کے پرانے ڈیزائن کی جگہ نیا لیمی نیٹڈ(Laminated) ڈیزائن جاری کر دیا۔(۱۶۶)

۶۔ جنرل مشرف کا جواب تھا کہ میں آصف علی زرداری کو کمفرٹ لیول دینا چاہتا ہوں۔"(۱۶۷)

آپ بیتی نگار پر نہ صرف بطور ایک ادیب بلکہ بطور انسان بھی بہت سی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ اپنی ذات پر قلم اُٹھانے سے پہلے اُنہیں اپنے مزاج اور طبیعت کے مختلف رنگوں اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں میں ایک خاص تناسب اور توازن پیدا کرنے کی شعوری کوشش کرنی چاہیئے۔ ویسے بھی آپ بیتی عمر کے آخری حصے میں تحریر کی جاتی ہے۔ جب انسان کے جذبات، احساسات اور خیالات میں ایک ٹھہراؤ اور اعتدال کی کیفیت پیدا ہو چکی ہوتی ہے۔ للٰہذا پُر خلوص سچائی، حقیقت بیانی، سادہ اسلوب بیان، واقعات و حالات کے فنکارانہ انتخاب اور بیان کے ترتیب سے ہی ایک عمدہ آپ بیتی وجود میں آتی ہے۔ "سچ تو یہ ہے" میں چودھری شجاعت حسین نے اپنی زندگی کے چیدہ چیدہ واقعات بیان کیے ہیں جس سے اختلاف تو کیا جا سکتا ہے مگر ردّ نہیں کیا جا سکتا۔

حوالہ جات

۱۔ پردے سے پارلیمنٹ تک، محمد اسلم ڈوگر، مشمولہ: سیارہ ڈائجسٹ آپ بیتی نمبر، مارچ ۱۹۸۰ء ص۔ ۲۴۱
۲۔ پردے سے پارلیمنٹ تک، بیگم شائستہ اکرام اللہ، طباعت وسن اشاعت ندارد، ص۔ ۲۴۱
۳۔ ایضاً، ص۔ ۲۴۳
۴۔ ایضاً، ص۔ ۲۴۴
۵۔ ایضاً، ص۔ ۲۴۵
۶۔ ایضاً، ص۔ ۲۴۵
۷۔ ایضاً، ص۔ ۲۴۹
۸۔ ایضاً، ص۔ ۲۴۶
۹۔ ایضاً، ص۔ ۲۵۰
۱۰۔ ایضاً، ص۔ ۲۵۱
۱۱۔ ایضاً، ص۔ ۲۵۱
۱۲۔ ایضاً، ص۔ ۲۴۲
۱۳۔ ایضاً، ص۔ ۲۵۰
۱۴۔ ایضاً، ص۔ ۲۵۱
۱۵۔ جرم سیاست، منظور احمد وٹو، جنگ پبلشرز لاہور، ۲۰۰۱ء، ص۔ ۲۸
۱۶۔ ایضاً، ص ۴۳۔ ۴۴
۱۷۔ ایضاً، ص۔ ۱۲۰
۱۸۔ ایضاً، ص۔ ۱۵۲
۱۹۔ ایضاً، ص۔ ۱۵۳
۲۰۔ ایضاً، ص۔ ۱۵۷
۲۱۔ ایضاً، ص۔ ۲۶۳
۲۲۔ ایضاً، ص ۲۶۱۔ ۳۰۹

۲۳۔ ایضاً، ص۔۱۵

۲۴۔ ایضاً، ص۲۳۔۲۴

۲۵۔ ایضاً، ص۹۴۔۱۸۰

۲۶۔ ایضاً، ص۔۹۵

۲۷۔ ایضاً، ص۔۱۶۹

۲۸۔ ایضاً، ص۔۲۴۷

۲۹۔ ایضاً، ص۔۳۰۹

۳۰۔ ایضاً، ص۔۳۰۹

۳۱۔ ایضاً، ص۔۳۲۳

۳۲۔ ایضاً، ص۔۳۰۸

۳۳۔ ہاں میں باغی ہوں، جاوید ہاشمی، ساگر پبلشرز لاہور، ۲۰۰۵ء، ص۔۲۷

۳۴۔ ایضاً، ص۲۹۔۳۶

۳۵۔ ایضاً، ص۔۳۶

۳۶۔ ایضاً، ص۔۵۰

۳۷۔ ایضاً، ص۔۵۱

۳۸۔ ایضاً، ص۔۵۴

۳۹۔ ایضاً، ص۱۳۵۔۱۳۶

۴۰۔ ایضاً، ص۔۱۵۳

۴۱۔ ایضاً، ص۱۷۰۔۱۷۱

۴۲۔ ایضاً، ص۔۲۰۵

۴۳۔ ایضاً، ص۔۱۷۳

۴۴۔ ایضاً، ص۔۱۰۷

۴۵۔ اُردو خود نوشت فن و تجزیہ، وہاج الدین علوی، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، ص۔۱۳

۴۶۔ ہاں میں باغی ہوں، جاوید ہاشمی، ساگر پبلشرز لاہور، ۲۰۰۵ء، ص۔۲۳۳

۴۷۔ ایضاً، ص۔۱۷۴

۴۸۔ ایضاً، ص۔۲۴۰

۴۹۔ ایضاً، ص۔۱۸۱

۵۰۔ ایضاً، ص،۸۳۔۲۳۱

۵۱۔ سجاد میر، ایک باغیانہ آواز، مشمولہ: جنگ راولپنڈی، سنڈے میگزین، مورخہ یکم اکتوبر ۲۰۰۴ء۔

۵۲۔ چاہ یوسف سے صدا، یوسف رضا گیلانی، نگارشات لاہور، ۲۰۰۶ء، ص۔۱۰

۵۳۔ ایضاً، ص۔۹

۵۴۔ ایضاً، ص۱۸۔۱۹

۵۵۔ ایضاً، ص۱۹۔۲۰

۵۶۔ ایضاً، ص۲۸۔۲۹

۵۷۔ ایضاً، ص۔۱۷

۵۸۔ ایضاً، ص۔۳۷

۵۹۔ ایضاً، ص۔۴۱

۶۰۔ ایضاً، ص۔۳۹

۶۱۔ ایضاً، ص۔۴۷

۶۲۔ ایضاً، ص۔۵۵

۶۳۔ ایضاً، ص۔۵۴

۶۴۔ ایضاً، ص۔۶۳

۶۵۔ ایضاً، ص۔۶۹

۶۶۔ ایضاً، ص۔۱۱۱

۶۷۔ ایضاً، ص۔۱۱۶

۶۸۔ ایضاً، ص۔۱۳۲

۶۹۔ ایضاً، ص۱۳۴۔۱۳۵

۷۰۔ ایضاً، ص۔۱۳۷

۷۱۔ ایضاً، ص۔۱۷۰

۷۲۔ ایضاً، ص۔۲۰۶

۷۳۔ ایضاً، ص۔۲۰۲

۷۴۔ ایضاً، ص۔۲۳۲

۷۵۔ ایضاً، ص۔۲۵۷

۷۶۔ ایضاً، ص۱۳۷۔۱۳۸

۷۷۔ ایضاً، ص۔۱۲۶

۷۸۔ ایضاً، ص۔۱۴۳

۷۹۔ ایضاً، ص۔۱۲۸

۸۰۔ ایضاً، ص۱۸۰۔۱۸۱

۸۱۔ ایضاً، ص۔۲۳۰

۸۲۔ ایضاً، ص۔۴۶

۸۳۔ ایضاً، ص۔۱۶۵

۸۴۔ ایضاً، ص۔۲۳۷

۸۵۔ ایضاً، ص۔۴۳۔۴۴

۸۶۔ ایضاً، ص۱۱۷۔۱۱۸

۸۷۔ ایضاً، ص۔۵۰

۸۸۔ ایضاً، ص۔۲۳۴

۸۹۔ ایضاً، ص۔۱۰۶۔۱۰۷

۹۰۔ ایضاً، ص۔۵۱

۹۱۔ ایضاً، ص۔۱۱۱

۹۲۔ ایضاً، ص۔۲۰۱

۹۳۔ ایضاً، ص۔۱۶۱

۹۴۔ ایضاً، ص۔۱۴۳

۹۵۔ ایضاً، ص۔۴۱

۹۶۔ ایضاً، ص۔۲۷

۹۷۔ ایضاً، ص۔۲۲۴

۹۸۔ ایضاً، ص۔۱۱۳

۹۹۔ ایضاً، ص۔۱۲۱

۱۰۰۔ ایضاً، ص۔۱۳۴

۱۰۱۔ ایضاً، ص۲۲۰۔۲۲۱

۱۰۲۔ ایضاً، ص۔۲۲۴

۱۰۳۔ ایضاً، ص۔۲۲۹

۱۰۴۔ ایوان اقتدار کے مشاہدات، گوہر ایوب خان، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۳ء، ص۔۱۹

۱۰۵۔ ایضاً، ص۔۲۸

۱۰۶۔ ایضاً، ص۔۸۳

۱۰۷۔ ایضاً، ص۔۶۰

۱۰۸۔ ایضاً، ص۱۱۲۔۱۲۲

۱۰۹۔ ایضاً، ص۔۳۲۸

۱۱۰۔ ایضاً، ص۔۳۱۱

۱۱۱۔ ایضاً، ص۔۱۴۱

۱۱۲۔ ایضاً، ص۔۳۰۸

۱۱۳۔ ایضاً، ص۔۴۹

۱۱۴۔ ایضاً، ص۔۱۹۶

۱۱۵۔ ایضاً، ص۔۱٦۹

۱۱٦۔ ایضاً، ص۔۱۷۵

۱۱۷۔ میری تنہا پرواز، کلثوم سیف اللہ، علی پبلشنگ بیورو اسلام آباد، ۲۰۱۱ء، ص۔۳۵

۱۱۸۔ ایضاً، ص۔۴٦

۱۱۹۔ ایضاً، ص۔۸۴

۱۲۰۔ ایضاً، ص۔۸۵

۱۲۱۔ ایضاً، ص۔۱۰۸

۱۲۲۔ ایضاً، ص۔۱۵۱

۱۲۳۔ ایضاً، ص۔۲۲۲

۱۲۴۔ ایضاً، ص۲۰٦۔۲۰۷

۱۲۵۔ ایضاً، ص۔۲۱۰

۱۲٦۔ ایضاً، ص۔۲۰۸

۱۲۷۔ ایضاً، ص۔۲۲۴

۱۲۸۔ فرزند پاکستان، شیخ رشید احمد، رُمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز راولپنڈی، ۲۰۱۳ء، ص۔۱۷

۱۲۹۔ ایضاً، ص۔۲۳

۱۳۰۔ ایضاً، ص۔۲۷

۱۳۱۔ ایضاً، ص۔۳٦

۱۳۲۔ ایضاً، ص۔۹۴

۱۳۳۔ ایضاً، ص۔۱۲۴

۱۳۴۔ ایضاً، ص۔۱۲۷

۱۳۵۔ ایضاً، ص۔۱۴۲

۱۳٦۔ ایضاً، ص۔۳۷

۱۳۷۔ ایضاً، ص۔۱۲۱

۱۳۸۔ ایضاً، ص۔۱۳۸

۱۳۹۔ ایضاً، ص۔۱۳۹

۱۴۰۔ ایضاً، ص۔۱۰۷۔۱۰۸

۱۴۱۔ ایضاً، ص۔۷۲

۱۴۲۔ ایضاً، ص۔۱۷۲

۱۴۳۔ ایضاً، ص۔۱۲۱

۱۴۴۔ ایضاً، ص۔۷۲

۱۴۵۔ ایضاً، ص۱۵۳۔۱۵۴

۱۴۶۔ ایضاً، ص۔۱۷۱

۱۴۷۔ ایضاً، ص۔۱۷۱

۱۴۸۔ سچ تو یہ ہے۔ چودھری شجاعت حسین، فیروز سنز لاہور، ۲۰۱۸ء، ص-23-24

۱۴۹۔ ایضاً، ص۔۲۷

۱۵۰۔ ایضاً، ص۔۳۸

۱۵۱۔ ایضاً، ص۔۴۲

۱۵۲۔ ایضاً، ص۔۲۱

۱۵۳۔ ایضاً، ص۔۷۸

۱۵۴۔ ایضاً، ص۔۶۸

۱۵۵۔ ایضاً، ص۔۱۴۱

۱۵۶۔ غدار کون؟ محمد نواز شریف، مرتبہ: سہیل وڑائچ، ساگر پبلشرز لاہور، ۲۰۰۶ء ص۔۸۹

۱۵۷۔ سچ تو یہ ہے۔ چودھری شجاعت حسین، فیروز سنز لاہور، ۲۰۱۸ء ص۔۲۹۹

۱۵۸۔ ایضاً، ص۔۱۵

۱۵۹۔ ایضاً، ص۔۱۶۱

۱۶۰۔ ایضاً، ص۔۲۰۴

۱۶۱۔ ایضاً، ص۔۲۳۴

۱۶۲۔ ایضاً، ص۔۸۳

۱۶۳۔ ایضاً، ص۔۸۷

۱۶۴۔ ایضاً، ص۔۹۰

۱۶۵۔ ایضاً، ص۔۹۴

۱۶۶۔ ایضاً، ص۔۱۴۶

۱۶۷۔ ایضاً، ص۔۳۲۵

تیسرا باب

جزوی آپ بیتیاں

جزوی آپ بیتیاں:

جزوی آپ بیتیوں سے مراد وہ آپ بیتیاں ہیں جن میں زمانی اور منطقی ترتیب کا خیال نہ رکھا گیا ہو اور جن میں زندگی کے صرف چیدہ چیدہ واقعات کا ذکر ہو۔ جزوی آپ بیتی میں کوئی خاص واقعہ یا کسی زمانے کے چند مخصوص واقعات کو بیان کیا جاتا ہے۔ چونکہ یہ آپ بیتی لکھنے والے کی زندگی کی ایک مخصوص دَور کی سرگزشت ہوتی ہے اور اِس میں پیدائش سے لے کر آپ بیتی لکھنے کے زمانے تک زندگی کے تمام اہم مراحل و منازل کا ذکر نہیں ہوتا اِس لیے اِس قسم کی آپ بیتی کو جزوی آپ بیتی کا نام دیا گیا ہے۔

جزوی آپ بیتی یک رُخی اور سرسری ہوتی ہے۔ اِس کو پڑھ کر مصنف کی ذات، شخصیت، زندگی، سوچ، فکری ارتقا اور زندگی کی طرف میلانات ورجحانات کا مکمل اظہار نہیں ہوتا نیز اس قسم کی آپ بیتی اُصول آپ بیتی نگاری کے مطابق نہیں لکھی جاتی۔ ہم جزوی آپ بیتیوں کی دو اقسام کر سکتے ہیں ایک وہ جن میں کسی مضمون کو سناتے سناتے ضمناً اپنی خود نوشت بھی بیان کی گئی ہو۔ جیسے ''اور لائن کٹ گئی''، ''بڑی جیل سے چھوٹی جیل تک''، ''پنجاب کا مقدمہ''۔ دوسری قسم کی آپ بیتیاں وہ ہیں جن میں بغیر کسی ترتیب یا منصوبہ بندی کے اپنی سرگزشت بیان کی گئی ہو یعنی جب اور جیسے کوئی واقعہ یاد آیا لکھ دیا۔ مثلاً ''ناقابل فراموش''، ''جبر اور جمہوریت''، ''وزیر جیل سے اسیر جیل تک''۔ درج ذیل سیاسی آپ بیتیاں جزوی آپ بیتیوں کی فہرست میں شامل ہیں۔

(۱) اور لائن کٹ گئی (کوثر نیازی) (۲) سفر زندگی (الطاف حسین) (۳) جبر اور جمہوریت (بیگم کلثوم نواز شریف) (۴) وزیر جیل سے اسیر جیل تک (سید قمر عباس) (۵) سچ کہوں گا (چوہدری اعتزاز احسن) (۶) پنجاب کا مقدمہ (محمد حنیف رامے) (۷) بڑی جیل سے چھوٹی جیل تک (راجہ انور)۔

ا۔ اور لائن کٹ گئی (کوثر نیازی)

مولانا کوثر نیازی پاکستانی سیاست اور علمی حلقوں میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ کثیر الجہت انسان تھے، علم و ادب، شعر و شاعری، مذہب، صحافت اور سیاست غرض ہر میدان مولانا کی دلچسپی کا مرکز تھا۔ اُن کا بنیادی حوالہ سیاست اور تاریخ ہے۔ وہ پاکستان پیپلز پارٹی میں ایک اہم منصب رکھتے تھے اور ذوالفقار علی بھٹو کے انتہائی قریبی رفقاء میں اُن کا شمار ہوتا تھا۔ ہر نابغے کی طرح ذوالفقار علی بھٹو کی شخصیت میں امتیازی اوصاف کے ساتھ ساتھ چند بنیادی کمزوریاں بھی تھیں مثلاً وہ کسی پر نہ تو اعتماد کرتے تھے اور نہ اپنے منصوبے اور دل کے راز کسی پر آشکارا کرتے تھے تاہم مولانا کوثر نیازی معدودے اُن

چند افراد میں سے تھے جنہیں ذوالفقار علی بھٹو کا مزاج اور عادات سمجھنے کا اعزاز حاصل تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو کے کابینہ سے شہرت حاصل کرنے والے ایک طاقتور وزیر اور وزیرِ اطلاعات و نشریات کے روپ میں دُنیا کے سامنے آنے والے مولانا کوثر نیازی مرتے دم تک ایک سنجیدہ سیاستدان، مفکر، دانشور اور بڑے عالم کے طور پر عزت و احترام سے یاد کیے جاتے تھے۔

مولانا کوثر نیازی ۱۹۳۴ء کو میانوالی میں پیدا ہوئے۔(۱) انگریزی میں گریجویشن کے ساتھ ساتھ عربی، اُردو اور فارسی میں پنجاب یونیورسٹی سے آنرز کیا۔ اُنہوں نے مولانا مودودی سے اسلامی فکر، مولانا آمین احسن اصلاحی سے تفسیر قرآن، مولانا محمد اسماعیل سے علم حدیث، مولانا محمد ادریس کاندھلوی سے بخاری شریف اور مولانا عبدالحق ندوی سے عربی زبان میں رہنمائی حاصل کی۔ وہ فکرِ اسلامی، ادب، سیاست اور تاریخ و تحقیق پر ۳۰ سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں۔ اُن کی کتاب ''مطالعہ تاریخ'' متعدد یونیورسٹیوں میں ایم۔اے کے نصاب میں شامل ہے۔ اُن کی شاعری کے دو مجموعے ''زرِ گل'' اور ''لمحے'' منصہ شہود پر آئے ہیں۔ مولانا کوثر نیازی نے سیاسی کیریئر کا آغاز جماعت اسلامی سے کیا تھا بعد ازاں وہ پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے اور سیکرٹری جنرل کے عہدے تک پہنچے۔ ۱۹۷۰ء میں آپ نے جیل سے الیکشن لڑا اور پاکستان کی تاریخ میں سب سے زیادہ ووٹ حاصل کر کے قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ ۱۹۸۵ء میں سینیٹر منتخب ہوئے، ۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۷ء تک وہ پاکستان کے وزیر اطلاعات و نشریات رہے۔ ۱۹۹۳ء میں پاکستان پیپلز پارٹی نے اُنہیں اسلامی نظریاتی کونسل کا چیئرمین بنا دیا۔(۲)

''اور لائن کٹ گئی'' مولانا کوثر نیازی کی سیاسی روداد ہے جو اُس نے ۱۹۷۷ء میں ایام اسیری میں لکھی۔ اِس کتاب کو ملک گیر شہرت ملی۔ اِسے بیسٹ سیلر کتاب کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ آپ نے ذوالفقار علی بھٹو کی زندگی اور سیاست پر بھی ایک کتاب ''دیدہ ور'' کے عنوان سے شائع کی تھی جو اپنی جگہ ایک شاہکار کتاب ہے۔ مولانا نے اپنی کوئی باقاعدہ خودنوشت نہیں لکھی تاہم مذکورہ کتاب اور ''لائن کٹ گئی'' آپ کی سیاسی سرگزشت ہے۔ خصوصاً آپ کی زندگی کے ۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۷ء تک کے ہنگامہ خیز دِنوں کی خودنوشت ہے۔ اِس خودنوشت میں آپ نے اپنی ذات، خیالات و عادات، پسند و ناپسند، داخلی و خارجی زندگی، شخصیت کے کئی ڈھکے چھپے پہلو اور اپنے روز و شب کی تفصیلات بے ترتیبی سے سپرد قلم کی ہیں اِس لیے ہم نے اِس کتاب کو جزوی آپ بیتی کی فہرست میں شامل کیا ہے۔ یہ آپ بیتی اِس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ مصنف نے اپنے علاوہ سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو، اُن کے قریبی ساتھیوں، دیگر سیاسی رہنماؤں، فوجی جرنیلوں اور بیوروکریٹوں کے بارے میں بھی ہوشربا انکشافات کیے ہیں۔ اِس طرح یہ آپ بیتی جگ بیتی، تاریخی دستاویز، معاشرتی تغیرات، سیاست کے اُتار چڑھاؤ، بین الاقوامی سازشوں اور سماجیاتی تبدیلیوں کے حوالے سے ایک اہم آپ بیتی بن جاتی ہے۔

''اور لائن کٹ گئی''ایک جزوی سیاسی آپ بیتی ہے اِس لیے اِس میں مصنف کے ذاتی کوائف اور نجی معلومات زیادہ تفصیل سے موجود نہیں البتہ اپنے اور اپنے خاندان کے بارے میں آپ نے مختصر معلومات دیئے ہیں مثلاً آپ کے تین بیٹے طارق، رؤف عرف روفی اور رضوان ہیں۔ طارق اُن کا بڑا بیٹا، رؤف منجھلا اور رضوان سب سے چھوٹا ہے۔ آپ کی ایک بیٹی بھی ہے جو ۴ اور ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کے درمیانی رات ملک پر لگنے والے تیسرے مارشل لاء کے وقت گھر پر موجود نہیں تھی اور ماں کے ساتھ عمرہ کرنے گئی ہوئی تھی۔(۳)

۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں آپ جیل میں تھے۔آپ نے یہ الیکشن جیل سے لڑا تھا اور پورے مشرقی اور مغربی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمٰن کے بعد ووٹ حاصل کرنے والے اُمیدواروں میں اُن کا دوسرا نمبر تھا۔ جیل سے الیکشن لڑنے کے واقعے کو مولانا نیازی اپنی آپ بیتی میں یوں بیان کرتے ہیں:

> ''۱۹۷۰ء میں ملٹری کورٹ نے مجھے ۵ سال قید کی سزا سنائی۔ ۱۹۷۰ء کا الیکشن میں نے جیل سے اِس طرح لڑا کہ میرے حلقہ انتخاب پسرور میں میرے جلسوں میں پیپلز پارٹی کے کارکن میری جگہ، ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑی ہوئی میری قدم آدم تصاویر سے پُر کیا کرتے تھے اور الحمد اللہ کہ میں نے جیل سے یہ الیکشن اِس طرح جیتا کہ پورے پاکستان میں حاصل شدہ ووٹوں کی تعداد کے اعتبار سے شیخ مجیب الرحمٰن کے بعد میرا نمبر دوسرا تھا۔''(۴)

آپ نے اپنی آپ بیتی میں یہ بھی بتایا ہے کہ ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں بھی آپ نے اِسی حلقے یعنی پسرور سے حصہ لیا۔ اُن کے مقابلے میں قومی اتحاد (پی۔این۔اے) کے نسبتاً ایک گمنام وکیل انتخاب لڑ رہے تھے جنہیں آپ نے آسانی سے شکست دے دی۔ قومی اتحاد انتخابات میں پچاس سے زیادہ حلقوں پر دھاندلی کا الزام لگا رہی تھی جس میں آپ کا حلقہ بھی شامل تھا تاہم آپ نے بڑی صفائی سے اپنے حلقے کی دھاندلی کی شکایت کو گھول کر دیا ہے اور دیگر حلقوں کے انتخابی نتائج کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے۔(۵)

اِس آپ بیتی میں مولانا کوثر نیازی نے جہاں اپنے دیگر اوصاف، انتظامی صلاحیتوں، معاملہ فہمی، زیرکی، فصاحت و بلاغت اور بہترین مقرر ہونے کا اعتراف کیا ہے وہاں یہ بھی بتایا ہے کہ آپ علم نجوم خصوصاً دست شناسی پر بھی کامل عبور رکھتے تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو جس وقت قید کو ٹھڑی میں تھے اور ہائی کورٹ و سپریم کورٹ میں اُن پر مقدمات چل رہے تھے، کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اُنہیں پھانسی کی سزا ہو سکتی ہے۔ ہر آدمی پُر امید تھا کہ حکومت کسی نہ کسی مرحلے پر بھٹو

کے ساتھ معاملات ٹھیک کر دے گی۔ اُس وقت ذوالفقار علی بھٹو کا ہاتھ دیکھ کر مولانا کس نیتجے پر پہنچتے تھے، اُن کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

> ''جن دِنوں مسٹر بھٹو کوٹ لکھپت جیل میں تھے اور اُن پر احمد رضا قصوری کے والد کے قتل کی سازش میں شریک ہونے کے الزام میں مقدمہ زیر سماعت تھا تو ایم۔اے ملک صاحب (پاکستان کے ایک معروف دست شناس تھے) نے مجھے اُن کے ہاتھوں کے نشانات جو بھٹو نے اُنہیں بھجوائے تھے، دکھائے۔ اُنہوں نے ایک خاص لائن پر اُنگلی رکھی۔ دماغی لکیر کے اختتام پر ایک لکیر گر رہی تھی جس پر گول دائرہ تھا۔ اُنہوں نے مجھ سے پوچھا کہ آپ اِس لکیر کو دیکھ کر کس نتیجے پر پہنچے ہیں۔ میں خاموش رہ گیا۔ پھر وہ خود ہی بولے کہ اِس آدمی کا دماغ اِسے پھانسی کے تختے تک پہنچائے گا۔ مسٹر ملک کی بات درست تھی۔ میں خود بھی ہاتھ کے پرنٹ دیکھنے کے بعد اس نیتجے پر پہنچا تھا۔''(۶)

جس طرح اُوپر ذکر کیا گیا ہے کہ یہ آپ بیتی بنیادی طور پر ایک خاص سیاسی عہد کی سرگزشت ہے جو ۱۹۷۳ء سے لے کر ۱۹۷۷ء کے مارشل لاء لگنے تک کی مدت پر محیط ہے۔ اِس دوران مولانا کوثر نیازی نے جو کچھ دیکھا، سُنا یہ آپ بیتی اُس عرصے کے مشاہدات وتاثرات کا بے لاگ بیان یا کہانی ہے۔

۱۹۷۷ء کو وطن عزیز پر ایک مرتبہ پھر فوجی حکومت کی سیاہ رات طاری ہو گئی جو دَس سال سے زیادہ عرصے پر پھیل گئی اور جس کے اثرات آج بھی محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ جنرل ضیاء الحق کی مارشل لاء کیوں اور کیسے آئی؟ آپ نے بڑی تفصیل سے بھٹو حکومت کے خاتمے اور مارشل لاء لگنے کے اسباب وعوامل بیان کیے ہیں۔ اول بیروکریسی کے عوام پر ظلم، دوم فوج اور فوجی جرنیلوں کو سیاست میں ملوث کرنا، سوم پولیس کو حد درجہ سیاسی بنانا اور مخالفین کے خلاف مسلسل استعمال کرنا، چہارم اپوزیشن کے تمام چھوٹے بڑے رہنماؤں کو جیل میں ڈالنا، پنجم مساجد کے آئمہ حضرات کا حکومت کے خلاف تحریک کی قیادت سنبھالنا، ششم دیر اور بلوچستان میں جنرل ریٹائرڈ ٹکا خان کے ذریعے ملٹری آپریشن کروانا (۷) ایسی وجوہات تھیں جو بھٹو حکومت کے خاتمے اور فوجی مداخلت کے لیے جواز بن گئیں۔

میڈیا (خوااِس کی کوئی بھی قسم ہو) کا ہمیشہ سے سیاست دانوں اور حکمرانوں کے نیک نامی یا بدنامی میں اہم کردار رہا ہے۔ ہمارے ملک میں ابتدا ہی سے تقریباً ہر حکمران نے میڈیا کو ذاتی تشہیر کا ذریعہ بنایا ہے لیکن اس معاملے میں جو گھناؤنا

کردار ذوالفقار علی بھٹو کا رہا ہے اِس کی مثال اِس سے پہلے ہمارے سیاسی تاریخ میں نہیں ملتی۔ وہ دو وزارتوں میں خصوصی دلچسپی لیتے تھے وزارت خارجہ اور وزارت اطلاعات و نشریات۔ موٴخر الذکر وزارت کو آپ نے سائنسی خطوط پر استوار کر کے اِس کو ایک بہت بڑے ہتھیار کے طور پر استعمال کرنا شروع کیا۔ آپ نے ملکی تاریخ میں پہلی مرتبہ میڈیا کے گروپ بنائے اور بڑے بڑے صحافیوں کو لالچ دے کر اپنے ساتھ شامل کروایا(یہ اور بات کہ بعد میں صدر جنرل ضیاء الحق نے اُن ہی میڈیا گروپوں کو آپ کے خلاف استعمال کر لیا) ۔ مسٹر بھٹو نے صرف اِس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بھانڈوں کو بھی اپنی پارٹی کی پروپیگنڈہ مہم میں شامل کر لیا۔ آج مختلف سیاسی پارٹیاں گلوکاروں اور فلمی ستاروں کو اپنے جلسے جلوسوں میں لاتی ہیں۔ اِس کا آغاز بھی ذوالفقار علی بھٹو کی جدت پسند اور منفرد طبیعت نے کیا تھا۔ اِس سلسلے میں مولانا کوثر نیازی رقم طراز ہیں:

''وزیر اعظم انتخابات سے قبل پارٹی اور حکومت کی پبلسٹی مہم کے بارے میں کس قدر حساس تھے، اِس کا اندازہ اُس کے ایک مراسلے سے کیا جا سکتا ہے جو اُنہوں نے لاہور میں اپنی قیام کے دوران مجھے اور چاروں صوبوں کے وزرائے اعلیٰ کو بھجوایا تھا اور اِس جانب ہماری توجہ مبذول کروائی کہ پارٹی کی پروپیگنڈہ مہم میں بھانڈوں کو بھی منظم کیا جانا چاہیئے۔''(۸)

مارچ ۱۹۷۷ء کے عام انتخابات کے بعد اپوزیشن جماعتوں نے ذوالفقار علی بھٹو پر انتخابات میں بڑے پیمانے پر دھاندلی کا الزام لگا کر نہ صرف انتخابی نتائج مسترد کر دیئے بلکہ دوبارہ فوج کی نگرانی میں شفاف انتخابات کا مطالبہ کیا۔ پیپلز پارٹی نے اپوزیشن کا یہ دعویٰ مسترد کیا اور اپنی نئی حکومت تشکیل دے دی۔ اِس کے نتیجے میں زبردست محاذ آرائی ہوئی۔ کئی لوگ جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ہزاروں لوگ گرفتار ہوئے، سرکاری املاک کو نقصان پہنچا اور بالآخر ملک میں مارشل لاء نافذ ہو گیا۔ اگر ذوالفقار علی بھٹو آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کرتے تو ملکی سیاسی تاریخ آج مختلف ہوتی۔ مولانا کوثر نیازی اِس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ اپوزیشن کا دعویٰ بالکل صحیح تھا۔ وہ خود کو یہ کہہ کر اِس الزام سے بری الذمہ کرتے ہیں کہ اُنہیں انتخابات کے نتائج کے دو دِن بعد اِس دھاندلی کا پتہ چلا حالانکہ آزاد ذرائع اُنہیں اِس دھاندلی میں پوری طرح ملوث بتاتے ہیں۔ مولانا بڑی سادگی سے اِس قصے کا دبے الفاظ میں یوں ذکر کرتے ہیں:

''انتخابات میں رگنگ کا سب سے پہلا انکشاف مجھ پر ے مارچ کے دو ہی روز بعد اُس وقت ہوا جب پی۔ این۔ اے اپنا ایجی ٹیشن شروع کر چکی تھی، اُس نے انتخابی نتائج کو مسترد کر دیا تھا۔ ایک شام پی۔ ایم ہاؤس میں وزیر اعظم بھٹو، میں، حفیظ پیر زادہ،

رفیع رضا اور ایک دو اور احباب موجود تھے کہ وزیر اعظم نے پیرزادہ کی طرف دیکھا اور گویا ہوئے، کتنی سیٹوں پر گڑ بڑ ہوئی ہو گی؟ سر ۳۰ سے ۴۰ تک، حفیظ نے مختصر جواب دیا۔"(۹)

پاکستانی سیاست، معیشت اور عسکری منصوبوں میں امریکہ کی دلچسپی ایک کھلا راز ہے۔ بے شمار مواقع ایسے آئے جب امریکہ نے براہِ راست یا بلواسطہ ہماری سیاسی، معاشی اور عسکری تاریخ کے دھارے تبدیل کر دیئے لیکن اِس کا نقطہ عروج وہ تھا جب سوویت یونین کی فوجیں افغانستان میں داخل ہو گئیں۔ یہ ۷۹۔۱۹۷۸ء کا واقعہ ہے لیکن اِس سے بہت پہلے اِس خطے میں دونوں بڑی طاقتیں اپنے لیے میدان ہموار کر رہی تھیں۔ بھٹو حکومت کا خاتمہ، اُن کی پھانسی اور مارشل لاء ہمارے اکثر دانشور اِسی سلسلے کی مختلف کڑیاں تصور کرتے ہیں۔ ذوالفقار علی بھٹو بڑے جہان دیدہ اور کامیاب سفارت کار تھے۔ اُنہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ امریکہ اُنہیں راستے سے ہٹانا چاہتی ہے چنانچہ مولانا کوثر نیازی نے اِس بات کا بھی ذکر کیا ہے کہ بھٹو نے عوامی اجتماعات میں امریکی صدر اور وزیر داخلہ کے خلاف کھل کر بیانات دینے کا سلسلہ شروع کیا۔ وہ امریکہ کے لیے "ہاتھی" کا استعارہ استعمال کرتا تھا۔ بڑے دلائل اور ذاتی تجربات سے مولانا نے یہ ثابت کیا ہے کہ اُس وقت کے امریکی صدر جمی کارٹر اور وزیر خارجہ ہنری کسنجر ہر صورت میں بھٹو حکومت کا خاتمہ چاہتی تھی کیونکہ وہ اسرائیل کے خلاف تھے، فرانس سے ایٹمی معاہدے کر رہے تھے اور خلیجی ممالک کے سربراہوں کو نیا اعتماد دے کر مشرق وسطیٰ میں امریکہ کے خلاف ایک نیا اتحاد تشکیل دے رہے تھے۔(۱۰) یہ غلطی اُن کو اِتنی مہنگی پڑی کہ اُنہیں پہلے حکومت اور پھر زندگی سے ہاتھ دھونے پڑے۔

ذوالفقار علی بھٹو کے بارے میں مولانا کوثر نیازی نے بڑی سچائی سے رقم کیا ہے کہ وہ اِس ملک کے پہلے رہنما تھے جس کے عرب ممالک کے ساتھ مثالی تعلقات تھے اور اُن سے ہر قسم کے کام نکال سکتے تھے۔ عرب اسرائیل جنگ میں آپ نے کھل کر عربوں کی حمایت کی تھی اور اپنی افواج بھیجی تھیں۔ اُس دَور میں خلیجی ممالک کا ہماری سیاست میں کتنا اہم کردار ہو گیا تھا اِس بارے میں مولانا کوثر نیازی نے بڑی تفصیل سے بتایا ہے کہ بلکہ اپوزیشن کے ساتھ ذوالفقار علی بھٹو کی جنگ میں تصفیے کے لیے اِن حکومتوں نے اپنے سفیر بھیجے تھے۔ اِن سب میں سعودی عرب کے سفیر نے خصوصی کردار ادا کیا تھا۔ مولانا کوثر نیازی نے اُنہیں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

"متحدہ عرب امارات کے وزیر خارجہ تو اگلی صبح وطن واپس روانہ ہو گئے لیکن شیخ ریاض الخطیب جو پاکستان میں سعودی عرب کے سفیر تھے، معاملات سے اِن چ

> رہے۔ میں نے اپنی زندگی میں اُن جیسا شخص کبھی نہیں دیکھا۔ وہ پاکستان کے لیے
> جس قدر درد اپنے دِل میں رکھتے تھے، اُس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ کاش کہ خود
> پاکستانی اُس کا ایک پاسنگ بھی اپنے دِل میں رکھتے۔"(۱۱)

اُن دِنوں جب پیپلز پارٹی حکومت کے خلاف اپوزیشن جماعتوں پر مشتمل قومی اتحاد کا احتجاج زوروں پر تھا تو حکومت کے ساتھ مذاکرات میں مسٹر بھٹو نے ۱۵ نکات پر مشتمل ایک مسودہ پیش کیا جس میں اُنہوں نے حکومت پر زور دیا تھا کہ وہ قومی اسمبلی کو توڑ کر از سرِ نو نئے انتخابات کرائے، بلوچستان اور دیر میں فوجی آپریشن ختم کرے، سیاسی کارکنوں کو رہا کرے، آرمی ایکٹ اور آرمی عدالتوں کو فی الفور ختم کرے، پریس کو مکمل آزادی دے اور الیکشن کمیشن کو ہر لحاظ سے ایک خود مختار ادارہ بنائے۔ مولانا کوثر نیازی نے اپنی مذکورہ جزوی آپ بیتی میں اُس مسودے کی اصل کاپی درج کی ہے جس سے قارئین اُس وقت کے سیاسی فضا کا نقشہ آسانی سے سمجھ سکتے ہیں جو ۱۹۷۷ء کے عام انتخابات کے وقت تشکیل پا چکی تھی۔(۱۲)

پاکستانی سیاست بھی ایک طرفہ تماشا ہے۔ روزِ اول سے فوجی سربراہان ملکی سیاست میں گہری دلچسپی لیتے آئے ہیں۔ اِس کی اولین مثال تو اُس وقت سامنے آئی جب قائدِ اعظم محمد علی جناح حیات تھے اور جنرل اکبر خان نے سیاست کے بارے میں آپ سے کوئی سوال پوچھا۔ قائدِ اعظم نے اُنہیں سختی سے ٹوک دیا اور فرمایا کہ آپ کو اِن باتوں سے کیا سروکار ہے؟ پھر یہ سلسلہ ایسا شروع ہوا کہ آج تک ختم نہیں ہو سکا۔ سویلین بالادستی کو قبول نہ کرنا، حکومتوں کو مسلسل دباؤ میں رکھنا، اُن کی جاسوسی کر کے اُن کی ملاقاتیں اور باتیں ٹیپ کرنا، حکمرانوں کے لیے پالیسیاں وضع کرنا، غیر ملکی دورے کرنا، دیگر ممالک کے وزرائے خارجہ اور سفیروں سے ملاقاتیں کرنا ہماری فوج کا وہ کردار ہے جن کا حقیقی جمہوری ممالک میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اِن سب باتوں کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے کہ ہمارے سِول حکمران بھی فوج میں خوب دلچسپی لیتے ہیں۔ اپنی مرضی کے فوجی سربراہ تعینات کرتے ہیں اور کور کمانڈرز کانفرنسوں کی اندرونی باتیں معلوم کرواتے ہیں۔ مولانا کوثر نیازی نے اِس بارے میں بھی حیران کن انکشافات کر کے لکھا ہے کہ ہمارے وزرائے عظام فوج کے اندر اپنے جاسوس جرنیل رکھتے ہیں جو اُنہیں اندر کی خبریں لا کر اُن کو باخبر کرتے ہیں۔ میجر جنرل عبداللہ ملک مسٹر بھٹو کے ایک ایسے ہی معتمد تھے۔ اپنا ایک چشم کشا واقعہ بیان کر کے مولانا کوثر نیازی لکھتے ہیں:

> "دورانِ گفتگو اچانک مسٹر بھٹو نے میجر جنرل عبداللہ ملک سے پوچھا کہ آپ کے
> ہاں کی کیا خبریں ہیں؟ عبداللہ ملک نے جواب دیا کہ کچھ لوگ ذہنی تحفظات کا شکار
> نظر آتے ہیں۔"(۱۳)

مولانا کوثر نیازی نے اپنی سر گزشت میں بڑی سچائی سے اِس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف برپا ہونے والا احتجاج ملکی تاریخ کا سب سے بڑا احتجاج تھا۔ لیکن مسٹر بھٹو آخر تک اِسے کوئی اہمیت نہیں دے رہے تھے۔ اِس سلسلے میں وہ اِتنے پُراعتماد تھے کہ کسی کی بات سننا گوارا نہیں کرتے تھے۔ وہ اپوزیشن کے ساتھ مذاکرات میں بار بار پینترے بدل رہے تھے۔ بھٹو بڑے شاطر تھے۔ وہ سیاسی چال وقت پر کھیلنے میں یکتا تھے اور اُس وقت اُس کی مہارت دیدنی تھی۔ اُن کی اِن شاطرانہ سیاسی چالوں سے مذاکرات کو سخت نقصان پہنچا۔ مولانا نے یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ اگر بھٹو کو جرنیلوں سے خطرہ نہ ہوتا تو وہ اپوزیشن سے کبھی مذاکرات نہ کرتے۔ اُنہیں احساس ہو گیا تھا کہ بیرونی اور اندرونی عناصر مل کر اُنہیں سیاسی طور پر شکست دے رہی ہیں۔ بیرونی عناصر سے مراد امریکہ اور اندرونی عناصر سے فوج اور سول بیوروکریسی ہے۔ عین اُس وقت مولانا احتشام الحق تھانوی نے ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف کفر کی مشہور دستخطی مہم چلائی جس نے بھٹو کے خلاف چلنے والے اِس تحریک کو تیز کر دیا۔ اُس وقت کے آرمی چیف جنرل ضیاء الحق ابتدا میں بھٹو کے وفادار تھے۔ اُن کے ذہن میں ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کے خاتمے کا خیال کب پیدا ہوا تھا، اِس بارے میں مولانا کوثر نیازی یہ انکشاف کرتے ہیں:

> "جنرل ٹکا خان (مسٹر بھٹو کے دفاعی مشیر) نے ایک میٹنگ میں اپنی وہ احمقانہ تجویز پیش کی تھی جس کا ذکر جنرل ضیاء الحق نے متعدد مواقع پر کیا ہے۔ ٹکا خان نے فرمایا تھا۔ سر! ہم تو بولتا ہے کہ اُن کا (اپوزیشن کا) پانچ چھ ہزار آدمی صاف کرا دیتے ہیں۔ یہ لوگ ٹھنڈا ہو کر گھر بیٹھ جائے گا۔ جنرل ضیاء کے بقول یہی سے اُن کے ذہن میں بھٹو حکومت کے خاتمے کا خیال پیدا ہوا تھا کیونکہ بھٹو حکومت خون خرابے پر تُلی ہوئی تھی۔"(۱۴)

حقیقت یہ ہے کہ بیرونی اشارے اور کچھ دیگر عوامل بھی ضیاء الحق کو ایسا کرنے کی تحریک دے رہے تھے۔ مولانا نے یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ مسٹر بھٹو ضیاء الحق کو آرمی چیف کے منصب سے ہٹانا چاہتے تھے۔ غلام اسحاق خان نے ضیاالحق کو یہ خبر پہنچائی تھی اِس لیے وہ بھی بھٹو سے چھٹکارا حاصل کرنے کے منصوبے بنانے لگے۔ اِن سب باتوں کے باوجود یہ بھی درست ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو کا آمرانہ رویہ اور طرزِ عمل بھی اُن کے زوال کا سبب بنا۔

آپ بیتی پڑھنے کے گوناگوں فوائد اور برکات ہیں۔ تاریخ، معاشرت، معیشت، سیاست اور اِس قسم کے کئی دلچسپ پہلو رکھنے کے باعث یہ صنفِ ادب ایک پہلودار صنف بن جاتی ہے۔ مختلف لوگ آپ بیتیاں اپنی اپنی پسند کے لیے پڑھتے ہیں۔ اِس طرح ایک آپ بیتی کئی لوگوں کی پسندیدہ کتاب بن جاتی ہے۔ جب بھی ہم بطور محقق یا نقاد کسی آپ بیتی کا محققانہ اور

ناقدانہ تجزیہ کرتے ہیں تو ہم دیگر اُمور کے ساتھ ساتھ یہ بھی تلاش کرتے ہیں کہ اپنی آپ بیتی میں مصنف نئے اور حیران کن انکشاف کتنے اور کس نوعیت کی کرتا ہے؟اِس کے علاوہ موضوع یا واقعے کے حوالے سے مصنف اپنی تعلی، مبالغہ، خود نمائی، ذاتی تشہیر، ایغو، خود بینی وغیرہ جن کو جدید نفسیاتی اصطلاح میں نرگسیت کہا جاتا ہے کا اظہار کیسے اور کیونکر کرتا ہے۔ جہاں تک ''اور لائن کٹ گئی'' میں نرگسیت کا سوال ہے وہ تو ظاہر ہے ساری آپ بیتی میں سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ ہر بڑے، نابغہ روزگار، عالم اور دانشور اور یکتائے زمانہ فرد کی طرح مولانا کوثر نیازی کی شخصیت بھی مرضِ نرگسیت سے مبریٰ نہیں۔ وہ زمانے کو اور اپنے اِرد گرد کے واقعات کو اپنی Intilictual Leval سے دیکھ رہے تھے اور وہ اُس پورے منظر نامے اور ہنگامے کا حصہ ہونے کے باوجود بھی خود کو اِس سے الگ تھلگ بتاتے ہیں، جو نرگسی آدمی کا خاصہ ہے۔ باقی رہا انکشافات کا معاملہ تو وہ بھی اِس کتاب کے ایک ایک صفحے پر دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ آپ بیتی اِس لیے تو مشہور ہے کہ اِس میں ہمارے ایک خاص عہد کے بارے میں دلچسپ اور حیرت انگیز انکشافات کیے گئے ہیں۔ان میں سے چند ایک کا ذکر درج ذیل سطور میں اختصار سے کرتے ہیں:

۱۔ ذوالفقار علی بھٹو نے ۱۹۷۴ء کو دنیا بھر سے اسلامی سربراہی کانفرنس کا کامیاب انعقاد کیا تھا۔ یہ مسٹر بھٹو کی دُور اندیشی تھی کہ مسلمان ممالک کے سربراہوں کو ایک جگہ جمع کر کے مسلمان ممالک کا ایک بڑا فیڈریشن تشکیل دیا جا سکے۔ یہ کانفرنس توقعات سے بڑھ کر کامیاب ہوئی تھی جس کا یقیناً امریکہ اور یورپ کو بے حد رنج تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو کی کرشماتی شخصیت، ذہانت، ذکاوت اور سفارتکار طبیعت کا نتیجہ تھا کہ عالم اسلام کے تقریباً تمام رہنما اور صدور کئی دِن تک اسلام آباد میں جمع ہو کر اپنے مسائل کو زیرِ بحث لاتے رہے۔اِس کانفرنس کا سب سے خوشگوار اور ہمیشہ یاد رہنے والا لمحہ وہ تھا جب تمام سربراہان نے لاہور کے بادشاہی مسجد میں ایک ساتھ نماز پڑھی تھی۔ وہ منظر آج بھی لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ ہے۔ مولانا کوثر نیازی نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ بادشاہی مسجد میں اسلامی سربراہان کا اجتماع اُن کی تجویز پر ہوا تھا۔ اُن پُر مسرت لمحات کو مولانا اپنے مخصوص اسلوب میں یوں یاد کرتے ہیں:

> ''کانفرنس توقعات سے کہیں زیادہ کامیاب رہی تھی۔ میری تجویز پر بادشاہی مسجد لاہور میں تمام سربراہوں کا اجتماع اور نماز کی ادائیگی کے عمل نے قوم کے اُن صدیوں پرانے خوابوں کو حیاتِ نو بخشی جو اِس خطے کے مسلمانوں کے اذہان کی گہرائیوں میں رَچے بسے ہوئے تھے۔ وہ ایک منظر بڑے بڑے مذہبی خطبوں سے زیادہ موثر تھا۔''(۱۵)

۲۔ آپ نے اِس بات کی بھی تفصیلات دی ہیں کہ بھارتی جیلوں میں قید پاکستانی قیدیوں کی رہائی کے سلسلے میں آپ کی وزارت نے بھرپور مہم چلائی تھی۔ آپ اِس بات کا کریڈٹ بھی لیتے ہیں کہ شیخ مجیب الرحمٰن کے ساتھ پہلا رابطہ بھی آپ

نے کیا تھا، وزارت خارجہ نے نہیں۔ نئے بننے والے ملک بنگلہ دیش کو تسلیم کرنا اور ملک کے اندر رائے عامہ کو ہموار کرنا وہ کٹھن کام تھا جس کا سارا کریڈٹ وہ بھٹو کے بعد خود کو دیتے ہیں۔ بنگلہ دیش اب دنیا کے نقشے پر ایک آزاد اور خود مختار ملک تھا۔ اِس حقیقت کو تسلیم کرانے میں بڑی جذباتی روکاوٹیں حائل تھیں اور شملہ معاہدے کو قوم سے قبول کروانے میں اُن کا ہاتھ تھا۔ آپ نے یہ بھی بتایا ہے کہ ذوالفقار علی بھٹواُن کی صلاحیتوں کو دیکھ کر ہی اُن پر اعتماد کیا کرتے تھے۔

> ''یہاں میں یہ انکشاف بھی کرتا چلوں کہ شیخ مجیب الرحمٰن کی حکومت کے ساتھ پہلا براہِ راست خفیہ رابطہ وزارت خارجہ کے توسط سے نہیں ہوا تھا بلکہ یہ فرض بھی میری وزارت نے نبھایا تھا۔ اِس قسم کی حساس اور نازک کامیابیاں حاصل کرنے کے بعد مجھ میں اعتماد پیدا ہوا جس کے بعد مسٹر بھٹو نے تمام معاملات میرے اُوپر چھوڑ دیئے تھے۔''(۱۶)

۳۔ ذوالفقار علی بھٹو بڑی صلاحیتوں والے انسان تھے۔ مولانا کوثر نیازی نے اپنی سر گزشت میں جہاں اُن کی شخصیت کے کمزور پہلو کی نشاندہی کی ہے وہاں اُن کی بے حد تعریف بھی کی ہے۔ وہ کئی دِن تک مسلسل بغیر کسی آرام کے کام کر سکتے تھے۔ پاکستان جیسے ملک میں ایک نئی پارٹی بنانا، اِس کو تمام ملک میں یکساں طور پر مقبول کرانا اور ایک نئی و ناتجربہ کار پارٹی کو ایوانِ اقتدار میں لانا بھٹو جیسا شخص ہی کر سکتا تھا۔ مولانا نے یہ بھی لکھا ہے کہ بھٹو کی یہ عادت تھی کہ رات گئے تک فائلوں کے مطالعے میں ڈوبے رہتے تھے اور بہت کم ایسا ہوتا کہ کوئی فائل اُن کے آفس میں ایک دِن تک رُکی ہو۔ مصنف نے اِس معاملے میں اُن سے زیادہ آہنی اعصاب کا مالک آدمی کم دیکھا ہے۔(۱۷)

بھٹو کی شخصیت کے حوالے سے مولانا کوثر نیازی نے یہ دلچسپ انکشاف بھی کیا ہے کہ مسٹر بھٹو پُراسرار علوم خصوصاً علم نجوم اور دست شناسی پر کامل یقین رکھتے تھے۔ ہر اہم موقع پر خصوصاً انتخابات یا کسی اور مشکل صورتحال میں وہ جوتشیوں کو بلاتے۔ سری لنکا اور دیگر غیر ملکی دست شناسوں کے ساتھ اُن کے رابطے تھے۔ غرض بھٹو کی طبیعت بھی ایک طرفہ تماشا تھی۔

۴۔ یہ بات تو عیاں ہے کہ پاکستان جیسے تیسرے دنیا کے ممالک میں سیاسی پارٹیاں اپنی جماعت کو کامیاب بنانے کے لیے ہر جائز اور ناجائز وسیلہ استعمال کرتی ہیں۔ چنانچہ اُس وقت پی پی پی کے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو نے بھی ہر قسم کے ہتھکنڈے استعمال کیے۔ آج کل تو پوری پوری میڈیا گروپس اور ٹی وی چینلیں مخصوص ایجنڈے پر کام کرتی ہیں۔ کوئی بھی ٹی وی چینل آج کل غیر جانبدار یا الگ تھلگ نہیں رِہ سکتا۔ مولانا کوثر نیازی نے یہ انکشاف کیا ہے کہ ۱۹۷۷ء کے الیکشن

میں مسٹر بھٹو نے اُن کی ڈیوٹی لگائی تھی کہ وہ نامور اور زیادہ متحرک صحافیوں کو اپنے ساتھ شامل کر لے۔ مصنف نے اُن کے نام نہیں لکھے اگر لکھتا تو اُس کی بات کی سچائی اور صداقت اور بھی معتبر ہو جاتی ہے علاوہ ازیں پارٹی نے اُنہیں یہ ذمہ داری بھی دی تھی کہ صوبہ سرحد میں دینی علماء اور مسجدوں کے آئمہ کے ذریعے انتخابی مہم چلائی جائے۔ یہ بڑی افسوسناک صورتحال ہوتی ہے اِس کو قبلِ انتخابات دھاندلی کہا جاتا ہے۔ کھیل اور سیاست ہر قسم کی دھاندلی سے محفوظ ہونے چاہیئے ورنہ یہ اپنی اہمیت کھو دیتے ہیں۔ مولانا کوثر نیازی لکھتے ہیں:

> ''ایک خط میں مسٹر بھٹو نے مجھے لکھا کہ میں معروف علماء سے ذاتی طور پر ملوں جب میں صوبہ سرحد کے دَورے پر تھا، اُن کے مسائل حل کرنے کے لیے مالی اور ہر قسم کی دوسری ممکن امداد کی پیشکش کروں تاکہ اُن کے ذریعے حزب اختلاف کے متعلق پروپیگنڈے کا توڑ کیا جاسکے۔''(۱۸)

۵۔ پاکستان کا ایٹمی طاقت بننا یقیناً ایک بڑا معجزہ ہے۔ دنیا کی نظروں سے چھپ کر اِتنا بڑا کارنامہ کرنا افسانوی سی بات لگتی ہے۔ اِس افسانے کو حقیقت کا روپ دینے میں جہاں ہمارے سائنسدانوں، انجینئرَوں اور فنی ماہرین کا ہاتھ ہے وہاں ہر دَور کے حکمران کا اِس کو عالمی برادری کا دباؤرڈ کر کے پایہ تکمیل تک پہنچانے کا عمل دخل بھی شامل ہے۔ صدر جنرل ضیاء الحق سے لے کر وزیراعظم نواز شریف تک ہر حکمران ملک کو ایٹمی طاقت بنانے میں دلچسپی لیتا رہا۔ ان حکمرانوں میں بظاہر بڑا اختلاف تھا لیکن اِس نقطے پر سخت ترین سیاسی حریف بھی ہم خیال تھے۔ ہندوستان اور پاکستان کے عسکری طاقت میں کوئی توازن نہ تھا۔ یہ ایٹمی طاقت کا حصول ہی ہے جس نے پاکستان کو انڈیا کے ہم پلہ کر دیا۔ یہ بات بھی ڈھکی چھپی نہیں کہ اگر پاکستان ۱۹۷۱ء میں جوہری طاقت ہوتا تو انڈیا پاکستان کے ساتھ نہ تو کھلی جنگ کرتا اور نہ مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بنتا۔ پاکستان میں جوہری طاقت اور جوہری ری پراسسنگ پلانٹ کا آغاز ذوالفقار علی بھٹو نے کیا تھا۔ یہ خیال بھٹو کو کیسے آیا؟ اِس سلسلے میں اُس نے کیا پاپڑ بیلے، کیسے اُس نے کام کا آغاز کیا، کس طرح دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکی اور ایک معمولی سی پراجیکٹ ری پراسسنگ پلانٹ کو کس طرح دنیا کا عظیم ترین منصوبہ کہوٹہ ریسرچ لیبارٹری میں تبدیل کیا۔ یہ سب واقعات اور حقائق مولانا نے پوری سچائی سے رقم کیے ہیں۔ اِس پر تہہ در تہہ پردے پڑے ہوئے تھے لیکن مولانا، پہلی مرتبہ اپنی اِس آپ بیتی کے ذریعے وہ حقائق دنیا کے سامنے لائے۔ ابتدا میں بھٹو نے ایک فرانسیسی فرم کے ساتھ صرف صنعتی مقاصد کے لیے توانائی کے حصول کے لیے ری پراسسنگ پلانٹ کا معاہدہ کیا تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ ہمارے سائنسدان اور ہنرمند اِتنے نااہل نہیں ہوں گے کہ ایک ٹیکنالوجی کو دیکھنے کے باوجود خود اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ویسا ہی دوسرا پلانٹ تعمیر

نہ کر سکیں۔ بھٹو جانتے تھے کہ اُن کا پروگرام طویل اور صبر آزما ہے لیکن اُنہیں اِس بات کا بھی یقین تھا کہ وہ تیل سے مالا مال عرب دوست ممالک کی مدد سے اپنا خواب شرمندۂ تعبیر دیکھ سکیں گے کیونکہ اِس منصوبے کے حصول کے لیے اُن کے سامنے ۳۵ ملین ڈالر کا سوال تھا۔ اُن کا اندازہ صحیح نکلا کیونکہ لیبیا، سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، کویت اور عراق کی جانب سے اُنہیں ہر قسم کے مالی تعاون کی پیشکش ہوئی۔ مولانا کوثر نیازی نے صراحت سے بتایا ہے کہ اِس سارے معاملے میں اُنہیں اعتماد میں لیا گیا اور تمام صورتحال اُن کے سامنے رکھ کر بھٹو نے وقتاً فوقتاً اُن سے رائے طلب کی۔(۱۹)

بالآخر مسٹر بھٹو کی اللہ نے سُن لی۔ جب ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے ساتھ اُن کا رابطہ ہوا۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان فُلزیات کے ماہر اور یورینیم کی افزودگی جیسے پیچیدہ اور مشکل ترین کام میں مہارت رکھتے تھے۔ وہ اُس وقت ہالینڈ میں اِس قسم کے ایک پروجیکٹ پر کام کر رہے تھے اور چھٹیاں گزارنے پاکستان آئے تھے۔ بھٹو نے اُنہیں ملاقات کے لیے اسلام آباد بُلایا۔ اُنہیں مجبور کیا کہ وہ ہالینڈ نہ جائیں بلکہ اپنے ملک میں جوہری ریکٹر بنانے اور آگے بڑھانے کے منصوبے پر کام کا آغاز کریں۔ ڈاکٹر قدیر نے سوچنے اور گھر والوں کے ساتھ مشورہ کرنے کے لیے وقت مانگا۔ جب اگلے دِن اُس نے فون پر مسٹر بھٹو کو پاکستان میں ٹھہرنے اور اُن کے منصوبے پر عمل کرنے کی خوشخبری سنائی تو اُس وقت بھٹو کی خوشی دیدنی تھی۔ اُن کی دیرینہ خواہش پورا ہونے کا وقت آگیا تھا۔ مولانا کوثر نیازی اُس وقت وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے ہمراہ تھے۔ اُس تاریخی ساعت کے بارے میں مولانا کوثر نیازی یوں تحریر کرتے ہیں:

> ''ٹھیک ایک گھنٹہ بعد ڈاکٹر قدیر خان نے فون پر وزیر اعظم کو اطلاع دی کہ وہ ہالینڈ واپس نہیں جا رہے بلکہ پاکستان ہی میں رِہ کر یورینیم افزودگی کا پلانٹ لگائیں گے۔ میں نے دیکھا کہ وزیر اعظم کا چہرہ خوشی سے دمک اُٹھا تھا۔ اُس نے میز پر اپنے مخصوص انداز میں مکہ مارتے ہوئے کہا: I will see the hindu Bastards now.۔ اُس وقت مسٹر بھٹو کی مسرت کا عالم دیدنی تھا۔''(۲۰)

اِس موقع پر مولانا کوثر نیازی نے یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ بھٹو نے اِس معاملے میں اُنہیں کم از کم چار مرتبہ سعودی عرب کے فرمانروا شاہ فیصل کے پاس خفیہ پیغام دے کر بھیجا تھا۔ دوسری طرف کہوٹہ ریسرچ لیبارٹری کے بارے میں بھٹو کے اختیاط کا یہ عالم تھا کہ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ میں اپنے حق میں ہر قسم کے دلائل دینے کے دوران کہوٹہ ریسرچ لیبارٹری یا ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا نام کبھی اُن کی زبان پر نہیں آیا۔

۶۔ بھٹو نے بھی دیگر سیاستدانوں اور حکمرانوں کی طرح مذہب کو بطورِ ایک سیاسی آلہ استعمال کیا۔آپ نے اسلامی سوشلزم کا نعرہ بلند کیا، ملک میں اسلامی قوانین نافذ کرنے ،آئین کو اسلامی بنانے اور شرعی قوانین کا اجراء کرنے جیسے اعلانات کیے، اسلامی نظریاتی کونسل بنانے، پاکستان کے آئین میں بعض خاص دفعات شامل کرنے، جمعہ کی چھٹی کرنے، قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے اوراِس قسم کے بے شمار واقعات ہیں جواُن کا دوغلا پن آشکارا کرتی ہیں۔ذوالفقار علی بھٹو کے دست راست مولانا کوثر نیازی اپنی مذکورہ آپ بیتی میں اِس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ وہ بیک وقت ایک تیر سے دو شکار کر رہے تھے۔ایک طرف خود کو اپنے دیس کے لوگوں کے سامنے کٹر مسلمان ثابت کر رہے تھے اور دوسری طرف مغربی دنیا کے سامنے لیبرل اور روشن خیال بن رہے تھے۔ نتیجہ وہی نکلا جو اِس قسم کا دوہرا کردار ادا کرنے والوں کا نکلتا ہے۔ایک چھوٹے سے واقعے سے کوثر نیازی مرحوم نے مسٹر بھٹو کی طرفہ طبیعت کی نقاب کشائی کی ہے:

> ''لاہور گورنر ہاؤس میں منعقدہ ایک پریس کانفرنس کے ذریعے اُنہوں نے شراب اور جوئے پر پابندی کا اعلان کیا تو بی بی سی نے مختصراً اُن کی پریس کانفرس کی خبر دینے کے بعد آخری سطر جو نشر کی وہ یہ تھی، جب بھٹو شراب پر پندی کا اعلان کر رہے تھے تو وہ سگار پی رہے تھے۔ صرف اِس ایک جملے نے وزیر اعظم کے اِن اقدامات کو مشکوک بنا کے رکھ دیا تھا۔''(۲۱)

۷۔ تیسری دنیا کے دیگر ممالک کی طرح پاکستان میں بھی یہ بات مشہور تھی کہ بڑی طاقتیں خصوصاً امریکہ بڑے عہدوں پر تعینات لوگوں کو خرید کر اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے۔اَسّی اور نوّے کی دہائی میں تو ہمارے صدور اور وزرائے اعظم باقاعدہ امریکہ کی قومیت یعنی گرین کارڈ رکھتے تھے۔ بڑے بڑے مالیاتی اداروں کے سربراہ، تجارت و کاروبار کے بڑے نامی گرامی لوگ ، دفتر شاہی سے وابستہ افراد، سفارتکار، صحافی، ممبران قومی اسمبلی اور سینیٹرز غرض بڑی تعداد میں لوگ بیرون ممالک کا پاسپورٹ رکھتے تھے۔اِس سے بڑی بدقسمتی اور کیا ہوسکتی ہے کہ ایسے افراد کا ملک کے ساتھ رشتہ برائے نام ہوتا ہے کیونکہ اُن کے بچے باہر پڑھتے ہیں، کاروبار اور رہائش بیرون ملک میں ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اِس قسم کے لوگوں پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔وہ کسی بھی وقت ملک کے اندرون خانہ راز باہر منتقل کر سکتے ہیں۔ وطن عزیز میں کئی مواقعوں پر وزرائے اعظم باہر سے ''درآمد'' کیے گئے۔وزیر اعظم معین الدین قریشی اور وزیر اعظم شوکت عزیز اِس کی بڑی مثالیں ہیں۔مولانا کوثر نیازی نے کافی تفصیل سے اِس معاملے پر بھی اظہارِ خیال کر کے بتایا ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو کی کابینہ میں ایسے وزرائے مملکت تھے جو امریکی خفیہ ایجنسی سی۔آئی۔اے کے تنخواہ دار ملازم

تھے۔ وہ ذوالفقار علی بھٹو کی سر گرمیوں اور جوہری پروگرام سے لمحہ بہ لمحہ اپنے باہر کے آقاؤں کو خبر دار کرتے تھے۔ رفیع رضا، حیفظ پیر زادہ اور مولانا کوثر نیازی کو تھری سٹارز فو لکن (تین ستاروں کی جھرمٹ) کہا جاتا تھا کیونکہ یہ تینوں مسٹر بھٹو کے انتہائی قریب ساتھی تھے (یہ اور بات ہے کہ یہ تینوں بعد میں مارشل لاء کے ساتھ ایسے بہہ گئے کہ پیپلز پارٹی کی بنیادی رُکنیت سے بھی محروم کئے گئے تاہم یہ ہمارا موضوع نہیں اِس لیے اِس پر قلم نہیں اُٹھاتے)۔ مولانا کوثر نیازی نے یہ انکشاف کیا ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو کے داست راست، ممبر قومی اسمبلی اور بھٹو کابینہ کے وزیر قانون رفیع رضا سی۔آئی۔اے کے ایجنٹ تھے اور پاکستانی ایٹمی پروگرام کے بارے میں امریکہ کو خفیہ معلومات دیتے تھے۔ ملاحظہ ہو مولانا کوثر نیازی کا انکشاف:

> ''وزیر اعظم نامعلوم وجوہ کی بنا پر اُن سے کچھ بد ظن تھے حتیٰ کہ کئی مرتبہ اُنہوں نے واضح طور پر یہ تک کہہ دیا تھا کہ رفیع رضا سی۔آئی۔اے کے ایجنٹ ہیں اور پاکستان کے ایٹمی پروگرام سے متعلق امریکہ کو اُنہوں نے آگاہ کیا تھا۔''(۲۲)

۸۔ مولانا کوثر نیازی نے اپنی سر گزشت میں یہ بھی اقرار کیا ہے کہ حکومت اور اپوزیشن کے درمیان ہونے والے مذاکرات کامیاب ہو گئے تھے۔ حکومت نے اپوزیشن کے تمام نکات تسلیم کر لیے تھے بلکہ وزیر اعظم بھٹو نے رات دَس بجے پریس کانفرنس میں اعلان کرکے کہا کہ میں کل صبح قومی محاذ کے ساتھ ہونے والے معاہدے پر دستخط کرکے نئے انتخابات کا اعلان کرتا ہوں لیکن اب کافی دیر ہو چکی تھی۔ اُس صبح کے لیے قوم نے گیارہ سال انتظار کیا۔ اِس بحث کو مصنف اپنے مخصوص اور مدبرانہ اسلوب میں یوں سمیٹتے ہیں:

> ''مصطفٰی کھر نے فون پر وزیر اعظم سے ابھی اِتنا ہی کہا تھا، سر میں نے سنا ہے کہ ---اور پھر--- ٹیلی فون لائن کٹ گئی۔ جرنیلوں کی طویل رات کا آغاز ہو چکا تھا''۔(۲۳)

۹۔ مولانا کوثر نیازی ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ زیادہ قربت کی وجہ سے اُن کے رمز شناس تھے۔ آپ نے بھٹو کا بہت قریب سے مطالعہ کیا تھا۔ بھٹو فی الواقعہ افسانوی شخصیت کے مالک تھے۔ اُن کے چاہنے والے اُنہیں کسی اور دنیا کے باسی کی صورت میں پیش کرتے ہیں جبکہ اُن کے مخالفین اُنہیں ڈکٹیٹر، جاگیر دار، سخت مزاج اور ایک بڑے سیاسی اداکار کے طور پر یاد کرتے ہیں۔ مولانا کوثر نیازی نے اپنی آپ بیتی میں بھٹو کی شخصیت، نشست و برخاست اور مزاج کو مناسب انداز سے پیش کیا ہے۔ بھٹو بڑی ذکاوت اور حِس مزاح رکھنے والے انسان تھے۔ مولانا نے اُن کی بلند شخصیت، خطرات کا سامنا کرنے

والے مزاج، انسانوں کی پرکھ اور بروقت ٹھیک فیصلہ کرنے کی صلاحیت کی تعریف کی ہے لیکن اُن کی شخصی کمزوریوں اور خامیوں کی بھی بڑی سچائی سے پردہ کشائی کی ہے۔آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ بھٹو سخت خوشامد پسند تھے۔ اکثر سیدھی اور صاف بات کہنے والوں کو ناپسند کرتے تھے۔ اختلاف رائے ظاہر کرنے پر بھٹو کا موڈ فوراً آف ہو جاتا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو کی حِس مزاح اور طنز کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ اُس وقت جب آزاد کشمیر کے صدر سردار عبدالقیوم خان اُن سے ملنے وزیراعظم ہاؤس آئے تھے:

> ''سردار صاحب اُن دِنوں پریس کی آنکھوں کا تارہ بنے ہوئے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ
> جب وہ بھٹو صاحب سے ملے تو اُنہوں نے سردار صاحب سے کہا: سردار صاحب!
> پریس میں آج کل یا تو نور جہاں کو پبلسٹی ملتی ہے یا پھر آپ کو۔''(۲۴)

۱۰۔ مولانا کوثر نیازی نے اپنی آپ بیتی میں بعض سیاسی رہنماؤں کی بڑی تعریف کی ہے۔سیاست میں عموماً سیاستدان ایک دوسرے کے بارے میں زیادہ اچھی رائے نہیں رکھتے بلکہ الزام تراشی، کردار کشی اور کیچڑ اُچھالنے کی روایت عام ہے۔ پچھلے ایک دہائی سے سیاست میں گالی گلوچ اور ایک دوسرے کو نیچا دِکھانے کی رسم چل نکلی ہے۔ایک دوسرے کے لیے اِتنی غلیظ زبان استعمال کی جاتی ہے جس کی توقع عام بازاری لوگوں سے بھی نہیں کی جاسکتی۔ حیرت ہوتی ہے کہ ہندوستان میں ایک ایسا دَور بھی تھا جب سیاستدانوں اور سیاسی رہنماؤں سے لوگ اخلاق، رواداری، ملنساری اور نشست و برخاست سیکھتے تھے۔ سیاستدان اپنے سیاسی ورکروں کی اخلاقی تربیت بھی کیا کرتے تھے لیکن اب سیاسی ماحول پراگندہ ہو گیا ہے تاہم مولانا کوثر نیازی ہمارے اُس سیاسی عہد کی نمائندگی کرتے ہیں جو سیاست میں شرافت، سنجیدگی اور رواداری کے حامل لوگ تھے۔آپ نے اپنی آپ بیتی میں مفتی محمود، نوابزادہ نصراللہ خان، پروفیسر غفور، سردار عبدالقیوم خان، عبدالولی خان اور مولانا مودودی کی بے حد تعریف کی ہے۔(۲۵)

سچائی اور صداقت کسی بھی آپ بیتی کے لیے شرطِ اولین ہے۔ جھوٹی اور سچائی سے دُور آپ بیتیاں فسانہ فسوں تو ہو سکتی ہیں آپ بیتی نہیں۔ مولانا کوثر نیازی کی آپ بیتی اِس شرط پر بھی بڑی حد تک پوری اُترتی ہے۔آپ نے پاکستانی فوج پر بھی بعض معاملات میں سخت تنقید کی ہے اور واضح طور پر کہا ہے کہ فوج اگر سیاست میں آتی ہے تو پھر تنقید کرنے کے لیے بھی تیار ہو جائے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ فوج حکومت بھی کرے اور خود کو ہر قسم کے احتساب اور تنقید سے مبرّیٰ سمجھے۔آپ نے طویل تاریخی تجزیے کے بعد یہ ثابت کیا ہے کہ ہر مارشل لاء شروع میں مضبوط ہوتی ہے بعد کی فوجی حکومتیں کمزور سے کمزور تر ہوتی جاتی ہیں۔اِس ملک کی پہلی مارشل لاء یعنی ایوب خان کی مارشل لاء ایک طاقتور فوجی حکومت تھی اِس کے بعد

یحییٰ خان اور پھر ضیاء الحق کی فوجی حکومتیں نسبتاً کمزور حکومتیں تھیں۔ایک وقت وہ بھی آئے گا کہ مارشل لاء کو اِس ملک میں کوئی زکام برابر اہمیت نہیں دے گا۔ نیز آپ نے اِس بات کا بھی اعتراف کیا ہے کہ پاکستان میں فوجی آفسر وہ شاہانہ زندگی گزارتے ہیں جن کا ترقی یافتہ دنیا میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات آپ نے اُس وقت لکھی ہے جب وہ ضیاء الحق کے مارشل لاء کے وقت قید میں تھے۔اُن کے الفاظ میں :

> ''عوام نے ہمیشہ اپنی فوج کی عزت کی دُعائیں مانگی۔اُنہوں نے خود کو بھوکا رکھا اور اپنے بچوں کو بھوکا مارا کہ فوجیوں کو پیٹ بھر کر کھانے کو ملے۔اِس لیے نہیں کہ ہمارے جنرل اور اعلیٰ آفیسر ایسی زندگی گزار سکیں جو برطانوی اور امریکی جرنیلوں کو نصیب نہیں۔''(۲۶)

مولانا کوثر نیازی کی اس آپ بیتی کا اسلوب بھی اہمیت کا حامل ہے۔مولانا دیگر سیاستدانوں کے برعکس ایک بڑے عالم، مفکر اور ادیب تھے۔اُن کا بنیادی حوالہ سیاست نہیں علم و ادب تھا۔اگر وہ پاکستانی سیاست کا رُخ نہ کرتے تو بھی وہ اپنے علمی، سماجی، تحقیقی، دینی اور تنقیدی کتابوں کی وجہ سے مشہور ہوتے۔سیاست نے تو ایک طرح سے اُن کی تحریری اور تقریری صلاحیتوں کو متاثر کیا۔اُن کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ اگر وہ سیاست میں نہ آتے تو زیادہ کامیاب ہوتے۔واقعہ یہ ہے کہ مولانا کوثر نیازی دلچسپ اسلوب نگارش کے مالک ہیں۔وہ چھوٹے چھوٹے فقروں میں اپنا مافی الضمیر بیان کرنے پر قادر ہیں۔وہ طوالت کی بجائے اختصار کے قائل ہیں۔وہ کفایت الفاظ اور اختصار نویسی کے اِتنے شائق ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔آپ نے طویل ترین سیاسی واقعات اور روداد وں کو بہت سلیقے سے مختصر ترین الفاظ میں بیان کیا ہے۔ایک مقرر اختصار سے کام نہیں لیتا بلکہ قصے کو طویل تر کرتا ہے تاہم نثر لکھتے ہوئے مولانا کوثر نیازی کا قلم مائل بااختصار نظر آتا ہے۔

سقوطِ ڈھاکہ سے ضیاء الحق کے مارشل لاء تک کا زمانہ ہمارے ملک کی تاریخ کا ایک پُرآشوب اور آویزش والا زمانہ تصور کیا جاتا ہے۔کئی حوالوں سے یہ ایک ہنگامہ خیز دور تھا۔ مولانا کوثر نیازی نے اُس زمانے کے واقعات کو اختصار سے بیان کیا ہے۔جہاں تک آپ کے اسلوب کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں دیکھا جا سکتا ہے کہ ان کی ہاں ڈرامائیت، سنسنی خیزی، شگفتہ بیانی، شاعرانہ انداز اور محاورے کا خوبصورت استعمال دیکھنے میں آتا ہے۔

موصوف اپنی سر گزشت سناتے ہوئے ہمیشہ واقعات کو ڈرامائی انداز سے شروع کرتے ہیں اور ڈرامائی انداز سے ختم کرتے ہیں۔ڈرامائیت اُن کے اسلوب کا ایک بڑا عنصر ہے جس سے وہ اپنی کہانی میں قاری کی دلچسپی پیدا کرتے ہیں۔ اُنہیں احساس ہے کہ لوگ اُس کی بات کو بڑی بے صبری سے سُن رہے ہیں اِس لیے وہ قاری کی توجہ ایک لحظے کے لیے بھی

بھٹکنے نہیں دیتے۔اِس سلسلے میں وہ اس قدر اہتمام کرتے ہیں کہ ہر باب کو ڈرامائی انداز سے ختم کرتے ہیں تاکہ پڑھنے والا فوراً بغیر کسی انتظار یا توقف کے دوسرا باب شروع کرے اس طرح وہ اپنی اِس شعوری یا لاشعوری کوشش میں کامیاب رہتے ہیں۔ جس زمانے کی سر گزشت کوثر نیازی نے سنائی ہے وہ فی الحقیقت ہماری سیاسی، عسکری اور سماجی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ خصوصاً مسٹر بھٹو کے آخری ایام میں ملک کے سیاسی حالات اِس قدر ابتر ہو چکے تھے کہ گزرتا ہوا ہر پل اور ہر لمحہ چاروں طرف پھیلی ہوئی ابتری میں اضافہ کر رہا تھا۔ ہنگامے، ہڑتالیں، جلسے جلوس، لاقانونیت اور تشدد کی جو لہر اُٹھی تھی وہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ وہ پورا سیاسی منظر نامہ ڈرامہ بن چکا تھا اور دوسرا یہ کہ مصنف کو عام سیدھے سادھے واقعے کو ڈرامائی انداز سے پیش کرنے کا بھی خاص شوق ہے۔ یہ دونوں وجوہات مل کر مولانا کے اسلوب کو ڈرامائی بناتے ہیں۔ مولانا نے بعض ایسے واقعات بھی سنسنی خیزی سے بیان کیے ہیں کہ اُن کی جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو صرف سرسری تذکرہ کرنے پر ہی اکتفا کرتا۔ مولانا کوثر نیازی کے اندازِ بیان اور تحریر کو پڑھ کر کبھی کبھی یوں لگتا ہے گویا کسی ٹیلی ڈرامے یا فلم کا سنسنی خیز منظر ہماری آنکھوں کے سامنے گزر رہا ہے۔ ۴اور ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کی درمیانی رات جب فوج نے عنان حکومت سنبھالی اور اُن کو گرفتار کیا جا رہا تھا، اِس واقعے کو کسی فلمی سین کی طرح متحرک دکھایا ہے جو مصنف کے موئے قلم کی ایجاز ہے:

> ''میں نے بیرونی ہال کے دروازے پر پڑے ہوئے پردے سرکائے تو باہر بالکنی میں لگے ہوئے بلبوں کی روشنی میں عین جالی سے متصل دو فوجی کھڑے تھے۔اُن کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں جو سیدھی میری جانب تنی ہوئی تھیں۔ ایک لمحے میرے ذہن میں بنگلہ دیش کے شیخ مجیب الرحمٰن کے خلاف آنے والے فوجی انقلاب کا پورا نقشہ گھوم گیا۔ مجھے اپنے پورے بدن میں سنسنی اور تناؤ کی ایک ایسی لہر دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی جو صرف موت کو اپنے مقابل کھڑے دیکھ کر ہی محسوس ہو سکتی ہے۔ پل بھر میں سینکڑوں مناظر میری آنکھوں کے سامنے گزر گئے۔ کہیں شیخ مجیب کی لاش خاک و خون میں پڑی تڑپ رہی تھی اور اُن کے اہل خانہ کے بے جان لاشے پڑے ہوئے تھے۔ مجھے بالکل یہی محسوس ہوا جیسے اب سے چند لمحوں بعد قیامت ایک مرتبہ پھر گزرنے والی ہو۔''(۲۷)

اکثر قلم کار اِس باب میں بڑے حساس ہوتے ہیں کہ قاری کی توجہ ایک لحظے کے لیے بھی اُس کے بیان سے ہٹ نہ

جائے۔اِس لیے وہ اُنہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے قسم قسم کے حربے استعمال کرتے ہیں۔ڈرامائی اندازِ تحریر تجسس اور سنسنی خیزی کے بغیر کامیاب نہیں بنایا جاسکتا۔ سنسنی خیزی اور تجسس ڈرامائی اسلوب کے اہم اجزاء ہیں۔ مولانا کوثر نیازی ایک اچھے نثر نگار ہونے کے علاوہ مشہور مقرر بھی تھے۔ تقریر میں بروئے کار لائے جانے والے معنی خیز اور سنسنی خیز سٹائل کو آپ نے تحریر میں خصوصاً اپنی سیاسی خود نوشت میں بھی بڑی مہارت سے برتا۔ وہ اپنے سیاسی حالات و واقعات کسی مہم جو کی طرح خوب سنسنی خیزی سے بیان کرتے ہیں۔ایک مرتبہ جب اُس وقت کے وزیر اعظم مسٹر بھٹو نے اُنہیں اور چند دیگر ساتھیوں کو پی۔ایم ہاؤس سے رات بارہ بجے اپنی گاڑی میں سوار کروایا وہ اُنہیں سہالہ ریسٹ ہاؤس میں نظر بند اپوزیشن رہنماؤں سے ملانے جا رہے تھے لیکن اپنے ساتھیوں کو اُس نے کچھ نہیں بتایا تھا۔اِس واقعے کو مولانا کے سنسنی خیز قلم سے ملاحظہ کریں:

> ''وزیر اعظم کی پیشانی پر ناگواری کی چند شکنیں تھیں۔ گاڑی کی نشستوں کے درمیان شیشے کا ایک شٹر تھا جس کی وجہ سے آگے بیٹھنے والوں کے لیے گفتگو سننا مشکل تھا لیکن مسٹر بھٹو نے پھر بھی ہمیں یہ بتانا پسند نہیں کیا کہ وہ اِس وقت رات گئے کس مشن پر جا رہے ہیں۔ گاڑی شہری حدود سے باہر نکلی اور ائیر پورٹ کی سڑک سے ہوتی ہوئی سہالہ کی طرف روانہ ہوئی۔ ہم سارا راستہ خاموش رہے مگر ہمیں اندازہ ہو گیا تھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔''(۲۸)

مولانا کوثر نیازی کے اسلوب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ قاری کو اپنی طرف متوجہ رکھتا ہے۔بسا اوقات واقعے سے زیادہ اُن کے قلم کی معجزہ بیانی دِل موہ لیتی ہے۔اُردو آپ بیتیوں میں کم ایسے آپ بیتی نگار ہیں جن کی دلکش طرزِ تحریر اور اسلوب مشہور ہے۔اُردو میں شہاب نامہ جیسی آپ بیتیاں کم کم منظر عام پر آئیں جو افسانوی، رومانوی اور تخیلاتی اسلوب کا کرشمہ ہوں۔ بڑے بڑے ادیب اور افسانہ نگار جب اپنا افسانہ لکھنے بیٹھے تو وہ کم درجے کے اسلوب میں اپنی کہانی لکھ گئے جس کی توقع ایک معمولی ادیب سے بھی نہیں کی جاسکتی۔آپ بیتیوں میں اسلوب کے حوالے سے ڈاکٹر پرویز پروازی نے ایک جگہ بڑی دلچسپ بات لکھی ہے جس کا حوالہ دینا یہاں بے محل نہ ہو گا:

> ''رہا آپ بیتی میں اسلوب کا سوال تو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ صداقت اور واقعیت ہی اِسے تازگی بخشتی ہے۔ جہاں جہاں مصنف اخفا، راز، جھوٹ یا پردہ پوشی کا سہارا لے گا اُس کی تحریر میں ایک اُلجھن اور تھکاوٹ کی سی کیفیت پیدا ہو گی۔ صاف

لگے گا کہ یہاں مصنف اپنااور قاری کادامن چھڑا کرآگے بڑھنے کی کوشش کر رہا ہے۔۔۔"(۲۹)

سیاسی آپ بیتیوں کی تو بات ہی اور ہے۔ یہاں تو سیاسی حوادث پیدا ہونے کے اسباب اور جوہات سے بحث کی جاتی ہے۔ اکثر سیاستدانوں سے صرف سیدھے سادھے انداز میں اپنا قصہ تحریر کرنے کو ہی غنیمت خیال کیا جانا چاہیے۔ اسلوب اور پھر منفرد، دلکش اور دِل کو چھو لینے والا اسلوب توان مصنفین سے بعید تر تصور ہوگا۔ مولانا کوثر نیازی کو قصہ بیان کرنے کا ڈھنگ بھی آتا ہے اور خوبصورت الفاظ میں پیش کرنے کا ہنر بھی۔ وہ مختصر فقروں میں واضح اور دوٹوک بات کرتے ہیں جو اُن کی نفاست پسند طبیعت کو آشکارا کرتی ہے۔ عالمانہ سنجیدگی، بھرپور تجزیہ، آسان اور عام فہم الفاظ کا استعمال اور کم سے کم الفاظ میں بڑی سی بڑی بات اُن کے مزاج، ذہانت اور علمیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ اُن کی تحریر پر اُن کے مخصوص تفکر کی ہلکی ہلکی فضا چھائی ہوئی ہے۔ طویل ترین پیرائے میں بات کرنا کوئی خوبی نہیں۔ مختصر الفاظ میں جامع بات کرنا اور الفاظ کی نشست و برخاست سے اپنی بات میں زور پیدا کرنا اصل کمالِ ہنر ہے جس کو مولانا کوثر نیازی جیسا ادیب سیاستدان ہی بروئے کار لا سکتا ہے۔ مولانا کوثر نیازی اپنے اسلوب کو کئی عناصر سے جاذب نظر اور قابل توجہ بناتا ہے۔ بعض اوقات وہ اپنے جوشیلے انداز بیان سے پڑھنے والوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتا ہے مثلاً جب بھٹو پولیس سے ریٹائرڈ بیورو کریٹس کے نرغے میں آگیا۔ اُن ہی کے اُلٹے سیدھے مشوروں پر چل کر مسلسل سیاسی غلطیاں کرنے لگا تو اِس موقع پر کوثر نیازی بہت غم وغصے سے اُن مشیروں کی خبر لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میرے نزدیک یہ پیپلز پارٹی کی سیاسی حکمت عملی کی سب سے بڑی غلطی تھی لیکن نقار خانے میں طوطی کی صدا کون سنتا ہے۔ وہ لوگ مسٹر بھٹو کے نفس ناطقہ بنے ہوئے تھے جنہیں سیاسی عمل کی مبادیات سے بھی آگہی نہ تھی۔ پولیس ملازمت کے دوران اُوپر والوں کی جوتیاں سیدھی کرنے اور عوام کو جوتے لگانے تک اُن کے تجربات محدود تھے۔ پولیس ملازمت کسی کو کچھ اور سکھاتی ہو یا نہ سکھاتی ہو، اپنے باس کو خوش کرنے کے آداب ضرور سکھا دیتی ہے۔ رانجھا راضی کرنے کے لیے اِس سروس کے بعض لوگ ہر حد سے آگے گزر جاتے ہیں۔"(۳۰)

مولانا کوثر نیازی کے اسلوب کا دوسرا عنصر اُن کی تحریر کی سچائی اور صداقت ہے۔ مولانا کوثر نیازی کو اِس کتاب

میں سچائی سے واقعات لکھنے نے بظاہر بہت نقصان پہنچایا۔ بیگم نصرت بھٹو نے اُنہیں نہ صرف پارٹی سے نکالا بلکہ اُن کے خلاف زبردست پروپیگنڈہ مہم بھی چلائی اور مشہور کیا کہ مولانا فوجی حکمرانوں کے ہاتھ بِک گئے ہیں حالانکہ بعد کے حالات نے یہ ثابت کیا کہ ضیاءالحق کے مارشل لاء سے اُنہیں ایک دھیلے کا فائدہ نہیں پہنچا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بعد میں محترمہ بے نظیر بھٹو نے اُنہیں منا کر اپنی پارٹی میں شامل کیا۔ جب وہ اپنی آپ بیتی میں ہمارے جیسے ملک اور ماحول میں اِس قسم کی سچی اور کھری باتیں لکھیں گے تو اِس منافقانہ معاشرے میں اُنھیں جوتے تو ضرور لگیں گے:

> ''وزیر اعظم بھٹو کی طبیعت بھی طرفہ تماشا تھی۔ یہ اُن کے مزاج کا خاصہ تھا کہ وہ اپنے کسی بھی دَور کے مخالفین کو اپنے زیر نگین اور احکامات کا تابع دیکھ کر ذہنی تسکین حاصل کرتے تھے۔ برطانیہ میں میاں ممتاز دولتانہ کی بحیثیت سفیر تعیناتی، خان عبدالقیوم خان کو وزیر داخلہ بنانا، پیر علی راشدی کو ایڈوائزر کا عہدہ دینا، ٹکا خان کو وزیر مملکت بنانا (یہ سب حضرات کسی زمانے میں بھٹو کے شدید ترین مخالف تھے)۔ اُن کی طبیعت کے اِسی پہلو کی عکاس اقدامات تھے وہ اِن لوگوں کو اپنا تابع مہمل دیکھ کر بے حد تسکین حاصل کرتے تھے۔''(۳۱)

سیاسی آپ بیتیوں میں مصنف نہ تو منظر نگاری کرتے ہیں اور نہ ماحول کا مرقع کھینچتے ہیں۔ تاہم مولانا کوثر نیازی کسی نہ کسی طرح سے منظر نگاری کی بھی گنجائش پیدا کر ہی لیتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ جان بوجھ کر یا واقعے کو گھمانے پھیرانے یا لطف لینے کے لیے ایسا نہیں کرتے بلکہ اُن سے تحریر میں خود بخود یہ ہو جاتا ہے جس سے اُن کے اسلوب میں ایک قدرتی دلکشی پیدا ہو جاتی ہے:

> ''مفتی محمود صاحب پان خوری کے ایسے ماہر بھی نہ تھے کہ پیک تھوکنے کی اُنہیں ضرورت ہی محسوس نہ ہو۔ مذاکرات کی ٹیبل پر پڑے ایش ٹریز میں پیک ڈالتے رہتے، سنگ مرمر سے بنے ہوئے یہ خوبصورت ایش ٹرے، لال لال رنگ کی پیک سے بعض اوقات لبالب بھر جاتے۔ اجلاس کے بعد بھٹو صاحب خوشگوار موڈ میں ہوتے تو کہا کرتے یہ ہیں مستقبل کے متبادل پرائم منسٹر جنہیں یہ نہیں معلوم کہ آدابِ مجلس کیا ہوتے ہیں۔''(۳۲)

مولانا کوثر نیازی کی مادری زبان سرائیکی تھی تاہم وہ فارسی، اُردو، عربی، پنجابی اور انگریزی زبان کو بھی روانی سے

لکھ، پڑھ اور بول سکتے تھے۔ اُردو زبان میں اُنہیں خصوصی مہارت حاصل تھی۔ تحریر اور تقریر دونوں پر انھیں خاص عبور حاصل تھا۔ بقول اُن کے اُنہوں نے اُردو زبان کے اصل جوہر نچوڑنے میں بے حد محنت کی تھی اور یہی اُردو زبان کے ساتھ اُن کے احترام اور عقیدت کا ثبوت تھا۔ اپنی تحریر میں آپ نے محاورے کا بھی خصوصی التزام کیا ہے۔ کوئی ایسا پیرا گراف نہیں جہاں آپ نے ایک یا ایک سے زیادہ محاورہ نہ لکھا ہو۔ موقع اور مناسبت سے محاورے لانا اپنی جگہ نگینہ تراشنے جیسا ہے۔ آپ نے کئی مقامات پر قدیم اور بھولے بسرے محاورے بھی قلم برداشتہ لکھے ہیں جو اُن کی نثر کو خوبصورتی عطا کرتے ہیں۔ جو محاورے آپ نے اپنی آپ بیتی میں زیادہ تر استعمال کیے ہیں یہاں اُن کا حوالہ دینا مناسب ہو گا:

۱۔ ''پلوں کے نیچے بہت سا پانی گزرنا''(۳۳)

۲۔ ''پلاٹ تیار کرنا''(۳۴)

۳۔ ''غبارے سے ہوا نکلنا''(۳۵)

مولانا کوثر نیازی نے بعض جگہوں پر ایسے محاورے بھی استعمال کئے ہیں جو ہمیں کلاسیکی ادب میں تو کثرت سے ملتے ہیں تاہم جدید نثر نگار اُنہیں برتنے کی تکلف نہیں کرتے۔ اِس سے یہ بھی عیاں ہوتا ہے کہ مصنف نے کلاسیکی ادب کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور عبارات تک کو ذہن میں اُتارا تھا جو وہ وقتاً فوقتاً کام میں لاتے:

۱۔ ''غچہ کھانا''(۳۶)

۲۔ ''پاسنگ دِل میں رکھنا''(۳۷)

۳۔ ''الزامات کا طومار باندھنا''(۳۸)

علاوہ ازیں مولانا ضرب المثال خصوصاً فارسی ضرب المثال کا بھی روانی سے استعمال کر کے اپنے بیانیے کو تقویت دیتے ہیں۔

اِس کے علاوہ مولانا کوثر نیازی کے اسلوب کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ وہ انگریزی الفاظ کا بہت زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ قید خانے میں جب وہ مذکورہ سر گزشت رقم کر رہے تھے اُس وقت انگریزی زبان کی ایک دینی کتاب بھی اُس کی زیر تصنیف تھی۔ ہو سکتا ہے کہ انگریزی زبان کا آپ کے حواس پر غلبے کی وجہ سے نادانستہ انگریزی الفاظ آپ کے قلم سے نکلے ہوں۔ وجہ جو بھی ہو کسی بھی تحریر میں غیر ضروری انگریزی الفاظ تحریر کو بوجھل اور غیر دلچسپ بناتی ہے۔ جب اُن الفاظ کا متبادل اُردو میں موجود نہ ہو یا کسی اور کے انگریزی الفاظ آپ جوں کے توں دُہراتے ہیں تو اِس مرحلے پر یہ عُذر قابل قبول ہے لیکن عام تحریر میں اِس قسم کا کوئی عُذر قابل قبول نہیں۔ آپ نے جہاں جہاں ایجی ٹیشن، ایڈمنسٹریشن اور وارننگ

کے الفاظ استعمال کئے ہیں وہاں تو تھوڑا گزارا ہے لیکن درج ذیل الفاظ کا اُردو کے رواں دواں اور سلیس عبارت میں کوئی گنجائش نہیں بنتی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اصل انگریزی الفاظ بھی مصنف نے قوسین میں نہیں دیئے جو اصل متن میں دینے چاہیئے تھیں:

۱۔ ''فلر آپ''(۳۹)	۲۔ ''اِن ٹچ''(۴۰)	۳۔ ''ایکس پلائیٹ''(۴۱)
۴۔ ''سیل''(۴۲)	۵۔ ''ایکسپو''(۴۳)	۶۔ ''پولرائزئنگ''(۴۴)
۷۔ ''کیموفلاج''(۴۵)		

مصنف جہاں جہاں ذوالفقار علی بھٹو کے الفاظ بیان کر رہے ہوں وہاں تو اُن کی تحریر میں انگریزی الفاظ زیادہ بُرے نہیں لگتے کیونکہ بھٹو اِس طرح سے انگریزی نما اُردو بولتا تھا لیکن جہاں جہاں وہ اپنا نقطہ نظر دے رہا ہو کم از کم وہاں مشکل انگریزی الفاظ سے اجتناب ضروری تھا۔ بہر حال آپ نے اُردو زبان کو کچھ نئی اصطلاحات بھی دی ہیں مثلاً ''مولو یالوجی''۔(۴۶)

اِس کے علاوہ اپنی آپ بیتی میں ابواب، عنوانات اور ذیلی عنوانات کے نام شاعرانہ اور خالص ادیبانہ انداز سے دینا بھی ادب کے بارے میں اُن کے باشعور میلان طبع کی خبر دیتی ہے:

> ''(۱) وہ خوفناک رات (۲) جنرل ایکسپوز ہوتے ہیں (۳) نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن (۴) ڈیڈ لاک ہوتا ہے (۵) سنسنی خیز لمحات (۶) اور لائن کٹ گئی۔''(۴۷)

جہاں تک کوثر نیازی کے اسلوب کیا تعلق ہے تو یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ آپ نے جگہ جگہ برجستہ اشعار سے اپنا اسلوب توانا بنایا ہے۔ آپ اکثر باب، عنوان یا ذیلی عنوان کا خاتمہ کسی شعر پر کرتے ہیں۔ اُس شعر میں پورے باب کا نچوڑ ہوتا ہے۔

''اور لائن کٹ گئی'' ایک زیرک اور تجربہ کار سیاستدان کی جزوی آپ بیتی ہے جو ہمارے تاریخ کے ایک بحرانی دَور کی نشاندہی کرتی ہے۔ یہ آپ بیتی بے شمار ایسے تاریخی، سیاسی، معاشرتی اور سماجی واقعات سے بھرپور ہے جن کا ذکر کسی قابل اعتماد تاریخی کتاب میں موجود نہیں۔ اِس قسم کے آپ بیتی کے لیے کہا گیا ہے کہ درجنوں تاریخی کتابوں پر بھاری ہوتی ہیں۔ یہ ہماری چالیس سال پہلے کی سیاسی تاریخ تھی۔ آج حالات کافی حد تک تبدیل ہو گئے ہیں۔ وطن عزیز اب کافی آگے جا چکا ہے۔ جمہوری روایات مضبوط ہوئی ہیں، سِول بالادستی کافی حد تک مستحکم ہے۔ عدلیہ آزاد ہے لیکن پھر بھی غیر جمہوری

عناصر کسی نہ کسی طریقے سے نظامِ حکومت کو کمزور کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ بعض باتوں پر غور کرنے سے احساس ہوتا ہے گویا ہم پھر ستّر کی دہائی میں واپس پلٹ گئے ہیں۔ اُس زمانے میں ملک جس سنگین صورتحال سے دوچار تھا اِس حوالے سے کوثر نیازی نے چند اشعار لکھ کر اُس دَور کے حالات کی بہترین ترجمانی کی تھی۔ وہ اشعار آج کے ماحول کی بھی حقیقی عکاسی کرتے ہیں۔

رشتہ دیوار و در تیرا بھی ہے میرا بھی ہے
مت جلا اِس کو ، یہ گھر تیرا بھی ہے میرا بھی ہے
کھا گئی کل ناگہاں جن کو سیاست کی صلیب
اُن میں ایک نُور نظر تیرا بھی ہے میرا بھی ہے
کیوں لڑیں آپس میں ایک ایک سنگ میل پر
اِس میں نقصان سفر تیرا بھی ہے میرا بھی ہے

(۴۸)

۲۔ سفر زندگی (الطاف حسین)

متحدہ قومی مومنٹ (ایم۔کیو۔ایم) کے بانی اور مشہور سیاسی رہنما الطاف حسین ہمارے ملک کے ایک متنازعہ سیاسی شخصیت رہے ہیں وہ کئی عشروں تک ملک کے سیاسی اُفق پر چھائے رہے۔ایک وقت تھا کہ اُن کے بغیر نہ تو وفاق میں حکومت بن سکتی تھی اور نہ ہی سندھ اسمبلی میں کوئی قانون پاس کر سکتا تھا۔اُس نے بڑی محنت سے مہاجروں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا اور اُنہیں الگ شناخت اور پہچان دی پھر سندھ بالخصوص کراچی کی سیاست میں ایک موقع ایسا بھی آیا کہ الطاف حسین کی ایک کال پر سارا شہر بند ہو جاتا تھا۔اُن کی مرضی کے بغیر ایک پتا نہیں گرتا تھا۔ابتدا میں الطاف حسین نے مہاجروں کے ساتھ ہونے والے ظلم و زیادتی کے خلاف آواز بلند کی۔اُن کے لیے الگ کوٹہ مختص کرنے اور سندھ کے وسائل پر ان کا حق تسلیم کرنے کی بات کی۔لیکن پھر وہ رفتہ رفتہ اپنے کاز، مقصد اور نصب العین سے بہت دور چلے گئے اور تشدد پسندانہ اقدامات پر اُتر آئے۔کہا جاتا ہے کہ سیاسی پارٹیوں میں مسلح ونگ بنانے، پُر تشدد کارروائیاں کرنے، بھتا وصول کرنے اور خوف و ہراس پھیلا کر لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کی روایت الطاف حسین اور اُن کی ساتھیوں نے ڈالی۔مجبوراً حکمرانوں اور ریاستی اداروں نے اُن کے خلاف آپریشن کر کے لوگوں کو اُن کے چُنگل سے آزاد کرایا۔

الطاف حسین 1988ء، 1990ء، 1993ء اور پھر 1996ء کے عام انتخابات میں کراچی کے حلقوں سے قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔وہ صحیح معنوں میں کینگ میکر تھے کیونکہ وہ جس پارٹی کا ساتھ دیتے قومی اسمبلی اور سینٹ میں وہ پارٹی عددی اکثریت حاصل کر لیتی۔1993ء میں ایم کیو ایم کے خلاف فوجی اپریشن کے بعد وہ ملک سے فرار ہوئے اور برطانیہ میں سیاسی پناہ حاصل کی۔بعد میں برطانیہ نے اُنہیں اپنی شہریت بھی دے دی۔کافی عرصہ تک وہ لندن میں بیٹھ کر اپنی پارٹی چلاتے رہے۔وہ کئی کئی گھنٹے ٹیلی فونک خطاب کرتے اور ہزاروں کا مجمع اُن کے سامنے خاموشی سے بیٹھا ہوتا۔کوئی اُن کے سامنے دم مارنے کی جراءت نہیں کر سکتا تھا آخر ملک کے خلاف بیانات دینے، ہندوستانی خفیہ ایجنسیوں سے روابط رکھنے اور دیگر ملک دشمن سرگرمیوں کے الزام میں اُن پر ویڈیو اور آڈیو خطابات پر پابندی لگادی گئی۔پھر اُن کی پارٹی بھی بکھر گئی اور وہ الطاف حسین جن کے نام سے بڑے بڑے لوگ اور حکمران کانپتے تھے قصہ پارینہ ہو گئے۔

''سفر زندگی'' الطاف حسین کی مختصر اور جزوی آپ بیتی ہے جس میں اُس کی زندگی کے کئی اہم پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔اس آپ بیتی میں اُن کی کراچی یونیورسٹی میں سیاسی سرگرمیوں کے آغاز سے 1988ء تک کی زندگی کی تفصیل اختصار سے درج ہے۔مذکورہ آپ بیتی میں الطاف حسین نے مہاجر سٹوڈنٹ مومنٹ اور بعد میں مہاجر قومی مومنٹ (ایم کیو ایم) بنانے اور منظم کرنے کے دوران اُٹھائے گئے تکالیف، مہاجروں کے ساتھ ناانصافیوں، اپنی سیاسی جدوجہد اور سندھ

میں سیاسی اصلاحات کے بارے میں اپنے خیالات پیش کیے ہیں۔ گو یہ سیاسی سر گزشت ہے لیکن درمیان میں مصنف نے اپنی ذاتی، نجی اور غیر سیاسی سر گرمیوں پر بھی اظہارِ خیال کیا ہے جس سے اُس کی سوچ، نفسیات اور زندگی کے کئی گوشوں پر روشنی پڑتی ہے اور الطاف حسین کی سفرِ زندگی کے چند اہم سنگ میل سامنے آتے ہیں۔

جزوی اور سرسری آپ بیتیوں کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اِن میں مصنف اپنی سر گزشت ترتیب سے نہیں لکھتا۔ اس قسم کی آپ بیتیوں میں مصنف کا زور ایک ہی بیان پر ہوتا ہے جبکہ دیگر چیزیں ثانوی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں۔ اُردو زبان میں کئی ادیبوں، سائنسدانوں، سپاہیوں، سیاست دانوں اور دیگر لوگوں نے خطوط، مقالات، مضامین اور اپنے مشاہدات لکھے ہیں لیکن ساتھ ہی اپنی نجی زندگی سے بھی پردے اُٹھائے ہیں۔ یوں تحقیق کرنے والے اُس کی تحریروں کی روشنی میں اُن کی اچھی خاصی سر گزشتِ زندگی مرتب کر سکتے ہیں۔ جزوی آپ بیتی میں مصنف کسی عنوان پر لکھتے ہوئے اپنی ذاتی زندگی کے چند پہلوؤں کو بھی زیرِ بحث لاتا ہے۔ جزوی سیاسی آپ بیتیوں میں مصنف زیادہ تر سیاسی حالات، پارلیمنٹ کی کار گزاری یا جیل میں گزارے گئے اپنے شب و روز کو محور و مرکز بناتا ہے لیکن ساتھ ہی اُس کا خاندان، پسند و مشاغل، ملکی و بین الاقوامی حالات، سماجی تغیرات، معاشرتی تبدیلیاں اور نجی زندگی جیسے بے شمار عنوانات اُس کی تحریر کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔ یوں مصنف کی ایک بے ترتیب سی خود نوشت سوانح وجود میں آجاتی ہے۔

''سفرِ زندگی'' مہاجر قومی موومنٹ کے بانی الطاف حسین کی جزوی آپ بیتی ہے۔ اُس نے اپنی سر گزشت کا آغاز بی ایس سی فارمیسی میں داخلے سے کیا ہے۔ پھر کراچی یونیورسٹی میں طلبا تنظیم بنانے اور بعد میں ایم کیو ایم کو تشکیل دینے کے بارے میں اپنی جدوجہد، مقاصد اور مستقبل کے عزائم کو بیان کیا ہے۔ الطاف حسین نے کافی تفصیل سے بتایا ہے کہ اُس نے نئی پارٹی بنانے کے لیے کتنی جدوجہد کی، اُن کو کن مسائل کا سامنا کرنا پڑا اور اُنہیں کراچی میں ایک نئی پارٹی بنانے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ مصنف کا سارا فوکس مہاجروں پر کیے جانے والے مظالم اور اپنی جدوجہد پر ہے۔ بیچ بیچ میں اُس نے ذاتی کوائف، اپنے تجربات، خاندان، بچپن اور غیر سیاسی باتیں بھی بیان کی ہیں۔ الطاف حسین کی اُردو زبان میں لکھی جانے والی آپ بیتی سیاست سے دلچسپی رکھنے والوں، تاریخ پڑھنے والوں اور ماہرینِ نفسیات سب کے لیے یکساں اہمیت رکھتی ہے اس لیے یہ آپ بیتی کئی لحاظ سے اہم ہے۔ الطاف حسین اپنی پیدائش کے بارے میں کہتا ہے:

> ''میں ۱۷ ستمبر ۱۹۵۳ء کو کراچی میں پیدا ہوا۔ ۱۹۶۹ء کو گورنمنٹ بوائز سیکنڈری سکول جیل روڈ سے میٹرک اور سٹی کالج کراچی سے انٹر سائنس کرنے کے بعد ۱۹۷۴ء میں اسلامیہ سائنس کالج سے بی ایس سی کیا۔ ۱۹۷۹ء میں کراچی یونیورسٹی

سے بی۔ فارمیسی کرنے کے بعد ایم۔ فارمیسی میں داخلہ لیا لیکن بعض ناگزیر حالات
کے تحت یونیورسٹی چھوڑنے پر مجبور ہوا''۔(۴۹)

اس آپ بیتی سے معلوم ہوتا ہے کہ بی۔ فارمیسی کرنے کے بعد الطاف حسین نے ایک غیر ملکی دواساز کمپنی میں ایک سال بطور ٹرینی بھی کام کیا اور پھر ڈیڑھ سال تک امریکہ میں رہا۔ وہ ۱۹۷۰-۷۱ء میں پہلے نیشنل سروس کیڈٹ سکیم کے تحت ایک سال تک فوج میں بلوچ رجمنٹ میں بھی شامل رہا۔

الطاف حسین کے والد نزیر حسین متحدہ ہندوستان میں سٹیشن ماسٹر تھے۔ وہ ہجرت کرنے کے بعد کراچی کے ایک مل میں کلرک رہے۔ الطاف حسین کا تعلق آگرہ (یوپی، بھارت) کے ایک ممتاز دینی خاندان سے تھا۔ اُن کے دادا مفتی رمضان حسین آگرہ شہر کے مفتی اور نانا حافظ رحیم بخش ایک جید عالم تھے۔ اپنے بہن بھائیوں اور گھر بار کے بارے میں الطاف حسین لکھتے ہیں:

''میرے چھ بھائی ہیں۔ پانچ بڑے اور ایک چھوٹا۔ میرے علاوہ تمام بھائیوں کی
شادیاں ہو چکی ہیں۔ میرے والد ایک سنجیدہ اور محنتی آدمی تھے اُن کا انتقال 13
مارچ 1967ء کو ہوا''۔(۵۰)

الطاف حسین ہمارے ملک کے اُن سیاست دانوں میں سے ہیں جس نے کوئی سرمایہ دارانہ یا جاگیر دارانہ پس منظر نہ ہونے کے باوجود بڑی بڑی سیاسی کامیابیاں حاصل کیں۔ اپنی دنیا آپ بنائی اور اپنی محنت و لیاقت کے بل بوتے پر اپنا ایک مقام حاصل کیا۔ پاکستان کے سیاسی تاریخ پر اگر نگاہ دوڑائی جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ابتداہی سے ملکی سیاست میں وڈیروں، سرمایہ داروں، جاگیر داروں اور دولت مند لوگوں کا غلبہ رہا ہے۔ میدان سیاست میں متوسط طبقے کے لوگ بہت کم اُوپر آسکے۔۔ الطاف حسین کے طرز سیاست سے اختلاف سہی لیکن یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ تیسری دنیا کے ممالک کے عوام کو اُس نے عملی طور پر ثابت کر دیکھایا کہ ایک غریب اور متوسط طبقے کا نوجوان بھی اپنی سیاسی پارٹی بنا سکتا ہے اور اس کو کامیابی سے چلا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

''میں کراچی کے فیڈرل بی ایریا میں ۱۲۰ مربع گز پر بنے ایک چھوٹے سے مکان
میں رہائش پذیر رہا۔ میرے کثیر الاولاد والدین نے اس چھوٹے سے کواٹر میں کیسے
گزارہ کیا یہ وہ ہی بہتر جانتے ہیں۔ دیگر مہاجرین گھرانوں کی طرح مجھے بھی بچپن ہی
سے حب الوطنی کا درس دیا جاتا تھا''۔(۵۱)

الطاف حسین کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کا طالب علمی کا زمانہ بڑی تنگدستی میں گزرا۔ وہ سائیکل پر لوگوں کے گھروں میں جا کر ٹیوشن پڑھا کر اپنا خرچہ پورا کرتے تھے۔

الطاف حسین نے اپنی آپ بیتی میں اختصار سے یہ بھی بتایا ہے کہ وہ ایک بگڑے ہوئے اور ضدی بچے تھے۔ اُن کی ماں اُس کی طبیعت کی وجہ سے فکر مند رہتی تھیں۔ اکثر آدھی رات کو گھر آتے کبھی تو صبح تین چار بجے گھر پہنچتے۔ اُس کی شفیق ماں اُس کا راستہ تکتی۔ ہمیشہ ماں ہی اُس کے لیے دروازہ کھولتی چاہے رات کے دو بجے ہی کیوں نہ ہوں۔ پھر اُسی وقت اُس کے سامنے کھانا رکھتی اور اُنہیں زندگی کے نشیب و فراز سمجھاتی۔ مصنف نے اس آپ بیتی میں اپنی ماں کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا ہے اور اعتراف کیا ہے کہ ماں نے کبھی میری حوصلہ شکنی نہیں کی بلکہ ہمیشہ مثبت انداز سے سمجھایا۔ ایک مرتبہ جب الطاف حسین کو فوجی حکومت نے ۹ ماہ قید بامشقت کی سزا سنائی اور حکومت نے اُن کی ماں پر معافی نامہ لکھنے کے لیے دباؤ ڈالا تو اُس نے کسی قسم کا معافی نامہ لکھنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس موقع پر الطاف حسین اپنی ماں کا ذکر ان شاندار الفاظ سے کرتے ہیں:

> ''کون ماں نہیں چاہتی کہ اُس کا بیٹا اگر جیل میں ہے تو رہا ہو جائے خاص طور پر جب عید آرہی ہو لیکن میں اپنی والدہ کی عظمت کو سلام کرتا ہوں کہ اُنہوں نے اپنے دل پر پتھر رکھ کر جس بہادری اور بلند حوصلے کا مظاہرہ کیا اُس نے اُن کی عظمت کو دوبالا کر دیا''۔(۵۲)

الطاف حسین نے اپنے بچپن کے حالات، بچپن کی شرارتوں، سکول کی زندگی، کھیل اور دیگر مشاغل کے بارے میں تفصیل سے نہیں لکھا ہے۔ وہ فوراً سیاسی موضوعات اور اپنی جدوجہد کی طرف آتے ہیں۔ لگتا ہے کہ اُنہیں مہاجرین کے ساتھ ناانصافیوں، محرومیوں اور اپنا سیاسی نکتہ نظر بیان کرنے کے سوا دیگر کسی موضوع سے دلچسپی نہیں۔

الطاف حسین کے خاندان، اباؤ واجداد اور رشتہ داروں میں کسی کا تعلق سیاست سے نہیں رہا۔ اُنہیں بھی بچپن اور کالج کی زندگی میں سیاسی سرگرمیوں سے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ تاہم جب اُس نے جامعہ کراچی میں داخلہ لیا تو وہاں اُس کو سیاست سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ سیاست میں آنا اور پھر الگ سیاسی تنظیم بنانے کو وہ ایک حادثہ سمجھتے ہیں جب اُسے یونیورسٹی میں داخلہ نہیں مل سکا اور اُس نے دیگر ساتھیوں کے ساتھ مل کر نو ماہ تک یونیورسٹی انتظامیہ کے خلاف طویل تحریک چلائی۔ کامیاب ہونے کے بعد اُس نے کسی طلبا تنظیم کے ساتھ شامل ہونے کے بجائے ایک الگ سیاسی تنظیم بنانے کا فیصلہ کیا۔ اُس نے یہ بھی مشاہدہ کیا کہ یونیورسٹی میں قومیت، صوبائیت، علاقائیت اور لسانیت کی بنیاد پر مختلف تنظیمیں کام کر

رہی ہیں۔ یونیورسٹی میں مہاجر لڑکوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ وہ دیگر تنظیموں میں اپنی توانائیاں صرف کر رہے ہیں لیکن اُن کی اپنی مہاجر تنظیم موجود نہیں چنانچہ آپ نے کراچی یونیورسٹی میں 11 جون 1978ء کو آل پاکستان مہاجر سٹوڈنٹس آرگنائزیشن (اے۔پی۔ایم۔ایس۔او) کے نام سے اپنی تنظیم قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔

الطاف حسین کے لیے اس نئی تنظیم کو چلانے اور کامیاب کرانے کے لیے پیسوں کا مسئلہ تھا۔ مسئلہ یہ بھی تھا کہ وہ خود اور اُس کے جملہ ساتھی غریب خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ اپنی پڑھائی کے اخراجات مشکل سے پورے کرتے ایک سیاسی تنظیم کے اخراجات کیسے پورے کر سکتے تھے۔ دیگر تمام طلباء تنظیموں کے پیچھے بڑی بڑی سیاسی پارٹیوں اور لوگوں کا ہاتھ تھا جبکہ اس تنظیم کا اوپر سطح پر کوئی ولی یا وارث نہیں تھا۔ الطاف حسین کو اپنی پارٹی کی مالی ضروریات کس طرح پورے کرنے پڑے اُن ہی کی زبانی سنیے۔

> ''ہم مختلف دکانوں سے ایک ایک یا دو دو روپیہ تو چندہ جمع کرتے ہی تھے لیکن ہمیں کئی جگہ سے یہ الفاظ بھی سننا پڑتے تھے معاف کرو! گویا ہم ان سے بھیک مانگنے کے لیے گئے تھے لیکن ہم معاف کرو کے الفاظ بھی خوشی سے سن کر اُن کا شکریہ ادا کر کے اگلی دکان کا رُخ کرتے تھے۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ میں نے خود ذاتی طور پر 25 پیسے، 10 پیسے اور 5 پیسے تک چندہ جمع کیا ہے۔ روزانہ جامعہ میں ہمارا اجلاس ہوتا تھا۔ پھر ہم چندہ جمع کرنے باہر نکلتے تھے۔ اس کے بعد شام کو ٹیوشن پڑھاتے تھے۔ ٹیوشن کے بعد انفرادی طور پر اپنے ملنے والوں اور عزیز واقارب کے پاس جا کر اُن سے اے پی ایم ایس او کے لیے چندہ حاصل کرتے تھے''۔ (۵۳)

الطاف حسین نے آل پاکستان مہاجر سٹوڈنٹس آرگنائزیشن کو کامیابی سے چلا کر کراچی اور حیدر بھر کے عوام میں مقبول کر دیا۔ وہ پاکستان کے اُن طلباء رہنماؤں میں شامل ہیں جن کو طالب علمی کے زمانے میں ملک گیر شہرت نصیب ہوئی۔ جامعہ کراچی میں طلبا سیاست اور دیگر سرگرمیوں کی وجہ سے آپ کو یونیورسٹی سے خارج کر دیا گیا۔ بہر حال اب اُنہیں سیاست کا چسکا پڑ چکا تھا اس کے علاوہ اُنہیں مہاجر برادری کی طرف سے سپورٹ کیا جا رہا تھا کہ آپ تعلیمی اداروں سے باہر ملکی سطح پر ایک بھرپور سیاسی جماعت بنائیں جو مہاجروں کے حقوق کی نمائندگی کرتی ہو۔ الطاف حسین نے اپنے دیگر طالب علم ساتھیوں کے ساتھ مل کر 18 مارچ 1984ء کو مہاجر قومی مومنٹ (ایم کیو ایم) تشکیل دی۔ الطاف حسین پر ہمیشہ سے یہ الزام لگایا جاتا رہا ہے کہ ایم کیو ایم دراصل ضیاء الحق نے بنائی اور یہ پارٹی فوج اور خفیہ ایجنسیوں کی پیداوار ہے۔ ضیاء الحق نے

سندھ سے پیپلز پارٹی کو ختم کرنے اور سیاسی پارٹیوں پر دباؤ ڈالنے کے لیے ایم کیو ایم کی داغ بیل ڈالی تھی تاہم الطاف حسین اس الزام کو یکسر مسترد کرتے ہیں۔ وہ ایم کیو ایم بنانے کے محرکات بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مہاجروں کو تیسرے درجے کا شہری سمجھا جاتا ہے۔ ان کے جان و مال کی کوئی قدر نہیں۔ تعلیمی ادارے ہوں، سرکاری، نیم سرکاری ادارے ہوں، ملازمتوں کا مسئلہ ہو، داخلوں کا مسئلہ ہو یا قومی اتحاد کی تحریک ہو۔ اس میں مہاجروں سے قربانیاں تو لی جاتی ہیں مگر انہیں دینے کے لیے کسی کے پاس کچھ نہیں۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مہاجر اسی طرح مرتے رہیں گے۔ اسی طرح کٹتے رہیں گے۔ اسی طرح لٹتے رہیں گے اور استعمال ہوتے رہیں گے جب تک اُن کی اپنی کوئی تنظیم نہیں ہو گی۔ ان کے لیے آواز اُٹھانے والا کوئی نہیں ہو گا''۔ (۵۴)

ایم کیو ایم پاکستان کی وہ سیاسی جماعت ہے جس پر اکثر تشدد، سیاسی مخالفین کو قتل کرنے، بھتا وصول کرنے، غنڈہ گردی کرنے اور خوف وہراس پھیلانے کا الزام لگایا جاتا ہے لیکن الطاف حسین اس قسم کے سارے الزامات مسترد کرتا ہے اور اُلٹا دوسرے سیاسی پارٹیوں پر اُن کو تنگ کرنے اور مہاجروں کے ساتھ ناانصافی کرنے کا رونا روتا ہے۔ کراچی شروع سے ہی لسانی فسادات کا مرکز رہا ہے۔ اس گنجان آباد اور مختلف قوموں کے مسکن شہر میں دشمن قوتوں نے لسانی اور نسلی بنیادوں پر لوگوں کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کیں ہیں۔ الطاف حسین کو اس بات کا احساس ہے کہ ان غلط فہمیوں نے اس شہر کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے لیکن لسانی بنیاد پر تشکیل دی گئی اپنی پارٹی کا دفاع کرتا ہے۔ ایم کیو ایم پر یہ بھی الزام ہے کہ مشہور قوم پرست رہنما اور ''سندھو دیش'' کا نعرہ لگانے والے جی ایم سید ہی دراصل الطاف حسین کو سیاست میں لائے ہیں۔ جی ایم سید نہ صرف اُنہیں گائیڈ لائین دیتے تھے بلکہ اُس نے ہی الطاف حسین کا تعارف بیرون ایجنسیوں سے کرایا۔ اس الزام کے جواب میں الطاف حسین رقمطراز ہیں۔

> ''دسمبر 1985ء کے آخر میں یعنی 1986ء شروع ہونے سے کچھ ہی دن پہلے سائیں جی۔ ایم۔ سید سے میری پہلی ملاقات ہوئی جب کہ میں 11 جون 1987ء کو اس تحریک کا آغاز اعلانیہ کر چکا تھا۔ اس تحریک کے لیے میں نے کام تو 1977ء میں نظام مصطفی کی تحریک کے دوران ہی شروع کر دیا تھا جب سائیں کے ساتھ میری پہلی ملاقات ہی تقریباً 1986ء میں ہو رہی ہے تو یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اُن کی ترغیب پر میں نے اس تحریک کا آغاز کیا؟'' (۵۵)

اپنے سیاسی سفر کے آغاز سے اپنی خود نوشت لکھنے (1988ء) تک وہ تین بار مختلف مقدمات میں جیل گئے تھے۔ الطاف حسین کے کئی سال جیل میں گزرے۔ اُنہیں پہلی مرتبہ 1979ء کو 9 ماہ قید بامشقت اور پانچ کوڑوں کی سزا ہوئی جب وہ کراچی یونیورسٹی میں طلبا تنظیم کے صدر تھے۔ دوسری مرتبہ 1986ء کو اور تیسری مرتبہ 1987ء کو اُنہیں گرفتار کر جیل میں ڈالا گیا۔ اپنی آپ بیتی میں مصنف نے جیل کے تجربات اور اُن پر کیے گئے بدترین تشدد کو اختصار سے بیان کیا ہے۔ اُن پر مختلف جھوٹے مقدمات بنائے گئے جن میں اُن پر ایک پولیس والے کی ٹوپی چوری کا مقدمہ بھی شامل تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری پولیس لوگوں کو پھنسانے کے لیے اُن پر کیسے کیسے مضحکہ خیز مقدمے بناتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایم کیو ایم پاکستان کی اُن گنے چُنے جماعتوں میں سے ہے جس کو بنانے والے اور جس میں شامل ہونے والے سب نچلے درجے اور متوسط طبقے کے نوجوان تھے۔ یہ جماعت جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور وڈیروں کے تعاون سے نہیں براہ راست عوام سے بنی تھی۔ ابتداء میں مہاجر کمیونٹی میں نچلے درجے اور متوسط طبقے کی طرف سے ان کو زبردست پذیرائی ملی۔ ایم کیو ایم ابتداء میں بڑی منظم جماعت تھی اور دیگر پارٹیوں کے برعکس انتظامی طور پر اس پر کافی محنت کی گئی تھی۔ ایم کیو ایم کو اندرونی اور انتظامی طور پر زونل انچارج، سیکٹر انچارج، سرکل انچارج اور یونٹ آرگنائزر میں تقسیم کیا گیا تھا۔ اپنے سخت انتظامی ڈھانچے اور منظم ہونے کے لحاظ سے پاکستان میں جماعت اسلامی کے علاوہ کوئی دوسری سیاسی پارٹی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔

''سفر زندگی'' الطاف حسین کی سیاسی سرگزشت ہے۔ وہ زیادہ تر سیاست کے حوالے سے بات کرتا ہے اپنی سیاسی زندگی کے شب و روز بیان کرتا ہے اور سیاسی واقعات پر توجہ مرکوز رکھتا ہے۔ کہیں غیر سیاسی موضوعات اگر آ بھی جائیں تو وہ بھی اُن کے سیاسی بیانیے کے تابع آتے ہیں اور وہ فوراً اپنے اصل موضوع کی طرف پلٹ جاتا ہے۔ اپنی آپ بیتی میں الطاف حسین نے جن سیاسی اور غیر سیاسی واقعات کو بیاں کیا ہے اور جو انکشافات کیے ہیں اُن کا مختصر جائزہ پیش کرتے ہیں۔

ا۔ 1970ء میں یحییٰ خان کی حکومت نے تمام کالجوں سے لازمی فوجی سروس کے لیے ''نیشنل کیڈٹ سروس سکیم'' (NCSS) شروع کی تھی جس کے تحت ہر میٹرک پاس نوجوان کو ایک سال تک لازمی طور پر فوجی خدمات انجام دینا تھیں۔ الطاف حسین کو بھی اس کورس کے لیے منتخب کیا گیا۔ اس دوران اُنہیں فوج اور فوجی زندگی سے بے حد شوق پیدا ہوا۔ اُس کی خواہش تھیں کہ وہ اس ٹریننگ کے بعد فوج میں مستقل کمیشن حاصل کرے۔ ٹریننگ کے دوران اُس کے یونٹ کو مشرقی پاکستان لے جانے کا فیصلہ ہوا لیکن راستے بند ہونے کی وجہ سے اُنہیں کراچی کیاڑی بندرگاہ سے واپس آنا پڑا۔ الطاف حسین کو فوج اور فوج کی زندگی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تاہم انھیں فوج میں موجود اقربا پروری، سختی اور سینئرز و جونیئرز

کے درمیان بے گانگی سے مایوسی ہوئی پھر ایک دن ایک حوالدار کی اُن کی کی گئی بے عزتی اور سارے مہاجروں کے لیے استعمال کیے گئے غلط الفاظ نے اُنہیں فوجی زندگی سے یکسر بدظن کر دیا۔اِس موقع پر الطاف حسین نے بڑی سچائی سے اپنے احساسات لکھے ہیں:

> ''ہمارے حوالدار بھی وہاں موجود تھے اُس نے مجھے آواز دی اوئے کیا شور کیا کرتا ہے، تم کو فوج میں کس نے بھرتی کیا ہے؟ تم کراچی میں رہنے والے چائے پینے والے، ٹیڈی پتلونیں پہننے والے کس طرح جنگ کروگے؟ اُس حوالدار نے نہ صرف مجھے بلکہ شہر میں رہنے والوں کو اور اُن کی ماؤں بہنوں کو نہ جانے کن کن ناموں سے پکارا۔اُس کی باتیں سن کر میرے ذہن سے وہ سوچیں چلی گئیں جو بچپن سے میرے ذہن میں تھیں کہ میں فوج میں جاؤں گا اور پاکستان کی خاطر اپنی جان دے دوں گا''۔(۵۶)

۲۔ الطاف حسین کو اپنی سیاسی جدوجہد کے دوران مختلف موقعوں پر گرفتار کرکے بدترین تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ دورانِ تفتیش سرکاری اہلکار اُنہیں مختلف طریقوں سے ٹارچر کرتے رہے۔اُن کو مہاجر ہونے کے طعنے دیئے گئے، مہاجروں کو گالیاں دی گئیں اور اُن پر انڈیا سے امداد لینے کا الزام لگایا گیا، یہ سب کچھ نوجوان، جذباتی اور حساس الطاف حسین پر بری طرح اثرانداز ہوا۔اُنہیں جیل میں یہ احساس شدید ہوتا گیا کہ پاکستان کے دیگر قومیں پنجابی، سندھی، پٹھان اور بلوچ وغیرہ غاصب ہیں جو سندھ کے وسائل پر قبضہ کرکے مہاجروں کا حق مار رہی ہیں۔اس موقع پر اُنہیں اس بات کا بھی افسوس ہوا کہ پولیس اور دیگر محکموں میں سندھیوں اور مہاجروں کے ساتھ سخت ظلم ہوتا ہے۔اُس پر یہ بھی آشکارہ ہوا کہ سندھ کی پولیس ، تعلیم اور صحت جیسے محکموں میں پنجاب اور سرحد سے لوگ لاکر بھرتی کیے جاتے ہیں اور مقامی لوگوں کی کوئی شنوائی نہیں۔اُس نے باقاعدہ اُن مہاجروں کے نام لیے ہیں جنہیں قومی کھیلوں اور مختلف محکموں سے صرف اس لیے نکالا گیا کیونکہ وہ کراچی اور حیدرآباد کے مہاجر تھے۔یہ سارے احساسات، پولیس کا تشدد اور مہاجروں کے بارے میں دیگر اقوام کے دلوں میں منفی سوچ نے اُنہیں نفرت، تعصب، لسانی اختلافات اور مہاجر کارڈ استعمال کرنے پر مجبور کیا اور وقت کے ساتھ ساتھ وہ تعصب اور نفرت کی راستوں پر دور چلا گیا۔اگر یونیورسٹی میں وہ مختلف قومیتوں اور لسانی تعصبات کا سامنا نہ کرتا۔اگر اُنہیں بار بار گالی کے ساتھ مہاجر کا طعنہ نہ ملتا اور اگر اُنہیں پولیس تھانوں میں بدترین تشدد کا نشانہ نہ بنایا جاتا تو شاید اُس کی سوچ، طرزِ سیاست اور فکر کا زاویہ مختلف ہوتا۔ تشدد اور دورانِ تشدد الطاف حسین اپنے خیالات، احساسات اور محسوسات یوں رقم کرتا ہے:

''میں تین راتوں سے لاک آپ میں جاگ رہا تھا۔اس سے پہلے تین راتوں سے میں حیدر آباد میں جلسوں کی تیاری کے سلسلے میں قطعی سو نہیں سکا تھا اس طرح مجھے جاگتے ہوئے چھ راتیں گزر چکی تھیں۔ مجھے کہا گیا کہ تم مسلسل چکر لگاتے رہو۔ سی۔آئی۔اے سیل کی اُس کوٹھڑی میں سات دن تک مجھ سے مسلسل چکر لگوائے گئے۔ چل چل کر میرے پیر سوج گئے۔ گردہ کی تکلیف میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔۔۔۔ میں یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیا یہ میرا اپنا ملک ہے۔ کیا یہ میرے اپنے لوگ ہیں، میں نے کیا جرم کیا ہے یہ تمام سوالات بھی میرے ذہن میں گردش کر رہے تھے پھر میں خود ہی ان سوالوں کا جواب دے لیتا تھا کہ چونکہ مہاجروں کے ساتھ پچھلے چالیس سال سے ناانصافیاں ہوتی رہی ہیں اور جو لوگ ان کے حقوق سے محروم کیے ہوئے ہیں وہ کبھی یہ نہیں چاہیں گے کہ مہاجروں کو سلب شدہ حقوق واپس مل سکیں چنانچہ وہ تمہارے ساتھ لازمی طور پر یہی سلوک کریں گے اور تمہیں یہ سب اذیتیں برداشت کرنا ہوں گی''۔(۵۷)

۳۔ مصنف نے اپنی آپ بیتی میں کئی جگہوں پر مہاجروں کو الگ قومیت قرار دیا ہے۔اُس کے خیال میں جس طرح ملک میں دیگر قومیتیں سندھی، پنجابی، بلوچی اور پٹھان بستے ہیں اور ان کے الگ الگ رسوم، رواج، زبان اور روایات ہیں اس طرح مہاجر بھی اپنی جدا ثقافت اور زبان کی بنیاد پر ایک الگ قومیت رکھتے ہیں۔ جس طرح دیگر قومیتوں سے پاکستان کی سالمیت پر فرق نہیں پڑتا بلکہ ان مختلف رنگوں سے ہماری متفقہ قومیت یعنی پاکستانی قومیت فروغ پاتی ہے اس طرح اس گلدستے میں مہاجر قوم کو شامل کرنے پر اعتراض کیوں کیا جاتا ہے۔الطاف حسین نے تاریخ سے مثالیں دے کر قومیت کے بارے میں اپنا نقطہ نظر دیا ہے۔آپ نے مختلف دلائل سے مہاجروں کو الگ قوم ثابت کر کے کہا ہے کہ مہاجر قومیت کی ابتدا پاکستان میں قیام پاکستان کے ساتھ ہی ہوتی ہے جب ہندوستان کے اقلیتی صوبوں سے بڑی تعداد میں مسلمانوں نے نقل مکانی کر کے پنجاب اور سندھ کو اپنا مسکن بنایا۔الطاف حسین مہاجروں کو پانچویں بڑی قومیت کے حق میں یہ دلائل دیتے ہیں:

''اس اعتبار سے مہاجر کسی طرح بھی پاکستان کی چار تسلیم شدہ قومیتوں (پنجابی، پٹھان، بلوچ اور سندھی) سے نظریہ قومیت کی بنیاد پر میل نہیں کھاتے اس لیے مہاجروں کی یقیناً ایک الگ اور منفرد حیثیت ہے اور یہ الگ اور منفرد حیثیت ہی مہاجر قومیت کا ایک مضبوط استدلال اور جواز ہے''۔(۵۸)

۴۔ الطاف حسین سندھ میں پنجابی اور پٹھانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد، مختلف ملازمتوں میں اُن کی کثیر تعداد، ٹرانسپورٹ اور تجارت پر اُن کی گرفت اور اثر و رسوخ کے سخت شاکی ہیں۔اُن کو افغان مہاجرین کی حد سے زیادہ میزبانی پر بھی کافی شکایتیں ہیں۔ وہ برملا اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ ان افغانیوں کی وجہ سے کراچی میں کلاشنکوف، ہیروئن اور ڈرگ مافیا کا کاروبار شروع ہوا۔ وہ اس پر بھی افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ افغان پناہ گزینوں کو صوبہ سرحد کے پاک افغان سرحد تک محدود کیوں نہیں رکھا گیا۔ اگر یہ سب کچھ اسلامی اخوت کی بنیاد پر کیا گیا تو وہ پاکستانی جو پچھلے سترہ سالوں سے بنگلہ دیش میں ریڈ کراس کیمپوں میں پڑے ہوئے ہیں اُن کو اسلامی اخوت کی بنیاد پر پاکستان کیوں نہیں لایا گیا؟

۵۔ الطاف حسین نے اپنی آپ بیتی میں اس پر بھی اظہار خیال کیا ہے کہ کسی بھی ملک میں جب لوگوں میں احساس محرومی بڑھتا ہے تو اس سے ملک کی سالمیت اور یکجہتی کو سخت نقصان پہنچتا ہے۔ بنگلہ دیش کی مثال دے کر اُس نے یہ بات سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ اگر ہم نے مختلف طبقوں اور اپنے حق سے محروم کی گئی چھوٹی بڑی قوموں کی شکایتوں کا ازالہ نہ کیا تو پھر ہمیں دوبارہ بنگلہ دیش والی صورتحال درپیش ہو سکتی ہے۔ مصنف ملک اور صوبوں کی تشبیہ گھر سے دیتے ہوئے کہتا ہے کہ ایک گھر کے اندر بھی لوگوں میں اختلاف ہو سکتا ہے اور وہ گھر تقسیم کرنے یا دیواریں اُٹھانے کی بات کرتے ہیں لیکن گھر کے سیانے اُن کی شکایات کا ازالہ کرتے ہیں۔ ملک بھی گھر کے مانند ہیں اور اس میں رہنے والے جملہ افراد کا اس پر یکساں حق ہوتا ہے۔ مصنف سندھ کے مشہور قوم پرست رہنما جی ایم سید کے بارے میں دلچسپ انکشاف کر کے پڑھنے والوں کو غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں:

> ''محب وطن پاکستانیوں کا فرض ہے کہ وہ اس بات پر غور کریں کہ آج سائیں جی۔ایم۔سید سندھو دیش کا نعرہ کیوں لگا رہے ہیں۔ کیا یہ وہی جی ایم سید نہیں ہیں جنہوں نے سب سے پہلے سندھ اسمبلی میں پاکستان کی قرارداد پیش کی اور اسے منظور کرایا۔ سندھ میں مسلم لیگ کو ارگنائز کیا۔ ہمیں سوچنا چاہیے کہ جو شخص کل پاکستان کی قرارداد پیش کر رہا تھا۔ جس نے کل دن رات مسلم لیگ کے لیے جدوجہد کی آج سندھو دیش کا نعرہ کیوں لگا رہا ہے۔ ہمیں ان اسباب پر غور کرنا چاہیے''۔(۵۹)

اس آپ بیتی میں جو بات بہت کھٹکتی ہے وہ مصنف کا متعصبانہ سوچ اور دیگر صوبوں کے ساتھ مخاصمت ہے مصنف نے شروع تا آخر مہاجروں پر ڈھائے گئے مظالم کا رونا رویا ہے۔ اُن کے اکثر باتوں سے نفرت اور تعصب کی بُو آتی ہے۔ پڑھنے والا اُس کے تلخ لہجے، دھمکی آمیز انداز کو بُری طرح محسوس کرتا ہے (ہو سکتا ہے یہ اُس کا فطری انداز ہو)۔ مصنف خود کو سندھ

بالخصوص کراچی کے لسانی اختلافات سے علیٰحدہ کرتے ہیں حالانکہ وہ کراچی کی بدامنی کے اِتنے ہی ذمہ دار ہیں جتنے دوسرے لوگ ہو سکتے ہیں۔ کالا باغ ڈیم کئی عشروں سے ہمارے ملک میں صوبوں کے درمیان ایک بڑا تنازعہ رہا ہے۔ الطاف حسین اِس اہم قومی ایشو پر یوں رقمطراز ہیں:

"کالا باغ کے منصوبے سے جو شکایات سندھ اور سرحد کو ہیں، سرکاری سطح پر ان کے بارے میں کسی قسم کی وضاحت نہ ہونے کی وجہ سے اِن شکایات کو تقویت حاصل ہوتی ہے کہ واقعی سرحد اور سندھ کو اِس منصوبے سے نقصان پہنچے گا۔ اِس لیے ہمارا موقف یہ ہے کہ اِس فنی اور تکنیکی منصوبے کے بارے میں چاروں صوبوں کے نہ صرف ماہرین اور رائے عامہ کے نمائندوں کو بلکہ عوام کو اعتماد میں لیا جائے اور ملک میں صرف ایسے منصوبوں پر عمل درآمد کیا جائے جن کے نتیجے میں کسی بھی صوبے کو نقصان نہ پہنچے۔ اِس لئے کہ پاکستان کے لیے یکجہتی اور سالمیت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہے۔" (۶۰)

۷۔ کتاب کے آخر میں الطاف حسین نے اپنا منشور، پارٹی کے اغراض و مقاصد اور مستقبل کے عزائم کے بارے میں کھل کر لکھا ہے۔ نیز مہاجروں کے ساتھ کی جانے والی ناانصافیوں کی ایک طویل فہرست دے کر پُرزور احتجاج کیا ہے۔

سفر زندگی کے مصنف نے زباں و بیاں کے حوالے سے کوئی خاص کوشش نہیں کی ہے بلکہ اپنی زندگی کا سفر نہایت اختصار سے عام گفتگو کے انداز میں لکھا ہے۔ اُس نے اپنی کہانی کو نہ تو رنگین بنا کر پیش کیا ہے اور نہ ہی زبان و بیان کی کرشمہ سازیاں دکھائی ہیں۔ مصنف کی فکر اور خیالات سے اختلاف تو کیا جا سکتا ہے لیکن اُس کے خلوص، محنت، لگن اور نظریے کی پختگی کے بارے میں دو رائے ممکن نہیں۔ مصنف نے آسان اور عام فہم انداز میں اپنی سیاسی کامیابیوں اور ناکامیوں کی کہانی تحریر کی ہے جس کو معمولی لکھا پڑھا آدمی بھی آسانی سے پڑھ سکتا ہے۔ اُن کی تحریر میں کوئی اُلجھاؤ اور رکاوٹ نہیں۔ زبان پر اُن کو غیر معمولی قدرت حاصل ہے اور اہلِ زبان ہونے کا بھی اُنہیں فائدہ حاصل ہے۔ وہ لفاظی اور فلسفیانہ موشگافیوں میں پڑنے کے بجائے واقعے پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔

الطاف حسین الفاظ کے صوتی ترتیب، آہنگ اور خارجی صورت کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ وہ کبھی تکرار الفاظ، کبھی مترادفات اور کبھی ہم آواز الفاظ کو ایک ساتھ لا کر فقرے کی غنائی آہنگ کو برقرار رکھتے ہیں۔ اُنہیں مترادفات کے استعمال اور یکساں آوازوں والے الفاظ کو یکے بعد دیگرے لکھنے کا خاص شوق ہے۔ اُن کی تحریر میں موجود آہنگ، صوتی ترتیب اور

تکرار الفاظ سے مصنف کے لاشعور پر حاوی موسیقی کے اثرات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔اِس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اُن کو موسیقی سے خاص رُغبت ہے۔ چنانچہ تحریر کے وقت بھی موسیقی کی ہلکی ہلکی لہریں اُن کے پردہ لاشعور پر صاف محسوس کی جاسکتی ہیں:

''سندھی اور مہاجر ایک ہی سر زمین کے رہنے والے، ایک ہی دھرتی پر اناج اُگانے والے، ایک ہی اناج کا ذائقہ چکھنے والے، ایک ہی دھرتی پر بہنے والے پانی پینے والے، ظلم کی ایک ہی چکی میں پسنے والے، ایک طرح کے مسائل کا سامنا کرنے والے، ایک ہی دھرتی میں دفن ہونے والے اور ایک ہی دھرتی پر خرچ کرنے والے آپس میں لڑتے رہتے ہیں۔''(٦١)

الطاف حسین عام زندگی میں کافی سنجیدہ خیال کیے جاتے ہیں۔ عام گفتگو اور تقریروں میں وہ سنجیدگی کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تاہم اِس آپ بیتی میں وہ کئی جگہوں پر مزاحیہ روپ میں سامنے آتے ہیں۔ وہ حالات و واقعات کو مزاحیہ اور طنزیہ انداز سے پیش کرتے ہیں۔ جیل کے دِنوں کی یادیں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کس طرح پہلی مرتبہ اُس نے جیل کی دال چائے سمجھ کر نوش جان کی تھی لیکن پہلے گھونٹ کے بعد ہی اُنہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ یہاں جیل کے کھانوں پر بھرپور طنز کر رہے ہیں:

''پہلا گھونٹ جو بھرا تو بڑی حیرت ہوئی کہ جیل میں نمکین چائے ملتی ہے۔ دوسرا گھونٹ لیا تو معلوم ہوا کہ وہ چائے نہیں بلکہ دال تھی۔ گویا جیل میں دال اِتنی پتلی ہوتی ہے کہ ہم نے پہلے اِسے چائے سمجھ لیا۔''(٦٢)

الطاف حسین نے ''سفر زندگی'' میں اپنی تکلیفوں، مشکلات اور مسائل کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اپ نے بڑے کٹھن حالات میں ایک نئی سیاسی جماعت بنائی۔ اُس نے بغیر کسی جاگیردار یا سرمایہ دار کے تعاون سے ایک سیاسی پارٹی کی بنیاد رکھی اور غریب کارکنوں اور عہدیداروں کی خوب حوصلہ افزائی کی۔ ایم۔ کیو۔ ایم بڑی مشکل وقت میں بنائی گئی تھی۔ اگر کوئی دوسرا آدمی ہوتا تو وہ راستے کے مشکلات اور امتحانوں سے گھبرا کر ساری جدوجہد چھوڑ دیتا لیکن الطاف دھن کے پکے تھے کبھی ایسا موقع بھی آیا کہ اُن کے اِرد گرد دو یا تین افراد کے سوا کوئی نہ رہا تھا، مالی مشکلات اِس کے علاوہ تھیں الطاف حسین مایوس نہیں ہوتا بلکہ دوسروں کو بھی اُمید اور صبر کا درس دیتا ہے اور یہی اس آپ بیتی کی خصوصیت ہے۔

''سفر زندگی'' کے اسلوب پر عام بول چال کا رنگ نمایاں ہے۔ وہ عام روزمرہ گفتگو کے انداز میں لکھتے ہیں۔ بات

کو گما پھرا کر کہنا، فلسفیانہ انداز اختیار کرنا، عبارت آرائی کرنا اور ادبی شان پیدا کرنے کی کوشش کرنا ''سفر زندگی'' کے مصنف کا طریقہ کار نہیں۔ وہ سیدھی سادی اور عام بول چال کے انداز میں بات کرنے کے عادی ہیں۔ مصنف نے اپنی زندگی کی کہانی سنائی ہے۔ اُس کی بھرپور کوشش ہے کہ دوسرے لوگ اُس کے خیالات سمجھیں، اُن کی بات کو اہمیت دیں اور اُس کی جدوجہد کی قدر کریں۔ یہ اِس آپ بیتی کے لکھنے کی سب سے بڑی وجہ بھی ہے۔ مشکل اور اَدق موضوعات میں پڑنے کی بجائے الطاف حسین عام فہم زبان کا سہارا لیتے ہیں جس کو عام لکھے پڑھے لوگ، مزدور، کسان، دکاندار، سپاہی، دفتری بابو اور طالبعلم رومزہ کی زندگی میں بولتے، لکھتے اور پڑھتے ہیں۔ چونکہ اُس کا روئے خطاب اِن ہی لوگوں کی طرف ہے اِس لئے وہ اُن کی زبان لکھنے میں کوئی شرم یا عار محسوس نہیں کرتے۔

درج ذیل اقتباس پڑھ کر لگتا ہے کہ ایک شخص کسی دوسرے شخص کے سامنے اپنا مقدمہ بیان کر رہا ہے:

> ''میں پاکستان کے چاروں صوبوں کے غریبوں، مظلوموں، مزدوروں، کسانوں، ہاریوں اور چھوٹے ملازموں سے ایک سوال کرنا چاہوں گا کہ میرے بھائیو! یہ بتاؤ کہ تمہارے علاقے میں استحصال کرنے والے لوگ کون ہیں؟ جاگیردار، وڈیرے، سرمایہ دار، سردار، چودھری حالانکہ یہ لوگ تمہاری قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ تمہاری محنت کا کتنا حق دیتے ہیں۔ اِس پر غور کرو کہ تمہارا استحصال کون کرتا ہے اور کس طرح کرتا ہے۔ اگر تم خود میدان میں نہیں آؤ گے تو پھر یہ اُمید نہ رکھو کہ کوئی اور تمہاری مدد کرے گا۔ خدا بھی اُن کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد خود کرنے کے لئے جدوجہد کرتے ہیں۔''(٦٣)

الطاف حسین کی تقریر کا اپنا ایک انداز ہے۔ وہی انداز اُس کی تحریر کا بھی ہے۔ سیاسی لوگوں کو خطاب کرنے کا خاص شوق ہوتا ہے۔ چونکہ اُن کی زندگی عوامی اجتماعات میں گزرتی ہے اِس لیے اُن کی نجی گفتگو اور تحریر پر بھی یہ انداز چھایا ہوتا ہے۔ ایک عوامی شخص، سیاسی رہنما، مذہبی سکالر اور معلم جب بھی تحریری صورت میں کچھ لکھے گا، لامحالہ تقریر کرنے کے انداز میں لکھے گا۔ بہت کم ایسے عوامی لوگ ہوتے ہیں جو فن تقریر کے ساتھ ساتھ صاحب اسلوب ادیب بھی ہوں۔ الطاف حسین کوئی بڑے ادیب یا عالم فاضل سیاستدان نہیں ہیں اِس لیے اُن سے ادیبانہ اسلوب کی توقع عبث ہے۔ آپ نے یہ جو یادداشتیں لکھیں وہ بھی بڑی بات ہے۔ جہاں قومی سطح پر من حیث القوم لوگوں میں لکھنے پڑھنے کی عادت نہ ہو وہاں عام اور سیدھی سادی تحریر میں اپنے زمانے کی تہذیبی، سیاسی، سماجی اور معاشرتی تاریخ محفوظ کرنا غنیمت ہے۔ الطاف حسین کی

تحریر میں تقریر اور خطاب کی ایک جھلک ملاحظہ ہو:

> ''میں حکومت سے انتہائی پُر زور اپیل کرتا ہوں کہ مہاجرین مشرقی پاکستان کو فی الفور پاکستان لایا جائے۔ یہ اُن کا اسلامی حق ہے، یہ اُن کا قومی حق ہے۔ وہ پہلے بھی پاکستانی تھے اور آج بھی اُنہوں نے اپنے کیمپوں میں پاکستانی جھنڈے لگائے ہوئے ہیں۔ اُنہیں پاکستان آنا چاہیئے۔ اگر ہم اسلامی اخوت کی بنیاد پر ان لوگوں کی مدد نہیں کریں گے جن کا پہلا حق بنتا ہے تو ہم اسلامی اُصولوں کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوں گے اور اُن کے سزاوار قرار پائیں گے۔''(٦٤)

کبھی کبھی مصنف فریادی انداز اختیار کر لیتے ہیں۔ خطاب میں تو فریادی انداز کی گنجائش ہے کہ اس سے بعض اوقات تقریر موئثر ہو جاتی ہے اور یہ کہ سامعین کے دِل جیتنے کے لئے خطیب قسم قسم کے حربے استعمال کرتے ہیں۔ تحریر میں اِس قسم کی باتوں کی گنجائش نہیں ہوتی۔ ''سفر زندگی'' کے مصنف کے لکھنے کا یہ عجیب سٹائل ہے کہ وہ عام واقعہ لکھتے لکھتے خطاب کی طرف آتے ہیں اور خطاب سے التماسانہ اور فریادی انداز اپناتے ہیں اور آخر میں اُن کا لہجہ دعائیہ صورت اختیار کر جاتا ہے۔ الطاف حسین کی رنگ بدلتی تحریر کا ایک نمونہ درج ذیل ہے:

> ''امی کے بعد میرے بھائیوں سے رابطہ کیا گیا لیکن اُنہوں نے بھی دوٹوک الفاظ میں وہی بات کہہ دی جو امی نے کہی تھی۔ کون ماں نہیں چاہتی کہ اُس کا بیٹا اگر جیل میں ہے تو رہا ہو جائے، خاص طور پر جب عید آرہی ہو لیکن میں اپنی والدہ کی عظمت کو سلام کرتا ہوں کہ اُنہوں نے اپنے دِل پر پتھر رکھ کر جس بہادری اور بلند حوصلگی کا مظاہرہ کیا، اُس نے اُن کی عظمت کو دوبالا کر دیا۔ میں دُعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میرے تمام ساتھیوں اور کارکنوں کی ماؤں کو وہی حوصلہ عطا فرمائے جو اُس نے میری ماں کو عطا کیا تھا۔''(٦٥)

ہمارے لکھاری خصوصاً سیاست دان، کالم نگار اور دانشور اپنی تحریروں میں انگریزی الفاظ کا بے دریغ استعمال کرتے ہیں۔ بسا اوقات تو پورا فقرہ انگریزی الفاظ میں لاتے ہیں۔ صرف مرکبات ناقص اُردو کے ڈال کر اپنی طور پر اِسے اُردو تحریر سمجھتے ہیں۔ اُردو بڑی ترقی یافتہ زبان ہے۔ ہر قسم کے خیالات اور موضوعات نہایت آسانی سے اِس میں ادا ہو سکتے ہیں۔ جب ایک مرتبہ آپ نے یہ فیصلہ کیا کہ میں اپنی تحریر اپنی قومی زبان میں لکھوں گا تو پھر خوا مخواہ اِس میں انگریزی الفاظ کا استعمال علمیت نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب سیاسی رہنما، حکمران اور لیڈر جو لوگوں کی رائے بناتے ہیں، وہ اُردو کے

تراکیب، اصطلاحات اور الفاظ کو استعمال نہیں کریں گے تو یہ آہستہ آہستہ ہمارے ذخیرہ الفاظ سے نکلتے چلے جائیں گے۔ آج کل کے ٹی وی چینلز، ٹاک شوز، اخبارات اور صحافت سے وابستہ لوگ اُردو زبان کا جو حشر کر رہے ہیں، آئندہ نسلوں پر زبان کے لحاظ سے اِس کے منفی اثرات مرتب ہوں گے۔ جہاں تک ''سفر زندگی'' کا تعلق ہے تو اِس کے مصنف نے بھی جابجا انگریزی الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ بعض جگہوں پر تو اُردو میں لکھنے کی تکلف بھی نہیں کیا اور اکثر انگریزی کے پورے جملے تحریر کی ہیں۔ اُردو کے عام اور رواں عبارت میں انگریزی لفظ لکھنا ایسا ہے جیسے ہموار فرش میں اچانک ایک اُبھری ہوئی اینٹ سامنے آئے۔ یہ اُردو تحریروں کے لیے نیک شگون نہیں۔

مصنف نے اپنی آپ بیتی میں جو انگریزی الفاظ استعمال کیے ہیں اُن کی تفصیل درج ہے:

> ''Son of the Soil کی جگہ فرزند زمین کا لفظ زیادہ اچھا تھا، ایڈ ملنے سے مدد ملنا، کنوینس سے سواری، فرنٹ پیج سے پہلا صفحہ، Mandate سے اکثریت، Un-wanted Elements سے غیر ضروری عناصر، Share طے کرنے سے حصہ وصول کرنے کے الفاظ زیادہ سُبک، شیریں اور فصیح ہیں۔''(۶۶)

''سفر زندگی'' کے مصنف کو اپنی زبان پر بہت فخر ہے۔ وہ بار بار اپنی اِس برتری کا اظہار کرتے ہیں کہ قومی زبان اُردو اُس کی مادری زبان ہے۔ اُنہیں اہل زبان ہونے پر بھی فخر ہے۔ اپنے ساتھیوں، گھر اور نجی محفلوں میں وہ اُردو زبان میں گفتگو کرتے ہیں لیکن حیرت ہے کہ وہ اُردو قواعد، محاورے اور روزمرے میں فاش غلطیاں کرتے ہیں۔ اِس کی ایک وجہ اُن کی ادب اور اُردو زبان سے عدم دلچسپی، اُن کا سائنسی تعلیمی پس منظر اور لااُبالی طبیعت ہی ہو سکتی ہے۔ الطاف حسین نے انتہائی کم محاورات استعمال کیے ہیں حالانکہ اہل زبان عبارت میں قدم قدم پر محاورات اور ضرب الامثال لانے پر فطرتاً مجبور ہوتا ہے۔ ویسے تو اس قسم کے محاوروں اور روزمروں کی ایک طویل فہرست تیار ہو سکتی ہے جو غلط باندھے گئے ہیں تاہم، ہم چند مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں:

> ''۱۔ ''وہ کھلی ہوئی دہشت گردی پر اُتر آئے'' (وہ کھلی دہشت گردی پر اُتر آئے درست ہے۔ کھلی ہوئی اُردو روزمرہ کے خلاف ہے)۔''(۶۷)
>
> ۲۔ ''اِتنی دھواں دار بارش ہوئی (موسلادار بارش)۔''(۶۸)
>
> ۳۔ ''میرے ساتھیوں میں کوئی لغزش پیدا نہیں ہوئی (میرے ساتھیوں کے پاؤں میں کوئی لغزش پیدا نہ ہوئی لکھنا فصیح تھا)۔''(۶۹)

۴۔ ''لاک آپ میں قیدی لبالب بھرے ہوئے تھے''(یہاں بھی غلط محاورہ لکھا گیا ہے۔ انسانوں کے لیے ''کھچا کھچ'' مائع چیز کے لیے ''لبالب'' جیسے چائے سے پیالہ لبالب بھرا ہوا تھا، بے جان چیزوں کے لیے ''اٹا اٹ'' آتا ہے۔ جسے کمرے میں فرنیچر ''اٹا اٹ'' بھرا ہوا تھا)۔''(۷۰)

۵۔ ''اُس کی باتیں سن کر میرے ذہن سے وہ سوچیں چلی گئیں (اُس کی باتیں سن کر میں نے اپنا ارادہ بدل لیا، سوچیں چلی جانا، اُردو میں کوئی محاورہ نہیں)''۔(۷۱)

مختصر یہ کہ اِس آپ بیتی کو پڑھنے کے بعد آپ بیتی اور آپ بیتی نگار کی جو مجموعی تصویر بنتی ہے وہ یہ ہے کہ مصنف کی سوچ انتہائی محدود اور اُس کی تنگ ودو صرف اور صرف ایک گروہ یعنی مہاجروں کے لیے ہے۔ اُس نے اپنی اِس آپ بیتی میں مہاجرین کو انتہائی مظلوم، پسے ہوئے اور مسترد شدہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُس کی نظر میں پاکستان کی ساری حکومتیں اور ساری قومیں غاصب، ظالم اور مہاجر دشمن ہیں۔ اِس آپ بیتی کے ایک ایک سطر سے مصنف کا بُغض، عناد، حسد، تنگ نظری، متعصبانہ سوچ اور غرور آشکارا ہے۔ اگر مصنف اپنی سوچ بلند رکھتے اور صرف مہاجروں کا نہیں جملہ پاکستانیوں کے حقوق کے لیے آواز بلند کرتے تو وہ سیاست میں زیادہ کامیاب ہو سکتے تھے۔ یہ عام سا نکتہ ہمارے قوم پرست رہنماؤں کے ذہنوں میں نہیں آیا کہ اِس ملک کے ساری قومیتوں کے لوگ ایک طرح کے مظلوم اور ظلم و جبر کے نظام کا شکار ہیں۔ بہر حال الطاف حسین اپنی منفی سوچ، قوم پرستانہ عقائد، پُر تشدد رویے، انتقامی اور علاقائی سیاست کی وجہ سے اِتنے دُور چلے گئے کہ عبرت کی مثال بن گئے۔

۳۔ جبر اور جمہوریت (بیگم کلثوم نواز شریف)

کلثوم نواز نے یکم جولائی ۱۹۵۰ء کو اندرون لاہور کے کشمیری گھرانے میں حفیظ بٹ کے ہاں آنکھ کھولی۔ آپ رستم زمان گاما پہلوان کی نواسی تھیں۔ آپ نے میٹرک لیڈی گریفین سکول سے کیا جبکہ ایف ایس سی اور بی ایس سی اسلامیہ کالج لاہور سے کیا۔ اُنہوں نے اُردو شاعری میں جامعہ پنجاب سے ایم اے بھی کیا تھا۔

محترمہ کلثوم نواز شریف مشہور سیاسی رہنما اور پاکستان کے سابق وزیر اعظم کی زوجہ تھیں۔ ایک مشہور و معروف سیاسی خاندان سے تعلق رکھنے کے باوجود وہ ایک عرصے تک سیاست میں نہیں آئیں۔ سیاسی خاندانوں کی عورتیں بھی کسی نہ کسی طرح سے سیاست میں مصروفِ عمل ہوتی ہیں لیکن حیران کن طور پر وہ دو مرتبہ ملک کی خاتونِ اوّل کا اعزاز حاصل کرنے کے باوجود عملی سیاست سے دُور رہیں۔ اُس نے اپنی آپ بیتی میں اِس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء سے پہلے وہ خالصتاً ایک گھریلو عورت تھیں۔ وہ ہر وقت اُمور خانہ داری میں مصروف ہوتیں اور آپ نے میاں نواز شریف کے ساتھ کبھی سیاسی معاملات پر گفتگو تک نہیں کی۔

جب ۱۷ نومبر ۱۹۹۹ء کو اُن کے شوہر اور اُس وقت کے وزیر اعظم پاکستان میاں محمد نواز شریف کو جنرل پرویز مشرف نے گرفتار کر کے لانڈھی جیل بھیج دیا تو محترمہ کلثوم نواز اچانک سیاست کے اُفق پر نمودار ہوئیں۔ اُنہوں نے اپنے شوہر کو قید سے نجات دِلانے کے لیے ایک بھرپور کردار ادا کیا۔ وہ تن تنہا اپنے وقت کے آمروں سے اُلجھ پڑیں۔ جب بڑے بڑے سیاستدان اور نامی گرامی لوگ مارشل لاء کے خلاف آواز بلند کرنے سے گھبرا رہے تھے یہ عورت فوجی حکمرانوں کے عزائم کے آگے دیوار بن گئیں۔ اُس نے ملک کے کونے کونے میں مارشل لاء کے خلاف احتجاج جاری رکھا اور لوگوں کو منظم کرنے لگیں۔ حکومت اُن کے لانگ مارچ اور دھرنوں کے خلاف جتنی سختی دکھاتی یہ زیادہ بھرپور احتجاج شروع کرتی۔ وہ کئی سال تک مسلسل پرویز مشرف کی حکومت کو للکارتی رہیں اور اُن کے خلاف رائے عامہ کو ہموار کرتی رہیں۔ یہ ہمارے ملک کی سیاسی تاریخ میں ایک عجیب و غریب دَور تھا۔ ملک میں شہری، بنیادی، آئینی اور انسانی ہر قسم کے قانونی اور اخلاقی حقوق معطل تھے، اسمبلیاں، سینٹ اور آئین سب کچھ ختم کر دیا گیا تھا۔ سول سوسائٹی اور سیاسی دنیا میں ایک طرح کا سکوت طاری تھا۔ ہر شخص خوفزدہ اور پریشان تھا۔ سپریم کورٹ کے ۱۲ ججوں پر مشتمل فل بنچ نے ۱۲ مئی ۲۰۰۰ء کو ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کے فوجی اقدام کو نظریہ ضرورت کے تحت حق بجانب، درست اور جائز قرار دے دیا جس سے پی سی او کو اقتدارِ اعلیٰ کا درجہ مل گیا۔ یہ سارا دَور خوف کا دَور تھا، لوگ دِل کی بات زبان تک نہیں لا سکتے تھے جبکہ دوسری طرف اقتدار کے بھوکے اور سازشی لوگ سیاسی جماعتوں سے نکل نکل کر فوجی آمر کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لیے کھڑے تھے۔ ایسے میں واحد

اختلاف اور سب سے بڑی مخالف آواز محترمہ کلثوم نواز شریف کی تھی جو کئی محاذوں پر بڑی بہادری سے لڑ رہی تھیں۔ اُس نے عزم اور حوصلے کے ساتھ آمریت کو للکارا، سازشی کرداروں کو بے نقاب کیا، ملک کے طول و عرض میں طوفانی دَورے کیے، اپنی خطابت کے جوہر دکھائے اور ملک کے کونے کونے سے نظریاتی اور اُصولی سیاست دانوں اور مسلم لیگی رہنماؤں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا۔ اُس پُرآشوب دَور میں اُن کی جدوجہد آمریت پر پہلا پتھر ثابت ہوا۔ اس کے بعد قافلہ چلتا رہا اور کارواں بنتا رہا۔ ہماری ملکی سیاست میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ ایک گھریلو خاتون اچانک کسی بڑے حادثے کے بعد میدان سیاست میں آئی ہو اور پھر اپنا مقصد حاصل کرنے کے بعد دوبارہ سیاست سے کنارہ کش ہو گئی ہو۔ محترمہ کلثوم نواز اِس کی واحد مثال ہیں۔ آپ کے اِس کردار پر مشہور صحافی اور کالم نگار حامد میر نے تجزیہ کرتے ہوئے لکھا:

> ''محترمہ کلثوم نواز کے اِس مجاہدانہ کردار نے نہ صرف شریف فیملی کا سر فخر سے بلند کیا بلکہ میدانِ سیاست میں حق گوئی اور شرافت کی لاج رکھ لی۔ جب بڑے بڑے چغادری سیاستدان ذاتی مصلحت کے تحت اپنی وفاداریاں تبدیل کر رہے تھے اور شریف فیملی کے ممنون احسان ہزاروں لوگ وقت کے تیور دیکھ کر اپنے منہ چھپاتے پھرتے تھے تو ایسے دگرگوں حالات میں یہ عظیم خاتون میدان سیاست میں اس انداز سے نمودار ہوئیں کہ دنیا انگشت بدندان رِہ گئی۔ ایسا کم ہوا ہے کہ چاردیواری کو خیر باد کہنے والی خاتون دوبارہ چاردیواری کی زیب و زینت بنی ہو لیکن بیگم کلثوم نواز شریف وہ واحد خاتون ہیں جو اپنے خاندانی وقار کے لیے دوبارہ اپنی چاردیواری میں واپس چلی گئیں۔''(۷۲)

''جبر اور جمہوریت'' محترمہ کلثوم نواز شریف کی خودنوشت ہے جو اُن کے سیاسی کردار کو نمایاں کرتی ہے۔ اِس آپ بیتی میں ۱۲؍اکتوبر ۱۹۹۹ء (پرویز مشرف کا اقتدار پر قبضے اور نواز شریف کی گرفتاری) سے لے کر ۲۰۰۱ء یعنی میاں نواز شریف کی جلاوطنی تک کے واقعات کو نہایت اختصار کے ساتھ قلم بند کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے اِس آپ بیتی میں مصنفہ کی ذاتی زندگی، بچپن، ابتدائی حالات، تعلیم، شادی، بچے، خانگی زندگی اور ذہنی و فکری ارتقا کے بارے میں تفصیلات دینے کی کوئی گنجائش نہیں نکل سکتی تھی۔ اُس نے ایک مخصوص دور، حالات اور سیاسی تبدیلیوں کو موضوع بحث بنایا ہے لیکن پھر بھی اُس نے کہیں کہیں سرسری اور لاشعوری طور پر اپنے بارے میں بھی لکھا ہے۔

محترمہ کلثوم نواز کی آپ بیتی ''جبر اور جمہوریت'' پڑھنے کے بعد معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ خالصتاً ایک مشرقی خاتون

ہیں۔ مشرقی اقدار شریف خاندان کی ایک بڑی خصوصیت تسلیم کی گئی ہے۔ مہمان نوازی، دوست نوازی، اسلامی شعائر کی پابندی، سادگی، خلوص اور مشرقی روایات کی پاسداری اِس خاندان کی ہمیشہ سے روایت رہی ہے جن کا اُن کے مخالفین بھی کھلے عام اعتراف کرتے ہیں۔ اِس آپ بیتی کا ایک ایک لفظ گواہ ہے کہ کلثوم نواز کو دیگر گھریلو پاکستانی عورتوں کی طرح اپنے خاوند سے انتہائی محبت ہے جس کا اُس نے بار بار ذکر کیا ہے۔ اپنے خاوند کے لیے وہ ہر وقت کتنی پریشان رہتی تھیں اور ایک سچی وفا شعار بیوی کی مانند اُس کے وجدان نے پہلے سے اُنہیں کیسے آنے والے خطرات سے آگاہ کیا تھا وہ میاں نواز شریف سے اپنی آخری الوداعی ملاقات کچھ اِس طرح کے پُرسوز الفاظ میں بیان کرتی ہیں:

> ''۱۱؍اکتوبر کی صبح ۸ بجے میاں نواز شریف اسلام آباد جانے کے لیے گھر سے نکلے تو جانے کیوں میں اُنہیں خالی خالی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ یوں گھر سے جانا تو اُن کا معمول تھا۔ میں بظاہر اُن کو رخصت کرنے کے لیے دروازے پر کھڑی تھی لیکن میرے دل و دماغ پر وسوسوں کا قبضہ تھا اور آج یہ پہلی مرتبہ ہوا تھا۔ اس اچانک خیال نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ ہاں یہ کیسا عجیب خیال تھا کہ جب انسان اپنے گھر سے نکلتا ہے تو اُسے پتہ نہیں ہوتا کہ وہ دوبارہ کب اور کتنی مدت کے بعد ملے۔ اِس خیال نے میری روح کو لرزہ کے رکھ دیا۔ اِس اثنا میں میاں نواز شریف خدا حافظ کہہ کر روانہ ہو چکے تھے۔ مجھے یہ خیال کیوں آیا؟ اُس وقت تو میں اس کو کوئی توجیہ نہ کر سکی تھی اور اب سوچتی ہوں شاید میرے رب نے آنے والے جانگسل لمحات سے مجھے خبردار کر دیا تھا اور اگلے ہی روز یہ تمام وسوسے اور خدشات ایک بھیانک حقیقت بن کر سامنے آ گئے۔''(۴۷)

اِس آپ بیتی میں بیگم کلثوم نواز نے اپنے بارے میں اور اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں بہت کم بتایا ہے۔ وہ طبیعتاً ایک کم گو اور خاموش طبع خاتون ہیں۔ اِس آپ بیتی میں چونکہ اُس نے اپنے خاوند کی مظلومی اور پرویز مشرف حکومت کے ظلم و جبر کے بارے میں لوگوں کو آگاہ کرنا تھا اس لیے بھی اُس نے اپنے بارے میں بہت کم لکھا ہے۔ ۱۲؍اکتوبر ۱۹۹۹ء اور اُس کے بعد کی صورتحال ایسی بن گئی کہ حکومت کے خلاف مہم چلانے کی ساری ذمہ داری آپ کے کندھوں پر آئی۔ مسلم لیگ ''ن'' کی ساری قیادت جیلوں میں تھی، پارٹی کے لوگ حکومتی صفوں میں ایک ایک کرکے شامل ہو رہے تھے۔ اس دوران بیگم صاحبہ اپنی تقریروں، جلسے جلسوں، پریس کانفرنسوں اور دیگر تحریروں کے ذریعے میاں نواز شریف کی

مظلومیت اور پرویز مشرف کی جبر کے بارے میں رائے عامہ کو ہموار کرتی رہیں۔ کلثوم نواز تحریر کرتی ہیں کہ اُن کے دو بیٹے ہیں حسن نواز اور حسین نواز اور دو بیٹیاں ہیں جن کے نام مریم نواز اور اسماء نواز ہیں۔ اسماء نواز بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹی ہیں۔ اُس وقت جب یہ آپ بیتی لکھی جا رہی تھی، آپ کے بیٹے حسین نواز اور بڑی بیٹی مریم نواز کی شادیاں ہو چکی تھیں بلکہ حسین نواز تو ایک تین سال کے بیٹے کے باپ بھی تھے۔ اپنے اِس پوتے ''زکریا'' کا ذکر بیگم صاحبہ نے بڑے دردناک الفاظ میں کیا ہے اور بتایا ہے کہ اپنے باپ حسین نواز اور دادا نواز شریف کے ساتھ جیل میں ملاقات کے وقت کس طرح چھوٹا ''زکریا'' چیخ چیخ کر بُرا حال کر دیتا جس سے سارا ماحول اُداس ہو جاتا۔

محترمہ کلثوم نواز نے اپنی بہن بھائیوں کا ذکر نہیں کیا۔ صرف اپنی بڑی بہن کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ اور اُس کا خاوند پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر ہیں۔ ۱۲؍اکتوبر ۱۹۹۹ء کے فوجی انقلاب کے وقت اُن کی ماں ماڈل ٹاؤن میں اُن کے ساتھ تھیں اور وہ اپنی بیمار ماں کی تیمار داری میں مصروف تھی۔ جب فوجی جوانوں نے اُن کے گھر کو ہر طرف سے اپنے محاصرے میں لے لیا۔ اُس پُر آشوب لمحات کا ذکر بیگم کلثوم نواز اِن الفاظ میں کرتی ہیں:

> ''ہم اپنے ہی گھر میں قید ہو کر رہ گئے تھے۔ اپنا گھر جہاں سکون اور عافیت کا احساس ملتا ہے، ہمارے لیے زندان میں تبدیل ہو چکا تھا۔ ایک ایسی قید جس کی کوئی مدت مقرر نہیں تھی۔ مجھے اپنے سے زیادہ اپنی والدہ کی فکر لاحق تھی جو سخت علیل تھیں۔ میرے والد کی وفات کو ایک ماہ کا عرصہ بھی نہیں ہوا تھا۔ اُن کی وفات اور بیماری نے میری والدہ کو پہلے ہی نڈھال کر رکھا تھا، اُوپر سے اِس قیامت صغریٰ سے دوچار ہونا پڑ گیا اور اِس صدمے سے اُن کی طبیعت اور زیادہ بگڑ گئی۔ میری علیل والدہ اور چھوٹی بیٹی اسماء کے علاوہ میری بڑی بہن بھی میرے ساتھ محبوس ہو کر رہ گئیں تھیں۔''(۷۴)

پاکستانی اخبارات میں کئی بار یہ خبر ایک بڑی خبر کے طور پر پیش کی گئی کہ بیگم کلثوم نواز کی اپنی جٹھانیوں اور نواز شریف کے دیگر قریبی رشتہ داروں کے ساتھ سخت اختلافات ہیں۔ جن دِنوں شریف خاندان کے زیادہ تر مرد قید میں اور عورتیں گھروں میں نظر بند تھیں۔ یہ خبر میڈیا کے ذریعے پھیلائی گئی کہ محترمہ کلثوم نواز شریف کی شہباز شریف کی بیوی نصرت شہباز شریف کے ساتھ لڑائی جھگڑے چل رہے ہیں۔ آپ نے اِس قسم کی خبروں کی سختی سے تردید کر کے لکھا ہے کہ اُن کے درمیان آج تک ایسی کوئی بات نہیں ہوئی بلکہ اُن کا وقت بہنوں کی طرح گزرتا ہے۔ ہمارے ملک کا بڑا عجیب

رواج ہے کہ خبریں چھاپنے والے بغیر کسی تصدیق کے سنسنی پیدا کرنے کے واسطے خبر نشر کرتے ہیں۔ اگر کسی کی عزت اور وقار خاک میں ملے تو اُنہیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ دوسرا یہ کہ جب کسی پر بُرے دِن آتے ہیں تو میڈیا بھی اُنہیں نہ صرف نظر انداز کر دیتا ہے بلکہ نئے حکمرانوں کی خوشنودی میں وہ اُن کے مخالفین کے بارے میں غلط خبریں پھیلانے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ ٹی وی چینلوں کی یلغار اور سوشل میڈیا کی غیر ضروری آزادی کے بعد تو یہ رجحان خطرناک حد تک بڑھ چکا ہے۔ اِس صورتحال کا کیا نتیجہ نکلے گا؟ وقت ہی اِس کا جواب دے گا۔ جہاں تک بیگم کلثوم نواز کی سیاست کا تعلق ہے تو آپ نے بڑی سچائی سے اقرار کیا ہے کہ ۱۲؍ اکتوبر ۱۹۹۹ء سے پہلے وہ ایک گھریلو عورت تھی۔ اُس نے کبھی سیاست میں دلچسپی نہیں لی، اُن کی زندگی اُمورِ خانہ داری میں صرف ہو رہی تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اُس نے کبھی نواز شریف کے ساتھ سیاسی معاملات پر گفتگو تک نہیں کی۔ چنانچہ تحریر کرتی ہیں:

> ''خیالات کا ایک ہجوم ہے جو ماضی کے دریچوں سے نکل کر صفحہ قرطاس پر منتقل ہونے کے لئے بے قرار ہے۔ جب میں اِس امر کے متعلق سوچتی ہوں کہ ایک گھریلو عورت جس کی زندگی بچوں کی پرورش اور اُمور خانہ داری میں صَرف ہو رہی تھی، دفعتاً کیسے سیاست کی پُر خار وادی میں داخل ہوئی اور کم و بیش ایک سال تک رائے عامہ کو اصل صورتحال سے آگاہ کرنے اور متحرک کرنے کے لیے قریہ قریہ صدائے حق بلند کرتی پھری تو حیران رِہ جاتی ہوں کیونکہ نواز شریف صاحب کے سیاست میں ہونے کے باوجود نہ تو میں نے کبھی عملی سیاست میں حصہ لیا بلکہ حصہ لینا تو درکنار میں میاں صاحب سے سیاسی معاملات پر گفتگو بھی نہیں کرتی تھی۔''(۷۵)

''جبر اور جمہوریت'' محترمہ بیگم کلثوم نواز شریف کی سیاسی خودنوشت ہے جس میں ایک خاص وقت یعنی ۱۲؍ اکتوبر ۱۹۹۹ء سے لے کر ۲۰۰۱ء تک کے سیاسی حالات، سیاسی تبدیلیوں اور سیاسی واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ آپ نے اُن سیاسی اُمور پر بات کی ہے جو آپ کے مشاہدے میں آئے تھے یا جن کے ساتھ آپ کا براہِ راست تعلق رہا تھا۔ اِس آپ بیتی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ آپ نے سُنی سنائی باتوں یا میڈیا کے ذریعے پھیلائی گئی خبروں پر انحصار نہیں کیا بلکہ اپنے اور پرویز مشرف کے درمیان جو سیاسی معرکے ہوئے اُن کی چشم کشا واقعات درج کیے ہیں۔ ''جبر اور جمہوریت'' میں آپ نے جن اہم سیاسی اور دیگر واقعات کو تحریر کیا ہے، ان میں چند ایک یہ ہیں۔

۱۔ چیف آف آرمی سٹاف پرویز مشرف سری لنکا کے سرکاری دورے پر تھے جب اُس وقت کے وزیر اعظم نواز شریف نے اُن کو برطرف کر کے اُن کی جگہ ایک نیا چیف آف آرمی سٹاف بنایا۔ یہ نواز شریف کا آئینی حق تھا جو اُس نے استعمال کیا تھا تاہم فوج کے اعلیٰ کمانڈ کو نواز شریف کا یہ فیصلہ پسند نہ آیا اور پرویز مشرف کے پاکستان اُترنے سے پہلے ہی ایک منتخب وزیر اعظم کو وزیر اعظم ہاؤس میں نظر بند کر دیا۔ پرویز مشرف نے نواز شریف پر طیارہ اغوا کرنے اور اُن کی جان کو خطرے میں ڈالنے کے جرم میں قتل، اقدام قتل اور طیارہ اغوا جیسے سنگین الزامات لگائے۔ پرویز مشرف کا ہمیشہ سے یہ بیانیہ رہا ہے کہ اُن کی جان کو جان بوجھ کر خطرے میں ڈال دیا گیا تھا۔(۷۶) لیکن کلثوم نواز نے اپنی آپ بیتی میں مختلف دلائل دے کر پرویز مشرف کے اِس الزام کی سختی سے تردید کی ہے۔ آپ نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ نواز شریف کا تختہ اُلٹنا پرویز مشرف اور چند جرنیلوں کا ایک سوچا سمجھا منصوبہ تھا۔ یہ کوئی حادثہ نہیں تھا بلکہ خوب غور وخوص کے بعد اِس دن کا انتخاب کیا گیا تھا۔ جن فوجی دستوں کے ذریعے وزیر اعظم ہاؤس، پارلیمنٹ، وزیر اعلیٰ پنجاب ہاؤس، ایوان صدر اور ماڈل ٹاؤن میں واقع نواز شریف کے گھر کا محاصرہ کیا گیا تھا اُن دستوں کو صبح سے کسی بڑے آپریشن کے لیے تیار کیا گیا تھا اور اُن کے پاس اِن تمام جگہوں کے نقشے اور اندرونی معلومات تھیں۔ ظاہر ہے یہ سب کچھ وقتی یا حادثاتی نہیں ہو سکتا بلکہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کا حصہ ہی ہو سکتا ہے۔

۲۔ نواز شریف کا جیل جانے کے بعد جن حالات میں آپ نے اپوزیشن کو اکٹھا کرنے اور مشرف حکومت کے خلاف احتجاج کرنے کا کٹھن فیصلہ کیا، اِس پر اختصار سے روشنی ڈالتے ہوئے کہا ہے:

> ''پھر وہ لمحہ آگیا جب مجھے کچھ فیصلے کرنے پڑے۔ اپنی ساس، سسر، بیٹیوں اور چھوٹے بچوں کی حالت زار دیکھ کر مجھے فیصلہ کرنا پڑا کہ اب رونے دھونے کی بجائے عمل کا وقت آگیا ہے۔ یہ میری ذات کا معاملہ بھی تھا کہ میرے شوہر، بیٹے، دیور اور اُن کے ساتھیوں کی زندگیاں داؤ پر لگی تھیں اور میرے وطن عزیز کا مسئلہ بھی تھا کہ جیسے چند طالع آزما جرنیلوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ یہ عمل کی جانب پہلا قدم تھا۔''(۷۷)

۳۔ ہمارے سیاست دان کیسے راتوں رات اپنی وفاداریاں تبدیل کرتے ہیں۔ اِس آپ بیتی میں بڑی تفصیل سے اِس کا ذکر ہے۔ قیام پاکستان کے بعد سے آج تک ملک کی بڑی سیاسی پارٹی مسلم لیگ پر یہ الزام لگایا جاتا رہا ہے کہ یہ مفاد پرستوں کا ٹولہ ہے۔ نظریات کی بجائے ہمیشہ اِن لوگوں نے ذاتی مفادات کی سیاست کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جنرل ایوب سے لے کر جنرل مشرف تک جتنے آمر آئے، سب کو اِس پارٹی سے وزیر اور مشیر ملتے رہے۔ صرف مسلم لیگ پر کیا موقوف ہر سیاسی

پارٹی کی تقریباً یہی تاریخ رہی ہے۔اقتدار کے وقت سب لوگ آپ کے اس پاس ہوتے ہیں لیکن مشکل وقت میں آپ کا سایہ بھی آپ کو چھوڑ دیتا ہے۔ ہر سیاسی پارٹی کے غریب ورکرز ہر مشکل گھڑی میں اپنی پارٹی کے ساتھ ہوتے ہیں، گرمی اور سردی برداشت کرتے ہیں، لاٹھی اور گولی کا نشانہ بنتے ہیں لیکن سیاسی رہنما اپنی پارٹیوں کے اِتنے مخلص نہیں ہوتے۔ محترمہ کلثوم نواز نے ''جبر اور جمہوریت'' میں تفصیل سے اُن لوگوں کے بارے میں لکھا ہے جو اُن کی پارٹی چھوڑ کر پرویز مشرف کے گروہ میں شامل ہو گئے تھے۔آپ نے انکشاف کیا ہے کہ اعجاز الحق وہ پہلا شخص تھا جس نے نہ صرف خود وفاداری بدلی بلکہ پارٹی کے دیگر لوگوں کو بھی شریف خاندان سے بد ظن کر کے مخالف جماعت میں لے جاتا رہا۔ چودھری شجاعت حسین کے بارے میں بھی بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے کہ وہ آغاز ہی سے پارٹی کے میٹنگوں اور احتجاجوں میں شرکت نہیں کرتے تھے اور پرویز مشرف کے ساتھ اُن کے درپردہ تعلقات تھے۔ جس دِن نواز شریف کو عدالت کی طرف سے عمر قید کی سزا ہوئی، چودھری شجاعت نے ایک پریس کانفرنس بلائی اور پرویز مشرف کی بنائی ہوئی پارٹی مسلم لیگ ''ق'' میں باقاعدہ شمولیت کا اعلان کیا۔ چودھری شجاعت حسین نے اپنی آپ بیتی ''سچ تو یہ ہے'' میں یہ شکوہ کیا ہے کہ اُس نے اُس وقت تک مسلم لیگ ''ن'' کا ساتھ دیا اور پرویز مشرف کے ٹیم میں شامل نہ ہوئے جب تک نواز شریف مشرف کے ساتھ ایک ڈھیل کے نتیجے میں سعودی عرب کے شہر جدہ نہ گئے۔(۷۸) لیکن بیگم صاحبہ نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ چودھری شجاعت، میاں اظہر اور اعجاز الحق کا پہلے تو مسلم لیگ ''ن'' کی پارٹی قیادت پر قبضہ کرنے کا منصوبہ تھا لیکن جب وہ خود مسلم لیگ کی قیادت کے لیے آگے آئیں تو اُنہوں نے پرویز مشرف کے ساتھ ہاتھ ملایا۔اُن کا بہت پہلے سے پارٹی کے اندر الگ دھڑا بنانے کا پروگرام تھا لیکن اُنہیں موقع نہیں مل رہا تھا۔ مصیبت اور مصائب میں اُن کا پارٹی سے بغاوت کرنا اُن کا بہت بڑا جرم تھا جس نے شریف خاندان اور اُن کی پارٹی کو بہت بڑا نقصان پہنچایا اور جس کو کسی صورت معاف نہیں کیا جاسکتا۔(۷۹)

۴۔ محترمہ کلثوم نواز نے اُن لیگی رہنماؤں اور سیاسی ورکروں یعنی راجہ ظفر الحق، تہمینہ دولتانہ، سعد رفیق، خاقان عباسی، ممنون حسین، افتخار جھگڑا اور جاوید ہاشمی وغیرہ کا بڑے احترام سے نام لیا ہے اور بتایا ہے کہ قید و بند کی صعوبتوں کے باوجود وہ پارٹی سے مخلص رہے۔ اُنہیں ہر طرح کے لالچ دیئے گئے لیکن وہ ثابت قدم رہے۔ ایک جگہ پر جب خواجہ سعد رفیق کی ماں اپنے اسیر بیٹے کی جدائی میں تڑپ تڑپ کر جان دیتی ہے تو مصنفہ پرویز مشرف کو مخاطب کر کے باقاعدہ بین اور بددُعا کرتی نظر آتی ہیں۔ یہاں وہ ایک مکمل مشرقی عورت کے روپ میں نظر آتی ہیں:

> ''خواجہ سعد رفیق کی عظیم ماں پہلے اِس ملک پر اپنا سہاگ قربان کرتی ہے، پھر اِس شہید جمہوریت کے یتیموں کو پاکستان سے محبت اور اس پر قربان ہونے کا سبق دیتے ہوئے اُنہیں جوان کرتی ہے۔ جب وہ محب وطن، دُکھی عورت اپنے ملک کے

اندر اپنے ہی بھائیوں کے ہاتھوں چادر اور چار دیواری کا تقدس پامال ہوتے دیکھتی ہے ، اپنے بیٹے کو پاکستان سے محبت کی پاداش میں پابند سلاسل پاتی ہے تو کوٹ لکھپت جیل سے اپنے قیدی بیٹے کی راہ تکتے ہوئے وہ ہمیشہ کے لیے اپنی راہ الگ کر لیتی ہے۔ماں اپنے بیٹے کو دیکھنے کی آخری حسرت دِل میں لئے اِس عالم فانی سے کوچ کر گئی۔اِس دکھی ماں کی بدُعا ضرور عرش معلیٰ تک پہنچی ہو گی۔ پتہ نہیں اللہ کی بے آواز لاٹھی کب ممتا کی لاج رکھتی ہے۔"(۸۰)

۵۔ بیگم کلثوم نواز نے اپنی آپ بیتی میں کئی اہم سیاسی انکشافات کیے ہیں مثلاً جمہوریت اور آمریت کے زمانے میں تمام چھوٹے بڑے فیصلے بیرونی طاقتوں کے اشاروں پر ہوتے ہیں اور یہ کہ پرویز مشرف کے زمانے میں بڑی طاقتوں نے اپنے این جی اوز کے ذریعے ملک میں اپنا عمل دخل اِس قدر بڑھا دیا تھا کہ کابینہ کے ارکان مختلف این جی اوز کی سفارش پر بنتے تھے۔ آپ نے باقاعدہ اُن وزراء اور این جی اوز کے نام لیے ہیں جن کے کہنے پر مختلف لوگوں کو وزارتوں کے قلمدان دیئے گئے تھے۔(۸۱)

۷۔ آپ نے پرویز مشرف کے لیے ریٹائرڈ جنرل لکھا ہے کیونکہ نواز شریف نے اُنہیں معزول کیا تھا۔ علاوہ ازیں اپنی آپ بیتی میں فوج اور جرنیلوں کے بارے میں انتہائی سخت زبان استعمال کی ہے۔ ہمارے یہاں عدلیہ یعنی حاضر سروس ججوں اور فوجی افسروں کے خلاف عام لوگوں میں یا میڈیا میں بولنا یا لکھنا قانونی طور پر ممنوع ہے۔ یہ دونوں ادارے اپنے خلاف تنقید برداشت نہیں کرتے (گو سیاست میں اِن دونوں اداروں کا کلیدی کردار رہا ہے) تاہم بیگم کلثوم نواز شریف نے بڑی بہادری کے ساتھ فوج کی بدعنوانی اور جمہوریت دشمنی پر بات کی ہے۔ بعض فوجی جرنیلوں کے لیے پاکستان توڑنے والے، اپنے مفادات کے غلام، عیاش اور نفرتوں کو پروان چڑھانے والے جیسے سخت الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ایک جگہ تو فوجی افسروں پر بڑی خوفناک تنقید کی ہے۔ وہ باتیں جو لوگ اپنے نجی محفلوں میں چُھپ کر کرتے ہیں آپ نے اپنی آپ بیتی میں وہ کھل کر یوں بیان کی ہیں:

"وہ لوگ (فوجی جرنیل) جن کی دس پندرہ سال پہلے بے سروسامانی کا یہ عالم تھا کہ کینٹین کنٹریکٹر کے مقروض ہوا کرتے تھے ،آج کروڑپتی کیسے بن گئے؟ قوم پوچھ رہی ہے جو بچے کل تک اپنے بیٹ مین کے ساتھ سائیکل پر بیٹھ کر کینٹ پبلک سکول جایا کرتے تھے، آج وہ پاکستان کے مہنگے ترین علاقوں میں محلات نما

کوٹھیوں، لمبی لمبی گاڑیوں اور چار چار مربعوں میں پھیلی ہوئی انڈسٹریل سٹیٹ
کے مالک کیسے بن گئے؟۔"(۸۲)

یہ تو محترمہ کلثوم نواز کا سیاسی بیانیہ تھا۔ پرویز مشرف کے بغض میں اُس نے پورے ادارے پر تنقید کر ڈالی۔ لیکن تصویر کا ایک دوسرا رُخ بھی ہے وہ یہ کہ جس پرویز مشرف نے اُن کے خاندان اور پارٹی کے سرکردہ رہنماؤں کو جیل میں ڈالا۔ جس کے لیے آپ نے اپنی آپ بیتی میں "ملک دشمن" ، "غدار" اور "ہندوستان کے یار" جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں اُس پرویز مشرف کے ساتھ آپ اور آپ کے خاوند نے "این آر او" کیا، اُن سے خفیہ معاہدے کیے، ملک اور ساتھیوں کو پرویز مشرف کے رحم و کرم پر چھوڑا اور خود ملک سے باہر چلے گئے۔ تقریباً تمام سیاسی تجزیہ نگاروں کا اتفاق ہے کہ یہ معاہدے اُس وقت کی پرویز مشرف حکومت نے بیگم کلثوم نواز کے ذریعے کیے تھے۔ اِس بارے میں محترمہ نے اپنی آپ بیتی میں ایک حرف نہیں لکھا۔ جس پرویز مشرف پر آپ نے اپنی آپ بیتی میں بڑے بڑے اور سنگین الزامات لگائے اور دعویٰ کیا کہ دوبارہ اقتدار میں آکر اُنہیں عدالت کے کٹہرے میں لائیں گے۔ جب ۲۰۱۳ء کے عام انتخابات میں اُنہیں موقع ملا تو پرویز مشرف کو سزا دِلانا تو در کنار اُنہیں بہ سلامت روی ملک سے باہر جانے دیا۔ یہ ہمارے ملک کی سیاست کی نیرنگیاں ہیں۔

محترمہ کلثوم نواز شریف نے اپنی اِس آپ بیتی میں سیاست سے ہٹ کر دیگر موضوعات پر بہت کم بات کی ہے۔ "جبر اور جمہوریت" آپ کی جن ایام کی سرگزشت ہے وہ آپ اور آپ کے خاندان کے لئے بڑا ہولناک زمانہ تھا۔ آپ بیک وقت کئی محاذوں پر برسرِپیکار تھیں۔ آپ کی جدوجہد کا سب سے بڑا مقصد اپنے خاوند اور خاندان کے دیگر افراد کو جیلوں سے باہر نکالنا، اپنی منتشر پارٹی کو یکجا کرنا اور حکومت وقت کے ظلم و جبر کو عوام کے سامنے بے نقاب کرنا تھا۔ اِس آپ بیتی میں بھی آپ نے اپنی جدوجہد کی کہانی بیان کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محترمہ نے یہاں سیاسی موضوعات کے علاوہ دیگر غیر سیاسی، تاریخی، معاشی، معاشرتی، علاقائی اور نجی معاملات کے بارے میں اپنے خیالات بہت کم پیش کیے ہیں۔ سیاسیات سے ہٹ کر محترمہ کلثوم نواز شریف نے جن موضوعات کو زیرِ بحث لایا ہے، اُن میں چند ایک درج کرتے ہیں:

(الف) "رائے ونڈ محل" کے بارے میں ہمارے یہاں بہت سارے قصے کہانیاں مشہور ہیں۔ میڈیا میں اِس کے بارے میں قسم قسم کی کہانیاں گردش کرتی ہیں۔ شریف خاندان کے سیاسی مخالفین نے ایسی باتیں لکھی ہیں کہ یہ گھر پرانے زمانے کے بادشاہوں کا ایک عظیم الشان قصر مشہور ہو گیا ہے۔ آج بھی نواز شریف کے مخالف اِس کو تخت لاہور، قصرِ لاہور اور رائے ونڈ محل کے ناموں سے یاد کر کے سنسنی پھیلاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک زرعی فارم ہے جو نواز شریف کے والد میاں محمد شریف نے خریدا تھا اور اِس میں رہنے کے لیے رہائشی گھر بنائے گئے ہیں تاہم نواز شریف کے سیاسی مخالفین

اِس فارم کو افسانوی انداز سے پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ اپنے تمام مخالفین کے الزامات مسترد کرتے ہوئے محترمہ کلثوم نواز اِس فارم کے بارے میں حقیقت بیان کرتے ہوئے کہتی ہیں:

''رائے ونڈ فارم کے بارے میں عجیب و غریب کہانیاں مشہور کی گئی ہیں لیکن یہاں آنے والے ہزاروں افراد جانتے ہیں کہ یہ زرعی فارم ہے جس کے ایک حصے میں چار دیواری کے اندر چند الگ الگ مکانات بنے ہوئے ہیں۔ یہ ہر گز کوئی محل نہیں ہے۔ یہاں فارم میں جو گھر مجھے رہائش کے لئے ملا ہے، اُس کے مقابلے میں تعمیراتی تزئین و آرائش کے حوالے سے میرا ماڈل ٹاؤن والا گھر کہیں زیادہ خوبصورت ہے۔''(۸۳)

(ب) بڑے اور سیاسی گھرانوں میں اختلافات ہمارے معاشرے اور سماج کا حصہ ہیں۔ دولت، شہرت اور سیاسی لحاظ سے جو خاندان مشہور ہو جاتے ہیں، اُن خاندانوں کے اندر ٹوٹ پھوٹ اور نااتفاقی بھی شروع ہو جاتی ہے جو کبھی کبھی بڑھتے ہوئے خوفناک صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یہاں اقتدار اور کرسی کی خاطر بھائی بھائی کا دشمن بن جاتا ہے اور بیٹا باپ کے خلاف بغاوت کر لیتا ہے۔ دولت، شہرت، اقتدار اور منصب کی خاطر خونی رشتوں کی دشمنی میں تبدیلی روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ''شریف خاندان'' کا تین عشروں سے اقتدار اور سیاست میں رسوخ کے باوجود آپس میں متفق اور متحد رہنا ہماری معاشرتی اور سماجی روایات کی خوبصورت مثال ہے۔ ملک میں بالخصوص پنجاب کی سیاست میں بھرپور کردار ادا کرنے والے اِس خاندان کے بارے میں آج تک نااتفاقی، رنجش، بغاوت اور لڑائی جھگڑے کی کوئی بڑی خبر سامنے نہ آسکی۔ اِس خاندان کے بدترین مخالف بھی اِس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ذاتی شرافت، مروت، وضع داری اور سادگی میں اِن لوگوں کا جواب نہیں۔ کلثوم نواز نے بھی اپنی آپ بیتی میں اِس نکتے پر بہت زیادہ زور دیا ہے کہ شریف برادران اور اُن کے بیٹے آپس میں کس محبت سے رہتے ہیں۔ نیز ان کے بیگمات کا آپس میں انتہائی خلوص اور محبت کا رشتہ ہے۔ اُس نے خاندان کے افراد کی آپس میں محبت اور قلبی تعلق کی ایسی باتیں تحریر کیں ہیں جو ہمارے ملک کے تمام بڑے اور ارب پتی خاندانوں کے لیے سبق آموز ہیں۔ اپنے بڑے بیٹے حسین نواز کا شہباز شریف کے ساتھ محبت اور اُنس کے بارے میں اپنی آپ بیتی میں ایک جگہ لکھتی ہیں:

''اِس کے دو ہفتوں بعد ہم اُسی (فوجی) میس میں جا کر حسین سے ملے۔ اس وقت سردی کا موسم تھا۔ میں نے دیکھا کہ حسین نے شہباز بھائی کا کوٹ پہن رکھا ہے۔

میں نے حسین سے پوچھا کہ یہ شہباز بھائی کا کوٹ ہے؟ حسین نے بتایا کہ یہ اُسے فوجیوں نے لا کر دیا ہے اور اِسے پہن کر مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے انکل میرے ساتھ ہیں۔ اِس کوٹ سے آنے والی اُن کے جسم کی خوشبو مجھے اُن کی قربت کا احساس دِلاتی رہتی ہے۔"(۸۴)

(ج) تیسری دنیا کے اکثر ممالک میں آمریت کا راج ہے اور جہاں جمہوری حکومتیں ہیں وہاں خفیہ طاقتیں حکمرانوں کو اپنی مرضی کے مطابق حکومت چلانے نہیں دیتیں۔ بد قسمتی سے پاکستان بھی اُن ممالک میں شامل ہے۔ یہاں زیادہ عرصہ فوجی حکومتیں رہی ہیں۔ جب بھی عوامی انتخاب سے حکومتیں بنتی ہیں تو خفیہ ایجنسیاں اور فوج اُنہیں مرضی سے حکومت کرنے کے بجائے اُن کے لئے مشکلات کھڑی کرتی ہیں۔ علاوہ ازیں فوج کا مضبوط ادارہ ہر حال میں اپنے ہی ریٹائرڈ اور حاضر سروس افسروں کا دفاع کرتا ہے۔ ماضی میں جن فوجی جرنیلوں نے آئین معطل کیا، ملک کو سیاسی اور معاشرتی طور پر کمزور کیا یا بد عنوانی کے الزامات کی زد میں آئے، اُنہیں کوئی خاص سزا نہیں ملی حتیٰ کہ ملک کو دو لخت کرنے اور دشمن کے آگے ہتھیار ڈالنے کے ذمہ دار جرنیلوں سے بھی باز پُرس نہیں کی گئی بلکہ اُن کا کورٹ مارشل تک نہیں ہو سکا۔ اِس مقام پر ہر باشعور شہری یہ سوال اُٹھاتا ہے کہ کیا قانون صرف عام آدمی کے لیے بنا ہے؟ یہاں بڑے لوگوں کو سزائیں دینے کا رواج کب شروع ہو گا؟ یہی سوالات محترمہ کلثوم نواز نے بھی اپنی آپ بیتی میں بھی اُٹھائے ہیں بلکہ اُس نے تو ایک قدم آگے بڑھ کر یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ پاکستان کے سابق صدر یحییٰ خان جس نے اِس ملک کو دو ٹکڑے کیا تھا اور ایک سابق جنرل نیازی، جس نے ڈھاکہ کے پلٹن میدان میں ایک دشمن جنرل کے سامنے ہتھیار ڈالے تھے، کو سبز ہلالی پرچم میں لپیٹ کر دفنایا گیا تھا۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ یہ اِس ملک اور افواج پاکستان کے ساتھ بہت بڑی زیادتی ہے۔ محترمہ کے الفاظ میں ملاحظہ ہوں:

"آج ۲۸ سال بعد قوم مطالبہ کرتی ہے کہ ان غدارانِ اسلام کی بوسیدہ ہڈیوں کو ان کی قبروں سے نکال کر باہر پھینک دو کیونکہ ان کی مدہوشی اور غفلت کے نتیجے میں ہمارے ماتھے پر ذلت آمیز شکست کا دھبہ لگا ہوا ہے۔ تاریخ کا سب سے بڑا مذاق یہ ہے کہ جس شخص نے میدان جنگ میں پیٹھ پھیر کر سلطنت خداداد پاکستان کو دو لخت کروایا، اُسے اپنے ملک کے عظیم پرچم میں لپیٹ کر دفن کیا گیا۔ سقوطِ ڈھاکہ کے ذمہ دار لوگوں کا وجود یا اُن کا تابوت اِس پاک دھرتی پر ناقابل برداشت بوجھ ہے۔"(۸۵)

(د) اس آپ بیتی میں بتایا گیا ہے کہ ۱۹۷۱ء میں پاک بھارت جنگ کے ہیرو اور نشانِ حیدر حاصل کرنے والے اِس قوم کے سپوت میجر محمد اکرم کی قبر بنگلہ دیش میں ہے۔ محترمہ کلثوم نواز نے اپنی آپ بیتی میں وعدہ کیا تھا کہ دوبارہ اقتدار ملنے کے بعد وہ شہید محمد اکرم کی جسد خاکی کو بنگلہ دیش سے پاکستان لائے گی لیکن افسوس دوبارہ اقتدار ملنے کے باوجود اور اٹھارہ سال گزرنے کے بعد بھی وہ اپنا وعدہ ایفانہ کر سکی۔

> ''میں شہدائے اسلام، شہدائے پاکستان کی روحوں کو سلام پیش کرتی ہوں اور آج اس فورم سے اعلان کرتی ہوں کہ میں ۱۹۷۱ء کی جنگ کے ہیرو میجر محمد اکرم شہید نشانِ حیدر کا جسد خاکی بنگلہ دیش سے لا کر ۱۴ کروڑ عوام کی سلامی کے ساتھ پاکستانی پرچم میں لپیٹ کر اُن کے آبائی گاؤں میں سپرد خاک کروں گی اور اس سپوت کو خراج عقیدت پیش کروں گی جس نے ہلی محاذ پر دشمن کے دانت کھٹے کئے اور اپنی جرأت و بہادری کا لوہا منوایا۔''(۸۶)

(س) پاکستان کے تمام اداروں میں فوج ایک ایسا منظم ادارہ ہے جو ہر قسم کی سیاست اور بیرونی دباؤ سے آزاد ہے۔ اس میں انتخاب اور ترقی وغیرہ کا اپنا ایک خود کار نظام ہے جو پیشہ ورانہ اور دیگر عوامل پر استوار ہے۔ تاہم جب بھی فوجی حکومتیں برسر اقتدار آتی ہیں اور فوج کی اعلیٰ قیادت براہِ راست سیاست میں ملوث ہو جاتی ہے تو ملک اور ادارے دونوں کے لئے بڑے خطرناک نتائج پیدا ہو جاتے ہیں۔ فوج کی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کو نقصان پہنچتا ہے اور ملکی سرحدوں پر دشمن کی طرف سے دباؤ بڑھ جاتا ہے کیونکہ جنگی کمانڈر اب جنگی نقشے ترتیب دینے کے بجائے ملکی معیشت اور امن و امان کی صورتحال ٹھیک کرنے کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں فوجی حضرات پر مختلف طبقات کی طرف سے بدعنوانی کے الزامات سامنے آجاتے ہیں۔ بسا اوقات فوجی حکمران اپنے ماتحت لوگوں کو پلاٹوں اور پرمٹوں سے نوازتے ہیں لیکن اِس ساری بدعنوانی، اقربا پروری اور سیاسی رشوتوں کی گرم بازاری کے متعلق پریس میں کوئی ایک سطر نہیں چھاپ سکتا۔ یاد رہے کہ فوج کی اندرونی کرپشن کی کہانیاں فوجی حکومتیں ختم ہونے کے بعد منظر عام پر آتی ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ مالی بے ضابطگیاں اور دیگر بدعنوانیاں فوج جیسے ادارے میں اُس وقت جنم لیتی ہیں جب اُن ہی کی حکومتیں ہوں۔ جنرل پرویز مشرف کے زمانے میں بدعنوانی کے بڑے بڑے واقعات ظہور پذیر ہوئے جن میں فوج کے چند اعلیٰ افسران بلواسطہ اور بلا واسطہ ملوث تھے۔ اُس سارے زمانے میں بدعنوانی کے اِن واقعات پر کسی نے بھولے سے بھی بات نہیں کی۔ کلثوم نواز شریف نے بڑی بہادری سے اپنی آپ بیتی میں اِس قسم کے واقعات لکھے ہیں جب جنرل پرویز مشرف کا فوجی اقتدار اپنے عروج پر تھا۔ آپ نے فوج اور

نیوی کے اُن اعلیٰ افسروں کے باقاعدہ نام لیے جنہیں پرویز مشرف نے اسلام آباد اور دیگر ڈیفنس سوسائٹیوں میں پلاٹ عطا کیے یا جنہیں سیاسی خوشنودی کے لیے مربعے الاٹ کیے گئے۔اِس قسم کا سچ بولنا بڑی ہمت کا کام ہے۔ صرف آپ بیتی نگار سے ہی کڑوے سچائی کی توقع کی جاسکتی ہے:

> ’’نیوی کے سابق چیف منصور الحق کو وطن واپس لانے کی جھوٹی طفل تسلی دی جا رہی ہے مگر ملک کے اندر منصور الحق کے کئی کرپٹ بھائی حکومت کے پَروں تلے پناہ لئے ہوئے ہیں۔اِن میں سے ایسے لوگ بھی موجود ہیں جنہوں نے اسلام آباد میں ۳۴لاکھ کا پلاٹ لے کر سوا کروڑ کا بیچا جنہوں نے مہنگی ترین گاڑیاں کسٹم ڈیوٹی دیئے بغیر خریدیں اور مہنگے داموں بیچ ڈالیں۔ وہ لوگ جن کے پندرہ سال پہلے بے سروسامانی کا یہ عالم تھا کہ کینٹین کنٹریکٹر کے مقروض ہوا کرتے تھے،آج کروڑ پتی کیسے بن گئے؟ قوم پوچھ رہی ہے جو بچے کل تک اپنے بیٹ مین کے ساتھ سائیکل پر بیٹھ کر کینٹ پبلک سکول جایا کرتے تھے آج وہ پاکستان کے مہنگے ترین علاقوں میں محلات نما کوٹھیوں، لمبی لمبی گاڑیوں اور چار چار مربعوں میں پھیلی ہوئی انڈسٹریل سٹیٹ کے مالک کیسے بن گئے؟۔‘‘(۸۷)

(ش) کہتے ہیں کہ تحریر اور اسلوب انسانی شخصیت کی بہترین عکاس ہوتی ہے۔ تحریر میں انسان کی سوچ،اندازِ فکر، پسند و ناپسند، جذبات جذباتی رویے غرض شعور اور لاشعور میں پڑے ہوئے جملہ احساسات کسی نہ کسی شکل میں جلوہ گر ہو جاتے ہیں۔ بیگم کلثوم کی تربیت ایک خالص مشرقی ماحول میں ہوئی تھی۔وہ سرتاپا ایک گھریلو خاتون تھیں۔ یہ کلثوم بیگم ہی تھیں جس نے پرویز مشرف کو للکارا تھا۔وہ تیسری دنیا کے تمام عوام کے لیے جدوجہد اور آمریت کے خلاف احتجاج کرنے کی علامت بن گئی تھی۔ یہ بیگم کلثوم کی خاندانی شرافت اور بڑاپن ہے کہ اُس نے دیگر سیاسی رہنماؤں کی طرح اپنی تحریر اور تقریر میں بازاری یا گالی گلوچ کی زبان استعمال نہیں کی۔آپ کی آپ بیتی میں پرویز مشرف یا دیگر مخالفین کے لیے اخلاق باختہ زبان استعمال نہیں ہوئی۔آپ نے نہ تو اپنے مخالفین پر غیر اخلاقی الزامات لگائے اور نہ ہی اُن پر کوئی بہتان باندھا۔ (حالانکہ اُن دِنوں ملک میں مشرف اور اُن کے قریبی ساتھیوں کے بارے میں اِس قسم کے انکشافات عام تھے)۔آپ ٹھوس حقائق پر مبنی بھرپور دلیل سے بات کرتی ہیں بلکہ بیگم کلثوم نواز کا کمال اور بڑاپن یہ بھی ہے کہ وہ اپنے مخالفین کا ذکر اچھے الفاظ میں کرتی ہیں۔پرویز مشرف جیسے بدترین مخالف کے لئے بھی نیک خواہشات اور کلمہ خیر ادا کرتی ہیں۔ یہ خوبی بہت کم

پاکستانی سیاستدانوں میں پائی جاتی ہے۔ عدم برداشت، حسد، رقابت اور ذاتیات ہمارے معاشرے کے کمزور پہلو ہیں لیکن سیاستدانوں میں تو یہ کمزوریاں زیادہ ہیں۔ اپنی آپ بیتی میں ایک جگہ پرویز مشرف کو مخاطب ہو کر کہتی ہیں:

"پرویز مشرف! اگر تمہاری پیاری اور محترم بوڑھی ماں تمہارا راستہ تکتے تکتے اپنی ہمت ہار جائے تو تمہارے دِل پر کیا گزرے گی۔ اللہ تمہاری ماں کو یہ دِن نہ دِکھائے۔ میں بھی کسی کی ماں ہوں، ماں کا دِل رکھتی ہوں۔ ہم کسی کا بُرا نہیں چاہتے۔ ہم کسی کو بددُعا نہیں دیتے مگر سعد رفیق کی دُکھی ماں کی بددُعا نے عرش معلیٰ کو ضرور ہلایا ہوگا۔" (۸۸)

(ص) بیگم کلثوم نواز کا سیاست میں آنے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ اپنے خاوند اور خاندان کے تمام مرد حضرات کو قید خانے میں ڈالنے، اُن کی دو تہائی اکثریت کی حکومت کو ختم کرنے اور مسلم لیگ (ن) کی منتشر ہونے کے بعد مجبوراً وہ کوچہ سیاست میں آئی اور اپنا بھرپور کردار ادا کرنے کے بعد اُسی خاموشی کے ساتھ دوبارہ اُمور خانہ داری کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ آپ نے اپنی آپ بیتی بھی اُن ہنگامی دِنوں میں سپرد قلم کی تھی۔ آپ بیتی میں اُس نے ایک جگہ قیام پاکستان کے اغراض و مقاصد، سیاست میں اپنی آمد اور اپنے مقصد حیات کو بڑی دلچسپ اور شیرین انداز سے تحریر کیا ہے:

"پاکستان کو ایک محب وطن وکیل کی قیادت میں مسلم لیگ نے دو قومی نظریے کی بنیاد پر بنایا تھا، جب ایک شاعر کا دِل عشق نبیؐ سے منور ہوا تو اُس دِل کی پہلی کرامت برصغیر میں اسلام کے نام لیواؤں کے لئے الگ اسلامی ریاست کے قیام کا تصور تھا جس طرح اس کے نظریاتی، جغرافیائی محافظوں کا تعین ہو چکا ہے اس طرح اس کے آئین اور قانون کے محافظوں کو میں یہ باور کرانے آئی ہوں کہ وہ اپنی ذمہ داریاں کیوں نہیں نبھا رہے۔ میں اس لئے گھر چھوڑ کر باہر نکلی ہوں اور آپ سب خواتین و حضرات سے باہر نکلنے کی درخواست کر رہی ہوں تا کہ ہماری انتھک محنت سے ملک کے اندر شہری اور جمہوری آزادیوں، بنیادی انسانی حقوق، آئینی حاکمیت اعلیٰ کے لئے ملک کی اعلیٰ عدالتوں اور عوامی عدالت ہر فورم پر انتھک محنت کریں۔" (۸۹)

بیگم کلثوم نواز کا اسلوب اُن کے فکری تسلسل کا حصہ ہے۔ بیگم صاحبہ نے جو کچھ لکھا ہے، بے ساختہ لکھا ہے۔ سادگی اور صداقت اُن کے اسلوب کا نمایاں وصف ہے۔ اُن کے ہاں مقصدیت اور فن آپس میں ملے ہوئے نظر آتے ہیں۔

مذکورہ آپ بیتی لکھنے کا مقصد اپنی اور اپنے خاوند کی بے گناہی اور جنرل پرویز مشرف کے جبر کو پیش کرنا تھا۔ یہ مقصدیت اور فن کی وحدت کا نتیجہ ہے کہ اُن کی آپ بیتی قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ اُس نے ایک مخصوص دَور کے تجربات و مشاہدات اور سیاسی حالات کو اختصار سے بیان کیا ہے۔ الفاظ و تراکیب کا استعمال، موضوع پر مکمل گرفت، بھرپور استدلال، اندازِ بیان، عمدہ ذوق، طرزِ ادا اور کلاسیکی انداز، اُردو ادب کے ساتھ اُن کی دلچسپی کا بین ثبوت ہے جس نے اُس کے اسلوب کو سنجیدہ، متین اور جاذب بنایا ہے۔ اگر وہ یکسوئی سے اُردو تحریر کی طرف توجہ دیتی اور مزید موضوعات پر دلجمعی سے لکھتی تو اُردو ادب کی ایک اچھی نثر نگار ا ہو سکتی تھی مگر بدقسمتی سے دیگر سیاستدانوں کی طرح سیاسی مصروفیات نے اُنہیں ایسا نہیں کرنے دیا۔ بیگم کلثوم نواز کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ شاہرہ پر چلتے چلتے اچانک اپنا موضوع چھوڑ کر کسی پگڈنڈی کی طرف نکل جاتی ہیں تاہم نفس مضمون پر اُن کی گرفت اِتنی مضبوط ہوتی ہے کہ مرکزی عنوان اُن کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ نفسیات کی اصطلاح میں اِس مہارت کو سیلان شعور، (Stream of Consciousness) کا نام دیا گیا ہے۔ اپنی آپ بیتی میں بیگم صاحبہ نے کئی مقامات پر اِس تکنیک کو کامیابی سے استعمال کیا ہے۔

محترمہ کلثوم نواز نے ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کے واقعات بڑی دلخراش انداز سے تحریر کیے ہیں۔ جب ملک میں جنرل پرویز مشرف نے مارشل لاء لگایا، آپ کے گھر کے سارے مردوں کو گاڑیوں میں ڈال کر نامعلوم مقامات پر لے جایا گیا اور عورتوں کو گھروں کے اندر نظر بند کر دیا گیا، اِس موقع پر محترمہ لکھتی ہیں:

> ''مجھے یقین تھا کہ ایک طرف تو میجر حکم کا پابند ہے۔ وہ بھی کسی ماں کا بیٹا ہے، اُس کے گھر میں بھی بہنیں ہیں اور اُس کی تربیت بھی کسی اچھی گود نے کی ہو گی۔ دوسری طرف میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ اگر یزید کے دربار میں وہ جنت کی مالک پاک ہستیاں بے آسرا ہو کر آواز بلند کر سکتی ہیں تو آج کیوں نہ ہم اُن کی سنت کو زندہ کر لیں۔ جو بھی ہو اب اُس کا خندہ پیشانی سے سامنا کرنا ہے۔''(۹۰)

محترمہ کلثوم نواز نے اپنی آپ بیتی میں کہیں کہیں پُر تجسس اور انکشافی اسلوب کے نمونے بھی دیئے ہیں۔ وہ بات کو اخفا میں رکھتی ہے جوں جوں پڑھنے والے کا تجسس بڑھتا ہے وہ قصے یا واقعے کو طویل تر کرتی ہیں اور پھر اچانک بات منکشف کر کے عجیب اثر پیدا کرتی ہیں۔ قید میں اپنے بڑے بیٹے حسین نواز کے ساتھ پہلی ملاقات کا ذکر کچھ اِسی اسلوب میں کیا ہے:

> ''مجھے راولپنڈی کے ایک فوجی میس میں لے جایا گیا۔ میرے وہاں پہنچنے کے پندرہ بیس منٹ بعد گیٹ سے ایک گاڑی اندر داخل ہوئی۔ مجھے یوں لگا جیسے سول کپڑوں میں ملبوس دو افراد کے درمیان ایک کالے رنگ کا برقعہ پہنے کوئی عورت بیٹھی

ہے۔ جب اُس عورت کو باہر نکالا گیا تو پتہ چلا کہ وہ برقعہ نہیں کسی شخص پر کالی چادر
ڈالی گئی ہے۔ چادر ہٹائی گئی تو میرا دِل حلق تک آگیا کیونکہ یہ حسین تھا جو میرے
سامنے گٹھڑی بنا بیٹھا تھا۔ اُس وقت وہ میرے آنسو نہیں دیکھ سکتا تھا کیونکہ اُس کی
آنکھوں پر سیاہ پٹی بندھی ہوئی تھی۔"(۹۱)

سیاسی خودنوشت میں زیادہ تر اسلوب پر توجہ نہیں دی جاتی کیونکہ سیاسی بائیو گرافیاں ایک خاص مقصد کے لیے لکھی جاتی ہیں اس لیے یہ جس قدر آسان، سہل اور سادہ زبان میں ہوں گی زیادہ پُراثر ہوں گی تاہم "جبر اور جمہوریت" کی خوبی یہ ہے کہ ایک سیاسی خودنوشت ہوتے ہوئے بھی ہمیں اِس میں مختلف اسالیب کے نمونے مل جاتے ہیں۔ مصنفہ نے کہیں کہیں شاعرانہ اسلوب کا استعمال بھی کیا ہے۔ دو مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں:

"ایک رات اچانک یہ روح فرسا اعلان قوم پر قیامت بن کر ٹوٹا کہ اے آزادی کے
پروانو! تمہارے بال و پَر تمہارے ہی مدہوش غداروں نے جبراً کاٹ ڈالے ہیں۔
تمہارا ایک بازو جسد تن سے جدا ہو گیا ہے۔ حیدر کرار اور خالد بن ولید کے وارث
جرنل جن اسلامی لشکروں کے سربراہ ہوا کرتے تھے، اس اسلامی لشکر کے ۹۰ ہزار
سپوت جو جذبہ شہادت لیے ہوئے محاذ پر گئے تھے، بھکے ہوئے سپہ سالار کے
بدولت دشمن کی اذیت ناک قید میں پہنچ گئے۔"(۹۲)

ایک اور موقع پر شاعرانہ اسلوب کا جوہر یوں دکھاتی ہیں:

"وفائیں خون میں شامل ہوتی ہیں اور ضمیر کا حصہ ہوتی ہیں۔ لکھ کے وفا کا اقرار کرنا
تو کوفہ والوں کی پرانی ریت ہے۔ ابوجہل جو وفا نہ کر سکا، سردار مکہ سے ابوجہل بن
گیا اور بلال حبشی اپنی محبت اور وفا کے صلہ میں نہ صرف ایک جید صحابی کا مقام
حاصل کر گئے بلکہ وارث جنت بن گئے۔"(۹۳)

ایک اچھے اسلوب کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ کسی واقعے کے بیان میں ایسا انداز اختیار کیا جائے کہ پڑھنے والے کے سامنے واقعے کے تمام پہلو آجائیں۔ اِس موقع پر طوالت طرزِ تحریر کو بہت نقصان پہنچاتی ہے۔ اختصار اور جامعیت واقعہ نگاری اور منظر نگاری کے لیے لازمی شرائط ہیں۔ جہاں تک بیگم کلثوم نواز کے واقعہ نگاری اور ڈسکرپشن کا تعلق ہے تو حقیقت یہ ہے کہ موصوفہ واقعے کو جزئیات کے ساتھ تحریر کرتی ہیں۔ مارشل لاء لگنے کے فوراً بعد جب فوج نے ملک کے تمام سرکاری اور غیر سرکاری اہم عمارتوں کا کنٹرول سنبھالا تو فوج کا ایک دستہ لاہور ماڈل ٹاؤن میں واقع آپ کے گھر میں بھی

داخل ہو گیا جہاں اُس وقت آپ رہائش پذیر تھیں۔اِس طویل قصے کو محترمہ نے کچھ اس انداز سے بیان کیا ہے کہ پورا منظر آنکھوں کے سامنے گزرتا ہوا محسوس ہوتا ہے:

> ''رہائش گاہ کے پہلے حصے میں فوجی دندناتے ہوئے داخل ہوئے۔اُنہوں نے بالکل وحشیانہ انداز میں ٹھڈے مار مار کر دوروازے کھولے ۔ملازمین کو بُری طرح زدوکوب کیااور مار مار کراُنہیں گھر سے باہر نکال دیا۔وہ اپنے گنز کے ساتھ گھر کے ہر ہر کمرے کے باہر کھڑے ہوگئے اور باقاعدہ گھر کے ہر فرد کا نام پکار کر پوچھتے رہے کہ فلاں کہاں ہے؟''(۹۴)

۵۔ محترمہ کلثوم نواز نے اپنی آپ بیتی کو بیس چھوٹے بڑے ابواب میں تقسیم کر رکھا ہے۔اُس نے ابواب کے نام نہایت شاعرانہ رکھے ہیں جو کلثوم نواز کے مطالعے، روشن ذہن اور اُردو ادب کے ساتھ اُن کی گہری دلچسپی کی غمازی کرتے ہیں۔وہ بیچ میں کسی مشہور شعر کا حوالہ دیتی ہیں یا گفتگو کو شعر پر ختم کرتی ہیں۔ابواب کے نام ملاحظہ ہوں:

> ''اذنِ ضمیر، نیرنگی سیاست، وطن کی فکرِ کر ناداں، شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن، گلشن قائد کے تحفظ کا عہد۔''(۹۵)

''جبر اور جمہوریت'' اگرچہ بلند پایہ ادبی کارنامہ نہیں، پھر بھی مصنفہ نے اکثر مقامات پر سیاسی بیان کو بھرپور ادبی زبان میں تحریر کرنے کی سعی کی ہے۔ آپ نے جابجا ''ایام اسیری''(۹۶) ، ''زندان''(۹۷) ، ''اتمام حُجت''(۹۸)، ''حیلہ پرویزی''(۹۹) جیسی اصطلاحات کا استعمال کیا ہے۔پرویز مشرف کے نام کی مناسبت سے وہ حکومت کی ظلم و ستم اور سیاسی چالوں کے لیے ''حیلہ پرویزی''(۱۰۰)، ''پرویزی چال''(۱۰۱)، ''حکمت پرویزی''(۱۰۲)، ''مسلک پرویزی''(۱۰۳) جیسے الفاظ و اصطلاحات استعمال کرکے عبارت کی ادبی شان بڑھاتی ہیں۔ ''اسیرانِ جمہوریت''(۱۰۴)، ''بزم خواتین''(۱۰۵)، ''اندھے کی لاٹھی''(۱۰۶)، ''نوشتہ دیوار''(۱۰۷) محترمہ کلثوم نواز کی پسندیدہ اصطلاحات ہیں۔ علاوہ ازیں محترمہ نے بعض اصطلاحات پہلی مرتبہ استعمال کی ہیں جو اس سے پہلے اُردو میں مستعمل نہیں تھیں یا کچھ اور معنوں میں استعمال ہوتی تھیں، محترمہ نے اُن کو زیادہ وسیع اور سیاسی پس منظر میں استعمال کیا ہے:

(الف) ''خاکی کالر کرائم''(وائٹ کالر کرائم کی نسبت سے فوج میں ہونے والی بدعنوانی کے لیے خاکی کالر کرائم کا لفظ استعمال کیا ہے۔) (۱۰۸)

(ب) ''پرویزی خودسری''(اُس وقت کے فوجی جرنل اور صدر پاکستان پرویز مشرف کے لیے اُن کے غرور اور تکبر کی

وجہ سے پرویزی خودسری کی اصطلاح استعمال کرتی ہیں۔)(۱۰۹)

(ج) ''آئینِ پرویزی'' (پرویز مشرف ملکی آئین میں مسلسل ترامیم کر رہے تھے اور صدارتی آرڈیننس کے تحت حکومت چلا رہے تھے اس کے لیے محترمہ نے آئینِ پرویزی کی اصطلاح استعمال کی ہے۔) (۱۱۰)

اُردو میں انگریزی الفاظ کا استعمال روز بروز خطرناک حد تک بڑھ رہا ہے۔ پہلے تو اُردو زبان انگریزی زبان سے الفاظ لیتی اور اپنے قواعد کے مطابق اِن کو اُردو کا جامہ پہناتی جیسے سکول، کالج، یونیورسٹی، بازار سینکڑوں الفاظ ہیں جن پر گمان ہی نہیں گزرتا ہے کہ یہ غیر زبان کے الفاظ ہوں گے۔ اب صورتحال مختلف ہوگئی ہے۔ لوگ روانی میں بغیر سوچے انگریزی کے پورے پورے جملے بولتے اور لکھتے ہیں۔ اِس سے بھی زیادہ تشویشناک صورتحال یہ ہے کہ نہ تو قاری اور نہ نقاد ایسا کرنے پر لکھنے والوں کی گرفت کرتے ہیں۔ اب تو جدید دَور کے شعراء اپنی نظموں کے عنوان تک انگریزی میں درج کرتے ہیں۔ اچھے اچھے اور نامور اُردو مصنفین کا یہ عام روش ہے، سیاستدانوں کو کیوں موردالزام ٹھہرایا جائے۔

''جبر اور جمہوریت'' میں بھی یہ خامی ہے کہ انگریزی الفاظ، محاورات اور ضرب الامثال جوں کے توں لکھے گئے ہیں حالانکہ اُن کے اُردو مترادفات لکھنے چاہیئے تھے۔ یہ اسلوب کی خامی اور کمزوری ہے۔ فصاحت اور بلاغت کے لیے انگریزی الفاظ لکھنا شرط نہیں۔ ''کمانڈر''، ''گنز''، ''وائٹ مین''، ''مینڈیٹ''، ''آن ریکارڈ''، ''انجینئرڈ''، ''روڈ میپ''، ''رولز آف بزنس''(۱۱۱) وہ الفاظ ہیں جن کو اِس آپ بیتی میں بار بار استعمال کیا گیا ہے اور جن کے استعمال سے آپ بیتی کی تفہیم اور ابلاغ کو نقصان پہنچا ہے۔ اِن کی جگہ اگر عام فہم الفاظ لکھے جاتے تو زیادہ مؤثر ہو کر اُن کے بیانیے کو تقویت پہنچاتے۔

آپ بیتی میں بعض جگہوں پر تو مصنفہ نے انگریزی الفاظ کو اُردو میں لکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ براہِ راست انگریزی زبان میں لکھ دیا ہے جیسے:

"Order of the day"، "Moto"، "Take over"(۱۱۲)۔

''جبر اور جمہوریت'' میں زبان و بیان کی غلطیاں بھی نظر آتی ہیں۔ سیاستدان، کھلاڑی اور علمائے دین عام لوگوں کے لیے مثال ہوتے ہیں۔ عوام کھانے پینے، پہننے، بولنے، چلنے غرض ہر بات میں اُن کی پیروی کرتے ہیں۔ اُنہیں حقیقی معنوں میں لوگوں کے ماڈل ہونے کا فریضہ سرانجام دینا چاہئے ورنہ لوگوں کا اعتماد تمام نظام سے اُٹھ جاتا ہے۔ تقریر اور تحریر دونوں میں سیاستدانوں کو انتہائی احتیاط کرنا چاہیئے۔ اُن کے منہ سے نکلی ہوئی ایک بات یا اُن کے قلم سے لکھا گیا ایک جملہ اُنہیں کل تاریخ کے کٹہرے میں کھڑا کر سکتا ہے۔ محترمہ ملک کی ایک بڑی سیاسی پارٹی کی رہنما تھیں۔ اُنہیں اِن غلطیوں سے اجتناب کرنا چاہیے تھا۔ مثالیں نیچے درج ہیں:

۱۔ یہ جملے اُردو قواعد کے خلاف ہیں:

''یہ افراد پرویز مشرف کے سامنے نمبر بنانے کی دوڑ میں صاف نظر آرہے تھے۔''(۱۱۳)

''حالات کی سختیاں اُن کے اعضاء وجوارح سے صاف نظر آرہی تھیں۔''(۱۱۴)

''اُن لوگوں کا ایک اجلاس منعقد ہوا جس میں یہ درفنطنی چھوڑی گئی کہ نواز شریف کو لچک دکھانے کا کہیں گے۔''(۱۱۵)

۲۔ کئی جگہ محترمہ کا لہجہ عامیانہ ہو گیا ہے۔ ایک سنجیدہ، متین اور لکھی پڑھی عورت شائستہ زبان لکھتے لکھتے اچانک پٹڑی سے اُتر جاتی ہیں خصوصاً اپنے مخالفین یا نواز شریف کو مشکل میں دغا دینے والے سیاستدانوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ متانت اور سنجیدگی کا دامن چھوڑ دیتی ہیں:

''مگر جب اُنہیں ٹھینگا دکھانے والے حالات پیدا ہونے لگتے تو وہ دوبارہ نواز شریف کے قصیدے پڑھنا شروع کر دیتے۔''(۱۱۶)

''غازی صاحب! (پرویز مشرف کے دَور حکومت میں وزیر مذہبی اُمور تھے) اب تمہاری غزا مشکوک ہو گئی ہے، ہماری ذہنوں میں ہزاروں سال اُٹھتے ہیں۔ اب تمہیں جواب دینا پڑے گا۔''(۱۱۷)

آپ بیتی کے ایک باب ''گلشن قائد کے تحفظ کا عہد'' میں کئی پیرا گراف ایسے ہیں جن کا کوئی سر پیر نہیں اور جو اصل متن کے ساتھ جوڑ نہیں کھاتے بلکہ پڑھنے والے کو پریشان کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں ''جبر اور جمہوریت'' کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ اِس کی تحریر میں جابجا تقریر کا رنگ جھلک رہا ہے۔ وہ اپنی کتاب میں بار بار پرویز مشرف کو للکارتی ہیں۔ اِس موقع پر اُن کی تحریر پر تقریر کا گمان ہوتا ہے:

''ریٹائرڈ جنرل! (پرویز مشرف) آنکھیں کھول کر دیکھو اور کان کھول کر سنو کہ قوم نے تمہاری یہ بات مسترد کر دی ہے۔''(۱۱۸)

اپنی تمام تر خامیوں اور کوتاہیوں کے باوجود ''جبر اور جمہوریت'' جبر اور مارشل لاء کے زمانے کی آپ بیتی ہے اور اُس بہادر اور بے خوف سیاسی رہنما کی سرگزشت ہے جو تمام تر پابندیوں کے باوجود ایک مطلق العنان حکمران کے سامنے کھڑی ہو گئی اور جلسے جلوسوں، احتجاج اور تقاریر کے علاوہ اپنی مذکورہ آپ بیتی کے ذریعے اپنی اور اپنے خاندان کا مقدمہ ہر عدالت میں کامیابی سے لڑا۔ جب اُنہیں کامیابی نصیب ہوئی تو ایک بہادر فاتح کی طرح اپنی تلوار نیام میں ڈال کر گھر گرہستی میں مصروف ہو گئیں۔

۴۔وزیر جیل سے اسیر جیل تک(سید قمر عباس)

سید قمر عباس ہمارے صوبے کے ایک نامور سیاست دان تھے۔وہ پاکستان پیپلز پارٹی کے رہنمااور فارغ بخاری کے فرزند ہونے کی وجہ سے شہرت رکھتے ہیں۔آپ نے سیاسی زندگی کاآغاز زمانہ طالب علمی سے کیا۔۱۹۶۷ء میں جب ذوالفقار علی بھٹونے پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیادرکھی تو سید قمر عباس اُس وقت سے لے کر زندگی کی آخری سانس تک بھٹو کے نظریات سے وابستہ رہے۔۱۶نومبر ۱۹۸۸ء کو پشاور شہر کے پی ایف II سے صوبائی اسمبلی کے ممبر منتخب ہو کر وزیر ہاؤسنگ و فزیکل پلاننگ رہے۔۱۹۹۳ء کو پھر اسی حلقے سے ممبر صوبائی اسمبلی منتخب ہوئے تو اُنہیں وزیر جیل خانہ جات بنایا گیااور تین سال تک اس عہدے پر رہے۔علاوہ ازیں دو مرتبہ وہ بلدیاتی انتخابات میں گل بہار وارڈ سے چیر مین منتخب ہوئے۔غرض آپ کی سیاسی زندگی تیس سالوں پر محیط ہے۔

سید قمر عباس ایک ہمہ گیر شخصیت تھے اور اُس نے بڑی ہنگامہ خیز زندگی گزاری۔وہ ایک اچھے انسان، بے مثل سیاست دان، شعلہ بیان مقرر، قابل اعتماد دوست اور ایک اچھے لکھاری تھے۔معروف علمی وادبی خاندان کے فرزند ہونے کی وجہ سے اُن کی تحریر میں ادبی چاشنی باپ کی صحیح وراثت کی نشانی ہے۔آپ نے دو کتابیں ''سرچشمہ ہدایت'' اور ''تکمیل انسانیت'' بھی تصنیف کی ہیں علاوہ ازیں مقامی اخبارات میں اپنا کالم بھی ''راہرو'' کے نام سے لکھتے تھے۔۱۹۹۶ء کو عین الیکشن کے دن عوامی نشنل پارٹی کے رہنماغلام احمد بلور کے بیٹے شبیراحمد بلور کے قتل کے جرم میں گرفتار ہوئے اور جیل میں اپنی آپ بیتی ''وزیر جیل سے اسیر جیل تک'' لکھی۔یہ آپ بیتی نجی، سیاسی اور سماجی تینوں زاویوں سے نہایت اہم ہے۔ مصنف اپنی آپ بیتی لکھنے کا مقصد اپنے تجربات، معلومات اور مشاہدات کو سیاسی جدوجہد کرنے والے افراد اور عام قارئین تک پہنچانا بتاتے ہیں۔قمر عباس نے اپنی سیاسی اور غیر سیاسی زندگی کی سرگزشت عام فہم اور خوبصورت انداز سے لکھی ہے جس کو پڑھ کر ہمیں اُس عہد کے کئی سیاسی، تاریخی (ظاہر ہے اُس زمانے کے حالات وواقعات آج تاریخ کا حصہ بن گئے ہیں) سماجی، ادبی اور دیگر حالات سے واقفیت حاصل ہو جاتی ہے۔

''وزیر جیل سے اسیر جیل تک'' ایک جزوی اور سرسری آپ بیتی ہے۔مصنف نے زیادہ تر اپنے سیاسی سفر، سیاسی کامیابیوں اور سیاسی واقعات پر قلم اُٹھایا ہے لیکن بیچ بیچ میں اُس نے اپنے خاندان، والدین بہن بھائیوں، دوستوں، ہم عصر سیاست دانوں اور دیگر مشاہیر کے واقعات بھی لکھے ہیں۔آپ کی سرگزشت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ۱۹اکتوبر ۱۹۵۰ء کو فارغ بخاری کے ہاں پشاور میں پیدا ہوئے۔آپ نے میٹرک گورنمنٹ ہائی سکول نمبر ا پشاور شہر سے کیا۔میٹرک تک وہ ایک درمیانے درجے کے طالب علم تھے۔اُن کی لاپرواہی، تعلیم میں عدم دلچسپی اور آوارہ گردی سے اُن کے والد

ہمیشہ پریشان اور متفکر رہتے، تقریر کرنے کا شوق اُنہیں آٹھویں جماعت سے ہوا۔ یہ شوق بعد کی زندگی میں اُنہیں بہت کام آیا جب بڑے بڑے جلسوں میں لوگ آپ کی تقریر سننے کے لیے آتے تھے۔ میٹرک میں کم نمبر آنے پر باپ نے اُنہیں کامرس کالج پشاور میں داخل کر دیا۔ چونکہ اُس نے بچپن ہی سے اپنے گھر میں ایک خاص ادبی اور سیاسی ماحول دیکھا تھا اس لیے کالج کے آزاد فضا میں اُنہیں سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے میں دیر نہ لگی۔ کامرس کالج پشاور میں آپ نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر پہلی طلبہ یونین بنائی اور اس یونین کے جنرل سیکرٹری بنے۔ آپ بیتی میں اپنے کالج کے زمانے کی چھوٹی چھوٹی شرارتیں، احتجاج اور کالج انتظامیہ کے ساتھ لڑائیوں کے بارے میں دلچسپ باتیں تحریر کی ہیں۔ اُس زمانے سے آپ کو سیاست کا ایسا چسکا پڑا کہ مرتے دم تک اس کے سحر سے نہ نکل سکے۔ چنانچہ اپنی ابتدائی زندگی، خیالات، سوچ، سیاست کی طرف میلان کے متعلق کچھ اس طرح تحریر کرتے ہیں:

> " کامرس کالج کے دوسرے سال یعنی D.com میں مجھے طلبہ یونین کا جنرل سیکرٹری اور یونس صراف صدر چُنا گیا اور کالج کی ہنگامہ خیزیاں جاری رہیں۔ بہر حال سیاست کا چسکا پڑ چکا تھا اور لیڈری کا خناس ذہن میں گھس کر باقاعدہ اپنی جگہ بنا چکا تھا یہ تھی ابتدا جہاں سے ایوب خان کے دور حکومت کے آخری دو سالوں میں ہم نے طلبا یونین کی بنیاد رکھی۔ گھر میں چونکہ والد صاحب کا تعلق بائیں بازو سے تھے اس لیے ماوزے تنگ وہ پہلا لیڈر تھا جس سے ہم متاثر ہوئے، معاشرے کی ناہمواری، غربت و امارت کی جنگ، معاشرے کا عدم مساوات ہمیں ماوزے تنگ کی لال کتاب پڑھ کر پتہ چلے اور اس وجہ سے ہم نے باقاعدہ ماؤ کے بیج لگا کر لال کتابیں تقسیم کرنا شروع کر دیں۔"(۱۱۹)

کامرس کالج سے ڈی کام کرنے کے بعد ہیلی کالج لاہور میں چارٹرڈ اکاونٹسی (C.A) میں داخلہ لیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ لاہور کا انتخاب آپ نے پڑھائی کی وجہ سے نہیں بلکہ سیاست اور سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے کیا تھا۔ اُس وقت لاہور اور پنجاب کے دیگر شہر طلبا کے سیاسی سرگرمیوں کے مراکز تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو اُن دنوں پاکستان کے سیاسی اُفق پر تیزی سے اُبھر رہا تھا۔ نوجوان، طلبا اور لکھا پڑھا طبقہ بہت تیزی سے بھٹو کے نظریات کو قبول کر کے اُس کا گرویدہ بنتا جا رہا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو جب لاہور آ رہا تھا تو قمر عباس اپنے کالج کے لڑکوں کو لے کر لاہور ریلوے سٹیشن پر اُن کے استقبال کو پہنچے اور وہاں مجمعے کے سامنے پہلی سیاسی تقریر کی پھر سخت لاٹھی چارج کا نشانہ بنے۔ سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے پر اُنہیں

ایک سال کے لیے ہلی کالج سے نکال دیا گیا۔اِس کے بعد پشاور یونیورسٹی کے قائدِ اعظم کالج آف کامرس میں داخل ہوئے اور ساتھ ہی ادیب فاضل کا امتحان بھی پرائیوٹ طور پر پاس کیا۔ پشاور یونیورسٹی میں بھی قمر آرام سے نہیں بیٹھے بلکہ یہاں بھی طلبہ کے سیاسی یونین کو آز سر نو منظم کروایا اور پاکستان سٹوڈنٹ فیڈریشن (PSF) صوبہ سرحد کی داغ بیل ڈال دی۔ اُنہیں اس تنظیم کا پہلا صدر بنایا گیا۔ طالب علمی کے زمانے ہی میں اُن کی تقاریر کی دھاک ہر طرف بیٹھ گئی تھی۔ یونیورسٹی کے بڑے بڑے سیاسی جلسوں میں اُنہیں خطاب کے لیے مدعو کیا جاتا۔ قمر عباس کے مطابق اُنہیں قائدِ اعظم کالج آف کامرس پشاور یونیورسٹی سے بھی سیاست میں حصہ لینے کی وجہ سے بے دخل کر دیا گیا۔اس کے بعد آپ نے پشاور یونیورسٹی کے شعبہ اُردو میں داخلہ لیا۔ وہ پہلے سال تو یکسو ہو کر پڑھتے رہے لیکن اُس کا دوسرا سال سیاسی ہنگاموں کی نذر ہو گیا۔ حیات محمد خان شیر پاؤ کو پشاور یونیورسٹی میں ایک تقریب کے دوران قتل کر دیا گیا جس کی وجہ سے آپ کو بھی یونیورسٹی سے خارج کر دیا گیا۔ یوں وہ تعلیم ادھوری چھوڑ کر سیاست کی طرف مکمل طور پر متوجہ ہو گئے۔ اپنی ابتدائی زندگی اور بچپن کے حالات بیان کرتے وقت وہ ایک واقعے کا خصوصی طور پر حوالہ دیتے ہیں جس کی وجہ سے اُس کے دل میں حکمرانوں اور پورے نظام کے خلاف زبردست بغاوت پیدا ہوئی۔ جب اُن کے والد فارغ بخاری کو ایوب خان کے مارشل لا کے زمانے میں ملٹری کورٹس نے ایک سال کی سزا سنادی تو نوجوان قمر عباس کو حکومت کا یہ اقدام سارے نظام کے خلاف باغی کر گیا:

> ”آخر کار اُن (فارغ بخاری) کو ایک سال سزا دے دی گئی اور سنٹرل جیل پشاور
> میں ڈال دیا گیا۔ یہاں سے میرے اندر کی بغاوت اُبلنے لگی۔ اب میں اس گلے
> سڑے نظام کے خلاف بے نیام تلوار بن چکا تھا۔“ (۱۲۰)

”وزیر جیل سے اسیر جیل تک“ کو بغور پڑھنے سے یہ بات بھی عیاں ہوتی ہے کہ آپ کے کل تین بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ آپ کے بڑے بھائی ظفر عباس پچھلے تیس چالیس سال سے امریکہ میں مقیم ہیں اور آپ کی بڑی بہن بھی امریکہ میں ہیں جبکہ آپ کے چھوٹے بھائی طاہر عباس اور ایک بہن عذرا آپ کے پاس پشاور میں رہتی تھیں۔ عذرا کی بھی شادی ہو چکی تھی۔ وہ پشاور میں جی ٹی روڈ پر ایک ٹریفک حادثے میں ہلاک ہوئیں۔ آپ اہل تشیع تھے اور آپ کا تعلق شیعوں کے ممتاز خاندان سادات سے تھا۔ سید ہونے کا آپ نے بار بار بڑے فخر سے تذکرہ کیا ہے۔ قمر عباس نے اپنی ساری زندگی پشاور کے گلبہار میں ایک پانچ مرلے کے آبائی مکان میں گزاری۔ آپ کا تعلق ہمارے ملک کے سیاسی تاریخ کے اُس عہد سے ہے جہاں نظریاتی سیاست کا دور دورا تھا۔ پلاٹوں، ٹھیکوں اور پرمٹوں کی سیاست ابھی شروع نہیں ہوئی تھی بلکہ بدعنوانی اور کرپشن کرنے والے افراد لوگوں سے آنکھ نہیں ملا سکتے تھے۔ آپ وزیر ہاؤسنگ تھے حیات آباد کا نیا فیز یعنی ”فیز-6“ آپ

کے دور میں بنا۔ اگرآپ چاہتے تو بہت کچھ بٹور سکتے تھے لیکن وہ اپنی قلندرانہ وضع پر قائم رہے۔ وہ اپنی سر گزشت میں تین باتوں پر فخر کرتے ہیں۔ اپنے سیاسی نظریے، جوش خطابت اور ذاتی صلاحتیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

> " سیاسی زندگی میں بھی میں نے اپنی تقریر کرنے کی صلاحیت سے فائدہ اُٹھایااور پشاور کے لوگوں میں میری تقریریں ہمیشہ پسند کی جاتی تھیں۔ میں نے ہر الیکشن پیپلز پارٹی کے ساتھ بے غرض نظریاتی تعلق اور زبان کے زور پر کروڑوں کے مقابلے میں جیتا۔ صرف زور بیان، پُر خلوص نظریے، اپنے دوستوں کے چندوں اور اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر اُن کو ہرادیتا۔"(۱۲۱)

" وزیر جیل سے اسیر جیل تک" بنیادی طور پر ایک سیاسی خود نوشت ہے اس لیے قمر عباس نے زیادہ تر بلکہ بڑی حد تک ملکی، بین الاقوامی اور مقامی سیاست کو اپنے بیان کا محور بنایا ہے۔ اپنی زندگی کی سیاسی اُٹھان، سیاسی تربیت، سیاسی ہنگاموں، سیاست کے لیے دی گئی قربانیوں اور سیاسی اُتار چڑھاؤ کی بات کی ہے دیگر مضامین اگرآئے بھی ہیں تو ضمنی اور سرسری طور پر۔ حقیقت یہ ہے کہ جو فرد قمر عباس کی طرح بھرپور سیاسی زندگی گزارتا ہے اور جس کی سوچ، فکر اور صبح سے شام تک کی زندگی سیاست میں گزرتی ہو اُس سے سیاست سے ہٹ کر کسی دوسرے عنوان کی توقع بھی نہیں کی جاسکتی تاہم حقیقت تو یہ بھی ہے کہ اُس نے اُصولِ سیاست اور بامقصد زندگی گزارنے کی بات نہایت مناسب اسلوب میں کی ہے۔ آج ایک عام قاری اور سیاست سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں کو آپ کی آپ بیتی میں بہت کچھ مل سکتا ہے۔

قمر عباس نے قومی سطح کی سیاست کا آغاز اُس وقت کیا جب ذوالفقار علی بھٹو اور اُس کی بنائی ہوئی نئی پارٹی پاکستان کے سیاسی منظر نامے پر بڑی تیزی سے نمودار ہوئی۔ بھٹو روشن خیالی، مساوات اور جمہوریت کے علمبردار تھے اور آمریت کے خلاف اُن کی آواز ملک کے نوجوانوں کی للکار بن گئی۔ ملک کے مزدور، کسان، مڈل کلاس اور چھوٹے طبقات کے لوگ بھٹو کے گرد جمع ہونے لگے۔ اُن دنوں قمر عباس ہیلی کالج آف کامرس لاہور کے طالب علم تھے۔ چنانچہ بھٹو جب پہلی مرتبہ لاہور آرہے تھے تو اُن کے استقبال کے لیے لاہور ریلوے سٹیشن پر گئے۔ اُس نے مارشل لا کے خلاف احتجاج میں نہ صرف پولیس کی لاٹھیاں کھائیں بلکہ زندگی کی پہلی گرفتاری بھی ہوئی۔ اُنہیں انارکلی تھانے کے حوالات میں رکھا گیا اور پھر اُنہیں صوبہ بدر کر دیا گیا۔ آپ نے صوبہ سرحد میں حیات محمد خان شیر پاؤ کے ساتھ مل کر پاکستان پیپلز پارٹی کو متعارف اور منظم کروایا۔ وہ ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ اپنی پہلی ملاقات اور ملک بھر کے تعلیمی اداروں میں پیپلز سٹوڈنٹس فیڈریشن کی بنیاد رکھنے کا ذکر اس طرح سے کرتے ہیں:

" اس دوران بھٹو صاحب نے سرحد کا دورہ کیا اور ہماری پہلی ملاقات شیر پاؤ صاحب کے گھر پر ہوئی۔ بھٹو صاحب نے طلبہ کو منظم کرنے اور تحریک کا ہراوّل دستہ بننے پر زور دیا۔ انہوں نے کہا کہ یاد رکھو کسی بھی انقلاب کے لیے نوجوانوں کی شمولیت شرط اوّل ہوا کرتی ہے۔ سرحد میں اس سے پہلے وہ ڈیرہ اور کوہاٹ میں کامیاب جلسے کر چکے تھے۔ ہم اُن کے ساتھ ہری پور اور ایبٹ آباد سے ہوتے ہوئے تربیلا ریسٹ ہاؤس پہنچے اور رات وہاں قیام کیا۔ کھانے کے بعد ریسٹ ہاؤس کے برآمدے میں، میں نے پیپلز سٹوڈنٹس فیڈریشن کا ذکر کیا تو وہ اس خیال سے متفق تھے۔" (۱۲۲)

ہمارے صوبے کے طلبا سیاست میں قمر عباس کا نہایت اہم کردار رہا۔ آپ نے اپنی آپ بیتی میں "طلبہ سیاست" کے نام سے ایک طویل باب تحریر کیا ہے جس میں پشاور یونیورسٹی اور صوبے کے دیگر کالجوں میں سیاست اور سیاسی سرگرمیوں کو بیان کیا ہے۔ مختلف فیڈریشنوں میں اختلافات اور لڑائی جھگڑوں کو بھی ذکر کیا ہے اور بعض طلبا رہنماؤں کے نام لے کر اُن کے کرتوت اور پارٹی فنڈز میں خورد بورد کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ صوبہ سرحد میں پہلی بار آپ نے پیپلز سٹوڈنٹس فیڈریشن کی بنیاد رکھی اس کے پہلے صدر رہے اور اس تنظیم کو دیگر اضلاع تک پھیلانے میں دن رات کام کیا۔ سیاسی مصروفیات اور عملی سیاست کی وجہ سے وہ اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر صرف سیاست کے ہو کر رہ گئے۔ وہ اپنی محنت سے پی پی پی کے ایگزیکٹیو کمیٹی کی رکنیت اور سینئر رہنما کے عہدے تک پہنچے۔ وہ بے نظیر بھٹو کے پولیٹکل سیکرٹری اور دیگر ممتاز عہدوں پر بھی رہے۔ ذوالفقار علی بھٹو کے فرزند میر مرتضیٰ بھٹو کے ساتھ اُن کا گہرا تعلق رہا لیکن اُن کی دہشت گرد تنظیم الذوالفقار کا حصہ نہ بنے۔ حالانکہ اُن دنوں اس پارٹی کے نوجوان بھٹو کی پھانسی سے مایوس ہو کر اور ضیاءالحق کے امرانہ اقدامات کے باعث دھڑا دھڑ الذوالفقار میں شامل ہو رہے تھے۔ الزوالفقار سے دوری کا جواز قمر عباس یوں پیش کرتے ہیں:

" اس کے بعد مرتضیٰ سے میرا رابطہ نہ رہا لیکن افغانستان میں رہائش کے دوران جب اُسے اپنے ساتھ مخلص ساتھیوں کی ضرورت پڑی تو اُس نے کافی کوشش کی کہ میں اُس کے پاس چلا جاؤں۔ لیکن میری اور اُس کی راہیں جُدا تھیں۔ میں اُس کی بہن کے ساتھ رہ کر ملک کے اندر پُرامن طور پر جمہوریت کی بحالی کی جدوجہد میں

مصروف تھا۔ میں ایک عرصے تک بے نظیر بھٹو کے ساتھ سیکرٹری کے طور پر کام کر چکا تھا اس لیے اگر میں اُس کے پاس چلا جاتا تو بے نظیر کے خلاف یہ پروپیگنڈا ایک حقیقت بن جاتا کہ الذوالفقار کی سرگرمیاں بے نظیر کے تعاون اور تائید سے چلائی جا رہی ہیں۔اس لیے میں نے ہمیشہ انکار کیا اگرچہ اُس وقت پاکستان کے اندر رہ کر ظلم و تشدد کے جو پہاڑ ہم پر گرائے جا رہے تھے اُن سے بچنے کے لیے وہاں جا کر کام کرنا آسان تھا'' (۱۲۳)

پیپلز پارٹی کے ساتھ قریبی تعلق کی وجہ سے جنرل ضیاء کے مارشل لانے جن لوگوں کو جیلوں میں بند کر کے بے پناہ تشدد کا نشانہ بنایا اُن میں قمر عباس بھی شامل تھے۔رہا ہونے کے بعد وہ امریکہ چلے گئے۔1986ء میں جب بے نظیر بھٹو اپنی جلاوطنی ختم کر کے برطانیہ سے پاکستان آئیں تو اُس نے قمر عباس کو بھی پاکستان واپس بلا لیا۔اپنے بڑے بھائی اور عزیز رشتہ داروں کی منت سماجت کے باوجود آپ نے امریکہ میں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا۔وہ سیاست کے لیے بنے تھے اور سیاست کے بغیر اُن کی زندگی ادھوری تھی۔19 اکتوبر 1988ء کے عام انتخابات میں وہ پشاور کے، پی کے II سے صوبائی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔اِس دوران مرکز اور صوبے میں آپ کی پارٹی کی حکومت بنی چنانچہ اپنے صوبے میں وزیر قانون بنائے گئے۔اِس کے بعد 1993ء کے عام انتخابات میں اپنے اِسی حلقے سے ایک مرتبہ پھر تمام سیاسی جماعتوں کا مقابلہ کیا اور صوبائی اسمبلی کے ممبر بن گئے۔اِس مرتبہ اُنہیں صوبائی کابینہ میں وزارت جیل خانہ جات کا قلم دان دیا گیا۔آپ نے اِس موقع پر ملکی اور مقامی سطح کی سیاسی اُتار چڑھاؤ کا خوب ذکر کیا ہے۔

ہمارے ملک میں عام انتخابات (بالخصوص سینٹ کے انتخابات) میں ووٹ خریدنے کے لیے جو بولیاں لگتی ہیں اور جو جو ہتھکنڈے استعمال کیے جاتے ہیں اُن کا پردہ قمر عباس کچھ اِس طرح چاک کرتے ہیں (یہ 1993ء کے الیکشن کی صورتحال تھی۔حالات آج بھی کچھ زیادہ مختلف نہیں خصوصاً دیہی علاقوں میں):

''میرے حلقے میں آٹھ سرائیں تھیں جن میں غریب مزدوروں کے کم از کم ڈیڑھ ہزار ووٹ تھے مکمل بک گئیں۔قرآن پر ہزار کا نوٹ رکھا گیا ہر شخص نے اِس پر ہاتھ رکھا اور کہا کہ اگر میں نے سید علی شاہ (قمر عباس کے مخالف اُمیدوار) کو ووٹ نہ دیا تو مجھ پر بیوی طلاق ہے نوٹ اُٹھایا اور بڑی ایمانداری سے جا کر شیر پر نشان لگایا''(۱۲۴)

ہمارے ملک میں قومی اسمبلی یا صوبائی اسمبلی میں سادہ یا معمولی اکثریت سے جیت کر حکومت بنانا بے حد مشکل کام ہے۔ اتحادی پارٹیوں اور آزاد اُمیدواروں کے ناز نخرے اُٹھانے پڑتے ہیں اور منتخب حکومت اُن کے اشاروں پر چلتی ہے جس سے نہ صرف لوٹ مار کا بازار گرم ہو جاتا ہے بلکہ حکومتیں بھی ناکام ہو جاتی ہیں۔ قمر عباس نے اِس موضوع پر بھی کھل کر اظہار خیال کیا ہے۔ اُس نے ۱۹۹۳ء کے صوبائی حکومت کے متعلق اپنی معلومات کی روشنی میں بتایا ہے کہ زیادہ تعداد میں منتخب ہونے والے آزاد اراکین اسمبلی اور چھوٹی چھوٹی پارٹیوں کے اراکین کس طرح اپنی مرضی سے حکومتیں چلاتے تھے جو ہماری پارلیمانی نظام کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔ اِس سلسلے میں مصنف نے باقاعدہ اُن ارکان اسمبلی کے نام لیے ہیں جو فروخت ہوئے تھے اور رقم بھی بتائی ہے کہ کس شخص نے کس پارٹی سے کتنے پیسے وصول کیے تھے۔ اِس بات کا کسی سطح پر بھی بعد میں نہ تو کوئی جواب آیا اور نہ قمر عباس کی اِس الزام کی تردید سامنے آئی۔ آپ بیتوں میں عموماً مصنف نام اخفائے راز میں رکھتے ہیں وہ خوف خلق یا کسی اور مصلحت کی بنا پر نام ظاہر کیے بغیر الزام لگاتے ہیں اِس لیے بسا اوقات ہماری اُردو آپ بیتیاں یک رُخی اور غیر متوازن ہو جاتی ہیں۔ قمر عباس اِس بات کی پروا نہیں کرتے وہ جہاں مناسب سمجھتے ہیں لوگوں کے نام تک لکھ لیتے ہیں سچی اور حق بات کہتے وقت وہ اِس بات کا خیال نہیں رکھتے کہ یہ میری اپنی پارٹی کا بندہ ہے یا اِس بات سے میری اور اُس بندے کا سماجی مقام گر جائے گا۔ قمر عباس اپنی پارٹی یعنی پاکستان پیپلز پارٹی پر بھی کڑی تنقید کرتے ہیں اور اس سلسلے میں وہ کسی کے ساتھ رورعایت نہیں کرتے:

> ''دراصل جب پارٹی حکومت میں آجاتی ہے ہمارے سیاست دان حکومت کو زیادہ اہمیت دینے لگتے ہیں اور اپنی بنیاد یعنی پارٹی کو کم توجہ دیتے ہیں۔ اُن کو یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ جس عمارت پر کھڑے بھڑکیں مار رہے ہیں اگر اس کی بنیاد ہی گر گئی تو اِن بھڑکوں کا کیا حشر ہوگا؟ پیپلز پارٹی کی بھی یہ بدقسمتی رہی ہے کہ حکومت میں آنے کے بعد ہمیشہ کارکنوں کا سامنا کرنے سے گریز کیا گیا۔ بیروکریسی پر تکیہ کرنا شروع ہوا اور اسی چیز نے کارکنوں کو پارٹی سے بدظن ہونے کا موقع دیا۔''(۱۲۵)

سیاسی جماعتوں کے اندر بعض رہنماؤں میں سخت اختلافات ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ اختلافات بڑھتے بڑھتے خوفناک صورت اختیار کر جاتے ہیں جس سے سیاسی جماعتوں، حکومتوں اور نتیجے کے طور پر عوام کو نقصان اُٹھانا پڑتا ہے۔ آپ نے اپنی پارٹی میں موجود چپقلشیں، مجادلے اور لڑائی جھگڑوں کو بھی بے نقاب کر کے بتایا ہے کہ صرف ہمارے دیگر اداروں

میں ہی نہیں سیاسی جماعتوں میں بھی ٹانگ کھینچنا معمول ہے۔

قمر عباس ۱۹۹۶ء کے انتخابات میں پشاور شہر سے قومی اسمبلی کے لیے این اے 1 سے غلام احمد بلور کا مقابلہ کر رہے تھے۔ عین پولنگ کے دن ایک پولنگ سٹیشن کے باہر غلام احمد بلور کے بیٹے شبیر بلور کے ساتھ ایک جھڑپ میں اُسے قتل کیا اور جیل چلے گئے۔ قمر عباس نے اپنی آپ بیتی میں بڑی صفائیاں پیش کی ہیں کہ یہ قتل غیر ارادی طور پر اُن کے باڈی گارڈ سے ہوا تھا اور اُس نے اپنے باڈی گارڈ کو گولی چلانے کا حکم نہیں دیا تھا۔ ہائی کورٹ نے اُنہیں بعد میں اِس کیس سے بری کر دیا جس سے اُس کے بیانیے کو تقویت ملتی ہے۔ بہر حال اُنہیں دو سال جیل میں گزارنے پڑے اور مذکورہ آپ بیتی اُن کے اُن ہی ایام اسیری کی یادگار ہے۔

"وزیر جیل سے اسیر جیل تک" کے مصنف نے سیاست سے ہٹ کر دیگر معاملات پر بھی گفتگو کی ہے۔ سید قمر عباس نے جن دیگر موضوعات پر قلم اُٹھایا ہے اور حیران کن انکشافات کیے ہیں اُن میں چند ایک درج ذیل ہیں:

ا۔ امریکہ میں آپ نے ۱۹۸۲ء سے ۱۹۸۷ء کے زمانے تک قیام کیا۔ یہاں آپ نے خوب محنت کی بلکہ بقول آپ کے ۲۴، ۲۴ گھنٹے کام کیا۔ پٹرول پمپوں پر محنت مزدوری کی اور دیگر مزدوروں کے ساتھ بوجھ اُٹھایا۔ قمر عباس نے نہایت سچائی اور ایمانداری سے وہاں کے شب و روز کے بارے میں بتایا ہے اور کوئی لاف زنی یا جھوٹ کا سہارا نہیں لیا۔

مصنف کو اپنے ملک کی مٹی سے پیار ہے اس لئے نیویارک اور کیلی فورنیا میں بھی پشاور شہر کے تنگ و تاریک گلیوں اور قصہ خوانی بازار کو یاد کر کے آہیں بھرتا ہے:

> "لیکن اب مجھے اپنے ملک کی یاد ستانے لگی۔ قصہ خوانی یاد آتا، دوست عزیزوں کی یاد ستانے لگی۔ اپنے ملک کی محبت بھی عجیب چیز ہے۔ اپنی مٹی سے پیار انسان کے اندر رچا ہوا ہے۔ ہم کتنا ہی چاہیں اپنے گھر کی خوشبو سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے"۔ (۱۲۶)

۲۔ پیسہ کمانا قمر عباس کا کبھی مطمع النظر نہیں رہا۔ اگر وہ چاہتے تو سیاست اور وزارت سے بہت کچھ بنا سکتے تھے لیکن اُس کا مقام اور مقصد بہر حال ان چیزوں سے بلند تھا۔ اپنی سرگزشت میں اس نے اپنے یک طرفہ اور ناکام عشق کا بھی بین السطور ذکر کیا ہے۔ یہ اِس آپ بیتی میں واحد مقام ہے جہاں مصنف کا قلم پردہ داری کی جانب مائل ہے اور دلیرانہ سچائی سے کام نہیں لیا۔ امریکہ سے واپسی کے فوراً بعد یعنی ۱۹۸۸ء میں اُن کی شادی "عزرا" نامی ایک لڑکی سے ہوئی۔ قمر عباس اپنی خودنوشت میں جگہ جگہ اپنی بیوی کا ذکر بہت احترام سے کر کے اُنہیں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ قمر عباس معاف کرنے کو بزدلی اور بدلہ لینا بہادری کی نشانی سمجھتے ہیں۔ پٹھان ہونے کی وجہ سے دریادِلی اور معافی کو کسرِ شان سمجھتے ہیں۔ ہمارے صوبے کے سابق گورنر جنرل فضل حق نے اُنہیں اپنی گورنری کے زمانے میں ظلم و ستم کا نشانہ بنایا تھا۔ موقع ملنے پر قمر عباس اُن سے کیسے

انتقام لیتے ہیں۔ اس واقعے سے اُس کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیات اور مزاج کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے:

''اسد نوید اُسے لے کر میرے پاس آیا۔ میرا دِل اُس کے خلاف ہمیشہ سے بھرا ہوا تھا۔ اُس نے ہاتھ آگے کیا تو میں نے ہاتھ ملانے سے انکار کر دیا۔ وہ بھڑک اُٹھا۔ میں نے اُسے خوب کھری کھری سنائیں اور نوبت گریبانوں تک ہاتھ پہنچنے کو آگئی۔ لوگوں نے ہمیں الگ کیا اور دوسرے دِن اِس واقعے کو اخباروں نے شائع کر دیا۔'' (۱۲۷)

۳۔ سچائی، خلوص، مشاہدہ اور آزادانہ اظہارِ خیال اِس آپ بیتی کی وہ خوبیاں ہیں جو اِس کو اپنے ہم عصر آپ بیتوں میں ممتاز کرتی ہیں۔ قمر عباس حق بات کہنے میں خوف محسوس نہیں کرتے۔ اُنہیں جو بات ٹھیک لگتی ہے اُس کا بے دھڑک اظہار کرتے ہیں۔ چنانچہ مشہور صحافی مجیب الرحمٰن شامی اور الطاف حسین قریشی کو ایجنسیوں کا ایجنٹ قرار دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں اپنی آپ بیتی میں بعض ایسی سچائیاں بھی بیان کی ہیں جو مختلف مجبوریوں کے سبب لوگ کم از کم اُس شخص کا نام لے کر آشکارا نہیں کرتے ہیں۔ چین کے ایک سرکاری دَورے سے واپسی پر جب جہاز میں بے نظیر صاحبہ نے اُن کے ایک دوست سے شاپنگ کی چیزیں دیکھنا چاہیں تو اُس موقع پر جو ناقابل بیان صورتحال بنی، اِس کا ذکر قمر عباس کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

''اب سعید احمد خان بھی بیگ لے کر کھڑے تھے۔ بی بی نے اُن سے پوچھا، اچھا آپ نے بھی شاپنگ کی ہے تو اُنہوں نے اپنا بیگ میرے آگے رکھ دیا۔ میں نے ایک دو چیزیں نکالیں تو سعید احمد خان نے گھبرا کر پشتو میں کہا: یار! میں غلط بیگ لے آیا ہوں۔ اِس میں میری بیگم کے بلاوز رپڑے ہیں۔ اب حیران کہ اگر نکالوں تو بے عزتی ہے، نہ نکالوں تو بی بی اشتیاق سے دیکھنے بیٹھی ہے۔ میں نے کھسیانی ہنسی ہنسی اور گھبرا کر کہا: بی بی جی! یہ سارا بیگ ان ہی چیزوں سے بھرا ہوا ہے۔ اُنہوں نے کہا ٹھیک ہے اور میں نے بیگ جلد سعید کے حوالے کیا۔ بعد میں ہم کافی دیر تک ہنستے اور اس واقعے کے مزے لیتے رہے۔'' (۱۲۸)

۴۔ قمر عباس نے یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ شاہنواز بھٹو کے دنیا کے تمام دہشت گرد گروپوں اور جنگجو کمانڈروں کے ساتھ روابط تھے۔ نیز اُنہیں ضیاء الحق نے مروایا تھا۔ ضیاء الحق نے یورپ میں بھی اُن کے پیچھے ریاستی خفیہ ایجنسیاں لگا رکھی تھیں۔ جو نہی اُنہیں موقع ملا تو اُسے اپنی افغان بیوی سے قتل کروایا۔ ضیاء الحق کو یہ خطرہ تھا کہ شاہنواز بھٹو اُنہیں جان سے مار دے گا۔ اِس لیے وہ ہر قیمت پر دونوں بھائیوں کو راستے سے ہٹانا چاہتا تھا۔ میر مرتضیٰ بھٹو کے قتل میں البتہ وہ بڑی طاقتوں کی

ملوث ہونے کا انکشاف کرتا ہے۔آج تک تو ہم یہ سنتے آئے تھے کہ وہ اپنے خاندان کے اندرونی سازشوں کا شکار ہوا تھاتاہم قمر عباس کو اُس کے قتل میں بیرونی ہاتھ نظر آتے ہیں۔وہ یہ انکشاف بھی کرتا ہے کہ بین الاقوامی ایجنسیوں نے میر مرتضیٰ بھٹو کو اُس وقت کے پیپلز پارٹی کے اپنے صدر فاروق لغاری کے ذریعے قتل کیا تھا:

''چہلم (میر مرتضیٰ بھٹو کا چہلم) سے پہلے ہم اسلام آباد پہنچے اور بے نظیر بھٹو کے ساتھ ایک اجلاس میں پرائم منسٹر ہاؤس میں ملے۔بی بی کا بھی خیال تھا کہ اِس سازش کے ڈانڈے بہت گہرے ہیں۔ لغاری کے ملوث ہونے میں بھی بی بی کو سو فیصد خیال تھا کیونکہ اِس عرصہ میں فاروق لغاری سے تعلقات انتہائی کشیدہ ہو چکے تھے۔''(۱۲۹)

۵۔ قمر عباس کے بقول بے نظیر کی قتل کا منصوبہ کئی بار تیار ہوا لیکن بعض وجوہات کی بنا پر ناکام رہا۔جب اِس معاملے پر مصنف کی بے نظیر بھٹو سے بات ہوئی تو اُنہیں بھی اِس بارے میں معلومات تھیں۔قمر عباس کے خیال میں تین بڑی طاقتیں صیہونیت، ملکی ایجنسیاں اور دہشت گرد تنظیمیں اُنہیں مارنے کے لیے یکجا ہو گئیں تھیں۔اِس کے علاوہ جب وہ وزیر اعظم تھیں تو وزیر اعظم ہاؤس میں اُن کے فون ٹیپ ہوتے تھے۔بے نظیر نے خود اُنہیں ٹیپ کرنے والے آلات دکھائے تھے۔

٦۔ آپ نے بے نظیر بھٹو کے دونوں ادوار اور نواز شریف کے وزارتِ عظمیٰ کے زمانے میں کئی بیرونی ممالک کے سرکاری دورے کیے جو کئی ہفتوں پر محیط تھے جن میں کوریا، تھائی لینڈ، چین اور ایران کے دورے شامل ہیں لیکن آپ نے اپنی آپ بیتی میں اِن دوروں کی کچھ زیادہ تفصیلات نہیں دی ہیں۔آپ نے کئی بڑے بڑے سیاسی رہنماؤں، کھلاڑیوں اور سماجی لحاظ سے بلند مرتبہ لوگوں کے نام لے کر اُن کی بے وفائیوں، طوطا چشمی اور ابن الوقتی کی مثالیں دے کر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ بڑے لوگوں کا کوئی ایمان نہیں ہوتا۔ قمر عباس کا عقیدہ ہے کہ انسان کی دُعا ضرور قبول ہوتی ہے، اگر خلوصِ نیت سے مانگی جائے۔اگر کوئی دُعا خانہ کعبہ میں مانگی جائے تو اُسے شرف قبولیت میں دیر نہیں لگتی۔ قمر عباس نے یہ دلچسپ انکشاف بھی کیا ہے کہ وہ خانہ کعبہ میں اپنی شہادت کی دُعا مانگتا رہا:

''میں نے اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگی کہ میرے رب! میں نے اب تک جو دُعائیں مانگی ہیں وہ بیشک قبول نہ کر لیکن ایک دُعا قبول کر لے۔ میں نے اپنے رب سے شہادت کی موت مانگ لی۔ میں روتا جاتا تھا اور میرے منہ سے صرف یہ دُعا نکلتی رہتی کہ اے میرے مالک! مجھے شہادت کی موت دے دے۔ میں اب آخرت

مانگنا چاہتا ہوں۔ سرخروئی چاہتا تھا۔ اس کے حضور آخرت میں سر اُٹھا کر پہنچنا چاہتا تھا۔" (۱۳۰)

۷۔ قمر عباس مرحوم نے اپنی وزارت جیل کے دوران صوبہ بھر کے جیلوں میں جو اصلاحات نافذ کیں، اُن کی تفصیلات دی ہیں۔ آپ نے اِس کتاب میں جگہ جگہ بیورو کریسی کا رونا رویا ہے اور تفصیل سے بتایا ہے کہ سیکرٹری اور اس سے نچلے سطح کے لوگ کس طرح عوامی نمائندوں کے جائز اور قانونی کاموں کو سُرخ فیتے کی نظر کرتے ہیں۔ آپ نے اپنی وزارت میں جو جیل اصلاحات کیے، اُن میں چند ایک یہ ہیں:

"۱۔ آپ نے قیدیوں کو جیل کے کپڑے نہ پہننے اور گھر کے کپڑے پہننے کی اجازت دی۔

۲۔ قیدیوں کو جیل میں اپنا کھانا خود پکانے کی اجازت دی۔

۳۔ جیلوں کے اندر ٹک شاپس بنائیں۔

۴۔ ہر بارک میں ٹی وی لگایا۔

۵۔ قیدیوں کو اخبارات اور خطوط لکھنے کی اجازت دے دی گئی۔

۶۔ جیل کے سارے کمبل اور بستر ہٹا دیئے گئے اور قیدیوں کو گھروں سے بستر اور کمبل لانے کی اجازت دے دی گئی۔

۷۔ قیدیوں کی خواتین سے ملاقات کے لیے ہر ملاقاتی کمرے کے ساتھ علیٰحدہ کمرہ بنایا گیا جہاں صرف خواتین قیدیوں سے ملاقات کر سکتی ہیں۔

۸۔ جیلوں میں فلش سسٹم بنانے کا حکم جاری کیا۔

۹۔ ہر کمرے اور چکی میں پنکھے نصب کرنے کا حکم جاری کر دیا اور چھتر ول پر پابندی لگا دی۔" (۱۳۱)

۸۔ قمر عباس نے غلام احمد بلور کے اکلوتے بیٹے بشیر بلور کی قتل اور اپنے زخمی ہونے کے واقعے کو نہایت تفصیل سے تحریر کر کے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ یہ قتل باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت نہیں بلکہ حادثہ اور اتفاق تھا اور جس میں اُن کے باڈی گارڈوں نے نازک صورتحال کے باعث اُن کے حکم کے بغیر گولی چلائی تھی۔ اُنہیں اِس کیس میں ڈھائی سال کا عرصہ جیل میں گزارنا پڑا۔

اِس آپ بیتی کا آخری باب قمر عباس کے بھائی طاہر عباس نے اُن کی موت کے بعد تحریر کر کے آپ بیتی میں شامل کیا ہے۔ باب کا نام ہے ''اسیر جیل سے لقمہ اجل تک''۔ طاہر عباس نے اپنے بھائی کے الفاظ میں کہانی سنائی ہے جو فاش غلطی ہے۔ اُنھیں اپنے الفاظ میں صیغہ واحد غائب میں یہ سر گزشت سنانی چاہیئے تھی۔ یہاں ایک عام قاری بیان میں فرق نہیں کر سکتا کہ یہ بیان کون کر رہا ہے۔ اپنی موت کی کہانی اپنی زبانی کچھ مضحکہ خیز لگتا ہے۔ آج تک کسی شخص نے اپنی موت کی کہانی نہیں لکھی:

> ''میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ دو کانوں کے شٹر اُترنے کی آوازیں میرے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ شاید موقع کے چشم دید گواہ رفوچکر ہونے کی تیاری کر رہے تھے۔ میری نظروں میں محمد علی کی ماں کا چہرہ گھومنے لگا۔ اُس کی معصوم بہنیں اور چھوٹا بھائی یہ صدمہ کیونکر سہہ سکیں گے۔۔۔۔۔۔۔۔۔
> زندگی کی سانسیں ختم ہونے کو تھیں کہ مجھے چند ہاتھوں کا لمس محسوس ہوا۔ غالباً ہمیں کسی گاڑی میں ڈالا جا رہا تھا لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ اب کلمہ شہادت ہی ہمارا آخری علاج تھا۔ مجھے اپنے حلق میں شہادت کی شیرینی محسوس ہوئی۔ شاید یہ شہادت کی موت کا ذائقہ تھا جس کی میں ہمیشہ آرزو کرتا رہا۔'' (۱۳۲)

جب ہم زبان و بیان اور طرزِ تحریر کے حوالے سے مذکورہ آپ بیتی کا تجزیہ کرتے ہیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ بحیثیت مجموعی اِس آپ بیتی کی ایک منفرد شان ہے۔ قمر عباس کو اُردو ادب پر قدرت حاصل تھی۔ علم و ادب اُس کو وراثت میں ملا تھا۔ اُس نے ایک لکھے پڑھے اور عالمانہ ماحول میں آنکھ کھولی تھی۔ بچپن ہی سے وہ اپنے گھر اور بیٹھک میں مقامی اور ملکی سطح کے نامور شاعر، ادیب، صحافی، صوفیاء، علماء اور دانشور دیکھ رہا تھا۔ چنانچہ اس کا زبان و بیان پر قدرت اور ادب سے لگاؤ ایک فطری امر ہے۔ جب ہم اس آپ بیتی کی اسلوب کے لحاظ سے تحقیق کرتے ہیں تو ہمیں یہاں کئی اسلوب ملے جلے ملتے ہیں۔ قمر کبھی ایک اسلوب پر قانع نہیں ہوتے بلکہ موقع کی مناسبت سے سادہ، سلیس، رنگین، خطیبانہ اور طنزیہ یا مزاحیہ اسلوب سے کام لیتے ہیں جو اُردو زبان پر اُن کی دسترس ظاہر کرتی ہیں۔ قمر عباس کا اُردو نثر کا کافی مطالعہ تھا۔ اِس کا ثبوت یہ ہے کہ اُن کا اُردو ذخیرہ الفاظ بہت زیادہ ہے۔ ذخیرہ الفاظ کا تعلق لگاتار مطالعے سے ہے۔ جس آدمی کا مطالعہ خصوصاً کلاسیکیت کا مطالعہ وسیع ہو، اُسے انتخاب الفاظ اور ادائیگی الفاظ میں دُشواری پیش نہیں آتی۔

قمر عباس کو رواں اسلوب سے خصوصی شغف ہے۔ وہ الفاظ کے صوتی ترتیب کا خاص خیال رکھتے ہیں جن سے اُس کی نثر میں ایک طرح کا آہنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ آہنگ مصنوعی الفاظ، لفاظی، معرب اور مفرس لفظوں سے ترتیب نہیں پاتا

بلکہ لہجے کے اندرونی جوش سے پیدا ہوتا ہے۔اِس لیے اس پر تکلف، آورد اور بناوٹ کا الزام بھی نہیں لگایا جا سکتا۔ ذوالفقار علی بھٹو کی پہلی دفعہ لاہور ریلوے اسٹیشن پر تاریخی استقبال کا بیان مذکورہ بالا اسلوب میں کرتے ہیں:

"بھٹو صاحب پر لوگوں نے اپنی محبتیں نچھاور کرنی شروع کر دیں۔ وہ ایک تاریخی لمحہ تھا، ایک تاریخ لکھی جارہی تھی۔ یہ جمہوریت کی بحالی کی تاریخ تھی، یہ وہ وقت تھا جب ایشیاء کو عظیم لیڈر شپ مل رہی تھی، آمریت لرزہ براندام تھی، پنجاب کے جاگنے کی خوشخبری تھی، پاکستان کے مزدوروں اور کسانوں کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے، محروم طبقات کے جاگنے کا وقت تھا، جاگیر دار اور سرمایہ دار ان نعروں سے خوفزدہ تھے، سامراجی قوتیں اپنا انجام دیکھ رہی تھیں، بڑے بڑے پگ گرنے والے تھے، نام نہاد لیڈر خوف زدہ تھے۔"(۱۳۳)

سیاسی آپ بیتوں میں عموماً خطیبانہ، سادہ اور واقعاتی اسلوب دیکھنے کو ملتا ہے۔ سیاسی کہانیاں غیر جزیاتی، ٹھوس اور مدلل ہوتی ہیں اِس لیے اِن کے بیان میں رومانوی، انانیتی اور ڈرامائی اسلوب کی گنجائش نہیں بنتی لیکن جہاں تک مذکورہ آپ بیتی کے اسلوب کا تعلق ہے، مصنف نے موقع محل کے مطابق عنوان کی مطابقت سے کئی اسالیب کا سہارہ لیا ہے۔ اس آپ بیتی میں کئی مواقع ایسے آتے ہیں کہ مصنف دِلسوز تحریر میں اپنا بیان لکھ کر قاری کو اپنے بیان کے سحر میں مبتلا کر دیتا ہے۔ جس وقت اُس کے باپ فارغ بخاری فوت ہوئے، اُس وقت آپ پشاور سنٹرل جیل میں قید تھے۔ چنانچہ اپنے والد کے آخری دیدار کے لیے جب اُنہیں پے رول پر آبائی گھر لایا گیا تو اس موقع پر اُن کی پُر سوز، دلگداز اور دلسوز اسلوب کا نمونہ ملاحظہ کیجئے:

"۱۲ بجے رات ہتھکڑیاں لگا کر پہرے میں مجھے والد کا آخری دیدار کرنے کے لیے لے جایا گیا۔ گھر میں ایک کہرام تھا۔ لوگ جمع تھے۔ مجھے دیکھ کر سب کے آنسو اُبل پڑے، عورتوں نے بَین کئے اور میں خالی آنکھوں سے اپنے باپ کے قدموں میں بیٹھ کر اُنہیں چومنے لگا۔ میں نے اُنہیں ساری عمر دُکھ دیئے اور آخری صدمے کا ذمہ دار بھی میں ہی تھا۔"(۱۳۴)

اُن کے ہاں شاعرانہ اسلوب کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ اپنے ایک دوست اور پیپلز پارٹی کا رُکن حق نواز گنڈاپور کی شہادت پر بڑی پُر سوز نظم لکھی ہے جو آپ کے اچھے شاعر ہونے کی دلیل ہے۔ افسوس کہ سیاست کی سرگرمیوں نے اُنہیں شعر وادب کی طرف یکسو نہ کیا ورنہ وہ ایک قادر الکلام شاعر اور ادیب ہو سکتے تھے:

"گنڈاپور کا لہو رائیگاں نہ جائے گا
بے گناہ کا خون ہے اپنا رنگ لائے گا
دیکھنا ضرور یہ کوئی گل کھلائے گا
بانیانِ ظلم کو خاک میں ملائے گا
قاتلو جواب دو
خون کا حساب دو"(۱۳۵)

بنیادی طور پر سید قمر عباس ایک سنجیدہ اور خاموش طبع انسان تھے۔ تاہم ہنسی مزاح کی حِس بھی اُس کی شخصیت میں موجود تھی گو کہ وہ انتہائی قریبی حلقہ احباب کے سوا کسی سے بے تکلف نہیں ہوتے تھے اور یہ جو کہا گیا ہے کہ اسلوب شخصیت ہی کا دوسرا نام ہے تو یہ بات کچھ زیادہ غلط بھی نہیں۔ اُس کی تحریر میں کہیں کہیں طنزیہ اور مزاحیہ اسلوب کے نمونے بھی ملتے ہیں:

"چین کے ایک سرکاری ڈنر میں ہمیں تلے ہوئے بچھو پیش کئے گئے۔ ہم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ بچھو بھی چینیوں سے نہیں بچ سکے۔ جب میں نے انکار کیا تو اُن کے ترجمان نے بتایا کہ یہ ہمارے فارم کے پالتو بچھو ہیں اور چین کی بہت مہنگی ڈش ہے۔ دوسرا یہ کہ اس کے کھانے سے ایک سال تک آپ کو پھوڑے پھنسیوں سے نجات مل جائے گی۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور کہا ویسے بھی کئی سالوں سے مجھے پھوڑے پھنسیاں نہیں نکلیں۔ یہ چینیوں کے چہرے اِس لئے صاف اور چکنے ہوتے ہیں۔ کاش! ہمارے پٹھان بھائیوں کو بھی کوئی اِس ڈش کے لطف سے آشنا کرائے۔"(۱۳۶)

بعض موقعوں پر قمر عباس جذباتی انداز اختیار کرتے ہیں۔ اُن کا جذباتی انداز پڑھنے والوں کو بھی جذباتی کرتا ہے۔ اپنی بہن کی ایکسڈنٹ اور پھر موت کا ذکر اِس اسلوب میں کرتے ہیں:

"میں نے گھبرا کر اپنی بیوی فرحت کو لیا اور ڈرائیور کے ساتھ ۱۲۰ میل کی رفتار سے روانہ ہوا۔ سارے راستے میں دُعائیں مانگتا رہا کہ خدایا! خیر کرنا۔ اٹک پُل پر پولیس موبائل نے مجھے روکا اور کہا کہ واپس جائیں۔ زخمی پشاور چلے گئے۔ گاڑی واپس ہوئی اور اسی رفتار سے جب میں بہن کے گھر پہنچا تو اُس کی لاش پڑی تھی۔ عزرا میری بہن مجھ سے جدا ہو چکی تھی۔ اب میں اُسے کبھی نہ دیکھ سکوں گا۔"(۱۳۷)

مصنف اپنی کتاب کا ہر باب کسی مشہور شعر پر ختم کرتا ہے۔ اشعار کا انتخاب انتہائی موزوں ہوتا ہے۔ موقع کی مناسبت سے خوبصورت شعر کا استعمال مصنف کی عمدہ ذوق کو ظاہر کرتا ہے۔ نواز شریف کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد احتساب کے نام پر جن مخالف سیاستدانوں کو جیلوں میں ڈالا گیا اُن میں قمر عباس بھی تھے۔ اُس باب کو غالب کے اِس شعر پر ختم کرتے ہیں:

''پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دَم تحریر بھی تھا'' (۱۳۸)

اِس طرح جیل کی سر گزشت میں رات پچھلے پہر اپنی کال کوٹھڑی کے باہر تعینات پہرے دار کے خراٹوں کی آواز سن کر شاد عظیم آبادی کے ایک شعر پر اپنا مضمون ختم کرتے ہیں:

ہے اعتماد مرے بخت خُفتہ پہ کیا کیا
ورنہ نیند کہاں چشم پاسباں کے لیے (۱۳۹)

قمر عباس کی زبان پر پشتو کا کافی اثر معلوم ہوتا ہے بلکہ ساری آپ بیتی پشتو کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ مصنف کی تحریر وہاں کافی کمزور ہو جاتی ہے جب وہ پشتو زبان سے براہِ راست اُردو میں ترجمہ کرتے ہیں۔ ہر زبان کا اپنا ایک طریقہ کار ہے۔ کسی اور زبان سے بلواسطہ ترجمہ تحریر اور تقریر کا اثر زائل کر دیتی ہے:

''بہر حال اِس سے خاصی تو تو میں میں ہوئی اور ہم ساتھ ہی تھانے پر جا چڑھے۔''(۱۴۰)

''یہی وجہ ہے کہ میں سیاست میں بڑے بڑے کروڑ پتیوں اور طُرم خانوں کے مقابلے میں کامیاب رہا۔''(۱۴۱)

پشتو زبان سے براہِ راست پشتو کے روز مرے اور محاورات ترجمہ کرنے کی مثالیں بھی درج ہیں:

۱۔ ''میں نے خبریں لگائیں تو خبر کا یقین آیا''۔(۱۴۲)

۲۔ ''نواز شریف نے صدر اسحاق کو غلط پیمانے سے ناپا''۔(۱۴۳)

۳۔ ''مولانا نے ہر ٹکٹ پر ضد کی''۔(۱۴۴)

۴۔ ''لیکن ہوا یہ کہ مصالحہ زیادہ لگ جانے کی وجہ سے پیپلز پارٹی مکمل آوٹ کر دی گئی''۔(۱۴۵)

۵۔ ''اُس نے بے تحاشا گالیاں نکالنی شروع کر دیں''۔(۱۴۶)

اِس قسم کی درجنوں مثالیں ہیں جس میں مصنف اپنی پٹھان اصلیت نہیں چھپا سکے اور پشتو محاورات، روزمروں، تراکیب اور اصطلاحات کا براہ راست ترجمہ کیا حالانکہ اِن الفاظ کے مترادف اور متبادل اُردو میں کثیر تعداد میں موجود تھے۔

سید قمر عباس بعض اوقات بات کو صاف، واضح اور دوٹوک انداز سے نہیں لکھ پاتا۔ اس وجہ سے اُس کی تحریر میں الجھن اور اٹکاؤ کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ طویل پیرا گراف لکھتے وقت وہ فاش غلطیاں کرتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے فقروں میں تو گزارہ ہو جاتا ہے لیکن طویل اقتباسات اور لمبے فقروں میں وہ اپنا مافی الضمیر پوری طرح واضح نہیں کر پاتا۔ اُس نے کہیں کہیں اُردو کے غلط محاورات اور روزمرات بھی لکھے ہیں جس سے ابلاغ کو نقصان پہنچا ہے۔ مثلاً ایک جگہ مشہور سیاسی رہنما پرویز رشید کے بارے میں کہا ہے کہ "پرویز رشید اپنے چکروں میں مست تھا" اپنے چکروں میں مست ہونا تو اُردو لغت میں کوئی محاورہ نہیں۔ غرض اگر خالص ادبی نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو مصنف کو زبان و بیان پر وہ قدرت حاصل نہیں جو اُن سے فارغ بخاری کے فرزند ہونے کے ناطے توقع تھی۔

اس آپ بیتی کی ایک بڑی خامی یہ بھی ہے کہ مصنف نے جگہ جگہ اخلاق باختہ زبان بلکہ گالیاں تک لکھی ہیں جو کسی بھی تعلیم یافتہ شخص یا قومی سطح کے سیاست دان کے لیے زیبا نہیں۔ آپ بیتیاں گھروں میں اور سکولوں کی لائبریریوں میں نئی نسل کو پڑھنے کے لیے رکھی جاتی ہیں اس کے علاوہ ایک سیاسی آدمی درجنوں نوجوانوں کا آئیڈیل ہوتا ہے اُسے اپنی تقریر اور تحریر میں انتہائی شائستہ زبان استعمال کرنا چاہیے:

> "(۱) ایران نے اُنہیں دنیا بھر میں ننگا کر دیا تھا۔ (۲) میں نے اُس لعنتی بہن چود کو کئی مرتبہ سمجھایا تھا لیکن باز نہیں آتا۔ (۳) بدقسمتی سے وہی چند چھچھورے چچے اُوپر سے نیچے تک محض اپنی معاشی حالت سدھارنے کی خاطر ہماری حکومت کا گھیراؤ کر چکے تھے۔"(۱۴۷)

وزیر جیل سے اسیر جیل تک کے مصنف سید قمر عباس نے انگریزی الفاظ کا استعمال بھی غیر ضروری اور بہت زیادہ کیا ہے۔ وہ ہر فقرے میں انگریزی الفاظ لاتے ہیں حالانکہ وہاں اردو کے خوبصورت الفاظ سے وہ اپنی تحریر کو معیاری بنا سکتے تھے۔

> " ڈیولپ کرنے (ترقی دینا) ،انڈر گراؤنڈ وائر (زیر زمین تار)، ڈس انفارمیشن، ووٹ آف نو کالفیڈینس (تحریک عدم اعتماد)، پرابلم میں تھا (مشکل میں تھا) ، میں جیل برڈ تھا (عادی مجرم تھا) ، پارٹی کریم (پارٹی کے اہم لوگ) ، ارینج کی (ترتیب دیا)"۔(۱۴۸)

اکثر مصنف انگریزی الفاظ کو اُردو حروف تہجی میں لکھنے کا تکلف بھی گوارہ نہیں کرتے بلکہ انگریزی الفاظ جوں کے توں لاتے ہیں:

''شام کو ایک میوزیکل فنکشن Arrange کردو''۔(۱۴۹)

''ہمارے کیس کا Complainant سہیل صدیق تھا۔'' (۱۵۰)

سید قمر عباس کی تحریر پر اکثر تقریر کا گمان بھی ہوتا ہے خصوصاً جب وہ کوئی غمگیں یا ظلم و زیادتی والا موضوع چھیڑتا ہے تو خود بھی جذباتی ہو جاتا ہے اور اُس کی تحریر متاثر ہو جاتی ہے۔اس موقع پر اُنہیں اپنی تحریر پر کنٹرول نہیں رہتا نتیجتاً اُس کا انداز خطیبانہ ہو جاتا ہے۔اس آپ بیتی میں کئی مقام ایسے آتے ہیں جہاں قاری یہ فرق نہیں کر سکتا کہ ہم مصنف کی کوئی تحریر پڑھ رہے ہیں یا اُس کی تقریر سن رہے ہیں:

''مرتضیٰ بھٹو کا قتل ایک سوچی سمجھی سازش تھی۔یہ پیپلز پارٹی کے مستقبل کا قتل تھا۔یہ پارٹی کو بکھیرنے کی ایک سازش تھی۔یہ اتنے لمبے ہاتھوں کا کام تھا جن کے سامنے ملک کی وزیر اعظم بھی بے بس تھی''۔(۱۵۱)

یہ تو سید قمر عباس کی طرز تحریر اور اسلوب کی خوبیاں اور خامیاں تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ آپ بیتی کئی حوالوں سے خصوصی اہمیت رکھتی ہے اور اس کو پڑھ کر نہ صرف ایک خاص عہد کے سیاسی حادثات و واقعات کا علم ہو جاتا ہے بلکہ کئی سماجی، معاشرتی، سیاسی، علمی اور علاقائی تاریخ درست انداز سے پڑھنے کا موقع بھی میسر آجاتا ہے۔

''وزیر جیل سے اسیر جیل تک'' کے مصنف نے بڑی ہنگامہ خیز زندگی گزاری۔یہاں اُس نے زندگی کو اپنی نگاہ سے دیکھنے اور دیکھانے کی کوشش کی ہے۔اُن کے خیالات، تجربات اور واقعات سے اخذ کردہ نتائج سے متفق ہو نا ضروری نہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مذکورہ آپ بیتی نوجوانوں کو زندگی مردانہ وار بسر کرنے کا پیغام اور سبق دے رہی ہے جو بے حد اہم سبق ہے۔جہاں تک مصنف کی سرگزشت کا تعلق ہے تو بقول پروفیسر عندلیب شادانی:

''سنی سنائی بات نہیں اپنے اوپر بیتی ہے
پھول نکلتے ہیں شعلوں سے، چاہت آگ لگائے جو'' (۱۵۲)

۵۔ ''سچ کہوں گا'' (اعتزاز احسن)

اعتزاز احسن ہمارے ملک کے ایک لائق وکیل، نامی گرامی سیاستدان، دانشور اور پاکستان پیپلز پارٹی کے سنیئر رہنما ہیں۔ اُس نے پاکستان کی سیاسی تاریخ میں کئی بار وکالت اور سیاست کے میدانوں میں اپنی لیاقت کا سکہ جمایا ہے۔ اعتزاز احسن گجرات کے معروف سیاستدان چودھری بہاول بخش کے پوتے اور محمد احسن علیگ کے صاحبزادے ہیں جن کا خاندان قیام پاکستان سے پہلے سے سیاست میں سرگرم ہے۔ آپ نے پاکستان کے اعلیٰ پائے کے تعلیمی اداروں ایچی سن کالج، گورنمنٹ کالج لاہور اور پھر کیمرج یونیورسٹی لندن سے تعلیم حاصل کی۔ پھر وکالت اور سیاست میں ایک ساتھ قدم رکھا۔ وہ پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر گجرات شہر سے پہلی بار ۱۹۷۵ء میں پنجاب اسمبلی کے رُکن منتخب ہوئے اور پھر صوبائی وزیر برائے اطلاعات و ثقافت مقرر کیے گئے۔ اعتزاز احسن نے پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر ۱۹۸۸ء، ۱۹۹۱ء، ۱۹۹۷ء اور ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں لاہور سے کامیابی حاصل کی۔ وہ سینیٹ کے رکن، سینیٹ میں لیڈر آف دی ہاؤس اور لیڈر آف دی اپوزیشن کے اعزازات سے سرفراز ہوئے۔ علاوہ ازیں سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن کے صدر بھی رہے۔

ہمارے ملک میں وکالت اور سیاست کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے اور اعتزاز احسن پچھلے چالیس سال سے سیاست اور وکالت دونوں میدانوں کے نامی گرامی شخصیت ہیں۔ اعتزاز احسن کا شمار ہمارے ملک کے پڑھے لکھے، سنجیدہ، تعلیم یافتہ اور بُردبار سیاستدانوں میں ہوتا ہے۔ پاکستان کی تاریخ و ثقافت پر اُس کی لکھی ہوئی کتاب The Indus Saga (سندھ ساگر) اِس دعوے کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ وہ عموماً انگریزی میں لکھتے ہیں لیکن زیر نظر یادداشتیں اُس نے اُردو میں تحریر کی ہیں۔

اعتزاز احسن پرویز مشرف کے زمانے میں ''عدلیہ بحالی'' تحریک میں پیش پیش تھے۔ اِس تحریک کی وجہ سے بھی اُنہیں ملک گیر شہرت ملی۔ وہ بنیادی طور پر بائیں بازو کی سوچ رکھنے والے، جدت پسند، شخصی آزادی اور میڈیا کی آزادی پر یقین رکھنے والے، حقوق انسانی کے علمبردار اور جمہوریت پسند انسان ہیں۔ اعتزاز احسن کی زیر نظر آپ بیتی ''سچ کہوں گا'' ایک جزوی آپ بیتی ہے جس کے پڑھنے سے ہمیں اعتزاز احسن کی زندگی، اُن کے سیاسی تجربات، خیالات، پاکستان کی سیاست اور سوسائٹی سے متعلق اُن کے مشاہدات اور تاثرات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اعتزاز احسن نے اپنی یادداشتیں ''سچ کہوں گا'' کے نام سے شائع کی ہیں۔ اُن کی یہ یادداشتیں دو ادوار میں منقسم ہیں۔ دور اوّل ''بھٹو صاحب سے محترمہ بے نظیر بھٹو تک'' اور دور ثانی ''نومارچ سے لانگ مارچ تک''۔

اعتزاز احسن کی آپ بیتی ''سچ کہوں گا'' ایک نامکمل اور جزوی آپ بیتی ہے۔ اِس قسم کی آپ بیتی چونکہ خالصتاً آپ

بیتی کی نیت سے نہیں لکھی جاتی اِس لیے یہاں بچپن، جوانی، پیدائش، خاندان اوراِس قسم کے دوسرے عنوانات کو ترتیب وار درج نہیں کیا جاتا۔ مصنف آپ بیتی کے درمیان میں کہیں اختصار اور کہیں تفصیل سے اپنے بارے میں لکھتا ہے۔ اعتزازاحسن کی یادداشتیں پڑھ کر معلوم ہو جاتا ہے کہ اُن کا تعلق ایک زمیندار اور جاگیر دار خاندان سے ہے۔اُن کا خاندان قیامِ پاکستان سے بھی پہلے سیاست میں تھا۔اعتزازاحسن کے دادا''چودھری بہاوٗل بخش''نےاِس خاندان کی سیاسی بنیاد رکھی جب وہ ۱۹۲۲ء میں انڈیا کے قانون ساز کونسل کے رُکن منتخب ہوئے۔ چودھری بہاوٗل بخش ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ میں شامل ہوئے۔ پھر ۱۹۳۳ءاور ۱۹۴۶ء کاالیکشن اُس نے مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے لڑااور کامیاب ہوئے۔اپنی آپ بیتی میں اعتزازاحسن اعتراف کرتے ہیں کہ بچپن ہی سے اُنہیں گھر میں بہترین تعلیمی ماحول ملااور والدین نے اُنہیں ملک کے بہترین تعلیمی اداروں میں پڑھایا:

> ''اللہ کا مجھ پر فضل رہا کہ میں اچھے سکولوں میں پڑھتا رہا ہوں حالانکہ والد صاحب عملی سیاست میں تھے جس کے بڑے اخراجات ہوتے ہیں۔ میرا پہلا سکول کوئین میری ہے۔ کوئین میری سکول کے بعد مجھے ایچی سن کالج میں داخل کرادیا گیا۔ یہ اپنی نوعیت کا منفرد سکول ہے۔ میری رائے میں اس کی انفرادیت آج بھی قائم ہے۔ ایچی سن سکول سے میں گورنمنٹ کالج میں آگیا۔ گورنمنٹ کالج میں جو دو سال گزارے وہ میری زندگی کا بہترین سرمایہ ہیں۔ یہاں سے گریجویشن کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے میں کیمبرج (لندن) چلا گیا۔''(۱۵۳)

آپ نے یہ بھی اعتراف کیا ہے کہ والدین نے اپنے تمام بیٹوں کو ہمیشہ اپنے ذہن سے سوچنے اور اپنا فیصلہ خود کرنے کا حوصلہ دیااور اُن کی تربیت آزاد ماحول میں ہوئی۔اُن پر بچپن میں مضامین کے انتخاب، پڑھنے اور غیر نصابی کتابیں پڑھنے کی کوئی روک ٹوک نہیں تھی حتیٰ کہ پیشے کو اختیار کرنے اور سیاست میں آنے کے حوالے سے بھی اُنہیں والد نے کھلی چھوٹ دے کر کہا کہ زندگی آپ نے گزارنی ہے جیسے آپ کی خواہش ہو وہی کرو۔ چنانچہ ۱۹۷۰ء کو سی ایس پی کا امتحان دیا جس میں وہ ملک بھر میں (مشرقی اور مغربی پاکستان) اوّل آئے مگر آپ نے سول سروس میں جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس فیصلے پر اُنہیں دوستوں رشتہ داروں نے سخت تنقید کا نشانہ بنایا گیا تاہم اُن کے والدین نے اُن کے اِس فیصلے پر ناگواری کا اظہار نہ کیا بلکہ اُن کی بھرپور حوصلہ افزائی کی۔ ملک کا ہر لکھاپڑھا نوجوان سی ایس پی سروسز کو ایک بڑااعزاز سمجھتا ہے لیکن اعتزاز احسن نے اِس کو خاطر میں نہ لایا۔ وہ اِن نوکریوں سے نفرت کا اظہار اِن الفاظ میں کرتا ہے۔اِس سے پاکستان کی بیوروکریسی

کے بارے میں اُن کے خیالات سے بھی بخوبی آگاہی ہو جاتی ہے:

> ''دراصل نوکر شاہی کے بارے میں میرا تاثر تھا کہ یہ عوام سے الگ تھلگ اور عوام کے مسائل سے بالکل بے بہرہ خواص کا ٹولہ ہے۔ یہ نہایت بدعنوان اور بے حس ہے۔ ظاہر ہے یہ ٹولہ عوام کی خدمت پر مامور ہے مگر حقیقت میں ایسا نہیں۔ اِس ٹولے کا جبر بڑا دھیما اور میٹھا ہے۔ یہ عوام کی رگوں میں اُتر جانے والا اندھیرا ہے۔ یہ ٹولہ کہتا ہے کہ وہ عوام کا خدمتگار ہے مگر اصلاً افسری اور شاہی ٹولہ ہے اور میں کسی شاہی سلسلہ کا حصہ بننا نہیں چاہتا تھا۔''(۱۵۴)

انار کلی بازار لاہور میں ایک کم سن بچہ کندھے پر ہینگر کے ساتھ گرم کوٹ لٹکائے سخت سردی اور بارش میں اُنہیں بیچنے کے لئے صدا لگا رہا تھا۔ اعتزاز احسن نے اِس بچے کا اِتنا اثر قبول کیا کہ سول سروس جوائن کرنے کی بجائے عوامی خدمت یعنی سیاست میں جانے کا فیصلہ کیا۔

اعتزاز احسن نے گورنمنٹ کالج لاہور کے زمانے میں سوشلسٹ خیالات قبول کیے۔ اُن کا حلقہ احباب بھی زیادہ تر سوشلسٹوں پر مشتمل تھا۔ راحت کاظمی (مشہور ٹی وی آرٹسٹ) اور آصف سجاد خان (سینیٹر وسیم سجاد کے چھوٹے بھائی) جیسے قابل طلباء اُن کے بچپن کے دوست تھے۔ اعتزاز زمانہ طالب علمی سے بائیں بازو کے خیالات رکھتے تھے اور اب بھی رکھتے ہیں اور آج بھی خود کو ماڈریٹ کہتے ہیں۔

اعتزاز احسن نے اپنی آپ بیتی میں نہایت اختصار سے بچپن کی یادوں کو تازہ کیا ہے تاہم اُن کے بچپن کی یادوں میں سب سے دلفریب یاد وہ ہے جب مادرِ ملت فاطمہ جناح صدارتی الیکشن کے سلسلے میں گجرات آئی تھیں اور اُن کے گھر میں قیام فرمایا تھا:

> ''مادرِ ملت کا قافلہ ہمارے گھر پہنچا اور مادرِ ملت کی گاڑی ہمارے گھر کے سامنے رُکی تو میں نے سکوٹر سے چھلانگ لگا کے مادرِ ملت کی گاڑی کا دروازہ کھولا۔ مادرِ ملت نے باہر نکلتے ہی مجھے گردن سے پکڑ لیا۔ نحیف سا اُن کا ہاتھ تھا مگر اُس کی پکڑ بڑی سخت تھی۔ میں حیران تھا کہ اِتنی مضبوطی سے اُس نے میری گردن پکڑ رکھی تھی کہ میرے لئے گردن چھڑانا مشکل تھا۔ اِتنا نحیف ہاتھ اور ایسی گرفت۔ اگر اس وقت وہ مجھے ذرا سا دھکا دے دیتیں تو میں سر کے بل پیچھے گر پڑتا۔ میں آج بھی مادر

ملت کے ہاتھوں کی آہنی گرفت کے بارے میں سوچتا ہوں تو متعجب ہوتا ہوں۔"(۱۵۵)

اپنی آپ بیتی میں اعتزاز احسن نے یہ بھی بتایا ہے کہ وہ بچپن میں کافی شرارتی تھے۔ اپنی شرارتوں کی وجہ سے اکثر نقصان اُٹھاتے۔ ایک دفعہ اپنے گھر کے احاطے میں لگے بیری کے درخت سے گر کر چہرے کو شدید زخمی کر دیا۔ اُن کے چہرے پر ہونٹ اور ناک کے درمیان جو کٹ کا نشان نظر آتا ہے یہ اُس حادثے کی یادگار ہے۔

اعتزاز احسن نے سیاسی گھرانے میں آنکھ کھولی اور پھر ساری زندگی اِسی میدان کے شہسوار رہے۔ ۱۹۷۵ء میں گجرات سے صوبائی اسمبلی کے لیے پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر انتخابات میں حصہ لیا اور جیتا۔ اس کے بعد آج تک کبھی قومی اسمبلی اور کبھی سینٹ کے رُکن منتخب ہوتے چلے آرہے ہیں۔ یوں وہ پچھلے چالیس سال سے عملی سیاست میں ہیں۔ چونکہ وہ مختلف حکومتوں میں بڑے بڑے سیاسی عہدوں پر رہے اس لیے اُس نے پاکستانی سیاست کو بہت قریب سے دیکھا۔ چنانچہ جب وہ ہمارے ملک کے سیاسی حالات، سیاستدانوں کی نجی اور سیاسی زندگیوں، فوج اور ایجنسیوں کے کردار اور ہمارے ملک میں سیاست یا جمہوریت کی ناکامی پر قلم اُٹھاتے ہیں تو بڑی سنجیدگی کے ساتھ اِن مسائل کی وجوہات کو قاری کے سامنے لاتے ہیں۔ سیاست سے ہٹ کر معاشرت، معیشت، ملائیت، بنیاد پرستی، توہم پرستی اور دیگر قومی بیماریوں کے بارے میں بھی اپنی مخلصانہ رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ مذکورہ آپ بیتی میں اعتزاز احسن نے یہ دلچسپ انکشاف کیا ہے کہ وہ اِس ملک کا سب سے کم عمر سیاسی قیدی کا اعزاز رکھتا ہے۔ وہ اِس طرح کہ ایک سال کی عمر میں وہ اپنی ماں کے ساتھ پہلی مرتبہ جیل گئے تھے۔ قائداعظم محمد علی جناح کی کال پر اعتزاز احسن کے خاندان کے تین نسلوں نے گرفتاری پیش کر کے مسلم لیگ اور قائداعظم کے ساتھ اپنی وفاداری اور خلوص کا انوکھا مثال پیش کیا۔ اپنے خاندان کے اِس منفرد اعزاز کے بارے میں چودھری اعتزاز احسن لکھتے ہیں:

"آپ کو اپنے خاندان کے ایک تاریخی اعزاز کے بارے میں بتانا چاہوں گا۔ 1946ء میں جب قائداعظم نے کانگریسی حکومت کے خلاف ڈائریکٹ ایکشن کی کال دی تو دادا جان چودھری بہاؤل بخش مرحوم مسلم لیگ کے وہ معمر ترین رہنما تھے جنہوں نے گرفتاری پیش کی تھی۔ والد چودھری محمد احسن علیگ اُن دِنوں ریونیو ڈیپارٹمنٹ میں افسر مال تھے۔ اُنہوں نے بھی ملازمت سے استعفیٰ دیا اور گرفتاری پیش کر دی۔ والدہ محترمہ راولپنڈی ڈویژنل مسلم لیگ کی

> صدر تھیں، وہ بھی پیچھے نہ رہیں۔ اُنہوں نے مسلم لیگی خواتین کے شانہ بشانہ گرفتاری دی۔ میری عمر اُس وقت ایک سال سے بھی کم تھی۔ میں والدہ کی گود میں تھا جب اُنہیں جیل لے جایا گیا۔"(۱۵۶)

آپ نے ہمیشہ پارٹی ڈسپلن کی پابندی کی۔ آپ نے پارٹی میں نہ تو کوئی پریشر گروپ بنایا اور نہ ہی گروہی سیاست میں ملوث ہوئے بلکہ ساری پارٹی کو اپنا سمجھا۔ پارٹی کے علاوہ بھی اُن کے ذاتی دوستوں کا ایک وسیع حلقہ ہے۔ وکیلوں، صحافیوں، سیاستدانوں اور پارلیمنٹ غرض ہر جگہ اُس نے دوست بنائے۔ اپنی اِن یادداشتوں "سچ کہوں گا" میں اعتزاز احسن نے اپنے ساتھیوں کا ذکر بڑی محبت اور احترام سے کیا ہے۔ اعتزاز احسن کے باپ دادا کا تعلق مسلم لیگ سے تھا۔ گجرات سے اُن کے دادا مسلم لیگ سے الیکشن لڑتے رہے اور اُن کا شمار قائدِ اعظم کے مخلص اور وفادار دوستوں میں کیا جاتا تھا۔ محترمہ فاطمہ جناح نے قائدِ اعظم پر لکھی گئی کتاب "میرا بھائی" میں چودھری بہاول بخش کا ذکر اپنے بھائی کے انتہائی وفادار دوستوں اور پکے مسلم لیگیوں میں کیا ہے۔ اِس طرح آپ کے والد چودھری محمد احسن علیگ نے بھی اپنی ساری سیاست مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے کی لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ اعتزاز احسن نے اپنی سیاست کا آغاز پاکستان پیپلز پارٹی سے کیا۔ جس زمانے میں آپ نے اپنی سیاست شروع کی، ذوالفقار علی بھٹو کی شہرت کا نقطہ عروج تھا۔ اُس نے اپنی سحر انگیز شخصیت کی بدولت پاکستان کی سیاست میں بہت بڑی ہلچل پیدا کر دی تھی۔ ملک کے نوجوان، روشن خیال اور ترقی پسند لوگ بھٹو کے گرد جمع ہو رہے تھے۔ نوجوان اعتزاز احسن نے بھی بھٹو کی شخصیت اور نعروں میں کشش محسوس کی۔ چنانچہ پیپلز پارٹی میں شمولیت کے اسباب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "یہ بات بھی بجا کہ والد صاحب زمیندار تھے لیکن یہ امر ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ وہ پڑھنے لکھنے والے آدمی تھے۔ اعلیٰ سرکاری ملازمت میں رِہ چکے تھے۔ اِس لیے اُن کا تجزیہ، اُن کا مطالعہ اور اُن کا مشاہدہ وسیع تھا۔ جس مسلم لیگ میں وہ رِہ رہے تھے یا جس مسلم لیگ کے لیے اُس نے سرکاری ملازمت کو تج دیا تھا اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی تھیں، وہ مسلم لیگ بانیٔ پاکستان کی مسلم لیگ تھی اور اب وہ جس مسلم لیگ کو اپنے اِرد گرد دیکھتے تھے وہ کوئی اور چیز تھی۔ میرا احساس یہ ہے کہ قائدِ اعظم کی رحلت کے بعد والد صاحب جتنا عرصہ مسلم لیگ میں رہا، مضطرب ہی رہا۔ اِس لیے اگر میں پیپلز پارٹی میں آگیا تو اِسے والد صاحب کی مسلم لیگ سے بے اطمینانی کا نتیجہ بھی سمجھنا چاہیئے۔"(۱۵۷)

اعتزاز احسن اپنے تلون مزاجی، آزاد خیالی اور منہ پر سچی بات کہنے کی وجہ سے اپنی پارٹی میں بھی اکثر الگ تھلگ رہتے ہیں۔ پاکستان کی سیاسی جماعتوں میں خوشامد کرنے والے ٹولے کو اپنے قریب رکھا جاتا ہے جبکہ سچ بات کہنے والوں کو پارٹی لیڈر منہ نہیں لگاتے۔ یہی وجہ ہے کہ اعتزاز احسن اپنی پارٹی میں اکثر اجنبی بن رہے۔ لیکن یہ بھی درست ہے کہ اعتزاز احسن جیسے لوگ سیاسی پارٹیوں کے اصل اثاثے ہوتے ہیں اس لیے انہیں زیادہ دیر ناراض بھی نہیں رکھا جاسکتا۔ آپ کو ۱۹۷۷ء میں پاکستان پیپلز پارٹی سے نکال دیا گیا اور آپ نے تحریک استقلال میں شمولیت اختیار کی لیکن ۱۹۸۵ء کو تحریک استقلال نے بھی آپ کو اپنی پارٹی سے نکال کر باہر کیا اور آپ کو پاکستان پیپلز پارٹی نے دوبارہ اپنی صفوں میں جگہ دی۔ یہ سارا قصہ آپ نے اپنی آپ بیتی میں اختصار سے بیان کیا ہے۔

پاکستان میں ایک وقت وہ بھی آیا تھا کہ ایران پاکستان کے اندرونی حالات میں بہت زیادہ مداخلت کیا کرتا تھا۔ اعتزاز احسن نے باقاعدہ حوالوں سے بتایا ہے کہ جنوبی ایشیاء میں ایران امریکہ کے ریجنل چیف کی حیثیت سے تھے۔ پاکستان کی قیادت کے لیے انٹرویو شاہ ایران کرتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ ایئر مارشل (ر) اصغر خان شاہ ایران پہلوی سے ملنے گئے۔ شنید یہ تھی کہ اُنہیں پاکستان کے وزارت عظمیٰ کے انٹرویو کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ (۱۵۸) ایک آزاد اور خودمختار ریاست کے لیے یہ بڑی شرمندگی کی بات ہوتی ہے۔ تاریخی کتابوں میں ہمیں اِس بات کا ذکر نہیں ملتا۔ اِس مقام پر آپ بیتیوں کی تاریخی حیثیت بہت اہم ہو جاتی ہے۔ چودھری اعتزاز احسن پر بطور وزیر داخلہ اور بے نظیر بھٹو پر بطور وزیر اعظم بھارتی پنجاب میں سکھ حریت پسندوں کی فہرستیں راجیو گاندھی کو فراہم کرنے کا الزام لگایا جاتا رہا ہے۔ آپ نے اِس الزام کی نہ صرف سختی سے تردید کی ہے بلکہ ٹھوس دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ عملی طور پر کسی بھی سویلین حکومت کے لیے یہ ممکن نہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

> ''میں کہوں گا کہ اگر واقعی ایسی کوئی فہرست ہوتی تو وہ فوج اور آئی ایس آئی کے پاس ہونی چاہیئے تھی۔ کسی سویلین کے پاس نہیں۔ کسی سویلین کے ہاتھ وہ لسٹ آ ہی نہیں سکتی۔ اگر میرے پاس وہ لسٹ ہوتی میرا تو ٹرائل ہو جاتا۔ مجھ پر یہ الزام ۱۹۹۰ء کے الیکشن میں لگایا گیا جب ہماری حکومت برخاست ہو چکی تھی۔ اِس کے بعد کتنے آرمی چیف آئے ہیں۔ جنرل آصف نواز، جنرل عبدالوحید کاکڑ، جنرل جہانگیر کرامت اور جنرل پرویز مشرف۔ اگر اِس الزام میں ذرا بھی سچائی ہوتی تو فوج اِس بات کو ضرور اُٹھاتی اور میرا ٹرائل کراتی۔'' (۱۵۹)

پاکستانی سیاست میں فوج بلواسطہ اور بلاواسطہ اہم کردار ادا کرتی آرہی ہے۔ سویلین حکومتیں فوج کی بے جا مداخلت پر سخت پریشان رہتی ہیں۔ دیگر سیاسی رہنماؤں کے برعکس اعتزاز احسن نے اِس ایشو پر بڑی کھل کر اور تفصیلی گفتگو کی ہے۔ اُس نے اپنے تجربے کی روشنی میں بتایا ہے کہ فوج اور ایجنسیاں بڑی حد تک حکومتوں کو اپنے قابو میں رکھتی ہیں اور یہ گھناؤنا کھیل قیام پاکستان سے آج تک جاری ہے۔ ہمارے ملک کی ایجنسیاں اِتنی طاقتور ہیں کہ اِن کو صرف فوج کنڑول کر سکتی ہیں، سیاسی حکومتیں نہیں۔ سیاسی پارٹیوں کو صرف حکومت ملتی ہے، اقتدار نہیں ملتا۔آپ نے یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ ۱۹۹۰ء کو پاکستان پیپلز پارٹی کی پہلی حکومت برطرف کرنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ فوج کو کراچی میں مارشل لاء نافذ کرنے کی اجازت نہ دینا تھا۔ فوج سول حکومتوں کے ماتحت کام کرنے کو تیار نہیں۔ اُن کی کوشش ہوتی ہے کہ سیاستدان گملوں میں لگائے جائیں، یہی اِس ملک میں جمہوریت کی ناکامی کا سب سے بڑا سبب ہے۔ پاکستانی سیاست میں فوج کا براہِ راست عمل دخل کاآغاز ۱۹۵۲ء۔۱۹۵۳ءسے ہو گیا تھااور یہ بڑی بدقسمتی کی بات تھی۔ یہاں کی ملٹری اور سول بیوروکریسی گملوں میں سیاستدان اگاناچاہتی ہے لیکن جب وہ گملوں میں لگنے کے لیے تیار نہیں ہوتے تو فوج اُنہیں نکال پھینکتی ہے۔

اُن کے طویل تجربے، مشاہدے اور آنکھوں دیکھے واقعات کا لب لباب یہ ہے کہ فوج کا حکومت میں کوئی کردار نہیں ہونا چاہیئے نہ عملی اور نہ آئینی۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب بھی ہمارے ہاں اسٹیبلشمنٹ کا لفظ استعمال ہوتا ہے تو اِس سے مراد فوج، عدلیہ اور سول بیوروکریسی ہے۔ اسٹیبلشمنٹ نے ریاست کے اندر ریاست بنائی ہوئی ہے۔ کسی بھی ترقی یافتہ اور مہذب ملک میں ایسا نہیں ہوتا۔ ہمارے فوجی سربراہوں کو کبھی یہ گوارا نہیں کہ وہ سویلین کو سلوٹ کریں۔ اِس بارے میں وہ بہت عجیب انکشاف کرتا ہے:

> ''آپ کو ایک دلچسپ بات بتاؤں۔ اِس معاملے میں فوجی سربراہ اِتنے حساس تھے کہ جب کبھی بے نظیر بھٹو یا نواز شریف وزیر اعظم کی حیثیت سے جی ایچ کیو جاتے تو چیف آف آرمی سٹاف سر سے ٹوپی اُتار کر اُنہیں ریسیو کرتا تا کہ وزیر اعظم کو سیلوٹ نہ کرنا پڑے۔ آپ سب جانتے ہیں کہ جب وزیر اعظم کہیں جاتا ہے تو ٹی وی ٹیم بھی ہمراہ ہوتی ہے۔ چیف آف آرمی سٹاف نہیں چاہتا کہ عوام ٹی وی پر اُسے سیلوٹ کرتے ہوئے دیکھیں۔ محمد رفیق تارڑ کو جنرل مشرف نے گھر کیوں بھیجا؟ صرف اِس لئے کہ اِس آدمی کو کیوں سیلوٹ کروں جو خود میرے رحم و کرم پر ہے۔'' (۱۶۰)

چودھری اعتزاز احسن کا یہ بیان حقیقت پر مبنی نہیں اس لیے ہم اُن کے اِس موقف سے اتفاق نہیں کرتے۔ اُن کی

گفتگو سے فوج دشمنی اور پرویز مشرف سے بُغض کی بُو آتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم فوجی سربراہوں کو ۱۴ اگست، ۲۳ مارچ یا دیگر قومی تقاریب میں ٹی وی پر دیکھتے ہیں کہ ساری دنیا کے سامنے وہ منتخب وزیر اعظم اور صدر کو سیلوٹ کرتے ہیں اور کوئی سُبکی محسوس نہیں کرتے۔ نیز اعتزاز احسن کی یادداشتیں "سچ کہوں گا" اُس وقت لکھی گئی تھیں جب ساری قوم پرویز مشرف کے خلاف احتجاج کر رہی تھی۔ اب حالات بڑی حد تک مختلف ہو چکے ہیں۔ فوج نے پچھلے ایک عشرے سے سیاست سے الگ دہشت گردی اور ملکی سرحدوں پر اپنی توجہ مرکوز کر رکھی ہے۔ چنانچہ اعتزاز احسن کا بیان حقیقت پر مبنی معلوم نہیں ہوتا۔

۹ مارچ ۲۰۰۷ء کا دِن پاکستان کے سیاسی، سماجی، عدلیہ کی آزادی اور سول سوسائٹی کی بالادستی کے حوالے سے ایک اہم سنگ میل ہے۔ اس عرصے میں وکیلوں اور سول سوسائٹی نے مشرف حکومت کے خلاف بھرپور تحریک چلائی۔ اعتزاز احسن اِس تحریک کے چوٹی کے رہنما تھے۔ آپ معزول چیف جسٹس افتخار چودھری کے وکیل تھے اور مشرف کے ۱۳ وکیلوں کا آپ نے تنہا مقابلہ کر کے افتخار چودھری کا کیس لڑا اور جیتا۔ آپ نے یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ اِس تحریک کے دوران پرویز مشرف نے اُنہیں وزیر اعظم بنانے کی پیشکش کی تھی جو اُس نے شکریے کے ساتھ مسترد کر دی تھی۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ آپ نے ۱۹۹۸ء میں نواز شریف کا عدالتی کیس بھی لڑا تھا جب اُنہیں پرویز مشرف نے اٹک قلعے میں قید کر رکھا تھا۔ آپ نے اپنی آپ بیتی میں پرویز مشرف کو بہت بُرے الفاظ سے یاد کیا ہے۔ اُنہیں ضدی، ہٹ دھرم، نفسیاتی مریض اور فرعون کہا ہے جبکہ سیاستدانوں خاص طور پر بے نظیر بھٹو کا بہت احترام سے ذکر کیا ہے۔ بہر حال سیاست اور سیاسی حالات و واقعات کے بارے میں اعتزاز احسن کا اپنا ایک نقطہ نظر ہے جس سے اختلاف تو کیا جا سکتا ہے لیکن اِسے مسترد نہیں کیا جا سکتا۔

چودھری اعتزاز احسن نے سیاسیات سے ہٹ کر تعلیمی، سماجی، عدالتی اور معاشرتی موضوعات پر بھی قلم اُٹھایا ہے۔ آپ نے ذاتی تجربے اور ذاتی مشاہدے کی روشنی میں مختلف واقعات کا تجزیہ کر کے نتائج نکالے ہیں۔ اِن میں سے چند اہم موضوعات یہ ہیں:

۱۔ آج کل ہمارے ملک میں ہر ایک پاکستانی باشندہ انتخابات میں حصہ لے سکتا ہے اور ہر شخص ووٹ دینے کا حق رکھتا ہے۔ انتخابی مہم چلانا اب مشکل نہیں رہا۔ لوگوں کے درمیان رابطے بھی بڑے آسان ہو چکے ہیں۔ ایک اُمیدوار اگر چاہتا ہے تو ایک دِن میں اپنے سارے حلقے کا دورہ کر سکتا ہے۔ ماضی میں یہ کام اتنا آسان نہیں تھا۔ ایک تو ہر آدمی الیکشن نہیں لڑ سکتا تھا۔ دوسرا یہ کہ ووٹ دینے کا حق صرف اس شخص کو حاصل تھا جس کی اچھی خاصی زمین ہوتی تھی۔ انگریز کے زمانے میں

اُمیدوار اپنا انتخابی مہم کیسے چلاتے تھے۔ اعتزاز احسن اپنے دادا چودھری بہاؤل بخش کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''اُس زمانے میں ووٹر زیادہ نہیں ہوتے تھے۔ ووٹ کا حق صرف جائیداد کی بنیاد پر ملتا تھا۔ الیکشن مہم کے لئے اُمیدوار گھوڑوں پر بیٹھ کر نکلتے تھے۔ میرے دادا جان جب الیکشن مہم کے لئے جاتے تو اُن کے ہمراہ پچاس ساٹھ گھڑ سوار ہوتے۔ ایک بار مہم پر نکلتے تو کم از کم ایک ماہ بعد واپس آتے اور انتخابی مہم کے دوران میں دریاؤں، ندی نالوں، جنگلوں اور بیابانوں کو عبور کرتے ووٹروں تک پہنچتے۔''(۱۶۱)

۲۔ چودھری اعتزاز احسن نے پاکستان اور پاکستان سے باہر بہترین تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کی ہے۔ اُس نے یہاں اور باہر کے تعلیمی ماحول پر بڑی تفصیل سے گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہمارے اور باہر کے تعلیمی ماحول میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ یہاں تقلید، تابعداری اور تسلیم پر اصرار کیا جاتا ہے جب کہ وہاں عقل، تجسس اور شک کے اظہار پر زور ہے۔ یہاں اختلاف برداشت کرنے کا تصور نہیں وہاں اختلاف کو خوش آمدید کہا جاتا ہے۔ یہاں سوال کرنا گناہ ہے اور وہاں سوال نہ کرنے والے طالب علم کی ذہنی استعداد کے بارے میں اُستاد فکر مند ہو جاتا ہے۔ مغرب اپنے مثبت رویے کا پھل کھا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سائنسی ایجادات میں اِتنے آگے نکل گئے ہیں کہ ہمارے لیے اُن کے برابر آنا بھی مشکل ہے۔ اعتزاز احسن سارے خرابیوں کا قصوروار ملائیت کو ٹھہراتے ہوئے کہتا ہے کہ ان لوگوں کے ہوتے ہوئے معاشرتی اصلاح ممکن نہیں۔ وہ تمام باتوں کا نچوڑ نکال کر کہتا ہے کہ جب تک ہم ملائیت کی چنگل سے آزاد ہو کر روشن خیالی کے دائرے میں قدم نہیں رکھیں گے ہم ترقی کی شاہراہ پر آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے کی طرف چلے جائیں گے۔ ہماری ترقی، ہمارے رویے اور ہمارے تمام نظام ہائے زندگی کی کامیابی کا انحصار ملائیت کے غالب اثر سے باہر نکلنے میں ہے۔ اس بارے میں چودھری صاحب لکھتے ہیں:

> ''ملائیت میں اختلاف رائے سننے کی گنجائش نہیں ہے۔ اختلاف کرنے والا ناقابل برداشت بلکہ واجب القتل سمجھا جاتا ہے۔ ملائیت میں تفریح کا تصور نہیں ہے۔ آپ سینما دیکھ کر نکل رہے ہیں تو ان کو اعتراض ہے۔ آپ میلے پر جا رہے ہیں تو ان کو غصہ آتا ہے۔ آپ ٹیلی ویژن دیکھ رہے ہوں تو وہ ناراض ہوتے ہیں۔ آپ بیوی بچوں کے ساتھ پارک میں گھوم رہے ہوں تو وہ ناخوش دکھائی دیتے ہیں۔ مطلب یہ کہ آپ کو خوش نہیں ہونا چاہیئے، تفریح سے دُور ہونا چاہیئے اور موڈ ہر وقت آف رکھنا

چاہیئے۔اختلاف رائے کو برداشت نہ کرنااور تفریح کو بُرا سمجھنا ملائیت کی دو خاص نشانیاں ہیں۔''(۱۶۲)

۳۔ اعتزاز احسن بنیادی طور پر وکیل ہیں۔اُن کی شہرت تین حوالوں سے ہے، بطورِ سیاستدان، بطورِ دانشور اور بطورِ وکیل۔وکالت اُس کا پیشہ ہے۔اِس طرح اُن کی زندگی کی کئی جہتیں ہیں۔اپنی آپ بیتی ''سچ کہوں گا'' میں اعتزاز احسن سیاست کے علاوہ ہماری عدالتی نظام کو زیادہ تر خرابیوں کا ذمہ دار سمجھتے ہیں۔ماضی میں کس طرح حکومتیں ججوں کو خریدتی تھیں،اُن پر من پسند فیصلے کرواتی تھیں اور اپنے لوگوں کو آگے لاتی تھیں۔بھٹو پھانسی کیس کو وہ اِس ضمن میں بطورِ ثبوت پیش کرتے ہیں کہ کس طرح ہمارے اعلیٰ عدلیہ نے آئین و قانون کو بالائے طاق رکھ کر ایک ایسا فیصلہ دیا جس سے ساری دنیا میں ہماری جگ ہنسائی ہوئی۔اعتزاز احسن باقاعدہ مثالیں دے کر بتاتے ہیں کہ ہمارے ملک کے ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے اعلیٰ جج صاحبان ذاتی عناد، دشمنی اور ناراضگی کے سبب فیصلے دیتے ہیں۔اگر ملزم قتل ہو بھی جائے تو اُنہیں کیا۔اِس طرح اکثر و بیشتر آئین و قانون کی من پسند تشریح کر کے ہمارے ''منصف'' حق اور انصاف پر مبنی فیصلہ نہیں کرتے۔سیاسی مقدمات میں بالخصوص جج صاحبان پر مختلف اطراف سے اِتنا دباؤ ہوتا ہے کہ اُن کے لیے انصاف پر مبنی فیصلہ ممکن نہیں ہوتا۔چنانچہ اس بارے میں اعتزاز احسن بڑا دلچسپ واقعہ بیان کر کے لکھتے ہیں:

> ''جسٹس نسیم حسن شاہ (بھٹو کو پھانسی دینے والے ججوں میں شامل تھے) نے ایک دفعہ مجھے بتایا کہ بھٹو صاحب کو پھانسی کی سزا نہیں ہونی چاہیئے تھی تاہم سزا ہونے کا سبب اُس نے بڑا دلچسپ بیان کیا۔فرمایا، بھٹو صاحب کے وکیلوں نے غیر ضروری طور پر جج صاحبان کو ناراض کیا تھا۔ناراض اُنہوں نے کس طرح کیا؟ سارا وقت وہ مائی لارڈ مائی لارڈ کہتے رہے۔ایک لمحے کے لئے مان لیتے ہیں کہ جج صاحبان بھٹو کے وکیلوں سے ناراض تھے تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ اِس ناراضگی کی سزا بھٹو صاحب کو دی جائے۔اُنہیں پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔یہ عجیب و غریب نکتہ نسیم حسن شاہ صاحب کو سوجھا ہے۔''(۱۶۳)

۴۔ ہم نے اب تک جتنی سیاسی آپ بیتیاں پڑھی ہیں، کسی سیاستدان نے ضیاء الحق اور اُس کے دَور کو اچھے الفاظ میں یاد نہیں کیا حتیٰ کہ وہ سیاستدان جو صدر ضیاء الحق سے فائدے حاصل کر کے اقتدار کے مزے لوٹتے رہے، وہ بھی اُنہیں بُرا بھلا کہتے ہیں۔چودھری اعتزاز احسن نے بھی اپنی آپ بیتی میں ضیاء الحق کے دَور کو پاکستان کی تاریخ کا سیاہ باب کہا ہے اور بڑی

تفصیل سے اُس دَور کے واقعات لکھے ہیں۔ ہر آمر اپنے اقتدار کو دوام دینے کے لیے قسم قسم کے ہتھکنڈے استعمال کرتا ہے۔ جنرل ضیاء نے اسلامی شریعت کے قانون کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا۔ پھر جہاں جہاں اُنہیں نقصان ہوتا تو اپنے ہی نافذ کردہ شرعی قانون سے روگردانی کیا کرتے۔ منافقت، عدم برداشت، تنگ نظری اور بنیاد پرستی ریاستی سرپرستی میں پروان چڑھائے گئے۔ آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ سوویت یونین کا گرم پانیوں تک آنے کا کوئی منصوبہ نہیں تھا بلکہ محض ایک پروپیگنڈہ تھا جس کی ضیاء الحق حکومت نے مغربی میڈیا کے ساتھ مل کر خوب خوب تشہیر کی اور اِس کی آڑ میں افغانستان میں مداخلت کا جواز فراہم کیا۔ وہ جنرل ضیاء الحق کو عقل سے عاری اور بیرونی طاقتوں کا آلہ کار کہتا ہے جبکہ بے نظیر بھٹو مرحومہ کو بڑی بہادر اور نڈر عورت کے نام سے یاد کیا ہے۔ آپ نے ذاتی تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں بتایا ہے کہ وہ مشرق و مغرب میں یکساں مقبول سیاسی رہنما تھیں۔ اعتزاز احسن نے اپنی آپ بیتی میں بے نظیر بھٹو کے بارے میں کئی ناقابل فراموش واقعات لکھے ہیں جن میں سے ایک واقعہ نیچے درج کیا جاتا ہے:

> ''میں وہ دِن کبھی فراموش نہ کر سکوں گا جب ۱۹۹۲ء میں، میں آصف علی زرداری پر قائم ایک مقدمے کی پیروی کے لیے لانڈھی جیل کراچی کے بیرونی گیٹ سے اندر داخل ہوا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ پاکستان کی سابق وزیرِ اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو، بلاول اور بختاور کو بازوں میں بھرے اینٹوں کے ڈھیر پر بیٹھی ہیں۔ میں برداشت نہ کر سکا اور فوراً جیلر کے پاس پہنچا۔ محترمہ نے تحمل کی تلقین کی اور کہا، جیل سٹاف سے شائستہ رویے کی توقع رکھنی ہی نہیں چاہیئے۔ محترمہ کو اِس کا تجربہ شاید اِس لیے بھی تھا کہ خود اُن کی نوجوانی کے پانچ سال قید میں گزرے تھے۔''(۱۶۴)

اعتزاز احسن نے بارہا قید و بند کا بھی سامنا کیا۔ ایک مرتبہ جب اُنہیں ضیاء الحق کے مارشل لاء کے زمانے میں کوٹ لکھپت جیل میں بند کیا گیا تو اُس نے جیل میں بھی ضیاء الحق مارشل لاء کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیے رکھا۔ چنانچہ حبیب جالب چودھری اعتزاز احسن کی بہادری کے بارے میں اپنی آپ بیتی ''جالب بیتی'' میں تحریر کرتے ہیں:

> ''کوٹ لکھپت جیل میں جنرل ضیاء الحق کی طرف سے ایک معافی نامہ آگیا۔ چودھری اعتزاز احسن وہ معافی نامہ لے کر میرے پاس آیا اور کہا کہ ایک نظم لکھو جس سے قیدی ساتھیوں میں ہمت و حوصلہ پیدا ہو اور تمام قیدی معافی نامے کو ردّ کر دیں۔ اس پر ضیاء الحق نے اعتزاز احسن کو میانوالی جیل منتقل کر دیا۔''(۱۶۵)

اعتزاز احسن کی فرمائش پر حبیب جالب نے اُس وقت جو باغیانہ نظم لکھی،اُس کے دو بند ملاحظہ ہوں:

"دوستو جگ ہنسائی نہ مانگو   موت مانگو رہائی نہ مانگو
عمر بھر سر جھکائے پھرو گے   سب سے نظریں بچائے پھرو گے
مل رہا ہے جو بارِ ندامت   دِل پہ کیسے اُٹھائے پھرو گے
اپنے حق میں بُرائی نہ مانگو   موت مانگو رہائی نہ مانگو
رات سے روشنی مانگنا کیا   موت سے زندگی مانگنا کیا
ظلم کی ظلمتوں سے میری جان   چوٹ انصاف کی مانگنا کیا
غاصبوں سے بھلائی نہ مانگو   موت مانگو رہائی نہ مانگو" (۱۶۶)

چودھری اعتزاز احسن بنیادی طور پر انگریزی زبان کے لکھاری ہیں۔ انگریزی میں اُس نے کئی شاہکار مضامین لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ بعض انگریزی اخبارات میں اُن کے مضامین بھی چھپتے رہتے ہیں جو زبان و بیان کے حوالے سے انگریزی خوان طبقے میں خاص دلچسپی سے دیکھے جاتے ہیں۔ اُن کا سب سے بڑا کارنامہ پاکستان کے سیاسی، جغرافیائی اور تاریخی لحاظ سے لکھی جانے والی کتاب "سندھ ساگر" ہے۔ اِس کتاب میں اعتزاز صاحب نے پہلی مرتبہ دنیا کو بتایا کہ ہندوستان اور پاکستان جغرافیائی لحاظ سے بھی ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہیں اس لیے دونوں قوموں کی تقسیم ناگزیر تھی۔ اعتزاز احسن کی آپ بیتی "سچ کہوں گا" اُن کی ایک خاص زمانے کی یادداشتیں ہیں جو اُس نے اُردو میں تحریر کی ہیں اور جس کو نگارشات پبلشرز لاہور نے پہلی مرتبہ ۲۰۰۹ء میں شائع کیا تھا۔ اعتزاز احسن کی یہ آپ بیتی پڑھنے کے بعد قاری اِس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ وہ اُردو زبان میں انگریزی کی طرح رواں اور برجستہ نہیں لکھ سکتا نیز اُن کی زبان پر انگریزی کا اثر زیادہ ہے۔ الفاظ، تراکیب اور اصطلاحات براہِ راست انگریزی کی استعمال کی ہیں اور اُن کے اُردو مترادفات لکھنے کی تکلیف گوارا نہیں کی۔ اکثر جگہوں پر اُردو قواعد کا بھی خیال نہیں رکھا۔ املا میں بھی شدید غلطیاں کرتا ہے۔ وہ جان بوجھ کر بعض الفاظ کا اِملا عام روش سے ہٹ کر لکھتا ہے جس کا بظاہر ایک مطلب تو اپنی انفرادیت جتانا ہے۔ وہ پنجابی الفاظ اور فقرات لکھنے میں بھی عار محسوس نہیں کرتا۔ خصوصاً جب کسی کے ساتھ مکالمہ لکھنا مقصود ہو تو وہی الفاظ تحریر میں لاتا ہے جو بات چیت کے دوران اُن کی زبان سے نکلے تھے۔ وہ پنجابی فقرات کا اُردو ترجمہ بھی نہیں لکھتا۔ پھر بھی "سچ کہوں گا" اعتزاز احسن کی اچھی کاوش ہے جو پڑھنے والوں کے علم اور معلومات میں خاطر خوا اضافہ کرتی ہے۔

چودھری اعتزاز احسن نے "سچ کہوں گا" میں مختلف اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ یہ اصطلاحات مخصوص پیشوں کے

بارے میں ہیں۔ عام زندگی میں اِن اصطلاحات کو جاننے کے لیے متعلقہ لوگوں سے رجوع کرنا پڑتا ہے کیونکہ یہ اُردو یا انگریزی کی عام لغتوں میں نہیں ملتے ۔اِس آپ بیتی کے پڑھنے کا یہ فائدہ ہے کہ اِتنے کثیر الجہات الفاظ، تراکیب اور اصطلاحات ہمارے علم میں آجاتے ہیں۔ اگر ہم نے اعتزاز احسن کے استعمال کردہ تمام سیاسی اور عدالتی اصطلاحات کو لکھا تو پورا دفتر بن جائے گا اس لیے چند مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں:

"۱۔ بریف لیس لائیر (وہ وکیل جس کے پاس کوئی بڑا یا اہم کیس نہ ہو)

۲۔ برین چائیلیڈ (اچھوتا یا انوکھا خیال)

۳۔ بونس لیڈرشپ (نکال باہر کرنا)

۴۔ بوناپارٹ ازم (فوجی جرنیلوں کی سیاسی مداخلت)

۵۔ Dove،فاختہ (ڈرپوک اور بزدل سیاسی رہنما)

۶۔ Hawk،ہاک (سخت جان اور نڈر سیاستدان)

۷۔ دست شمشیر زن (فارسی اصطلاح ہے، مضبوط بازو "Strog Arm" آدمی)

۸۔ پیپلیا (سیاسی اصطلاح ہے پاکستان پیپلز پارٹی کا سرگرم رکن)

۹۔ Undue unholy haste (عدالتی اصطلاح میں بدنیتی پر مبنی عجلت یا شیطانی عجلت کو کہا جاتا ہے)۔"(۱۶۷)

چودھری اعتزاز احسن نے اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے کہ پنجابی اُن کی مادری زبان ہے۔ اُن کی دیگر تحریروں سے بھی یہ بات عیاں ہے کہ وہ پنجابی کو اُردو اور انگریزی زبانوں کی طرح آسانی سے بول، پڑھ اور لکھ سکتا ہے۔ اپنے دادا اور باپ کے ساتھ وہ اِسی زبان میں بولتے تھے۔ ماں بھی اُنہیں زیادہ تر پنجابی میں مخاطب کرتیں تاہم درمیان میں وہ اپنے بچوں کے ساتھ اُردو بھی بول لیتی۔ اپنے والدین، قریبی رشتہ داروں اور بے تکلف احباب کے ساتھ وہ پنجابی بولتے ہیں۔ آپ بیتی میں جب بھی کوئی ایسا موقع آتا ہے جب اِن لوگوں کے ساتھ ادا کیے گئے مکالمات لکھنا ہو تو پنجابی زبان میں براہِ راست تحریر کرتا ہے۔ کبھی کبھی تو قوسین میں فقروں کا اُردو ترجمہ لکھتا ہے لیکن اکثر ترجمہ بھی نہیں کرتا۔ سی ایس پی کے امتحان میں پاس ہونے کے بعد جب سول سروسز جانے سے انکار کیا تو اُن کے ایک قریبی رشتہ دار خصوصی طور پر اُن کے والد کو ملنے اُن کے گھر آئے اور اُن کے والد کو پنجابی میں جو کچھ کہا، اعتزاز احسن نے وہ ہو بہو پنجابی زبان میں نقل کیا ہے اور اِس کا ترجمہ بھی نہیں دیا:

"احسن پُتر پاگل ہو گیا ای، کہندا ائے میں ڈپٹی نئیں بننا۔ اونہوں بلاء، میں آپے
اونہوں چھڈ کے آوناں (احسن پاگل ہو گیا ہے کہتا ہے میں نے ڈپٹی [کمشنر] نہیں
بننا۔ اُسے بلاؤ میں خود اُسے [اکیڈمی] چھوڑ کر آؤں گا)۔"(۱۶۸)

"سچ کہوں گا" کی تحریر کا سب سے بڑا وصف اُس کا عام بول چال اور گفتگو کا انداز ہے۔ اعتزاز احسن نے اُردو میں بڑا بے تکلف، سادہ اور روز مرہ گفتگو کا سا انداز اپنایا ہے۔ بعض جگہوں پر تو اُن کی تحریر پر کسی انٹرویو یا مکالمے کا گمان ہوتا ہے۔ مصنف کے اِس سادہ اور بے تکلف اسلوب کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

۱۔ وہ اکثر الفاظ دہرا کے لکھتا ہے۔ ایسے موقعوں پر اُن کی تحریر میں عجیب خود کلامی کا سا انداز پیدا ہو جاتا ہے۔

"صدر جنرل پرویز مشرف آزاد اور خود مختار عدلیہ چاہتے ہی نہ تھے، بالکل چاہتے ہی
نہ تھے۔"(۱۶۹)

۲۔ مصنف بعض اوقات قاری کو اپنے دوبدو بیٹھا تصور کرتا ہے۔ اِس موقع پر مصنف کی زبان پر انگریزی زبان و ادب کے اثرات کو صاف محسوس کیا جا سکتا ہے:

"آپ کو ایک دلچسپ بات بتاؤں۔"(۱۷۰)

۳۔ تحریر میں مصنف مہمل الفاظ یا الفاظ کے تکرار سے فقروں کو برجستہ اور رواں بناتے ہیں۔ یہاں بھی اُن کا اسلوب مکالماتی اسلوب کی شکل اختیار کر لیتا ہے:

"اِس میں میاں نواز شریف کا مال وال تھا۔"(۱۷۱)

سچ یہ ہے کہ "سچ کہوں گا" کئی حوالوں سے ایک اچھی آپ بیتی ہے۔ مصنف نے اپنے عہد کے کئی سیاسی اور تاریخی واقعات کو اپنی جگہ پر رکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ جہاں تک مصنف کی تحریر یا آپ بیتی کے اندازِ بیان کا تعلق ہے تو اِس میں کافی سقم ہیں۔ اگر مصنف چاہتے تو وہ اُردو میں بھی ایک کامیاب شاہکار کا اضافہ کر سکتے تھے۔ مشہور صحافی اور ادیب اصغر عبداللہ کا اِس آپ بیتی پر تبصرہ بڑا معنی خیز ہے جس کا یہاں درج کرنا ضروری ہے:

"میرا احساس ہے کہ اِس آپ بیتی میں چودھری اعتزاز احسن خود ستائی میں مبتلا
دکھائی دے رہے ہیں۔"(۱۷۲)

اِس آپ بیتی کے بارے میں اصغر عبداللہ کا احساس جو بھی ہو لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ایک اَن پڑھ معاشرے کے نیم خواندہ اور انگوٹھا چھاپ سیاستدانوں میں لکھے پڑھے، سنجیدہ اور دانشور اعتزاز احسن کا وجود تازہ ہَوا کا جھونکا ہے۔ تازہ ہَوا کے جھونکے ہر موسم اور ہر ماحول میں نہیں آیا کرتے۔

۶۔پنجاب کا مقدمہ (محمد حنیف رامے)

جناب حنیف رامے سیاست اور ادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ ہماری عصری سیاست میں ایک مدبر، دانشور، شعلہ بیان مقرر، سنجیدہ سیاستدان اور ادب دوست شخص کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ ہمارے ملک کی سیاسی تاریخ میں جو حقیقی معنوں میں گنتی کے سیاستدان پیدا ہوئے ہیں، اُن میں محمد حنیف رامے کا نام بھی شامل ہے۔ کوئی سیاسی، صنعتی یا جاگیردارانہ پس منظر نہ رکھنے کے باوجود حنیف رامے صرف اپنی قابلیت اور خداداد صلاحیتوں کی بنا پر پاکستان کے سب سے بڑے صوبے پنجاب کے وزیر خزانہ اور وزارت اعلیٰ تک پہنچے۔ اُن کا شمار پیپلز پارٹی کے بانیوں میں ہوتا ہے۔

محمد حنیف رامے ۱۵ مارچ ۱۹۳۰ء کو ضلع شیخوپورہ میں پیدا ہوئے۔ (۱۷۳) ابتدائی اور ثانوی تعلیم پنجاب کے مختلف شہروں سے حاصل کی۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے اور ایم اے اقتصادیات کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ مل کر پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی۔ پنجاب میں پیپلز پارٹی کو مقبول بنانے میں آپ کا بڑا ہاتھ تھا۔ ۱۹۷۰ء میں لاہور سے پنجاب اسمبلی کے رُکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۷۲ء میں آپ کو پنجاب کا وزیر خزانہ لگایا گیا۔ ۱۹۷۴ء میں پنجاب کے وزیر اعلیٰ بنائے گئے (۱۷۴)۔ تاہم بھٹو سے اختلافات کی وجہ سے وزارت اعلیٰ سے ہٹا کر جیل میں بند کر دیئے گئے۔ ایک سال تک ملک کے مختلف جیلوں میں رہے۔ آپ سینیٹ کے رُکن بھی رہے ہیں۔ ملک میں مارشل لاء لگنے کے بعد آپ نے کئی سال جلاوطنی کی زندگی اختیار کی۔ اِس عرصے میں آپ یونیورسٹی آف کیلیفورنیا کے کئی شعبوں سے منسلک رہے۔ جب ۱۹۹۲ء میں پاکستان پیپلز پارٹی دوسری مرتبہ حکومت میں آئی تو آپ کو پنجاب اسمبلی کا سپیکر بنایا گیا۔ آپ دوبارہ پی پی پی کے ساتھ شامل ہوگئے۔ چنانچہ آپ مرتے دم تک اِس پارٹی کے مرکزی کمیٹی کے رُکن اور اہم رہنما رہے۔

حنیف رامے مرحوم ایک ہمہ جہت شخص تھے۔ سیاست کے علاوہ صحافت، ادب اور مصوری کے ساتھ بھی خصوصی شغف رکھنے کی وجہ سے ہر وقت خبروں میں اور عوام کے ساتھ رہے۔ آپ نے مشہور اخبارات اور رسائل ہفت روزہ نصرت، روزنامہ مساوات، راوی اور سویرا کی ادارت بھی کی۔ روزنامہ ''مساوات'' اور ''نصرت'' پی پی پی کے اخبارات تھے۔ روزنامہ مساوات کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو نے اِس کو انتقامی سیاست کے لیے اور مخالفین کی پگڑی اُچالنے کے لیے استعمال کیا۔ اِس اخبار کو فی الحقیقت حنیف رامے صاحب نے بام عروج تک پہنچایا تھا۔ آپ روزنامہ جنگ میں اور پھر نوائے وقت میں بھی اپنا مستقل کالم لکھتے رہے۔ حنیف رامے کی اصل شہرت مصوری کی وجہ سے ہے۔ وہ نہ صرف اِس ملک کے ایک بڑے مصور تھے بلکہ جدید مصوری کے بانیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ حنیف رامے کو مصورانہ خطاطی کا موجد گردانا جاتا ہے۔ پنسل اور رنگ دونوں قسم کی پینٹنگ پر یکساں عبور رکھتے تھے۔ آپ نے اپنے

مصورانہ شاہکار کئی بین الاقوامی نمائشوں میں نمائش کے لیے رکھ کر انعامات حاصل کیے ہیں۔ قومی اور بین الاقوامی سیاست میں ایک مدبر کے طور پر اور دینی و دنیاوی اُمور پر ایک دانشور کی حیثیت سے اپنا منفرد مقام رکھنے والے یہ درویش صفت انسان یکم جنوری۲۰۰٦ء کو لاہور میں دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔(۱۷۵)

جزوی آپ بیتیوں کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اِس میں مصنف آپ بیتی پر کم اور جگ بیتی پر زیادہ توجہ مرکوز رکھتا ہے۔ تمام جزوی آپ بیتیوں میں (معدودے چند) لکھنے والا بغیر کسی پابندی، قاعدے اور نظم و ضبط کے ذاتی زندگی کے بارے میں بے ترتیبی سے لکھتا ہے۔ جب تک پوری آپ بیتی کا مطالعہ نہ کیا جائے نہ تو مصنف کی خود نوشت سوانح کو مکمل طور پر پڑھا جا سکتا ہے اور نہ ہی مصنف کا بیانیہ سمجھ میں آسکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جزوی آپ بیتیوں میں لکھنے والے ذاتی زندگی پر کم لکھتے ہیں۔ وہ اپنی آپ بیتی کو بنیاد بنا کر دوسروں کی سرگزشت رقم کر لیتے ہیں جس سے اُن کی اپنی سرگزشت آنکھوں سے اُجھل رہتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جزوی آپ بیتیوں کو بعض نقاد سرے سے آپ بیتی ہی تسلیم نہیں کرتے۔ سوال یہ ہے کہ ایک مصنف نے اپنی زندگی کے واقعات، نشوونما، ارتقا، کامیابی کے راز اور معاشرے میں اپنا مقام بنانے کے پیچھے اپنی جدوجہد کو بیان کیا ہے خواہ اختصار، بے ربط، مبہم اور بے ترتیب حالت میں ہی کیوں نہ ہو تو پھر اِسے آپ بیتی، سرگزشت، خود نوشت سوانح عمری کے علاوہ اور کس خانے میں رکھا جائے؟

''پنجاب کا مقدمہ'' محترم حنیف رامے کی جزوی آپ بیتی ہے جس میں پنجاب کا مقدمہ پیش کرتے کرتے اُس نے اپنی زندگی کی تفصیلات بھی بڑی حد تک پیش کی ہیں۔

اِس آپ بیتی سے معلوم ہوتا ہے کہ حنیف رامے کی پیدائش ضلع شیخوپورہ کے چک نمبر ۵ میں چودھری غلام حسین کے ہاں ہوئی۔ پانچ برس کے تھے جب اُن کا باپ شیخوپورہ سے لاہور منتقل ہو گیا اور بقیہ زندگی آپ کی لاہور میں گزری۔ آپ نے یہ بھی بہت فخر سے بتایا ہے کہ پنجاب کے پانچ دریاؤں کی طرح اُن کے والدین کے بھی پانچ بیٹے تھے۔ نذیر رامے، بشیر رامے، رشید رامے، حنیف رامے اور حفیظ رامے۔ بھائیوں میں حنیف رامے کا نمبر چوتھا تھا۔ یہ ایک متوسط گھرانہ تھا اور اُن کے والد اپنی سفید پوشی کا بھرم رکھتے ہوئے بچوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کر رہے تھے۔ اُنہیں احساس تھا کہ مقابلے کے اِس دور میں تعلیم ہی وہ قوت ہے جو خاندانوں کو بہت آگے لے جاتی ہے۔ چنانچہ اپنے سارے بچوں کو چودھری غلام حسین نے اعلیٰ تعلیم دِلوائی۔ اِس موقع پر رامے صاحب لکھتے ہیں:

> ''پنجاب کے پانچ دریاؤں اور اپنے پانچ بھائیوں میں بھی مجھے ایک مماثلت نظر آتی
> تھی بلکہ بھائیوں میں چوتھے نمبر پر ہونے کے اعتبار سے مجھے چوتھا دریائے چناب

اپنے ساتھ خصوصاً قریب تر محسوس ہوتا تھا۔ میں پانچ برس کا تھا کہ میرے والد
چودھری غلام حسین چک نمبر ۵ تحصیل ننکانہ صاحب سے اپنے آبائی شہر لاہور
واپس آ گئے اور یوں میرا دانہ پانی دریائے چناب سے دریائے راوی اور نہر اپر چناب
سے میاں میر نہر کی طرف منتقل ہو گیا۔''(۱۷۶)

رامے صاحب نے اپنی ابتدائی زندگی اور بچپن کے بارے میں بہت کم معلومات دی ہیں البتہ اپنے بچپن کا ایک واقعہ نقل کیا ہے جو دلچسپی کا باعث ہے اور جس سے رامے صاحب کی ذہنی اُفتاد، تخیل، مصورانہ اور ادبی صلاحیتوں پر روشنی پڑتی ہے۔عام طور پر ڈیڑھ سال کا بچہ تھوڑی بہت باتیں کرنے لگتا ہے۔رامے کی عمر تین سال سے زیادہ تھی اور وہ ایک لفظ بھی نہیں بول سکتا تھا۔اُن کے گھر والے تشویش میں مبتلا تھے۔اُن پر دوا، دُعا اور ٹونے ٹوٹکے آزمائے گئے مگر اُن کی زبان کی گرہ نہ کھلی۔آخر ایک مرد درویش کے کہنے پر آپ کے گھر میں دعوت کا اہتمام کیا گیا۔اُن کے لیے میٹھے چاول تیار کیے گئے۔ چنانچہ اِسی دعوت میں آپ نے جو پہلا فقرہ ادا کیا، بڑا معنی خیز تھا۔باقی واقعہ رامے صاحب کی زبانی سنیے:

''اِس دعوت اور دھما چوکڑی کے دوران گھر کے کھلے آنگن کے بیچوں بیچ اُگے ہوئے
گاؤں بھر میں سب سے میٹھے پیلو دینے والے وَن کے گھنے درخت کے زیر سایہ،
میں اپنے میاں جی کے ساتھ کھڑا تھا جو بچوں کی خاطر تواضع کر رہے تھے کہ بے
اختیار میرے اندر ایک ترنگ اُٹھی۔ میں نے میاں جی کو اپنی جانب متوجہ کرنے
کے لیے اُن کا دامن کھینچا۔ پھر تیز دھوپ اور گھنی چھاؤں کی سرے پر جا کھڑا ہوا
اور تتلاتے ہوئے بولا: ائیں ہپ، ائیں ہاں (ادھر دھوپ، ادھر چھاؤں) وہ دِن
اور آج کا دِن یہی پہچانتے اور وضاحتیں کرتے عمر گزر گئی ہے کہ دھوپ کدھر اور
چھاؤں کدھر ہے۔''(۱۷۷)

آپ کے آباؤاجداد کا تعلق شام سے تھا جو محمد بن قاسم کے اسلامی لشکر کے ساتھ آئے تھے۔''رامی'' تیر انداز اور ''رامح'' نیزہ باز کو کہا جاتا ہے۔جس طرح مسلمان لشکریوں کے نیزوں اور تیروں کی ''انی'' ہندوستان میں ہَل کا پھل بن گئی اِسی طرح رامی اور رامح کا تلفظ سندھ اور پنجاب میں بگڑ کر رامے ہو گیا۔حنیف رامے قیام پاکستان کے وقت گورنمنٹ کالج لاہور میں ایف اے کے طالب علم اور قائدِاعظم محمد علی جناح کے ایک گمنام سپاہی تھے۔اُن کے والد بھی پکے مسلم لیگی تھے بلکہ ۱۴؍اگست ۱۹۴۷ء کو جب قیام پاکستان کا اعلان ہوا اور ساتھ ہی لاہور میں ہر طرف خوفناک مذہبی

فسادات شروع ہو گئے ،اِس پُر آشوب وقت میں بھی آپ کے باپ اپنے چھوٹے بچوں اور بیوی کو تنہا چھوڑ کر قائدِ اعظم کا استقبالی جلوس دیکھنے کراچی گئے ہوئے تھے :

> ''دِل پر دہشت کا پہرہ تھا۔ گھر میں میری ماں چھوٹے بھائی اور چھوٹی بہن کے سوا کوئی نہیں تھا۔ میرے میاں جی اور تینوں بڑے بھائی پاکستان میں قائدِ اعظم کی تشریف آوری کا منظر دیکھنے اور استقبالیہ جلوس میں شرکت کے لیے کراچی گئے ہوئے تھے۔''(۱۷۸)

حنیف رامے نے پنجاب کے مقدمے میں کئی سیاسی ،تاریخی ،سماجی اور دیگر موضوعات پر مدلل گفتگو کر کے اپنا مقدمہ عوام کی عدالت میں پیش کیا ہے۔ اِس کتاب کو پڑھ کر رامے صاحب کے ذوق، وسیع مطالعے، مشاہدے، تاریخ پر گہری نظر اور اُردو ادب کے ساتھ اُن کے بے پناہ شوق کا پتہ چلتا ہے۔ وہ ہر موضوع پر قلم برداشتہ لکھ سکتے ہیں۔ رامے کا اندازِ بیان گنجلک اور بھاری ہے۔ اُس پر خیالات اور موضوعات کا اِتنا یلغار ہوتا ہے کہ وہ کئی چیزوں کو ایک ساتھ لیے چلتا ہے۔ اگر وہ موضوع کے مطابق ایک وقت میں ایک عنوان یا ایک رُخ پر بات کرتے تو زیادہ بہتر نتائج پیدا کر سکتے تھے۔ آپ نے پنجاب کی تاریخ، پنجاب کی مظلومیت، پنجاب کے بارے میں غلط اور گمراہ کن پروپیگنڈے، ملک کے عمومی مسائل، سماجی تبدیلیوں، معاشرتی تغیرات اور دیگر اہم موضوعات پر اپنے خیالات، جذبات، مشاہدات اور معلومات پیش کیے ہیں۔

پنجاب اور عظمتِ پنجاب حنیف رامے کا مرغوب موضوع ہے۔ اُس نے اپنی آپ بیتی میں اِس موضوع پر بار بار بات کی ہے۔ اُنہیں پنجاب کی قدامت ،تاریخی کردار اور اِس کے باسیوں سے والہانہ محبت ہے۔ اِس ''محبت'' میں وہ اکثر عصبیت اور جانبداری کی حدوں سے بھی آگے چلے جاتے ہیں۔ اِس کا ذکر آگے آئے گا۔ آپ نے کمال مہارت سے پنجاب کی تاریخ اور یہاں کے تاریخی کرداروں کا ذکر کیا ہے۔ آپ نے پنجاب کی تاریخ کو چالیس صدیوں پر محیط بتایا ہے۔ وہ ہڑپہ کو پنجابی تہذیب کے ابتدائی آثار کہتا ہے (حالانکہ تقریباً تمام مؤرخ ہڑپہ کو موہنجوداڑو کے ساتھ منسلک کر کے سندھ کی تہذیب خیال کرتے ہیں)۔(۱۷۹)

حنیف رامے پنجابی تہذیب کے ابتدائی آثار اور ہڑپہ تہذیب کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں :

> ''آج سے قریب قریب چار ہزار سال پہلے کی بات ہے۔ مشرقی یورپ سے وسط ایشیاء تک بکھرے ہوئے خانہ بدوش آریائی قبائل نے ابھی اپنے گھوڑوں اور رتھوں کا رُخ ہندوستان کی طرف نہ موڑا تھا۔ اُس وقت آج کا پاکستان دنیا کی چند گنی

چنی تہذیبوں میں سے ایک تھا۔ سرحد سے بلوچستان تک پھیلی ہوئی اِس تہذیب کا
مرکز پنجاب میں ساہیوال کے قریب دریائے راوی کے کنارے آباد شہر ہڑپہ
تھا۔" (۱۸۰)

یہاں بھی مصنف ایک تاریخی غلطی کر رہا ہے۔ جس تہذیب کی طرف وہ اشارہ کر رہا ہے وہ گندھارا تہذیب ہے جس کا مرکز ساہیوال نہیں ٹیکسلا تھا۔ بغیر کسی تحقیق کے بات کرنا اور تاریخی حقائق کو من پسند طریقے سے موڑنا ادبی غفلت ہے۔ اِس غفلت کا مظاہرہ مصنف نے مذکورہ آپ بیتی میں جگہ جگہ کیا ہے۔

حنیف رامے اِس آپ بیتی میں پنجاب کے پانچ دریاؤں کی نسبت سے پانچ جواں مرد اور شجاع پنجابی کرداروں کا قدرے تفصیل سے ذکر کرتا ہے جنھوں نے افسانوی شہرت پائی۔ (۱) راجہ پورس (۲) دُلاّ بھٹی (۳) رائے احمد خان کھرل (۴) نظام لوہار (۵) بھگت سنگھ۔

رامے کو یہ شکوہ ہے کہ تاریخ میں اِن سورماؤں کو وہ جگہ نہیں ملی جو اِن کا استحقاق تھا۔ نیز اُنھیں یہ بھی شکایت ہے کہ انگریزوں نے پنجابیوں سے پنجاب، پنجابی زبان اور پنجاب کے بارے میں اصل حقائق چھین لیے تھے۔ وہ پنجاب کی نئی نسلوں کو اِن پنجاب جواں مرد پنجابیوں کے تذکرے سے جھنجھوڑنے اور اپنی پنجابی تاریخ، ثقافت اور زبان پر فخر کرنے کی تلقین اِن الفاظ میں کراتے ہیں:

"میں یہاں پنجاب کی نئی نسلوں کے لیے پانچ جواں مرد پنجابیوں کا تذکرہ کرنا چاہتا
ہوں (جن کے نام اُوپر درج کئے جا چکے ہیں)۔ مجھے احساس ہے کہ میری نسل کے
پنجابیوں نے اپنے جوانمردوں پر نہ تو خود فخر کیا اور نہ اپنی اولاد کو صحیح طور پر اِن سے
متعارف کرایا۔ مجھے احساس ہے کہ میں اِن عظیم پنجابی شخصیتوں کے ساتھ پورا پورا
انصاف نہ کر سکوں گا۔ ایک مرتبہ نئی نسل کو ان سے دلچسپی پیدا ہو گئی تو پھر یقیناً اُن
کے ساتھ انصاف کرنے والے قلم بھی حرکت میں آجائیں گے۔" (۱۸۱)

اِس کے بعد مصنف نے کافی تفصیل سے پنجاب کے اِن پانچ سورماؤں کا تذکرہ کر کے بقول اُن کے نئی نسلوں کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یہاں مصنف فاش غلطیاں کرتا ہے۔ وہ اِس قدر اہم دعویٰ کرنے کے باوجود تاریخ کو منہ نہیں لگاتا بلکہ ہوا ہوا میں بات کرتا ہے۔ وہ تاریخی واقعے کے بیان میں تاریخی الفاظ کا "چناؤ" بھی نہیں کرتے بلکہ اُن کے الفاظ پر کسی سنسنی خیز ناول کا گمان ہوتا ہے غرض وہ پنجابیوں کی محبت میں تاریخ کا گلہ گھونٹنے سے بھی احتراز نہیں کرتے۔

جب ۱۹۷۰ء میں ون یونٹ ٹوٹ گیا اور ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان بھی بنگلہ دیش بن گیا تو کچھ عرصے کے لیے پاکستان کے چاروں صوبوں میں یہ احساس پیدا ہو گیا کہ آئندہ باقی ماندہ ملک کے لیے جو بھی سیاسی ڈھانچہ مرتب ہوا، اُسے لازماً وفاقی ہونا چاہیئے۔ صوبوں کو ایسے حقوق ملنے چاہیئے کہ ہر صوبہ اپنے اندرونی معاملات میں بڑی حد تک خود مختار ہو اور اپنی زبان، ثقافت، رہن سہن اور رسوم و رواج کو حسبِ خواہش ترقی دے سکے۔ اِس بنیاد پر ۱۹۷۳ء کا دستور بنایا گیا۔ اِس آئین میں واضح طور پر لکھا گیا کہ تمام صوبوں کو خود مختاری دی جائے گی۔ افسوس کہ ذوالفقار علی بھٹو کی آمرانہ سوچ اور بعد کے مارشل لاؤں نے مضبوط وفاق کا نعرہ لگا کر صوبوں کو کمزور کر دیا۔ ملک کی تاریخ میں یہ سعادت آصف علی زرداری اور نواز شریف کو ملی جب اُنہوں نے اٹھارہویں ترمیم کے ذریعے صوبوں کو زیادہ سے زیادہ خود مختاری دے کر اُنہیں اپنے وسائل خود پیدا کرنے کی ترغیب دی۔ تمام دانشوروں اور سیاستدانوں کا نظریہ ہے کہ اِس طرح سے وفاق کمزور نہیں مضبوط ہو جاتا ہے۔ اگر ابتدا ہی سے ملک میں جمہوری روایات پروان چڑھتے اور مضبوط وفاق کے بجائے صوبائی خود مختاری اور فیڈریشن پر زور دیا جاتا تو مشرقی پاکستان کا المیہ جنم نہ لیتا۔ حیران کن طور پر حنیف رامے مضبوط فیڈریشن کی جگہ کنفیڈریشن یا وفاقیت کی بات کرتے ہیں۔ وہ صوبائی خود مختاری کا خیال رد کر کے عجیب منطق بگھار کر اُلٹی گنگا بہاتے ہیں:

> ''چار سالہ جلاوطنی کے دوران تمام تر غور و فکر کا حاصل یہ تھا کہ پاکستان ہی نہیں پنجاب بھی صرف اور صرف وفاقیت کے اُصول کو دِل و جان سے قبول کر کے زندہ رِہ سکتا ہے۔'' (۱۸۲)

ہندوستان میں بالخصوص پنجاب میں اسلام وسطی ایشیاء سے آئے ہوئے حملہ آوروں کے ذریعے نہیں بلکہ اُن کے ساتھ آئے ہوئے صوفیائے کرام نے پھیلایا۔ اسلامی مبلغین اور صوفیاء وسطی ہندوستان جاتے ہوئے پنجاب کی سرزمین پر پڑاؤ ڈالتے اور اکثر یہاں مستقل رہائش اختیار کرتے۔ وہ محبت، رواداری، مروت اور حُسنِ اخلاق کا درس دیتے۔ یہ اُن کی تعلیمات اور ماحول کا اثر تھا جو مقامی لوگوں نے قبول کیا۔ اِس علاقے میں تصوف کی حکمرانی کا سب سے بڑا نتیجہ یہ نکلا کہ پنجاب کے عوام کبھی مُلا کے اسلام کے پیروکار نہیں رہے۔ البتہ صوفیانہ اسلام کو ضرور دِل سے قبول کیا۔ محبت اور رواداری نفسیاتی طور پر انسان کو بہادر اور شجاع بناتی ہے۔ حنیف رامے صاحب کا استدلال یہ ہے کہ پنجاب کے عوام نے کبھی کسی کی بالادستی قبول نہیں کی ہے۔ وہ اِس تاریخی حقیقت سے بھی منکر ہیں کہ پنجاب نے ہمیشہ طاقتور کے سامنے بزدلی دکھا کر ہر جابر حملہ آور کو جگہ دی ہے۔ یہاں بھی رامے صاحب ایک بالکل اُلٹ نظریہ پیش کرتے ہیں۔ اُن کے تمام افکار کا نچوڑ یہ ہے کہ پنجاب نے بیرونی حملہ آوروں کو کبھی خوش آمدید نہیں کہا بلکہ اُن کے لیے رکاوٹ بن گئے ہیں۔ سکندرِ اعظم سے لے کر احمد

شاہ ابدالی اور نادر شاہ درانی تک سارے حملہ آوروں کا پہلا راستہ پنجاب کے پنجابیوں نے روکا تھا۔اِس سلسلے میں اُن کا یہ بھی کہنا ہے کہ انگریز کے خلاف برپا ہونے والی تمام تحریکیں سرزمین پنجاب سے اُٹھیں تھیں:

> ''کوکالہر، پگڑی سنبھال جٹا، بھرتی بند تحریک، ریشمی رومال، غدر پارٹی، اینٹی رولٹ ایکٹ تحریک، تحریک خلافت، ہجرت تحریک، نرمل در تن تحریک، نوجوان بھارت سبھا، انڈین سوشلسٹ ری پبلکن آرمی، نیلی پوش تحریک، تحریک حریت کشمیر، خاکسار تحریک، آزاد ہند فوج جیسی انقلاب دوست اور سامراج دشمن تحریکیں پنجاب میں پیدا ہوئیں اور یہی پروان چڑھیں۔ پنجاب کے بوڑھے درخت آج بھی اِن ہزاروں مجاہدین آزادی کی قربانیاں یاد کر کے آہیں بھرتے ہیں جنہیں اِن درختوں سے انگریزوں نے اِس لیے لٹکا دیا تھا کہ پنجابی عوام کا جذبہ حریت سرد پڑ جائے۔''(۱۸۳)

حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کے دیگر علاقوں کے برعکس پنجاب میں مربوط جاگیردارانہ نظام ترقی نہ پا سکا۔ یہاں کے موسمی حالات، جغرافیائی عوامل اور ثقافتی انفرادیت کی بدولت جاگیردارانہ نظام پھل پھول نہ سکا۔ جاگیردارانہ نظام نہ ہونے کے سبب پنجاب کے مزاج پر بہت گہرا اثر مرتب ہوا۔ یہاں کی زبان درباری عاجزی وانکساری سے محفوظ رہی۔اونچ نیچ اور مالک مزارع کی تقسیم سے بھی وہ معاشرہ بڑی حد تک محفوظ رہا(''چودھراہٹ'' اور ''مولا جٹ'' نظام بہت بعد میں یہاں پروان چڑھا۔ جب نہری نظام مضبوط ہوا تاہم یہ سب انگریز کا دین ہے۔ انگریز سے پہلے پنجابی معاشرے میں عملاً مساوات نافذ تھی)۔ ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی بہ نسبت پنجاب میں انگریزوں سے پہلے زراعت نے اِتنی وسعت اختیار نہیں کی کہ یہاں بڑی جاگیریں قائم ہو سکتیں۔ وہ جاگیردارانہ نظام جو دریاؤں اور ڈیلٹاؤں میں واقع صوبوں بنگال اور سندھ وغیرہ میں قائم ہوا۔ یہ نظام پنجاب میں پیدا ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ پنجاب کے دریا اِتنے تیز بہتے تھے کہ اِن سے موسمی نہریں نہیں بنائی جا سکتیں تھیں کہ جس کے نتیجے میں جاگیردارانہ نظام وجود میں آتا۔ پنجاب میں اِس وقت دنیا کا جو سب سے بڑا نہری نظام نظر آتا ہے، یہ انگریز عہد اور بعد میں ایوب خان دَور کی پیداوار ہے۔ تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ پنجابی معاشرہ اُس طرح کا قبائلی نہیں تھا اور نہ خانہ بدوش تھا۔ یہاں بڑی بڑی چراگاہیں اور ہرے بھرے جنگل تھے جہاں اُن کے مویشی آسانی سے چر سکتے تھے۔ وہ متمدن اور خوشحال لوگ تھے اور وسط ایشیاء کے قبائل کے برعکس دوسروں پر حملہ آور ہو کر اُنہیں ختم کرنے کے قائل نہ تھے بلکہ امن پر ایمان رکھتے تھے۔ یہی وہ اسباب تھے جن کی بدولت پنجاب کا معاشرہ

جاگیرداری کی لعنت سے محفوظ رہا اور نتیجتاً ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے برعکس امن وامان، مساوات، خوشحال اور انفرادیت کا حامل رہا۔ اِس سارے بحث اور پنجاب میں جاگیردارانہ نظام کے پروان نہ چڑھنے کی وجوہات حنیف رامے اپنی آپ بیتی میں یوں لکھتے ہیں:

> ''دنیا بھر میں زراعت کے پھیلاؤ ہی سے جاگیرداری نظام پیدا ہوا۔ پنجاب میں چونکہ زرعی کے بجائے گوپالی معاشرت تھی اس لئے جاگیرداریاں ناپید تھیں۔ اِسی طرح یہاں ظالم اور مظلوم، حاکم اور محکوم، جابر اور مجبور جیسے انسانی رشتے بھی موجود نہ تھے جو جاگیردارانہ معاشروں کی پہچان ہیں۔ بادشاہت بھی جاگیردارانہ نظام ہی کی پیداوار ہے۔''(۱۸۴)

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ انسانوں کی بولیاں اور زبانیں نئے ملک بناتی ہیں اور نئے خطوں کی تشکیل کا موجب بنتی ہیں۔ پاکستان اور بنگلہ دیش جدید زمانے میں اِس کی زندہ مثالیں ہیں۔ عرب بھی اِس بنیاد پر جمع ہوئے تھے اور ترکوں سے علیٰحدگی کی تحریک چلائی تھی۔ یورپ میں بھی جرمن اور فرانسیسی قومیں زبان کی بنیاد پر الگ قومیں بن گئیں۔ نیز یورپ میں تو چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی میں قومیت کا وہ جھگڑا اُٹھا جو چھوٹے بڑے درجنوں نئے ممالک بن جانے پر ختم ہوا۔ زبانوں کے سلسلے میں یہ نکتہ سمجھنے کا ہے کہ زبان صرف زبان کی حد تک محدود نہیں ہوتی بلکہ اِس کے پیچھے قوموں کی پوری ثقافت، تہذیب، معاشرت، عقائد، سوچ، افکار، پسند و مشاغل اور صدیوں کے نفسیات چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ دنیا کے تمام دانشور جب یہ کہتے ہیں کہ ہر قوم کی زبان کو قابلِ احترام جان کر اُن کو جائز مقام دینا سب کا مشترکہ فریضہ ہے تو لوگ اُنہیں مذاق کا نشانہ بناتے ہیں۔ حنیف رامے زبانوں کی اہمیت اور پاکستان میں خصوصی طور پر مختلف صوبوں کی زبانوں کی حساسیت پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:

> ''اِس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ زبان کا مسئلہ کس قدر اہم ہے۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ اگر ابتدا ہی سے اُردو کے ساتھ بنگالی کو بھی قومی زبان کا درجہ دیا جاتا اور اس سلسلے میں ایک دیانتدارانہ کوشش کی جاتی اور مغربی پاکستان کے لوگ بھی اُردو کے ساتھ ساتھ بنگالی اور مشرقی پاکستان کے لوگ بنگالی کے ساتھ اُردو سیکھ لیتے تو صورتحال مختلف ہوتی۔ آج بھی ہم نے اس عظیم المیے سے سبق حاصل نہیں کیا اور پاکستان کے چاروں صوبوں کی زبانوں کو پس پشت ڈال کر اُسی غلطی کو دُہرا رہے ہیں۔''(۱۸۵)

مشرقی پاکستان کا جدا ہو کر ایک الگ ملک بننا وطن عزیز کے لیے وہ خوفناک حادثہ ہے جو برسوں گزرنے کے بعد بھی بھلایا نہیں جا سکا۔ زندہ قومیں اِس قسم کے واقعات سے سبق حاصل کر کے آگے بڑھتی ہیں۔ وہ اُن عوامل اور عواقب کا غیر جانبدارانہ تجزیہ کرتی ہیں۔ اِس کو عوام کے سامنے رکھتی ہیں اور نئی نسلوں کو اِن کی تفصیلات بتا کر اُنہیں اعتماد میں لیتی ہیں تاکہ دوبارہ اُن عوامل اور حالات کے پیدا ہونے کی گنجائش ختم ہو سکے۔ ہمارے ہاں یہ خطرناک روش ہے کہ ہم اِس قسم کے واقعات اور حادثات کو چھپا کر، ریت میں دفن کر کے شتر مرغ کی طرح مستقبل کے خطرات سے آنکھیں بند کر کے اپنے تئیں یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ ہم نے کارنامہ کر دیا۔ قوموں اور ملکوں کی تاریخی اور سیاسی زندگی میں یہ ناقابل معافی جرم ہے۔ مشرقی پاکستان کی آزادی کے سلسلے میں ہم نے یہی طریقہ کار اپنایا۔ اس واقعے پر لب کشائی کو قابل جرم گردانا جاتا تھا، میڈیا میں اِس واقعے پر آزادانہ اظہارِ خیال پر پابندی تھی، اگر بات ہو بھی جاتی تو ریاست کا یک طرفہ اور بنا بنایا موقف پیش کیا جاتا تھا۔ اِس واقعے کے مرکزی کرداروں کو کوئی سزا نہیں ہوئی بلکہ مذکورہ حادثے کی کمیشن رپورٹ یعنی حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کو ملک کے ''وسیع تر مفاد'' میں شائع ہونے کے بجائے انتہائی خفیہ رکھا گیا۔ یہاں تک کہ چوبیس سال بعد انڈیا کے ایک اخبار میں شائع ہونے کے بعد ہی پاکستان نے اِس کو کھل دیا۔ اس سارے طرز عمل کا نقصان یہ ہوا کہ اِس عظیم حادثے کے بارے میں تفصیلی اسباب، وجوہات اور عوامل سامنے نہ آسکے۔ بھانت بھانت کی آوازیں آئیں اور حکمرانوں کی خوف میں دَب گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کے باقی ماندہ حصوں یعنی بلوچستان، وزیرستان اور سندھ وغیرہ میں کئی بار ہو بہو وہی صورتحال جنم لیتی رہی۔

واقعہ یہ ہے کہ مشرقی پاکستان کی علیحٰدگی کے اسباب و عوامل ہمیں تاریخی کتابوں میں کم اور عصری آپ بیتیوں میں زیادہ ملتی ہیں۔ ہر آپ بیتی لکھنے والے نے اِس عظیم حادثے کے بارے میں اپنے معلومات اور واقعات کا تھوڑا بہت اظہار ضرور کیا ہے۔ حنیف رامے نے اِس واقعے کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ وہ اُس مذاکراتی ٹیم کا حصہ تھے جو ذوالفقار علی بھٹو اور مجیب الرحمٰن کے درمیان ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے بعد ڈھاکہ میں ہوئے تھے۔ حنیف رامے کا خیال یہ ہے کہ ون یونٹ کے قیام اور ڈھاکہ میں آرمی ایکشن نے حالات کو اس نہج پر پہنچایا۔ اگر شیخ مجیب الرحمٰن یا مشرقی پاکستان کی بات ابتدا ہی سے توجہ اور ہمدردی سے سن لی جاتی تو نہ اُس قتل عام کی نوبت آتی جو آرمی ایکشن کے نتیجے میں ہوا اور نہ عبرتناک شکست ہماری مقدر بنتی۔ آج جب ۱۹۷۰-۷۱ء کے پُرآشوب اور دردناک واقعات کو بیتے اِتنے بہت سے سال ہو چکے ہیں تو ہمیں غیر جذباتی انداز سے دیکھنا چاہیئے کیونکہ آج بعض صداقتیں پہلے سے بھی زیادہ واشگاف ہو چکی ہیں۔ آج ایک بار پھر بلوچستان، فاٹا اور جنوبی پنجاب کے لوگوں میں احساس محرومی بڑھ رہی ہے۔ اگر نوکر شاہی، سیاست اور دیگر شعبوں میں مشرقی پاکستان کو اُس کی آبادی کے اعتبار سے نمائندگی دی جاتی اور اُن پر اسلام آباد سے حکومت کرنے کی بجائے خود اُس کے اپنے لوگوں اور اہل کاروں کے ذریعے ڈھاکہ سے حکومت ہوتی تو آج حالات یکسر مختلف ہوتے۔ مشرقی پاکستان کی آزادی کا نکتہ آغاز مجیب

الرحمٰن کے وہ چھ نکات تھے جن کے بِل بوتے پر اُس نے پانچ سال تک اپنا سیاسی مقدمہ لڑا اور جو اُن کا ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں بڑی کامیابی کا ذریعہ اور آخر میں الگ ملک کا موجب بنا۔ مجیب کے چودہ نکات کے بارے میں حنیف رامے حیران کن انکشافات کر کے لکھتے ہیں:

> ''انہی دِنوں (۱۹۶۶ء) گلبرگ لاہور میں واقع چودھری محمد علی مرحوم کی کوٹھی پر اپوزیشن جماعتوں کا ایک اجتماع منعقد ہوا جس میں شیخ مجیب الرحمٰن نے پہلے پہل مشرقی پاکستان کی طرف سے چھ نکات پر مبنی چارٹر آف ڈیمانڈ پیش کیا۔ اور کیا چاہیئے تھا اللہ دے اور بندہ لے۔ حکومت وقت نے چھ نکات کو غداری کا خوفناک منصوبہ قرار دے کر اپنی تمام پروپیگنڈہ مشینری کا رُخ اِس کے خلاف تشہیر کی جانب پھیر دیا۔''(۱۸۶)

مجیب ایک سیاسی آدمی تھے۔ جب اُن کے لیے سیاست کی گنجائش نہ چھوڑی گئی تو اُنہوں نے اِس مقدمے اور چھ نکات کو اپنی سیاست آگے بڑھانے کا وسیلہ بنایا۔ حنیف رامے کے بقول:

> ''بحث کرنے والے وکلاء اُن سے جب نام پوچھتے تو وہ شیخ مجیب الرحمٰن کی بجائے ''بنگلہ بندھو''، باپ کا نام پوچھا جاتا تو بتاتے تھے ''بنگلہ دیش''۔ مشرقی پاکستان کے عوام محسوس کرتے تھے کہ شیخ مجیب الرحمٰن بے گناہ ہے۔ وہ اس مقدمے کی تفصیلات پڑھتے اور بنگلہ بندھو کے لیے روتے جس نے اُن کی محرومیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کیا تھا۔ جوں جوں اِس مقدمے میں مجیب الرحمٰن کی رہائی دُور ہوتی گئی، مشرقی پاکستان کی علیٰحدگی قریب آتی گئی۔''(۱۸۷)

حنیف رامے مشرقی پاکستان کی علیٰحدگی کے یہ اسباب بتاتے ہیں:

> ''جائز حقوق کی خاطر جو احتجاج بھی بلند ہوتا ہے اور جو تحریک بھی اُٹھتی ہے بالآخر کامیابی سے ہمکنار ہوتی ہے۔ خواہ شروع میں کتنی ہی ناکامیاں پیش آئیں۔ اِس کے برعکس دوسروں کے جائز حقوق دبانے والے کچھ عرصے کے لئے تو کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن بالآخر انہیں صرف اور صرف ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔''(۱۸۸)

حنیف رامے نے اپنی اِس آپ بیتی میں کافی تفصیل سے پاکستان کے مسائل اور مشکلات پر روشنی ڈالی ہے۔ آپ نے مشرقی پاکستان کے پس منظر میں اِن مسائل کو پیش کر کے اِس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اگر یہ مسائل ہنگامی بنیادوں پر

حل نہ کیے گئے تو یہ عوام کے احساسِ محرومی میں تبدیل ہو جائیں گے اور احساس محرومی اور ریاست پر سے عوام کا اعتماد اُٹھنے کا نتیجہ انتہائی خوفناک ہوتا ہے جو مشرقی پاکستان کی علیٰحدگی کی صورت میں ہمارے تجربے سے گزرا ہے۔

حنیف رامے نے بتایا ہے کہ ۱۹۷۳ء کے آئین کو اپنی مکمل صورت میں بحالی، مارشل لاء کا خاتمہ، جمہوری نظام کی بحالی، چاروں صوبوں میں آبادی کے تناسب سے وسائل اور دولت کا مساوی تقسیم (این ایف سی ایوارڈ)، سرحد، بلوچستان اور پنجاب میں دریاؤں کے پانی کی مناسب تقسیم، دریائے سندھ کے پانی کا سندھ اور پنجاب میں مدت سے جاری جھگڑے کا تصفیہ وہ غور طلب موضوعات ہیں جو مستقبل کے کسی بڑے حادثے کا موجب بن سکتے ہیں۔ آپ نے اپنی آپ بیتی میں یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ اُس نے ۱۹۷۵ء میں وزارت اعلیٰ سے استعفیٰ بھی اِس لیے دیا تھا کہ مسٹر بھٹو پنجاب کو آئینی حقوق نہیں دے رہا تھا۔ علاوہ ازیں سندھ طاس کے معاہدے میں پنجاب کے ساتھ ناانصافی کی گئی تھی۔ رامے نے یہ بھی لکھا ہے کہ کتنی عجیب بات ہے کہ ہم نے بھارت کے ساتھ پاکستان میں بہنے والے دریاؤں کے بارے میں "سندھ طاس" معاہدہ کر کے بڑا نقصان کیا ہے کیونکہ ہم نے اِسی معاہدے میں دانستہ طور پر سرزمین کشمیر کو بھارت کا حصہ تسلیم کر لیا ہے۔ خان عبدالغفار خان اور اُس کی پارٹی اے این پی ہمیشہ پنجاب سے ضلع میانوالی اور اٹک دو ضلعوں کی واپسی کا پُرزور مطالبہ کرتی آئی ہے۔ حنیف رامے نے اِن دو ضلعوں کے بارے میں تاریخی، ثقافتی اور لسانی حوالوں سے دلائل دے کر اُنہیں پنجاب کا حصہ ثابت کیا ہے۔ وہ اپنے خیالات اور افکار کا نچوڑ یوں پیش کرتے ہیں:

> "سوال یہ ہے کہ کراچی کے فسادات، بجلی کی اندھا دُھند لوڈشیڈنگ، شمال مغربی سرحدی صوبے پر افغان مہاجرین کا مسلسل دباؤ اور سب سے بڑھ کر پانی کے مسئلے کو اِس بُری طرح کیوں نظر انداز کیا جا رہا ہے۔۔۔ یہ سارے مسائل بالآخر صوبائیت اور خانہ جنگی میں تبدیل ہوں گے۔ البتہ اِن مسائل کو اگر چاروں صوبوں کے سارے عوام کی خوشحالی کے منظر و پس منظر میں سلجھانے کی مخلصانہ کوشش کی گئی تو نہ صرف موجودہ مسائل بلکہ اِن کی روشنی میں مستقبل میں رونما ہونے والے دوسرے قومی اور بین الصوبائی مسائل کا قابل قبول اور آبرومندانہ حل کے لیے راستہ کھل جائے گا۔" (۱۸۹)

یہ آپ بیتی جن دِنوں میں لکھی جا رہی تھی، روس کے خلاف افغان جہاد زوروں پر تھا اور بڑی تعداد میں افغان مہاجرین ہمارے ملک میں پناہ لینے کے لیے آ رہے تھے۔ مہاجرین کا ایک سیلاب تھا جو طورخم بارڈر عبور کرنے کے بعد بغیر

کسی روک ٹوک اور شناخت کے چترال سے کراچی تک ملک کے کونے کونے میں پھیل رہا تھا۔اِن لوگوں کی وجہ سے ملک میں جو عدم استحکام، بے روزگاری، معاشرتی اور سماجی مسائل پیدا ہوئے،آج تک اُن کا سدِ باب نہ ہو سکا۔اگراُس وقت کوئی منصوبہ بندی کر کے مہاجرین کے لیے لائحہ عمل وضع کیا جاتا تو دہشت گردی، لوٹ مار، جہادی کلچر، کلاشن کوف کلچر اور منشیات فروشی کی وہ وبانہ پھیلتی جس نے کئی سالوں سے وطن عزیز کو اپنی گرفت میں لیا ہے۔حنیف رامے نے اُس زمانے میں جب اِس موضوع پر کوئی بات کرنے کو تیار نہ تھا بڑی بہادری سے افغان مہاجرین کی معیشت پر تباہ کن اثرات اور سماجی تغیرات کا ذکر کیا ہے۔اُن کی خدشات اور پیشن گوئیاں حرف بہ حرف درست ثابت ہوئیں جو اُن کی سیاسی بصیرت اور دانشورانہ فکر کی آئینہ دار ہیں:

> ''ہم اِن بتیس لاکھ افغان مہاجرین سے بے فکر بیٹھے ہیں اور اُن کے خطرناک وجود کو بالکل اسی طرح نظرانداز کیا ہے جیسے کبوتر آنکھیں بند کر کے بلی کے وجود کو نظر انداز کرتا ہے۔اگر پاکستان میں ہم نے اسلام کے نام پر افغان مہاجرین کی ذمہ داری قبول کرلی ہے اوراِس حقیقت کو نظرانداز کر دیا ہے کہ ان کے باعث پاکستان کی سلامتی اور اس کے عوام کی حفاظت خطرے میں پڑ چکی ہے تو پھر ہم پر پہلا حق تو اُن بہاری مہاجرین کا تھا جنھوں نے دو مرتبہ پاکستان کی خاطر خون دیا اور گزشتہ چودہ سال سے بنگلہ دیش میں پڑے اِس انتظار میں گل سڑ رہے ہیں کہ پاکستان کو کبھی تو غیرت آئے گی۔''(۱۹۰)

حنیف رامے نے بنیادی طور پر اپنی آپ بیتی میں پنجاب کا مقدمہ پیش کیا ہے۔مقدمے کے دلائل میں اُس نے اُن تمام ثبوتوں سے کام لیا ہے جو اُس کے مقدمے کو مضبوط کرتے تھے۔اُس کا بیانیہ یہ ہے کہ پنجاب کو اِس ملک میں خصوصی اہمیت حاصل ہے۔پنجاب کسی کا دشمن نہیں بلکہ تمام خطوں اور علاقوں کا خیر خواہ ہے جو مٹھی بھر لوگ پنجاب کے لباس میں چیرہ دستیاں کر رہے ہیں۔اُنہیں پنجاب کی نمائندگی حاصل نہیں۔وطن عزیز کے لیے پنجاب نے بڑی بڑی قربانیاں دی ہیں۔یہ واحد صوبہ ہے جو تقسیم وطن کے وقت تقسیم ہو گیا اور جس کے بیٹوں نے بڑی تعداد میں سرحد کے دونوں جانب ہجرت کی۔آپ نے اپنی آپ بیتی میں پنجاب کے بارے میں ایک خاص تاثر جو بنگلہ دیش، سندھ، سرحد اور بلوچستان میں پایا جاتا ہے کو زائل کرنے کی کوشش کی ہے۔نیز حنیف رامے نے بتایا ہے کہ محبت اور رواداری اہل پنجاب کے رگ رگ میں موجزن ہے اور محبت ورواداری دلیر وشجاع لوگوں کا خاصہ ہے۔پنجاب کے رہنے والے دلیر ہیں اِس لیے اُن سے کسی پر ظلم

کرنے یا کسی کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے کی توقع نہیں کی جاسکتی۔اِس خطے کی انفرادیت، خوبصورتی، دلآویزی اور عظمت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ ہندوستان کے تقریباً سارے آرٹسٹ اور فنکار اِس سرزمین سے اُٹھے ہیں۔ حنیف رامے نے تین چار صفحات پر محیط ایک طویل فہرست دی ہے جس میں اُس نے پنجاب کی مٹی سے اُٹھنے والے شاعروں، عالموں، ناقدوں، دانشوروں، ڈرامہ نگاروں، ناول نگاروں، افسانہ نگاروں، صحافیوں، مصوروں، خوش نویسوں، صداکاروں اور مزاح نگاروں کے نام لکھ کر اپنے بیانیے کو تقویت بخشی ہے۔(۱۹۱)

محمد حنیف رامے پنجاب میں پاکستان پیپلز پارٹی کے بانیوں میں سے تھے۔اُنہیں ذوالفقار علی بھٹو کے نہایت قریبی دوست ہونے کا اعزاز حاصل تھا بلکہ بقول اُن کے پیپلز پارٹی کو خونِ جگر سے سینچا تھا۔ ایوب خان اور جنرل یحییٰ خان کے خلاف ایک طویل جدوجہد کے بعد جب ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں پاکستان پیپلز پارٹی اقتدار میں آئی تو ۱۹۷۲ء کو اُنہیں پنجاب کا وزیر خزانہ بنایا گیا۔ یہ ایک اہم ذمہ داری تھی تاہم آپ نے اِس عرصے کے زیادہ واقعات نہیں لکھے۔ فقط اِتنا لکھا ہے کہ وہ خوشامد نہیں کرتے تھے بلکہ ذوالفقار علی بھٹو کو بھی سچی بات منہ پر کہنے سے نہیں کتراتے تھے۔ جس کا بڑا نقصان یہ ہوا کہ بھٹو صاحب کا دِل اُن کی طرف پراگندہ ہوا اور پھر آخری دم تک صاف نہیں ہو سکا۔ آپ نے اِس بات کا بھی زکر کیا ہے کہ جب وہ پنجاب کے وزیر خزانہ تھے تو کس طرح گورنر مصطفیٰ کھر کے سامنے اُن کی بعض پالیسیوں پر احتجاج کیا:

> ''اُس وقت پنجاب میں ملک معراج خالد وزیر اعلیٰ اور میں وزیر خزانہ تھا۔ میں نے بھری کابینہ میں اُن واقعات پر احتجاج کیا جو حکومت دانستہ طور پر کر رہی تھی جس پر گورنر کھر نے پوری کابینہ کو بلوایا اور مجھے سنا سنا کر مسٹر مختار اعوان اور مرحوم انور سمّہ کو سخت سست کہنا شروع کر دیا۔''(۱۹۲)

آپ نے ۱۵ مارچ ۱۹۷۴ء کو پنجاب کے وزیر اعلیٰ کے طور پر حلف اُٹھایا۔ یہ وزارت خزانہ سے زیادہ بھاری اور بڑی ذمہ داری تھی جو آپ کو سونپی گئی۔اِس سے پی پی پی میں آپ کے مقام اور حیثیت نیز ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ قریبی تعلق کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک سال سے بھی کم عرصے میں آپ کو پنجاب کے وزارتِ اعلیٰ کے منصب سے الگ کر دیا گیا۔ اس دوران بھٹو کے ساتھ آپ کے اختلافات اُس نہج پر پہنچ گئے تھے جہاں آپ کا اُن کے ساتھ چلنا ممکن نہیں رہا تھا۔ آپ نے بہت اختصار سے اپنے ایک سالہ وزارت اعلیٰ کے زمانے کے واقعات بیان کیے ہیں۔ آپ نے اِس موقع پر یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ بھٹو صاحب کے زمانے میں نام کی جمہوریت تھی۔ آئینی طور پر صوبے کا چیف ایگزیکٹیو وزیر اعلیٰ ہوتا ہے لیکن عملی طور پر وزیر اعظم اور پنجاب کے گورنر مصطفیٰ کھر صوبہ چلا رہے تھے۔اِس موقع پر رامے صاحب کا تجزیہ قابل غور ہے:

"تب میں نے جانا اور مانا کہ اگر پنجاب جیسے بڑے اور طاقتور صوبے کے ساتھ
مرکز یہ سلوک کر سکتا ہے کہ اُس کی انتظامیہ میں جا و بے جا دخل اندازی کرے اور
اُس کی آئینی اختیارات میں خواہ مخواہ ڈنڈی مارے تو وہ چھوٹے صوبوں کو کہاں خاطر
میں لاتا ہوگا۔" (۱۹۳)

وزارت اعلیٰ سے استعفیٰ دینے کے بعد آپ کو جیل بھیج دیا گیا۔ ذوالفقار علی بھٹو سے آپ کے اختلافات آپ کو خاصے مہنگے پڑے۔ دریائی پانی اور پنجاب کے دیگر مسائل کو جب آپ نے بار بار اُٹھایا تو آپ کو وزیر اعظم ہاؤس سے جیل بھیج دیا گیا۔ اُنہیں لاہور کے شاہی قلعے سہالہ، اٹک اور کوٹ لکھپت جیل میں رکھا گیا۔ اِس عرصے میں آپ کو انتہائی تشدد کا نشانہ بھی بنایا گیا۔ بھٹو کے ساتھ اختلافات اور اپنی سزا کا ذکر بڑی احتیاط سے کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اُنہوں نے (مسٹر بھٹو نے) سرحد اور بلوچستان کے لیڈروں کے ساتھ ساتھ
مجھے بھی قید کر دیا اور اپنے تئیں سمجھ لیا کہ اب "گلیاں سنجیاں" ہو گئی ہیں اور ان
میں "مرزا یار" مَن مانی کرتا پھرے گا۔ اُنہوں نے یہ نہ جانا کہ تینوں صوبوں کی
قیادتوں سے مکالمہ توڑ کر وہ پاکستان میں روز بروز تنہا ہوتے چلے جائیں
گے۔" (۱۹۴)

اِس موقع پر بھٹو نے نہ صرف اُنہیں کھلی دھمکیاں دی بلکہ اُنہیں اپنی پارٹی سے نکال باہر کیا۔ "جاگ پنجابی جاگ" کا پہلا نعرہ حنیف رامے نے لگایا تھا (جو بعد میں شریف برادران نے ایک سیاسی حربے کے طور پر استعمال کیا) ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ اپنے اختلافات کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ اُنہیں پانی کی منصفانہ اور مساویانہ تقسیم کے مسئلے پر بھٹو صاحب سے اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔

جنوری ۱۹۷۱ء کو مسٹر بھٹو پاکستان پیپلز پارٹی کی ایک ٹیم لے کر ڈھاکہ گئے اور وہاں تقریباً ایک ہفتہ قیام کے دوران مجیب الرحمٰن اور اُن کی پارٹی عوامی لیگ سے انفرادی اور اجتماعی مذاکرات کیے۔ حنیف رامے کو مسٹر بھٹو نے اِس مذاکراتی ٹیم کا کنونیر بنایا تھا۔ عوامی لیگ کی طرف سے بھی ایک ٹیم نامزد ہوئی تھی اور دونوں ٹیمیں اپنے منشوروں کی روشنی میں اشتراکِ عمل کی گنجائش ڈھونڈنے نکلی تھیں۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ مغربی پاکستان کی سیاسی جماعتیں عوامی لیگ پر اعتماد نہیں کر رہی تھیں کیونکہ عوامی لیگ نے یہ بھاری اکثریت مشرقی پاکستان میں اپنے چھ نکاتی پروگرام کی وجہ سے حاصل کی تھی اور اِس پروگرام سے مغربی پاکستان کے عوام کو بے خبر رکھا گیا تھا۔ اِس بارے میں اپنے تجربات اور معلومات بیان کرتے ہوئے رامے لکھتے ہیں:

''دونوں ٹیموں کے باہمی مذاکرات کے علاوہ مسٹر بھٹو اور شیخ مجیب الرحمٰن صاحب بھی ہر روز آپس میں ملتے رہتے تھے۔ جو کچھ میرے علم میں ہے اِس کے مطابق شیخ صاحب نے مسٹر بھٹو سے کہا تھا کہ تمہاری مذاکراتی ٹیم اچھی انگریزی بول کر میری ٹیم کو تو مرعوب کر سکتی ہے لیکن میں مرعوب ہونے والا نہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ شیخ صاحب دراصل اِس موقع پر اپنے قانونی اور آئینی استحقاق سے دست بردار ہونے کو تیار نہ تھے۔''(۱۹۵)

آپ نے اپنے اقتدار کے زمانے میں جو کام کیے تھے یا صنعتوں کی داغ بیل ڈالی تھی، اُس کی تفصیل دیتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ اُس نے چشمہ جہلم رابطہ نہر پر پنجاب کا حق تسلیم کروایا، نہری نظام اور آبپاشی کے لیے بہتر منصوبہ بندی کی، سندھ اور پنجاب کے درمیان مدت سے جاری دریاؤں کے پانی کی تقسیم کے حوالے سے ٹھوس اقدامات کیے اور چھوٹے شہروں میں صنعتی یونٹوں کا اہتمام کیا۔آپ نے اپنے ترقیاتی کاموں کی مختصر فہرست دی ہے لیکن ساتھ یہ گلہ بھی کیا ہے کہ غیر پنجابی حکمرانوں کو اُن کے کام ایک آنکھ نہ بھائے۔اِس لیے اُن کے لیے قدم قدم پر روڑے اٹکائے گئے جو بالآخر وزارت عظمیٰ اور پارٹی سے نکالے جانے پر منتج ہوئے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''میں نے پنجاب کے وزیر خزانہ اور وزیر اعلیٰ کے طور پر اِس ضمن میں صنعتی ترقیاتی بورڈ جیسے کئی ادارے قائم کیے اور سرکاری اور نجی سرمائے کے اشتراک سے ٹریکٹر اور اخباری کاغذ جیسی ضروری صنعتوں کے قیام کی داغ بیل ڈالی تھی لیکن مضبوط مرکز کے شوقینوں نے اِن کاموں کو اچھی نظر سے نہ دیکھا تھا اِس لیے کہ مرکز میں سربراہی اور کلیدی سیاسی عہدے غیر پنجابیوں کے ہاتھ میں تھے۔''(۱۹۶)

۱۹۷۸ء میں پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت ختم ہوئی اور ملک میں جنرل ضیاء الحق کا مارشل لاء نافذ ہو گیا۔ اگرچہ اِس عرصے میں آپ پیپلز پارٹی چھوڑ چکے تھے اور اپنی ایک الگ سیاسی پارٹی ''پاکستان مساوات پارٹی'' بنائی تھی لیکن پھر بھی پی پی پی کے اکابرین میں آپ کا نام لیا جاتا تھا۔ ۱۹۷۹ء کو آپ نے چار سال کے لیے خود ساختہ جلاوطنی اختیار کی اور امریکہ تشریف لے گئے۔اِس پورے عرصے میں آپ نے ملک کے حال اور مستقبل کے بارے میں سوچا۔ ملک کی طویل سیاسی تاریخ آپ کے سامنے تھی۔ ون یونٹ آپ کے سامنے بنا اور ختم ہوا تھا، فوجی حکومتیں، نوکر شاہی، مشرقی پاکستان کی علیٰحدگی،

مسٹر بھٹو کا عروج و زوال یہ سب کچھ آپ کے سامنے وقوع پذیر ہوا تھا۔ یہ وہ دَور ہے جب آپ نے پنجاب اور اہل پنجاب کی قیادت کرنے اور اُن کی آواز بننے کا فیصلہ کیا۔ یہی وہ وقت تھا جب آپ آگے آئے اور پنجاب کا مقدمہ لڑنے کا ارادہ کیا۔ وطن سے دُور بیٹھ کر کئی حقیقتیں اُن پر آشکارا ہوئیں۔ اول یہ کہ پنجاب کے بارے میں مخلصانہ رویے اور غلط فہمیوں کو دُور کیا جائے، دوم یہ کہ پنجاب حقیقت میں بڑے بھائی کا کردار ادا کرنے کے لیے تیار ہو جائے اور سوم یہ کہ بربادی کی جگہ سلامتی کی راہ اختیار کی جائے تاکہ نہ صرف پاکستان کی بقا اور یکجہتی بلکہ پنجاب کی سربلندی اور نیک نامی کا سامان مہیا کیا جا سکے۔ جلاوطنی کے بعد کے حنیف رامے ایک بدلے ہوئے سیاستدان تھے۔ اب اُس نے اپنی ساری توانائیاں جمہوری اقدار کی مضبوطی، پنجابیوں کے جمود کے خاتمے اور وطن عزیز کی یکجہتی پر مرکوز کر دیں۔ تحریر و تقریر اور مصوری و خطاطی غرض ہر جگہ آپ نے یہی بیانیہ اختیار کیا اور یہ بیانیہ آپ کی پہچان ٹھہرا۔ گو آپ پر تعصب اور پنجاب کی طرف بے جا طرفداری کا الزام لگایا گیا (اگرچہ اِس الزام میں صداقت بھی ہے) لیکن آپ نے ہر چیز سے بے پروا ہو کر اپنے بیانیے پر توجہ مرکوز رکھی۔ چنانچہ اِس بارے میں رامے لکھتے ہیں:

> ''چار سال کی جلاوطنی کے دوران تمام تر غور و فکر کا حاصل یہ تھا کہ پاکستان ہی نہیں پنجاب بھی صرف اور صرف وفاقیت کے اُصول کو دِل و جان سے قبول کر کے زندہ رہ سکتا ہے۔''(۱۹۷)

محمد حنیف رامے بنیادی طور پر ادیب اور مصور تھے۔ اگرچہ سیاست اُس کی زندگی کا اہم حوالہ بن گئی لیکن وہ پیدائشی ادیب تھے۔ اُردو، پنجابی اور انگریزی تینوں زبانوں پر اُنہیں یکساں عبور حاصل تھا۔ مشہور مصور اسلم کمال نے ایک جگہ اُن کے بارے میں لکھا ہے:

> ''حنیف رامے پنجاب کے دریاؤں کی مانند فراخ دِل، فراخ مزاج اور کشادہ پیشانی رکھتے ہیں۔ وہ رنگ اور لفظ دونوں سے پیکر تراشی پر عبور رکھتے ہیں۔ اگر وہ سیاستدان نہ بھی ہوتے تو بھی اُس کی شہرت پر حرف نہ آتا۔ آج جو لوگ سوال اُٹھاتے ہیں کہ پاکستانی سیاست نے کس قسم کے لوگ پیدا کیے ہیں؟ تو میں اُن کے سامنے رامے کو پیش کر دیتا ہوں کہ سیاسیات پاکستان درجہ تکمیل کو پہنچ کر اُن جیسے لوگ پیدا کرے گی۔ مرنجانِ مرنج، صلح کل، منکسر المزاج، روشن دماغ، بہترین لکھاری، ماہر اقتصادیات، نامور خطاط اور بہترین مصور۔''(۱۹۸)

''پنجاب کا مقدمہ'' سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ اِس مقدمے کے مندرجات اور پیش کیے گئے دلائل پر بھی اعتراض کیا جا سکتا ہے اور اُن کے استغاثہ کا جواب بھی دیا جا سکتا ہے (جس طرح خان عبدالولی خان نے اُنھیں کھلے خطوط کے ذریعے دیا تھا) لیکن اِس کتاب کے اسلوب پر دو رائے نہیں دیئے جا سکتے۔ بلاشبہ حنیف رامے کا اسلوب خوبصورت، دلکش ،آسان، عام فہم اور رواں دواں ہے۔ وہ دوٹوک الفاظ میں بات کرتے ہیں۔ وہ موقع کی مناسبت سے اپنا اسلوب تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ زبان و بیان اور اظہارِ بیان پر اُنھیں قدرت حاصل ہے اور موقع و محل کو دیکھ کر بات کرتے ہیں

حنیف رامے کے اسلوب کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ نہ تو مرعوب ہوتے ہیں اور نہ عاجزی اور انکساری سے کام لیتے ہیں۔ وہ زیادہ تر جذبات کو اسلوب کے ماتحت لا کر چلتے ہیں۔ اُن کے بلند آہنگ اسلوب کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ عام زندگی میں بھی جذباتی اور تیز طرار شخص ہوں گے۔ ہار ماننا یا دوسروں کی بات سے متاثر ہونا اُن کی طبیعت کے خلاف تھا۔ چونکہ اسلوب ہی شخصیت اور شخصیت اسلوب ہے اس لیے اُن کے اسلوب کو مدنظر رکھ کر اُن کی شخصیت اور نفسیات سے بڑی حد تک آگاہی ہوتی ہے:

> ''سچ تو یہ ہے کہ پنجاب کے کردار کو راجہ پورس سے پہچاننے کی کوشش کرنی چاہیئے نہ کہ پورس کے ہاتھیوں سے۔ ہاتھیوں کی پسپائی کے باوجود پورس کی نگاہ اِتنی بلند اور جان اِتنی پُرسوز تھی کہ جب سکندر نے پوچھا کہ بتاؤ تم سے کیا سلوک کیا جائے تو پورس نے سکندر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا تھا کہ وہی جو ایک خود مختار اور غیرت مند قوم کے حکمران کے شایانِ شان ہو۔''(۱۹۹)

ایک دوسری جگہ پنجاب کے ماحول اور آب و ہوا کی تعریف رومانوی انداز سے کر کے جلال و جمال کے تناظر میں اپنی بات کو ماضی، حال اور مستقبل پر کچھ اِس طرح سے منطبق کی ہے کہ پورا منظر آنکھوں میں کبھی مدہم اور کبھی چکاچوند ہو کر اُبھرتا اور غائب ہوتا معلوم ہوتا ہے:

> ''پنجاب کی تیز دھوپ اور اس کے جلال نے اِس کی رزمیہ شاعری میں رنگ باندھا ہے۔ چنانچہ سیف الملوک اور مرزا صاحبان کے بول اور آہنگ آج بھی خون کھولانے کے لئے شراب و شباب کا کام کرتے ہیں لیکن پنجاب کی گھنی چھاؤں اور اِس کے جمال کا نقشہ ہی اور ہے۔''(۲۰۰)

تحریر میں خطیبانہ رنگ اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب آپ کو پورا احساس ہو کہ میرا نکتہ نظر سو فیصد درست ہے اِس

لیے میری بات تسلیم کرنا سب پر لازم ہے۔ اعلیٰ ذہین یا نابغہ روز گار شخص کی یہ پہچان بتائی گئی ہے کہ وہ دوسروں کے کام آئے گا، دلیر اور شجاع ہو گا اور کسی شخص سے متاثر ہوئے بغیر زندگی میں اپنے لیے الگ راستے بنائے گا۔ خطیبانہ اسلوب کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ اِس میں ابلاغ کو نقصان پہنچتا ہے تاہم لکھنے والا اِس بات کی فکر نہیں کرتا۔ وہ اپنی طرف سے چونکہ حق اور سچ پر ہوتا ہے اِس لیے زیادہ تر باتوں کو در خور اعتنا نہیں سمجھتا۔ جہاں تک مذکورہ آپ بیتی کا تعلق ہے، خطیبانہ اسلوب میں بھی مصنف کا سلسلہ ابلاغ اور تفہیم پر فرق نہیں پڑتا۔ خلوص، سچائی اور مضمون پر گرفت نے اُن کے خطیبانہ اسلوب کو خوشگوار بنایا ہے:

> ''یہ تھا میرا پنجاب جس کے گھبروؤں اور مٹیاروں کے رنگ میں دہکتے لہو کی سُرخی اور کچے دودھ کی سفیدی گندم گوں ہو گئی تھی۔ یہ تھا میرا پنجاب جہاں کے گھبرو کبڈی، کشتی اور گھڑ سواری میں تاک تھے۔ یہ تھا میرا پنجاب جس کی ہواؤں میں ڈھولے، ٹپے اور ماہیا کے اشتیاق انگیز بول اور سُر سموئے تھے۔ یہ تھا میرا پنجاب جہاں کیکروں پر کانٹے ہی نہیں پھول بھی آتے تھے اور جب یہ پھول پک جاتے تھے تو محبت کرنے والے کبھی نہ بچھڑنے کی قسمیں کھاتے تھے۔ یہ تھا میرا پنجاب جہاں گنے کا رس نکالنے والے بیلنے سردیوں میں چوپالوں میں بدل جاتے۔''(۲۰۱)

آپ بیتی میں صفحہ نمبر ۳۳ سے صفحہ نمبر ۹۰ تک تین ابواب ''تاریخ کا تشدد''، ''قیادت کا فقدان'' اور ''وفاقیت کے تقاضے'' میں اس قسم کے اسلوب سے کام لیا گیا ہے۔(۲۰۲)

حنیف رامے دانشور اور ایک اچھے ادیب تھے۔ اُن کی فلسفیانہ طبعیت اور دانشورانہ سوچ مختلف انداز سے ہمارے سامنے آتی ہے۔ اُن کے اقوال زرین اور دانشورانہ جملے ہر ہر صفحے پر دامن کشاں ملتے ہیں۔ ثبوت کے طور پر چند جملے نقل کرتے ہیں:

۱۔ ''یوں معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ نے موت کی طرح پنجاب کو تاک لیا تھا اور نت نئے حملہ آوروں کی صورت میں بار بار اِس کے گھر پر چھاپہ مارتی تھی''۔(۲۰۳)

۲۔ ''وائے افسوس کہ ہم آج بھی مسلمان بادشاہوں کی تاریخ کو تاریخ اسلام سمجھتے ہیں اور اُن کی فتوحات کو اسلام کی فتوحات گردانتے ہیں''۔(۲۰۴)

۳۔ ''خدا کا قانون ہے کہ کسی پر اِتنا بوجھ ڈالا ہی نہیں جاتا جو وہ اُٹھا نہ سکے''۔(۲۰۵)

۴۔ ''بھائی اگرایک جگہ کھائیں پکائیں تو گھر میں کشادگی کی جگہ کشیدگی اور خوشی کے بجائے شکایت پیدا ہو جاتی ہے''۔(۲۰۶)

۵۔ ''ذوالفقار علی بھٹو پنجاب میں کسی کو وارث شاہ کا وارث بنتا نہیں مانگتے تھے''۔(۲۰۷)

۶۔ ''واپسی پر ایک پنجابی سپاہی کے ہاتھوں سکندرِ اعظم کو ایک تیر لگا جو جان لیوا ثابت ہوا اور یوں ایک پنجابی کے ہاتھوں لافانی دیوتاؤں کی طرح آسمان پر جگمگانے والا سکندر پیوند خاک ہو گیا''۔(۲۰۸) [حالانکہ جدید تحقیق کے مطابق سکندر کی موت ملیریا نامی بیماری سے ہوئی تھی]۔

۷۔ ''جنہیں مستقبل میں بڑے بڑے کام کرنے ہوتے ہیں۔ وہ ماضی کی چھوٹی باتوں میں نہیں اُلجھا کرتے''۔(۲۰۹)

۸۔ ''میں نے خوش آمدید کہنے کی اُمید میں ولی خان کو خدا حافظ کہا''۔''(۲۱۰)

حنیف رامے کے یہاں اثر آفرینی کے بعض ایسے وسائل بھی ہیں جن میں بے ساختہ اہتمام کے انداز ملتے ہیں۔ مثلاً پہلے باب ''میرا پنجاب'' میں حنیف رامے نے جملوں کے ترتیب اور ایک جیسے آوازوں والے الفاظ سے عجیب سی فضا پیدا کی ہے۔ چنانچہ اِس میں ص، س، ش کی آوازوں کا مجموعی اثر مصنف کے اندرونی جذبات کے تلاطم اور فضا کی خارجی خاموشی کی اطلاع دیتا ہے۔اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ حنیف رامے آوازوں کی تاثیر سے اچھی طرح باخبر ہیں اور اُن کے الفاظ بے ساختہ مضمون کے مطابق آتے ہیں۔اِس سلسلے میں یہ عرض کرنا بے جا نہ ہوگا کہ حنیف رامے کا اسلوب اُس ادبی روایت کا وارث ہے جو سر سید، شبلی، رشید احمد صدیقی، مختار مسعود، مشتاق احمد یوسفی، ڈاکٹر سید عبداللہ، مولانا صلاح الدین، محمد طفیل اور ڈاکٹر وزیر آغا جیسے اکابرِ ادب سے ہوتا ہوا حنیف رامے کی نسل تک پہنچتا ہے۔ حنیف رامے اکثر الفاظ کے صوتی آہنگ اور الفاظ کی تکرار سے عجیب سماں باندھتے ہیں:

''رزم کی جگہ پنجاب کی بزم کو دیکھیں تو یہاں اِس کے پانچ دریاؤں کی طرح پانچ پیروں کے فیض کے چشمے بہتے نظر آتے ہیں۔آگے بڑھیں تو پانچ آبی دریاؤں اور

پانچ روحانی دریاؤں کے پانیوں پر پلنے والے برگدوں اور پیپلوں کے نیچے پانچ صوفی شاعروں کی محفل سجی نظر آتی ہے جس میں شاہ حسین، سلطان باہو، وارث شاہ، بلھے شاہ اور خواجہ فرید آمنے سامنے بیٹھے درد اور دوستی کے گیت سناتے پائے جاتے ہیں۔"(۲۱۱)

یہ پیرا گراف دیکھیے جس کے الفاظ اور ان الفاظ کے پیچھے ان کا صوتی آہنگ اور پس منظر میں رنگین عکس بناتے کوس دیر تک پردہ ذہن پر اپنے اثرات چھوڑتے جاتے ہیں:

"مہکتے، میٹھے دریاؤں کے پانی، تیز دھوپ اور گھنی چھاؤں والا میرا پنجاب جس کے ترنجنوں میں ہیروں، سہتیوں، سوہنیوں اور صاحباؤں نے اپنے اپنے چرخے ڈاہ رکھے تھے اور جن کے چرخوں کی گھوک سُن کر بڑے بڑے رانجھے، مراد، مہینوال اور مرزے پہاڑوں سے اُترے چلے آتے تھے۔"(۲۱۲)

حنیف رامے نے کہیں کہیں شاعرانہ اسلوب کا استعمال بھی کیا ہے خصوصاً وہاں، جہاں پنجابی سورماؤں یا پنجاب کی دھرتی کی شان و شوکت بیان کرنا مقصود ہو۔ رامے صاحب کا استدلال یہ ہے کہ خطہ پنجاب دنیا کے قدیم ترین خطوں میں سے ایک ہے۔ یہاں کی ثقافت کی اپنی شان اور اپنی انفرادیت ہے۔ یونانیوں اور آریاؤں سے لے کر مغلوں اور افغانوں تک سب نے اِس دھرتی کو پامال کیا۔ اِس زمین کے باشندوں نے کبھی اپنی سرحدوں سے نکل کر تجاوز کرنے کی کوشش نہیں کی اِس لیے پنجاب کو غاصب اور ظالم کا روپ دینا قرین انصاف نہیں۔ جس بدحالی، ناانصافی اور جبر سے پاکستان کے دیگر باشندے گزر رہے ہیں، اُن حالات کا یہ خطہ بھی شکار ہے۔ چند افراد کی ٹولی کی زیادتیوں کو سب کے سر نہیں باندھا جا سکتا۔ رامے صاحب بیک وقت دو مقدمے ایک ساتھ لڑ رہا ہے۔ ایک مقدمہ وہ پاکستان کے غیر پنجابی افراد کے سامنے پیش کر رہا ہے اور دوسرا پنجاب کے باسیوں کو اپنی تاریخ اور ثقافت اپنانے کا۔ جب وہ اپنا روئے سخن اپنے پنجابی عوام کی طرف کرتا ہے تب اُن کا اسلوب شاعرانہ اور کہیں کہیں طنزیہ ہو جاتا ہے:

"تم اُس خطہ زمین کے باسی ہو جس نے سہگل اور خورشید کی آوازوں کو اپنی دلکشی دی تھی جس کے صحراؤں نے ریشماں کی ہُوکوں اور کُوکوں میں اپنی آندھیوں اور بگولوں کا زور بھر دیا تھا جس کے میٹھے چشموں سے مہدی حسن اور غلام علی کی غزل پھوٹی تھی۔ جس کے تپتے میدانوں اور تھلوں نے عالم لوہار، طفیل نیازی، عنایت حسین بھٹی، شوکت علی اور عطاءاللہ نیازی کے لوک رنگ کو گداز بخشا تھا۔"(۲۱۳)

اب طنزیہ اسلوب کے نمونے ملاحظہ ہوں:

''اُردو بولو، اُردو پڑھو، اُردو لکھو، کا یہ قول گھروں اور دفتروں میں اُن (پنجابیوں) کا عمل بن گیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے پنجاب کی عظیم شاعری اُس کے باسیوں کے لئے یونانی اور عبرانی بن گئی۔ آج پنجاب کی نئی نسلیں شاید ہی حضرت وارث شاہ کی ہیر، مولوی غلام رسول کی یوسف زلیخا یا میاں محمد بخش کی سیف الملوک کو خود پڑھ یا سمجھ سکتی ہوں۔''(۲۱۴)

آگے چل کر مصنف مزید لکھتے ہیں:

''یہی کیفیت پنجاب کی رہن سہن کی ہے۔ وہ چوپال اور پنچائیتیں، وہ پنگھٹ، ترنجن اور پینگیں، پھلکاریاں، وہ جڑاؤ گلوبند، نتھیں اور لونگ، وہ لسی، رس اور سردائی، وہ سرسوں کا ساگ، وہ قیمے کے نان اور بلوں والے پراٹھے، وہ ہولاں، پھلے، کھیلاں اور مرونڈے، وہ اندرسے، کلچے، قتلمے اور پٹھورے، وہ پھینیاں اور ختائیاں، وہ لنگیاں، پٹکے، لاچے، وہ ناگرہ جوتیاں، طلائی کھسے، وہ کھیس، سلوکے، لوئیاں اور دَھسے، سب ایک طرف رِہ گئے اور اِرد گرد کا بے ربط رہن سہن پنجاب پر مسلط ہو گیا۔''(۲۱۵)

اِس فقرے میں طنز کا کس قدر کاٹ ہے:

''پنجاب کو بے زبان سمجھنے والوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ جب بے زبان اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں تو کسی کی نہیں سنتے۔''(۲۱۶)

جہاں تک اسلوب کا تعلق ہے تو حنیف رامے کا اسلوب مابہ اختصار معلوم ہوتا ہے۔ طویل اقتباسات اور تشریح طلب موضوعات کو رامے بڑی آسانی، صفائی اور روانی سے چند جملوں میں بیان کر جاتے ہیں۔ سر زمین پنجاب سینکڑوں سالوں سے دنیا کے مختلف اقوام کے نشانے پر رہی ہے۔ یہاں کی آب وہوا، چراگاہیں، زمین کے وسیع خطے، جنگلات، دریاؤں کے کنارے، زرخیز زمین وغیرہ کی کشش بار بار بیرونی حملہ آوروں کو اپنی طرف متوجہ کرتی آئی ہے۔ اِس وسیع موضوع کو رامے دو تین فقروں میں یوں بیان کرتے ہیں:

''آج اگر پنجاب اپنے آپ سے شرمندہ شرمندہ نظر آتا ہے تو اِس کے پیچھے تاریخ کے اِس تشدد کو دیکھنا چاہیئے جو آریائی قبائل سے شروع ہو کر یونانی، باختری، ساسانی،

پہلوی، ہن، تاتاری، غزنوی، مغل، دُرانی، ابدالی اور انگریز حملہ آوروں تک جاری رہا۔"(۲۱۷)

تاریخ نویسی کے لیے تلخیص نویسی بنیادی شرط ہے۔ ناول نگاری میں تشریح اور پھیلاؤ کے لیے کافی گنجائش موجود ہوتی ہے تاہم تاریخ نگار کے پاس ایسی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ آپ بیتی نگاری کے لیے بھی اختصار نویسی ضروری ہے۔ حنیف رامے کو اختصار نویسی کا ہنرِ خوب آتا ہے چنانچہ پنجاب کی ہزار سالہ تاریخ کو ایک پیرا گراف میں یوں سمویا ہے:

"یہ پنجاب اپنے دریاؤں کی طرح قدیم لیکن انہی کی طرح تازہ تھا۔ یہ وہ خطہ ارض تھا جس کی سوان وادی میں انسانی وجود کے اولین نشانات ملتے ہیں۔ اِسی سرزمین پر ہڑپہ کے نام سے دنیا کی سب سے پہلی انسانی تہذیب نے جنم لیا تھا۔ یہ رَگ وید اور مہابھارت کی دھرتی تھی۔ یہ صرف بابر کے کلر کہار، اکبر کے شاہی قلعے، جہانگیر کے ہرن مینار، شاہجہان کے شالیمار اور عالمگیر کی بادشاہی مسجد کا پنجاب نہ تھا، یہ لاکھوں بے گھر اور بے در مستانوں اور درویشوں کا ڈیرہ تھا۔ یہ کروڑوں، مزدوروں، کسانوں، مزارعوں، تاجروں، سوداگروں، سپاہیوں، کاریگروں اور محنت کشوں کا دیس تھا۔"(۲۱۸)

ہمارے زیادہ تر سیاستدان انشاپرداز نہیں جو تھوڑے بہت خوش قسمتی سے خوبصورت لکھنے والے ہیں، وہ تحریر پر نہیں بلکہ واقعے پر توجہ مرکوز کرتے ہیں اور آسان اسلوب میں اپنا مافی الضمیر بیان کرتے ہیں۔ اُنہیں بہر حال عوام کی عدالت میں اپنی پوزیشن واضح کرنی ہوتی ہے۔ محمد حنیف رامے معدودے چند سیاستدانوں میں سے ہیں جس کی مذکورہ آپ بیتی میں اُس کے ذاتی کوائف، سیاست، تاریخی واقعات، سماجی اور عمرانی تغیرات سے ہٹ کر زبان و بیان کی خوبیاں بھی جمع ہو گئیں ہیں۔ رامے کا تازہ اور نادر اسلوب قاری کو فرحت بخش احساس سے آشنا کراتا ہے۔ اِس آپ بیتی کے مندرجات موضوعات اور اندازِ فکر سے انکار کیا جا سکتا ہے لیکن اِس کتاب کے اسلوبِ بیان کی تازگی سے انکار ممکن نہیں۔ حنیف رامے کے یہ فقرے پڑھنے والوں کو تازگی بخشتی ہے:

"روایتوں اور رویوں پر بحث کے آغاز ہی میں یہ وضاحت بے حد ضروری محسوس ہوتی ہے کہ انسانی تاریخ کا سفر صرف ماضی کی جانب نہیں مستقبل کی طرف بھی ہے۔ قوموں اور قومیتوں کی زندگی ایک بہتے دریا کی طرح ہے جو اپنے مخرج سے

مدخل کی جانب مسلسل بہتا رہتا ہے اور اپنی قدامت کے باوجود ہر لحظہ اپنے آپ کو
بدلتا چلا جاتا ہے۔"(۲۱۹)

سیاسی واقعات کے بیان میں بھی وہ اکثر اِس انداز کو بروئے کار لاتے ہیں حالانکہ سیاسی سرگزشت میں اس قسم کی طرزِ تحریر لانا خاصہ دشوار ہے۔ سیاسی احتجاج کو زور زبردستی روکنے کے نتائج کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جسم کی چوٹ دِل کی چوٹ بن کر اندر ہی اندر گہری ہوتی جاتی ہے اور ہر نیا احتجاج
پہلے سے وسیع تر اور شدید تر صورت میں نمودار ہوتا ہے۔"(۲۲۰)

علاوہ ازیں رامے صاحب کے ہاں غیر مستند تاریخ اور فرضی داستانوں کے تذکرے بھی پڑھنے کو ملتے ہیں۔ حیرت ہے کہ جدید تعلیم یافتہ انسان اور مغربی علوم پر کامل دسترس رکھنے والا فرد تاریخی حقائق کو کیوں توڑ موڑ کر پیش کرتا ہے۔ الفاظ کے انتخاب میں بھی احتیاط سے کام نہیں لیتا اور تاریخی بیان کو لکھتے ہوئے مناسب الفاظ کا چناؤ نہیں کرتا بلکہ سنسنی خیز ناول والے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ آپ بیتی کے لیے جذباتی اسلوب زیبا نہیں۔ یہاں جوش کی جگہ ہوش، دیوانگی کی جگہ فرزانگی، بیگانگی کی جگہ اپنائیت اور جذباتیت کی جگہ سنجیدگی و متانت ضروری ہے۔ جو آپ بیتی نویس اِس قاعدے کی پیروی نہیں کرے گا وہ تاریخ سے سخت ناانصافی کا مرتکب ہو گا اور لامحالہ قاری کے سامنے اپنی پوزیشن مشکوک کرے گا۔ حنیف رامے نے کئی جگہ پنجاب کی محبت میں تاریخ کا گلہ گھونٹنے سے بھی احتراز نہیں کیا ہے:

"اُس کی گھوڑی ساوی (رائے احمد خان کھرل جس نے انگریز کے خلاف جہاد کیا
تھا) نے بھی انگریزوں کے خلاف جنگ میں بڑے کارنامے دکھائے تھے۔ کہا جاتا
ہے کہ جب احمد خان دشمنوں میں زیادہ ہی گھر جاتا تو ساوی نو فٹ اُونچی اور پندرہ
فٹ لمبی چھلانگ لگا کر اُسے بچا لے جایا کرتی تھی۔"(۲۲۱)

حنیف رامے پنجابی سورماؤں کی محبت میں تاریخ کے ساتھ ساتھ تحریر کے ساتھ بھی ظلم کرتا ہے۔ اپنے عظیم ہیروز کے بیان میں وہ اِس قدر جذباتی ہو جاتے ہیں کہ سُنی سُنائی باتوں کو تاریخی صداقتیں سمجھ کر لکھ لیتے ہیں۔ بعض مقامات پر اُن کا لہجہ بھی تحقیر آمیز ہو جاتا ہے۔ عبداللہ بھٹی (دُلا بھٹی) نے مغلوں کے خلاف بغاوت کی تھی۔ جب اُن کی اور مغل فوج کی لڑائی کا منظر بیان کرتے ہیں تو کوئی حوالہ یا سند و روایت کی زحمت گوارا نہیں کرتے:

"اُنہوں نے (دُلا بھٹی) نے محافظ سپاہیوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا۔
بارہ ہزار کی نفری پر مشتمل مغل قافلہ دیکھتے ہی دیکھتے تتر بتر ہو گیا۔ قافلے کا سردار
صوبیدار ریکا ملکیرہ دُم دَبا کر بھاگ اُٹھا۔"(۲۲۲)

غرض جہاں جہاں مصنف جذ باتی ہو جاتا ہے، واقعات اور تحریر دونوں پر اُس کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔

مختصر یہ کہ اپنی عصبیت، طرفداری اور جانبداری سے ہٹ کر اِس آپ بیتی میں کافی کشش ہے۔ ایک سیاسی آپ بیتی میں اِتنی متنوع معلومات اور جاندار اسلوب غیر معمولی کارنامہ ہے۔ اِس آپ بیتی میں ہمارے لیے بہت کچھ ہے۔ سیاسیات سے ہٹ کر بھی یہ بڑی کام کی کتاب ہے۔ یہ آپ بیتی ہمیں سوچنے، اپنے آپ کو بدلنے اور تبدیلی لانے پر مجبور کرتی ہے۔ جہاں تک اِس آپ بیتی کی واحد اور سب سے بڑی خامی یعنی عصبیت کا تعلق ہے تو اِس بارے میں خان عبدالولی خان کے خط سے ایک حوالہ کافی ہے جو اُس نے مذکورہ آپ بیتی کے جواب میں مختلف اخبارات میں شائع شدہ ایک کھلے خط میں کیا تھا:

> ''آپ کی کتاب کی سطر سطر سے یہ دُکھ سیاہی کی طرح نچڑتا دکھائی دے رہا ہے کہ
> پنجاب کے خلاف باقی صوبوں کے لوگ غاصب ہونے کا الزام کیوں لگاتے ہیں۔
> پشتو کا ایک ضرب المثل ہے کہ جب لہسن کھاؤ گے تو منہ سے لہسن کی بُو تو آئے
> گی۔''(۲۲۳)

۷۔ بڑی جیل سے چھوٹی جیل تک (راجہ انور)

ہمارے ملک کے وہ مشہور سیاست دان جو زمانہ طالب علمی سے میدان سیاست میں آئے اور پھر سیاست کے اُفق پر دیر تک چمکتے رہے اُن میں ایک نام پاکستان پیپلز پارٹی سے تعلق رکنے والے ایک نامور سیاست دان راجہ انور کا بھی ہے۔ ایوب خان کے خلاف اُٹھنے والی بغاوت میں راجہ انور صف اوّل کے طالب رہنما تھے جو ملک کے تعلیمی اداروں میں ایک نہ تھمنے والے طوفان کی مانند جنرل ایوب کے خلاف اُٹھا تھا۔ راجہ انور ہمارے ملک کے اُس قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جو ہمیشہ اس ملک میں حقیقی جمہوریت کا خواب دیکھتے ہیں اور اس خواب کو حقیقت میں بدلنے کے لیے ہر مارشل لا، ہر ڈکٹیٹر اور جمہوریت مخالف قوتوں کے خلاف بر سرِ پیکار رہتے ہیں۔ لطیفہ گو، بزلہ سنج، فقرہ باز اور ہر دکھ میں مسکرانے والے راجہ انور نے اپنی جوانی کا زیادہ تر حصہ قید و بند، نظر بندی اور جلاوطنی میں گزارا۔ وہ سیاسی سر گرمیوں سے ہٹ کر بھی ایک زیرک اور سکالر شپ ہولڈر طالب علم تھے۔ قید و بند کے ساتھ ساتھ اُس نے ہر امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کیا اور فلسفے میں ایم۔ اے کیا۔ وہ ایک انقلابی سوچ رکھنے والے انسان ہیں اس لیے بائیں بازو اور سوشلسٹ جماعت کے سر گرم رکن رہے۔ وہ ذوالفقار علی بھٹو کے عروج کے بعد پاکستان پیپلز پارٹی میں آئے کیونکہ ذوالفقار علی بھٹو کی شخصیت، انداز سیاست اور سیاسی نعرے خصوصاً نوجوانوں کو اپنی پارٹی میں شریک ہونے کا دعوت دے رہے تھے۔ اس طرح راجہ انور پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل ہو کر ذوالفقار علی بھٹو کے دست راست کہلائے۔ راجہ انور کا تعلق پیپلز پارٹی کی پہلی نظریاتی نسل سے تھا۔ لیکن بعد میں پیپلز پارٹی کی اپنی ہی منشور سے ہٹ جانے کے بعد اس پارٹی سے الگ ہو گئے۔ ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے بعد افغانستان جا کر دہشت گرد تنظیم الذوالفقار میں شمولیت اختیار کی۔ جنرل ضیاء الحق نے ملک میں دہشت گرد کاروائیوں کے الزام میں اُنہیں غدار اور مفرور قرار دیا تو وہ افغانستان سے جرمنی چلے گئے اور سیاسی پناہ حاصل کر کے وہاں دو عشروں تک قیام پذیر رہے۔ آج کل عملی سیاست اور سیاسی سر گرمیوں سے کنارہ کشی اختیار کر رکھی ہے۔

راجہ انور ایک منجھے ہوئے سیاست دان ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے لکھاری بھی ہیں۔ وہ کئی کتابوں کے خالق ہیں اور مختلف اخبارات میں مستقل کالم بھی لکھتے ہیں جو حالات حاضرہ، سیاست، معاشرت، معیشت، تاریخ، تصوف، ادب اور مذہب جیسے موضوعات پر ہوتے ہیں۔ یہ سب کچھ راجہ انور کی اُردو ادب پر گرفت اور صاحب اسلوب ادیب ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔

زیر نظر کتاب ''بڑی جیل سے چھوٹی جیل تک'' راجہ انور کی جیل کے زمانے کی آپ بیتی ہے جو نہ صرف جیل میں اُن کے معمولات، شب و روز اور مختلف حالات و واقعات کا احاطہ کرتی ہے بلکہ آپ کی نجی زندگی، خاندان، فکری اُٹھان،

پسند و ناپسند، سوچ، عقیدے، سیاسی سر گرمیوں اور زندگی کے بارے میں اُن کی نکتہ نظر کی وضاحت بھی کرتی ہے۔ جیلوں کی حالت زار، قید و بند کی مشکلات، قیدیوں کی تکالیف، اُن پر کیے جانے والے انسانیت سوز مظالم، جرائم پیشہ لوگوں کی زندگی، سزا پانے والے مجرم اور پھانسی کے منتظر قیدیوں کی ذہنی حالت کے بارے میں یہ آپ بیتی ذاتی مشاہدے پر مبنی ایک معیاری آپ بیتی ہے۔ جیل اور قیدیوں کی زندگی پر شاید ہی کوئی دوسری آپ بیتی اس قدر مؤثر اور دل کو چھونے والے اسلوب میں لکھی گئی ہو۔ ''بڑی جیل سے چھوٹی جیل تک'' مصنف کی باقاعدہ اور منظم آپ بیتی نہیں تاہم راجہ انور نے جیل اور جیل کے اندر کی زندگی کی کہانی لکھتے ہوئے اپنی سر گزشت بھی رقم کر دی ہے۔ اس لیے ہم نے اس آپ بیتی کو جزوی آپ بیتی کی فہرست میں جگہ دی ہے۔ مصنف نے اپنی سر گزشت کسی خاص اُصول یا باقاعدہ ترتیب سے نہیں لکھی بلکہ بے ترتیبی سے اپنے حالات لکھے ہیں۔ ہم اگلے سطور میں اس آپ بیتی میں اُٹھائے گے مختلف موضوعات اور انداز بیان۔ سے بحث کریں گے

راجہ انور کی آپ بیتی سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا تعلق پنجاب کے دور دراز دیہات سے ہے۔ اُن کا گاؤں پنجاب کے دیگر گاؤں کی طرح بنیادی ضروریات زندگی مثلاً سڑک، بجلی اور روزگار کے ذرائع وغیرہ سے یکسر عاری ہے۔ البتہ یہاں کے لوگ جفاکش، محنتی، ملنسار، مہمان نواز اور محبت کرنے والے ہیں۔ والد کا پیشہ کاشت کاری ہے اور وہ گاؤں میں کئی بیگہ زمین کے مالک ہیں اس لیے اُن کا شمار گاؤں کے چودھریوں میں ہوتا ہے۔ باپ نے اپنے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم کے لیے لاہور اور راولپنڈی کے تعلیمی اداروں میں داخل کر وایا تھا تاہم راجہ انور کا رحجان کالج کے زمانے سے سیاست کی طرف ہو گیا۔ آپ بیتی میں اپنی دیہاتی زندگی اور گاؤں کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> '' یہ 1970ء اوائل ستمبر کی 6 تاریخ تھی۔ برسات کے دن تھے۔ خاصے عرصے کے بعد ایک بھیگی شام اس غرض سے گاؤں لوٹا کہ چند روز اپنے آبائی ماحول کی آغوش میں، کالج کی سر گرمیوں، سیاست کے ہنگاموں اور شہر کی چیختی چلاتی بے حس مشینی زندگی سے دم بھر کے لیے نجات پاؤں اور ماں کے قدموں کے ساتھ ساتھ فطرت کے کشادہ دامن میں پناہ لے سکوں۔ سڑک، بجلی اور ٹی وی نے تاہنوز دیہی زندگی کے آنگن میں قدم نہیں رکھا تھا۔ دن بھر کے تھکے ہارے محنت کش دہقان سر شام سونے اور صبح کا جاگنے کے عادی تھے۔''(۲۲۴)

راجہ انور کی سر گزشت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے والد کی عمر ۷۰ سال سے زیادہ تھی جب وہ کالج کے طالب علم

تھے۔ وہ بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے اور والدین اُنہیں لکھاپڑھاکر آرمی آفسر بنانے کے خواہش مند تھے۔ علاوہ ازیں اُن کی ماں انتہائی سادہ اور محبت کرنے والی دیہاتی خاتون تھیں اُن کو اپنے بیٹے کی شادی کی فکر دامن گیر رہتی۔ راجہ انور کو احساس ہے کہ اُس نے اپنے والدین کی آرزوں اور تمناؤں کا خون کر کے اچھا نہیں کیا لیکن اُنہیں اس بات کی بھی تسلی ہے کہ وہ اپنا مستقبل خراب کر کے ملک سے جبر اور ظلم مٹا کر لاکھوں نوجوانوں کا مستقبل سنوار رہے ہیں۔ وہ اپنے احساسات اس پیر گراف میں کچھ اس طرح سے بیان کرتے ہیں:

> ''میرے سامنے اپنے جفاکش اور باہمت باپ کا پُر عزم چہرہ اُبھرتا ہے جو ۷۰ سال کی عمر میں بھی خون پسینہ ایک کر کے لمبے چوڑے خاندان کو پال رہے ہیں۔ اُنہیں کتنی آرزو تھی کہ میں فوج میں آفسر بنوں۔ میری تعلیم کے اخراجات کے لیے جانے وہ کس طرح رقم پس انداز کرتے رہے۔ اس عمر میں ان کو دن بھر محنت کرتے دیکھ کر میرا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔''(۲۲۵)

راجہ انور اپنی سادہ لوح ماں کا ذکر ان الفاظ سے کرتے ہیں:

> ''ایک میری سادہ لوح ماں ہے جسے ہر وقت اپنی بہو لانے کی فکر رہتی ہے۔ جب بھی کالج سے گھر جاتا ہوں وہ گاؤں کی ساری کنواری لڑکیوں کے نام لے کر مجھ سے پوچھتی ہے کہ ان میں سے کون سی تجھے پسند ہے اور میں مسکرا کے ٹال دیتا ہوں۔ بے جی! اتنی جلدی کیا ہے مجھے ایم اے تو کر لینے دیجئے۔ وہ ناراض ہو کر پوچھتی ہے بیٹا یہ ایم اے کتنا ہوتا ہے؟ میں اپنی ماں کی سادگی پر ہنس کر جواب دیتا ہوں دس اور چھ۔ بے جی کی آنکھیں حیرت سے پھیل جاتی ہیں۔''(۲۲۶)

راجہ انور گورڈن کالج راولپنڈی میں بی اے کے طالب علم تھے جب صدر ایوب خان کے خلاف مختلف کالجوں کے طلباء نے احتجاج کا زبردست سلسلہ شروع کیا۔ گورڈن کالج راولپنڈی اس سلسلے میں پیش پیش تھا جس کے طالب علم رہنما شیخ رشید احمد، پرویز رشید اور مختار رانا وغیرہ ملکی سطح پر مشہور ہو گئے۔ راجہ انور 70-1969 کے دوران گورڈن کالج سٹوڈنٹس یونین کے صدر رہے۔ 7 نومبر 1969ء کو جب اس کالج سے جنرل ایوب خان کے خلاف طلبا کا وہ تاریخی جلوس نکلا جو بالآخر ایوب خان کی اقتدار سے علیحدگی کا پیش خیمہ ثابت ہوا، راجہ انور اس جلوس کے پہلے اسیر تھے۔ وہ نشنل سٹوڈنٹ فیڈریشن (NSF) صوبہ پنجاب کے صدر بھی رہے۔ وہ ہماری سیاسی تاریخ کے پہلے طالب علم ہیں جنہیں جمہوریت کی بحالی اور

مارشل لا مخالفت کی بناپر طویل ترین سزا سنائی گئی تھی۔ چھ ستمبر ۱۹۷۰ء کو اپنی گرفتاری کی سرگزشت یوں بیان کرتے ہیں:

"اتنے میں کسی نے حویلی کا دروازہ کھٹکھٹایا اور میرے بڑے بھائی کو بلایا میں جاگ رہا تھا، پوچھا کون؟ بابا نادر کی جانی پہچانی آواز سنائی دی۔ تھانیدار صاحب آئے ہیں۔ بڑے بھائی اور آباجی بھی اُٹھ چکے تھے۔ ہم تھانیدار کی طرف آئے۔ پولیس کے سات سپاہی ایک تھانیدار کی معیت میں کھڑے تھے، عرض کیا، فرمایئے؟ کہنے لگے آپ کو لینے آئے ہیں۔"(۲۲۷)

یوں تو یہ آپ بیتی راجہ انور کی جیل کے زمانے کی داستان ہے تاہم اُس نے اپنی سرگزشت میں دیگر سیاسی ساتھیوں کی زندگی کی کہانی بھی بیان کر کے آپ بیتی کو جگ بیتی بنادیا ہے۔

راجہ انور کا تعلق میدان سیاست سے تھا اور اُس نے ایک سیاسی قیدی کی حیثیت سے اپنی آیام آسیری کی داستان لکھی ہے۔ اپنی سرگزشت میں وہ جگہ جگہ سیاسی خیالات، سیاسی وابستگی اور سیاست کے حوالے سے اپنا نکتہ نظر بھی سپرد قلم کیا ہے۔ اس آپ بیتی سے واضح ہے کہ آپ کا شمار پاکستان پیپلز پارٹی کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ وہ ذوالفقار علی بھٹو کی گرفتاری تک اُن کے ساتھ رہے۔ اپنی داستان میں اُس نے یہ سب باتیں بے ترتیبی سے لکھی ہیں۔ اُنہیں ایک حقیقی سیاسی کارکن کی طرح بین الاقوامی سیاست سے بھی گہرا شغف تھا۔ ملکی اور بین الاقوامی سیاست کے نشیب و فراز سے وہ جیل میں بھی وقتاً فوقتاً آگاہی حاصل کیا کرتے تھے بلکہ اُس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل ایک ریڈیو ٹرانزسٹر بھی غیر قانونی طریقے سے چھپا رکھا تھا جس سے وہ سیاسی حالات سے آگاہ ہوتے رہتے تھے۔ چنانچہ بین الاقوامی سیاست کا تجزیہ یوں کرتے ہیں:

" رات کا ڈیڑھ بجے چاہتا ہے۔ میرے ساتھی قید خانے کے اذیت دہ احساس سے کہیں دُور گہری نیند سو رہے ہیں۔ کچھ دن پہلے ہم اُردن کی نئ صورتحال پر گرما گرم بحث کر رہے تھے۔ ہم نے ایک چھوٹا سا ریڈیو سمگل کر رکھا ہے جس پر ہم بی بی سی سے لے کر چین تک ہر ریڈیو سنتے ہیں۔ اُردن میں حریت پسندوں اور شاہ حسین کے کمانڈران چیف فیلڈ مارشل مجالی کے درمیان خونریز جنگ کی خبریں ہم نے تقریباً ہر ریڈیو سٹیشن سے سنیں مشرق وسطیٰ ایک نیا ویت نام بن رہا ہے۔ یہ ہمارا متفقہ تجزیہ تھا۔"(۲۲۸)

ون یونٹ جنرل ایوب خان کا دین تھا۔ ایوب خان کے اس فیصلے سے ملک کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ ون یونٹ نے مغربی پاکستان کے تینوں صوبوں کو پنجاب کے خلاف یکجا کر کے بد ظن کر دیا اور اس کو پنجاب امپریلزم کا نام دیا گیا اس سے

پنجاب کے خلاف ملک بھر میں نفرت کی شدید لہر اُٹھی جو بالآخر ۱۹۷۱ء کے مشرقی پاکستان کی علیحدگی پر منتج ہوئی۔ ون یونٹ نے عام لوگوں کو کسی عذاب میں ڈالا تھا اور ون یونٹ کا پس منظر کیا تھا راجہ انور اختصار سے اس پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:

"لمحہ بھر کو رُکیے میں آپ کو وہ پس منظر بتاتا چلوں جس کی برکات سے چاروں صوبوں کے قیدی، بہاولپور جیل میں پائے جاتے تھے۔ دراصل ۱۹۵۶ء میں مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں یعنی سندھ، سرحد، بلوچستان اور پنجاب کو تحلیل کر کے ون یونٹ کے نام سے ایک مغربی صوبہ بنایا گیا۔ ون یونٹ کا صدر مقام لاہور تھا۔ گوادر اور تھرپارکر سے ایک غریب آدمی کو اپنا مقدمہ بھگتنے یا اپنے مسائل حل کرانے کے لیے لاہور آنا پڑتا تھا۔ جہلم کا قیدی بلوچستان کی مچھ نامی جیل میں رکھے جاتے تو گوادر کا بلوچ پشاور جیل میں اپنے پچھلوں کو روتا۔ غریب قیدیوں کے ورثاء، سالہا سال تک اُن سے ملنے کے لیے نہ جا پاتے۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں رسل اور رسائل کی عدم موجودگی میں ایک غریب آدمی کے لیے ون یونٹ کا قیام کتنا تکلیف دہ ہوا ہو گا۔"(۲۲۹)

راجہ انور فوجی حکمرانوں کو اس ملک میں خرابی کی سب سے بڑی وجہ بتاتے ہیں۔ اگر فوجی جرنیل اقتدار کی ہوس نہ رکھتے اور سیاست دانوں کو اپنا کام آزادانہ کرنے کا موقع فراہم کرتے تو ملک کی جغرافیائی، سیاسی، تاریخی اور معاشی حالت آج یکسر مختلف ہوتی۔ لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ سیاست دانوں کی ناکامی نے ہی فوجی آمروں کو سیاست اور حکومت کا راستہ دکھایا لیکن اس سلسلے میں یہ عرض ہے کہ اگر ایک سیاست دان ناکام ہو جاتا تو اُنہیں دوسرے سیاست دانوں کو موقع دینا چاہیے تھا۔ اگر سیاسی نظام یوں ہی چلتا رہتا تو ایک نہ ایک دن ہماری سیاسیات کا نقشہ بھی تبدیل ہو جاتا لیکن ایسا نہ ہو سکا اس میں زیادہ تر قصور اقتدار کے حریص فوجی آمروں کا ہے۔ راجہ انور اپنی سرگزشت میں تفصیل سے لکھتے ہیں کہ فوجی حکمرانوں نے کیسے کیسے یہ ملک تباہ کیا اور سارے ادارے مفلوج کر کے رکھ دیے:

"جنرل ایوب خان کو تاریخ شاید ہی کبھی معاف کر سکے کہ اُنہوں نے نہ صرف آئین اور جمہوریت کو غارت کیا بلکہ وزیروں، امیروں، افسروں کے منہ کو بدعنوانی کا خون بھی پہلی بار انہی کے دور میں لگا اگر اُن سے پہلے رشوت ستانی ایک شرمسار کن فعل، انفرادی معاملہ تھا تو ان کے دور میں اِسے باعزت اجتماعی مقام

حاصل ہو گیا۔ اگر انہوں نے ادارے تباہ کیے تو اُن کے جانشین یحییٰ خان نے پاکستان کو دولخت کر دیا۔ جنرل ایوب خان کے بیس سال بعد اقتدار پر قابض ہونے والے جنرل ضیاء الحق نے پورے سماج کو بم اور بارود سے اُڑا دیا۔ جنرل ضیاء الحق کا اقتدار پر شب خون مارنا اور جنرل مشرف کا عوام کی ہڈیوں پر رقص کرنا ہنوز تاریخ کی کوکھ میں پوشیدہ تھا اور ہم جیل کی اس تنگ کوٹھڑی سے مستقبل کے ان خوفناک واقعات کا اندازہ کرنے سے قاصر تھے۔"(۲۳۰)

راجہ انور پیپلز پارٹی کے علاوہ بائیں بازو کی سیاست سے بھی متاثر نظر آتے ہیں،۔ وہ ایک کٹر اشتراکی ہیں۔ کارل مارکس کی تعلیمات کو دنیا کے لیے راہ نجات اور خصوصاً تیسری دنیا کے ممالک کے مسائل کا واحد حل بتاتے ہیں۔ راجہ انور کا تعلق پاکستان کی اُس نسل سے ہے جو اشتراکی خیالات سے متاثر تھے۔ کمیونزم اختیار کرنا اُس زمانے میں ایک طرح کا فیشن بن چکا تھا۔ اور اس کی کئی وجوہات تھیں جس کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ پیپلز پارٹی میں شمولیت بھی اُن کی مارکسی نظریات کی تکمیل کے لیے تھا۔ اس نئی پارٹی نے نوجوانوں کو اس لیے بھی اپنی طرف متوجہ کیا تھا کیونکہ یہ پارٹی سرمایہ درانہ نظام پر شدید اعتراضات کر رہی تھی۔ راجہ انور کی اشتراکی نظریات کسی سے ڈھکے چھُپے نہیں۔ اس کتاب میں جہاں اُنہیں موقع ملتا ہے اپنے مارکسی نظریات کی پرچار سے دریغ نہیں کرتے:

"کُنبے اور گھرانے کا وجود جبر واستحصال کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ انسان ایک اکائی ہے لیکن وہ بہت سے چھوٹے چھوٹے گھروں اور گروہوں میں بٹا اور بکھرا ہوا ہے۔ یہی تقسیم دراصل معاشرے کا سب سے خوفناک پہلو ہے۔ جس دن یہ سماجی بندھن ٹوٹ گیا جان لیجئے انسان آزاد ہو گیا۔ ساری نسلیں، قومیں، فرقے، طبقے اور رنگ ختم ہو جائیں گے اور صرف انسان کی اکائی باقی رہے گی۔ یہ پوری دنیا اُس کی زمین ہو گی اس کرۂ ارض پر پُرامن انقلاب لانے کا واحد راستہ صرف یہی ہے۔"(۲۳۱)

ذوالفقار علی بھٹو کی کرشماتی شخصیت اور اُن کی بنائی ہوئی پارٹی پاکستان پیپلز پارٹی سے لوگوں نے کیا کیا اُمیدیں وابستہ کر رکھی تھیں؟ نوجوانوں کو اس پارٹی کے لیڈروں نے کس طرح سہانے خواب دیکھائے تھے؟ جذباتی نوجوانوں کو بھٹو کی شکل میں ملک و قوم کا نجات دہندہ نظر آ رہا تھا۔ زیر نظر اقتباس سے بخوبی آشکارہ ہو جاتا ہے:

"پیپلز پارٹی چند افراد کا مجموعہ نہیں۔ یہ تو ایک پروگرام کا نام ہے اگر کوئی آدمی اپنی دولت بچانا چاہتا ہے تو اُسے پیپلز پارٹی میں شامل ہونے کی بجائے یورپ چلا جانا چاہیئے۔ یہاں (پیپلز پارٹی میں) آنے والا اپنی ماضی اور دولت پر فاتحہ پڑھ کر آئے گا ورنہ عوام معاف نہیں کیا کرتے۔ اب تو عوام کا جن بوتل سے باہر آچکا ہے۔ اب صرف عوام کا راج چلے گا ورنہ سڑکیں دندناتی رہیں گی، ہنگامے ہوتے رہیں گے اور ہر حکمران کا حشر وہی ایوب خان والا ہو گا۔"(۲۳۲)

مذکورہ آپ بیتی چونکہ جیل سے متعلق ہے اس لیے مصنف نے بڑی سچائی سے جیل کے اندر کی کہانی سنائی ہے۔ آپ نے قیدیوں کے شب وروز اور اُن کے معمولات کو کافی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ چونکہ مصنف ایک اچھے لکھاری ہیں اس لیے اُس نے جیل قیدیوں کی نفسیات، خیالات اور انداز فکر کی بڑی اچھی ترجمانی کی ہے۔ راجہ انور کا مشاہدہ انتہائی تیز ہے۔ وہ ارد گرد کے ماحول پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ جہاں کہیں غیر معمولی بات یا واقعہ اُن کے مشاہدے میں آتا ہے تو اُنہیں سپرد قلم کرتے ہیں۔ جیل کے اندر ایک حلقہ یا حصہ پھانسی پانے والے مجرموں کا ہوتا ہے جنہیں عرف عام میں پھانسی گھاٹ کہتے ہیں۔ مصنف نے اس حوالے سے بھی لکھا ہے خصوصاً پھانسی کے پورے عمل اور پھانسی پانے والے مجرموں کے طرز عمل کے بارے میں "دار ورسن" کے نام سے ایک الگ باب ہے۔ راجہ انور نے پھانسی پانے والے مجرم کی اُس کی آخری رات سے لے کر پھانسی پر چڑھائے جانے کے عمل تک ہر عمل کو بیان کیا ہے۔ پھانسی پانے کے منظر کو راجہ انور کے الفاظ میں ملاحظہ کیجیے:

"اب جلاد آگے بڑھ کر اُس کی آنکھوں اور سر پر سیاہ ٹوپی چڑھا دیتا ہے۔ دونوں پاؤں کے انگوٹھے باہم باندھتا ہے اور ہاتھ پشت کی جانب تاکہ بوقت نذع وہ ہاتھ پاؤں نہ مار سکے۔ اب موت کے سارے سامان مکمل بھی ہیں اور تیار بھی۔ جیل سپرنٹنڈنٹ کا صرف ایک اشارہ حیات شیرین کو کسی لمحہ بھی ختم کر سکتا ہے۔ جلاد قیدی سے کہتا ہے کہ اپنا منہ سختی سے بند رکھ اور دل میں کلمہ پڑھو۔ یہ وہ آخری آواز ہے جو موت کے منتظر انسان کی قوت سماعت تک پہنچ پاتی ہے۔ عین اُس لمحے جیلر کا رومال ہوا میں لہراتا ہے۔ جلاد اس اشارے پر جونہی تختہ دار کا ہینڈل نیچے گراتا ہے اُس کے پاؤں تلے سے لکڑی کے تختے سرک جاتے ہیں اور وہ ایک جھٹکے کے ساتھ

> دھڑام سے نیچے گرتا ہے اور اُس کی لاش ہوا میں معلق ہو جاتی ہے۔ یہ لاش بعض اوقات ایک ایک گھنٹہ تک لٹکتی رہتی ہے۔''(۲۳۳)

راجہ انور نے پھانسی پانے والے قیدیوں سے انٹرویو بھی لیے ہیں اور اُن سے اُن کی ذہنی حالت، اُن کے احساسات اور محسوسات پوچھے ہیں۔ یونس نامی ایک قیدی جن کو چند گھنٹے بعد پھانسی پر چڑھایا جانا تھا سے مصنف نے جو گفتگو کی ہے اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس وقت پھانسی پانے والے کے دل پر کیا گزر رہی ہوتی ہے:

> '' وہ (یونس) کچھ دیر کے لیے رُکا اور پھر ٹھہر ٹھہر کر کہنے لگا۔ یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میرا جسم ابھی سے بے جان ہو چکا ہے۔ اس وقت عام الفاظ بھی میری سمجھ میں نہیں آرہے۔ ایک سیاہ سایہ میرے دماغ پر چھا رہا ہے۔ کبھی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ سب کچھ ایک خواب ہے۔ ابھی آنکھ کُھلے گی تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ کبھی یوں لگتا ہے جیسے کل میرے ساتھ ہی ساری دنیا تختہ دار پر چڑھ جائے گی۔ لیکن سب سے زیادہ تکلیف دہ احساس آنے والے بُرے لمحات کا انتظار ہے۔''(۲۳۴)

ہمارے ملک میں قیدی عورتوں کے لیے کوئی علیحدہ جیل موجود نہیں بلکہ اُنہیں مردانہ جیلوں کے اندر ایک الگ احاطہ مخصوص کیا جاتا ہے جسے ''زنانہ احاطہ'' کہا جاتا ہے۔ (شنید ہے اب ملتان میں عورتوں کے لیے ایک الگ جیل تعمیر کی گئی ہے) جہاں عام ملازمین اور مرد قیدیوں کو جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ مصنف کا کہنا ہے کہ قیدی عورتوں میں تقریباً ستر فیصد عورتیں عصمت فروشی، ۲۵ فیصد کے قریب اغوا، سمگلنگ قتل وغیرہ اور ۵ فیصد کسی اتفاقی حادثے کی بنا پر زینتِ زنداں بنتی ہیں۔ راجہ انور نے اپنی جیل کی سرگزشت میں ان قیدی عورتوں کے بارے میں بھی ہوش ربا انکشافات کیے ہیں اور بتایا ہے کہ عصمت فروش عورتوں کا مسلسل جنس فروشی بعد میں ایک عادت یا نشے کی طرح اُن کی اعضا پر چھا جاتی ہے۔ جس طرح کسی چرسی یا شرابی کو نشہ نہ ملے تو کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے اس طرح اس قسم کی قیدی عورتیں بھی اپنے ہوش وحواس پر قابو نہیں پاتیں۔ ایک ایسے ہی تجربے کا مصنف کو اُس وقت سامنا ہوا جب اُنہیں دیگر قیدی ساتھیوں کے ساتھ کسی تعمیراتی کام کے سلسلے میں زنانہ احاطے میں جانے کا اتفاق ہوا۔ قیدی عورتوں نے اُنہیں کس طرح حواس باختہ کیا اُن ہی کے الفاظ میں پڑھیے:

> '' باری باری وہ قیدی عورتیں کسی قصائی کی طرح نظروں سے ٹٹول کر ہمارا تجزیہ کرتیں پھر کچھ اس قسم کی آوازیں اُبھریں، یہ داڑھی والا تو مولوی لگتا ہے، دوسری

آواز، مولوی نہیں ہوگا، دیکھو سر کے بال کتنے لمبے لمبے ہیں، ایک اور آواز، بھئی میرے لیے تو یہی ٹھیک ہے ذرا سا کمزور ہے تو کیا ہوا۔ قہقہوں کی آوازیں، ایک اور نے کہا، ارے واہ! بڑی توند والا صاحب تو مجھے دے دو۔۔۔۔۔ ہائے اللہ جی۔ پھر ایسی زبان کا عام استعمال ہوا جسے مردوں کی محفل میں بھی شرما کے سنا جاتا ہے۔ میری زندگی کا یہ پہلا واقعہ تھا کہ میں نے مرد ہونے کے باوجود عورتوں کے سامنے خود کو انتہائی حقیر، بے وقوف اور بے چارہ پایا۔"(۲۳۵)

مصطفیٰ زیدی اُردو کے مشہور شاعر اور گوجرانوالہ کے سابق ڈپٹی کمشنر تھے۔ وہ غزل کے ایک اچھے شاعر تھے اُن کے بہت سے اشعار آج بھی زبان زد خاص و عام ہیں۔ جب ۱۹۶۹ء میں جنرل یحییٰ خان نے ملک میں مارشل لا لگایا تو اُس نے ۳۰۳ بڑے سول آفیسر بہ یک جنبش قلم نوکری سے برخاست کر دیے۔ مصطفٰے زیدی بھی اس فہرست میں شامل تھے۔ ۱۹۷۰ء میں مصطفیٰ زیدی نے اپنے ڈرائنگ روم میں اچانک خودکشی کرلی۔ اُن کی موت کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ راجہ انور نے مصطفیٰ زیدی کی موت کے بارے میں یہ دلچسپ انکشاف کیا ہے کہ مصطفیٰ زیدی کی موت کی وجہ اُن کی محبت میں ناکامی تھی۔ وہ گوجرانوالہ کی ایک لڑکی شہناز گل کی محبت میں گرفتار تھے۔ اُن کے قتل کے شبے میں پولیس نے شہناز گل کو گرفتار کر کے راولپنڈی جیل میں قید کر دیا تھا لیکن ثبوت نہ ملنے پر چند ماہ بعد اُنہیں خاموشی سے رہا کر دیا گیا۔ جیل کے قیدیوں میں اُن دنوں اس بارے میں کیا جوش و خروش پایا جاتا تھا، راجہ انور اس پر کچھ یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

" جیل کے تقریباً ہر کونے میں قیدیوں نے شہناز گل کی تصویریں چھپا کر رکھی تھی۔ یاد رہے کہ جیل میں ایکٹرسوں کی تصویریں بہت سنبھال کر رکھی جاتی ہیں اور جیل کی دیواریں اکثر ان سے مزین رہتی ہیں۔ غالباً موصوفہ واحد غیر فلمی شخصیت تھیں جن کی تصویر فلمی اداکاروں سے زیادہ نقش بر دیوار بنی۔"(۲۳۶)

ہمارے ملک کے جیل خانے بدعنوانی کے گڑھ ہیں۔ یہاں ہر قسم کی نشہ اور غیر قانونی چیزیں آسانی سے دستیاب ہوتی ہیں جو جیل سے باہر مشکل الحصول تصور کی جاتی ہیں۔ ان جیلوں میں جا کر اچھے بھلے لوگ نفسیاتی مریض اور جرائم پیشہ افراد بن جاتے ہیں۔ مغربی ممالک میں جہاں جیل نفسیاتی اور علاج معالجے کے مراکز ہیں، جیسا مجرموں کو صحت مند زندگی کی طرف بھیجا جاتا ہے جبکہ ہمارے ہاں قیدیوں کو اتنی بے رحمی سے رکھا جاتا ہے کہ انسانیت چیخ اُٹھتی ہے۔ تشویش کی بات یہ ہے کہ اُنہیں جیل میں وہ انسانی حقوق بھی حاصل نہیں ہوتیں جو جمہوری معاشروں میں ہر انسان کا پیدائشی حق ہیں۔ جیل کی

مذکورہ سرگزشت آج سے کم و بیش چالیس سال پہلے لکھی گئی تھی لیکن آج بھی ہمارے جیلوں میں تقریباً وہی صورتحال ہے۔ جیل میں قیدیوں پر روا رکھے گئے۔ انسانیت سوز سلوک پر مصنف اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

"آج کل ایک چکی میں سات افراد بند کیے جاتے ہیں، وہی کھانا پینا، سونا وہی رفع حاجت اور وہی پیشاب۔ جب کہ یہ مختصر سی جگہ سات افراد کے پہلو لیٹنے کے لیے بھی ناکافی اور تنگ ہے۔ اس کی طوالت تقریباً ۱۲ فٹ اور وسعت ۶ فٹ سے زیادہ نہیں۔ اس کا کچا زمینی فرش جان بوجھ کر ناہموار کر دیا جاتا ہے تاکہ یہاں کے مکین آرام سے سونہ سکیں۔ ان کے دیواروں پر ہر چار چھ ماہ بعد تار کول کا لیپ کر دیا جاتا ہے تاکہ قیدی اپنی سیاہ بختی پر نازاں رہیں۔ گرمیوں میں کھٹل اور سردیوں میں جوئیں ان چکیوں کا ارزاں تحفہ ہیں۔"(۲۳۷)

ہمارے ملک کے جیل ہمارے معاشرے کی ایک مکمل تصویر ہیں۔ اس میں زندگی کا ہر وہ دکھ، عیب، بُرائی اور نقص موجود ہے جو ہمارے معاشرے کا لازمی جُز ہے۔ رشوت، چوری، سفارش اور دیگر وبائیں جیل کی زندگی کا باقاعدہ حصہ ہیں۔ یہاں مصنف نے یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ جیلوں میں باقاعدہ گداگری، جیب تراشی اور ہم جنس پرستی ہوتی ہے۔ وہ پیشہ ور بھیکاری جنہیں پولیس گداگری کے جرم میں گرفتار کر کے یہاں لاتی ہے یہاں پہنچ کر بھی وہ پھر سے اپنا کاروبار شروع کر دیتے ہیں۔ جیل کے اندر سب جرائم اپنی جگہ لیکن ہم جنس پرستی اور زناکاری کا تو کم از کم نام و نشان بھی نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ جیلوں میں بیس سال سے کم عمر بچوں کو الگ بارک میں رکھا جاتا ہے۔ جس کو جیل کی اصطلاح میں "منڈا خانہ" کہتے ہیں۔ جیل کے اکثر قیدی جمعدار اور قیدی نمبر دار ایسے بچوں کو اپنے جنسی ہوس کے لیے مجبور کرتے ہیں۔ مصنف نے اس قبیح حرکت پر بھی تفصیل سے روشنی ڈال کر انسانی نفسیات کی روشنی میں اس کا تجزیہ کیا ہے:

"جیل میں عورت کی قربت کا محض تصور ہی کیا جاسکتا ہے لہٰذا اس جہنم میں ہم جنسی کی بیماری اور بھی خطرناک شکل اختیار کر جاتی ہے۔ جن لوگوں کی سزائیں طویل ہوں وہ عورت کی صورت تک بھول جاتے ہیں۔ جنسی خواہشات بہر حال اپنی جگہ موجود رہتی ہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ جنس سب سے طاقتور جبلت ہے۔ ایک صحت مند انسان برسوں تک اس پر کیسے قابو پاسکتا ہے؟ چنانچہ جیلوں میں خود لذتی یا ہم جنسی کا سہارا لیا جاتا ہے۔"(۲۳۸)

مصنف نے اپنی سر گزشت کا آخری باب ''پس چہ باید کرد؟'' کے عنوان سے چالیس سال بعد لکھا ہے اور ۲۰۱۱ء کے نئے اضافی شدہ ایڈیشن میں شامل کیا ہے۔ مصنف کو افسوس اور دکھ ہے کہ ان چالیس سالوں میں دنیا بدل گئی، لوگ بدل گئے، جرم اور جرائم کی نوعیت تبدیل ہوئی لیکن جیل کا نظام اور ہماری عدالتی نظام تبدیل نہ ہو سکا۔آج بھی جیل میں وہی انگریز کے زمانے کے کالے قوانین رائج ہیں اور قیدیوں کے ساتھ وہی پرانے ہتھکنڈے استعمال کیے جاتے ہیں۔ حکومتوں کی بے بسی اور بے حسی، حکومتی نظام کی خرابی، عدالتی فیصلوں میں طوالت، سماجی و معاشی ناہمواری، مہنگا وکیل، بد عنوان پولیس اور زنگ خوردہ عدالتی نظام آج بھی پہلے جیسا ہے۔اس باب میں مصنف نے ترقیافتہ ممالک کے جیلوں سے ہمارا موازنہ کر کے حکومت کو جیلوں کی بہتری کے لیے چند تجاویز دی ہیں:

''(۱)دہشت گردی میں ملوث مجرموں، خطرناک ڈاکوؤں اور منشیات فروش کو دوسرے عام قیدیوں کے ساتھ عام جیلوں میں نہ رکھا جائے۔

(۲) منظم گروہوں کو چلانے والوں، دہشت گردوں، منشیات فروشوں اور عورتوں کی عصمت لوٹنے والوں کی سزائیں عام مجرموں سے مختلف ہونا چاہیئے۔

(۳) خطرناک قیدیوں اور قاتلوں کی سزائیں رات دن کے شمار سے مبرا ہونے چاہیئے کیونکہ یہ مجرم رات دن کے شمار اور دوسری معافیوں کے سہارے چودہ سال کا عرصہ صرف چار پانچ سال میں گزار کر پھر سماج کی گردن پر سوار ہو جاتے ہیں۔

(۴) حکومت کو چاہیئے کہ جیل ملازمین کی ذہنی اور پیشہ ورانہ تربیت کا اہتمام جدید خطوط پر کرے۔

(۵) جیلوں کے اندر بڑے صنعتی کارخانے لگائے جائیں جن میں قیدی کام کر سکیں۔ یہاں اُنہیں معاش بھی ملے گا اور وہ قوم کی ترقی میں مثبت کردار بھی ادا کر سکیں گے۔

(۶)جیلوں میں جوان عمر کے قیدیوں کو کمپیوٹر، ٹی وی، آئی ٹی اور جدید فن تعلیم دینے کا اہتمام کیا جائے۔

(۷) یہ بات انتہائی ضروری ہے کہ شادی شدہ قیدیوں کو سال میں پانچ دس دن چھٹی دی جائے یا اُنہیں جیل کوارٹر دیے جائیں جن میں اُنہیں چند مہینے بعد اپنی

بیویوں کو چند دن رکھنے کی اجازت ہو۔ اس سے وہ بے گناہ بیویاں بھی سزا سے بچ
جائیں گی جنہیں غیر قانونی، غیر اخلاقی اور غیر انسانی طور پر اُن کے خاوندوں سے
دور کیا جاتا ہے۔''(۲۳۹)

ہماری زبان اُردو میں استعمال ہونے والا لفظ اسلوب بڑا بلیغ لفظ ہے اور اس کو کئی معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ عام طور پر لفظ اسلوب سُن کر اس سے بات کو فصیح انداز میں پیش کرنا اور وہ تمام وسائل استعمال کرنا جن سے کوئی ادبی تحریر مؤثر ثابت ہو سکتی ہو مراد لیا جاتا ہے۔ اسلوب پر اُردو نقادوں نے بہت کچھ لکھا ہے تاہم طارق سعید نے اسلوب کی جو سادہ اور مختصر تعریف کی ہے وہ پڑھنے کے قابل ہے:

''کسی مصنف کے لکھنے کے انداز کو اسلوب کہتے ہیں۔ تنقیدی ادب میں اسلوب
کے تین استعمال دیکھے گئے ہیں۔(۱) کسی شخص کے عام طرز تحریر کو اسلوب کہتے
ہیں۔(۲) اسلوب عام طرز تحریر نہیں بلکہ کسی ادیب یا انشاپردازی کی منفرد طرز
تحریر ہے جو اُسے اُس کے زمانے کے دوسرے انشاپردازوں سے ممتاز یا منفرد کرتا
ہے۔(۳) وہ اسلوب جو زمانے اور ماحول کی قید سے بالاتر ہو کر مصنف کے دنیا
بھر کے اسالیب کی صنف میں لے جائے جس کو انگریزی میں گرینڈ سٹائل
(Grand Style) کہتے ہیں۔''(۲۴۰)

اسلوب کے دو بڑے عنصر ہیں ایک داخلی اور ایک خارجی۔ داخلی عنصر میں ذہنی زندگی، پسند و مشاغل، عقائد، رسوم ورواج غرض سب کچھ کا عکس دیکھا جا سکتا ہے جبکہ خارجی عناصر میں زمانے کا اثر اور اپنے عہد کی خاص و عام چیزیں تلاش کی جا سکتی ہیں۔ جب ہم کہتے ہیں کہ سر سید کے اسلوب میں اُس کا زمانہ بول رہا ہے تو اس کا مطلب اُن کے زمانے کی عقل پرستی اور ریشنل ازم کا عام رجحان ہے جو اُن کے اسلوب یا تحریر میں نمایاں طور پر ملتا ہے۔ اس موقع پر کہا جاتا ہے کہ:
" Style is the man him self''مراد یہ ہے کہ اسلوب صاحب اسلوب خود ہے۔ دراصل ہر تحریر میں خود شخصیت بول رہی ہوتی ہے۔

عام طور پر سیاسی خودنوشتیں لکھنے والوں سے صاحب اسلوب ہونے کی توقع نہیں کی جا سکتی کیونکہ وہ بہت بڑے ادیب یا انشاپرداز نہیں ہوتے اس لیے ہمیں اُنہیں طارق سعید کی پہلی تعریف (کسی شخص کے عام طرز تحریر کو اسلوب کہتے ہیں) پر رکھ کر پرکھنا پڑتا ہے۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ بعض سیاسی خودنوشتیں اسلوب کے لحاظ سے بھی کافی بلند ہوتی ہیں

جو نہ صرف خود نوشت نگار کی سلجھی ہوئی شخصیت بلکہ اُن کے مطالعے، ذوق، مشاہدے اور زبان پر قدرت رکھنے کی بھی بین ثبوت ہوتی ہیں۔ اسلوب کے حوالے سے دیکھا جائے تو مذکورہ آپ بیتی اب تک ہمارے مطالعے میں آنے والی آپ بیتیوں میں سب سے منفرد آپ بیتی ہے۔ دیگر حوالوں سے ہٹ کر خاص اسلوبیاتی نکتہ نگاہ سے بھی اس آپ بیتی کی ایک خاص قدر و قیمت ہے۔

راجہ انور نے اپنی آپ بیتی میں اپنے اسلوب کو مؤثر بنانے کے لیے کئی وسائل کا استعمال کیا ہے۔ کبھی کبھی وہ شاعرانہ اسلوب کو بروئے کار لاتے ہیں۔ مشہور شاعر مصطفٰے زیدی کی محبوبہ شہناز گل کا ذکر آیا ہے تو اسی شاعرانہ اور رنگین اسلوب کو اختیار کیا ہے:

> ''شہناز گل گوجرنوالہ کی رہنے والی تھی۔ حُسن و زیبائی کا مرقع، خوبصورت آنکھیں، ستواں ناک، سنگ مرمر سے تراشا ہوا پیکر، یاقوتی لب و دہان، خوبرو، بلند قد و قامت اور خالصِ افغان شاہی نسل کی شہزادی۔''(۲۴۱)

وہ مترادفات اور پُر شکوہ الفاظ سے اپنے اسلوب کو آراستہ کر کے پیرا گراف کے آہنگ کو قابلِ توجہ بناتے ہیں۔ جب اُنہیں رہائی ملتی ہے اور واپس دنیا کے ہنگاموں میں شامل ہو جاتے ہیں تو جیل سے باہر کی دنیا کا کچھ یوں شکوہ کرتے ہیں۔ یہاں خوشی، غم، تاسف، حیرت اور بیزاری کے سارے رنگ اُن کے لب و لہجے میں شامل ہو جاتے ہیں:

> ''کوئی آدھا گھنٹے بعد ہم انسانوں کے ہجوم میں ڈوب چکے تھے۔ پھر وہی نعرے، ہار، ہائے ہو، غربت، تقریریں، وفاداری، سسکتے بچے، پھٹے آنچل، کاریں، اخلاق، بنگلے، دولت، قانون، جہیز، رسوم، جھونپڑے، آئین، قانون شکنی، جمہوریت، بلکتے انسان، مذہب، اُصول، ہڑتالیں، امن، انصاف، قتل، آگ، مساوات، خون، بغاوت، انسان، تعفن، خامشی، بارود، افلاس، لٹی عصمتیں، ہم تبدیل ہو کر بڑی جیل میں پہنچ چکے تھے۔ اب یہاں سے رہائی جانے کب ہو؟''(۲۴۲)

راجہ انور کو داستان سنانے اور واقعے کو افسانوی رنگ دینے کا بڑا شوق ہے۔ وہ سچے واقعے جو گاؤں اور شہروں میں وقوع پذیر ہوئے جنہیں ہم اخباروں میں چند سطروں میں پڑھ کر بُھلا دیتے ہیں وہ جب راجہ انور کے قلم سے لکھے ہوئے پڑھتے ہیں تو بار بار پڑھنے کو جی کرتا ہے۔ اُس نے ''ریشماں'' کے عنوان سے بعض ایسے واقعات بھی تحریر کیے ہیں جن پر کسی افسانے، ڈرامے یا فلمی کہانی کا گمان ہوتا ہے۔ یہ مصنف کا انداز بیان ہے جو سیدھے سادھے واقعے میں افسانے جیسی چاشنی ڈال دیتا ہے:

"نمبر دار کا اُنہیں غلطی سے ملاقاتی سمجھ کر جیل کے مین گیٹ سے باہر کرنا"، "بہاولپور جیل کا سفر"، "پانچ سال کے قیدی ندیم کا قصہ" اور "قیدیوں کا جیل میں خوشی منانے کا جشن" وہ عام روزمرہ واقعات ہیں جو عام اخباری خبر کے سوا کوئی اہمیت نہیں رکھتے لیکن راجہ انور کے جادوئی قلم نے انہیں کسی افسانے کی طرح ڈرامائی بنادیا ہے۔

"بڑی جیل سے چھوٹی جیل تک" کے اسلوب میں خطیبانہ اور واعظانہ انداز بھی کافی نمایاں ہے۔ مصنف جب بھی کوئی واقعہ، اپنا مشاہدہ یا تجربہ بیان کرتے ہیں تو اس سے کوئی نہ کوئی اخلاقی سبق بھی اخذ کرتے ہیں۔ اس موقع پر اُس کا لہجہ واعظانہ بن جاتا ہے۔ درج ذیل پیرگراف پڑھ کر مصنف کسی غضبناک مقرر کی طرح باقاعدہ ڈانٹ ڈپٹ کرتے معلوم ہوتے ہیں:

> "جیب تراش تو وہ مُلا بھی ہے جو محنت نہیں کرتا اور خدا کا نام بیچتا ہے۔ جیب تراش تو بھاری توند والا وہ تاجر بھی ہے جو رزق بلیک کرتا ہے، مہنگائی پیدا کرتا ہے، سرمایہ دار سے بڑا لٹیرا کون ہوگا لیکن یہ سب "دار السلام" کے قانونی جیب تراش ہیں لہٰذا ان پر مقدمہ نہیں چلتا، ہمارا قانون غداروں کا محافظ ہے لٹیروں کا رکھوالہ ہے۔ اگر غریب اپنا حق لینے کا نام لے تو اُسے باغی قرار دے کر تختۂ دار پر کھینچ دیتا ہے اگر وہ زندہ رہنا چاہے تو اُس پر کفر کے فتوے صادر کر دیتا ہے۔"(۲۴۳)

بعض جگہوں پر راجہ انور کا لہجہ نہ صرف تلخ ہو جاتا ہے بلکہ وہ طنزیہ پیرائے بیان اختیار کر لیتے ہیں، خصوصاً جیل کے حکام کی ظلم و ستم کے واقعات بیان کرتے ہوئے یا انسانوں کے درمیان عدم مساوات اور غیر مساویانہ تقسیم دولت کا ذکر کرتے ہوئے وہ شدید طنز کا سہارا لیتے ہیں۔ جیل کے اندر بد عنوانی، رشوت ستانی اور جیل کے اعلیٰ افسروں کی عیاشی کی داستانیں بیان کر کے وہ طنزیہ انداز میں یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں:

> "آخر یہ ملک آفسروں کی ان عیاشیوں کے لیے تو بنا تھا، افسر خواہ جیل کا ہو یا کسی اور محکمے کا بہر حال افسر ہے اور جہاں افسر ہے وہاں رشوت ہے۔ ہمارے نیک دل افسر اور حکمران اسی سیدھے سادھے اُصول پر کاربند ہیں۔"(۲۴۴)

ہر قصہ گو اپنے ارد گرد کے ماحول پر بھی گہری نظر رکھتا ہے اور جہاں اُسے مناسب لگے ماحول اور مناظر کی لفظی مصوری کرتا ہے۔ وہ جس قدر فطری انداز اختیار کرے گا اُس کی منظر نگاری زیادہ پُر تاثیر ہوگی۔ منظر نگاری صرف ارد گرد کے مناظر کو بیان کرنے کا نام نہیں بلکہ ایک ایسا جامع فن ہے جس میں ساری فضا موجود ہو، مختلف چیزوں کی تصویریں یک

جاہو گئی ہوں۔ محض کسی مقام یا تقریب یا ٹھوس چیز کا بیان منظر نگاری نہیں بلکہ کرداروں کے خارجی صورتیں اس طرح بیان کرنا کہ پوری مرکب چیز ہمارے سامنے پیش ہو جائے۔ وصف نگاری، کردار نگاری، سراپا نگاری، شخصیت نگاری، مرقع نگاری اور تقریب نگاری سب منظر نگاری کی ذیلی شاخیں ہیں۔اس لیے تو کہتے ہیں کہ منظر نگاری کرنے والا خداداد صلاحیتوں کا مالک فرد ہوتا ہے۔یوں تو سرگزشت، خودنوشت اور آپ بیتی لکھنے والے کے پاس نہ تو اتنا وقت ہوتا ہے کہ وہ منظر نگاری پر اپنی توجہ مبذول کرائے اور نہ خودنوشت نگار سے اس قسم کی توقع کی جاسکتی ہے کیونکہ آخر کار وہ ناول نگار نہیں ہوتا لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ آپ بیتی نگار اپنے اسلوب سے آپ بیتی کو منفرد بنا سکتا ہے اور اُردو کی ایسی کتنی آپ بیتیاں ہیں جو صرف اپنے دلکش اسلوب کی وجہ سے پڑھی جاتی ہیں۔اس لیے نقاد کہتے ہیں کہ منظر نگاری آپ بیتی کے لیے ایک اچھی خوبی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ یہ مبالغہ امیز، بناوٹی، گنجلک اور خلاف فطرت نہ ہو۔''بڑی جیل سے چھوٹی جیل تک'' کے مصنف نے منظر نگاری پر بھی خوب توجہ دی ہے۔ جہاں جہاں ضرورت ہو وہ خوب تفصیل سے واقعے کی منظر نگاری کرتے ہیں۔ جیل میں کوڑے مارنے والے منظر کو اس انداز سے بیان کیا کہ پورا واقعہ ہماری آنکھوں کے سامنے گزرتا ہوا محسوس ہوتا ہے:

'' بیدزن ایک خاص فلمی انداز میں قیدیوں کو بید مارتا ہے۔ ملزم ٹکٹکی پر چڑھانے کے بعد وہ تقریباً بیس گز کے فاصلے سے قیدی کی طرف سرپٹ دوڑتا ہے۔ وہ بید کو ہوا میں لہراتے، گھماتے اور سنسناتے ہوئے سائیں، سائیں کی ایسی خوفناک آواز پیدا کرتا ہے جسے سُن کر قیدی کا جسم پہلے سے ہی لرزنا شروع ہو جاتا ہے۔ قیدی کے پاس پہنچ کر جلاد ایک گھٹنا زمین پر ٹیکتے ہوئے گیند کو سویپ کرنے والے بیٹسمین کی مانند اپنی پوری قوت کے ساتھ اُسی کی پیٹھ پر بید مارتا ہے۔ بید کی پہلی ہی ضرب سے قیدی کی پیٹھ سے خون کا فوارا اُبلنا شروع ہو جاتا ہے۔''(۲۴۵)

اپنی آپ بیتی میں ایک جگہ مصنف نے دیہات کی رات کی کامیاب منظر کشی کی ہے:

'' سڑک، بجلی اور ٹی وی نے تاہنوز دیہی زندگی کے آنگن میں قدم نہیں رکھا تھا دن بھر کے کام کاج سے تھکے ہارے محنت کش دہقان سر شام سونے اور صبح کاذب جاگنے کے عادی تھے۔ میں نے گھڑی دیکھی تو محض دس بجے تھے لیکن پورا ماحول نیند کے خمار میں ڈوب چکا تھا۔ ہر طرف سکوت اور ٹھہراؤ کی حکمرانی تھی۔ کسی

بیل یا گائے کے گلے میں بندھی گھنٹی ہلنے سے رات کے سیاہ پردے پر تھوڑی سی تھرتھراہٹ پیدا ہوتی اور پھر وہی چُپ کا عالم"۔(۲۴۶)

اس آپ بیتی میں ابواب کے نام اور عنوانات یا ذیلی عنوانات کے نام بھی بڑے دلچسپ رکھے گئے ہیں جو مصنف کی شعر و شاعری سے شغف، موضوع پر اُن کی گرفت، اعلیٰ ذوق اور عمدہ اسلوب کے غماز ہیں۔ موضوع، واقعہ، حکایت اور اصل صورتحال کے مطابق وہ اپنی سرگزشت کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کرتے ہیں اور پھر اُس کو خوبصورت عنوان دے کر واقعہ لکھتے ہیں۔ دار و رسن، راہروان عدم، موت سے فرار، انہی پتھروں پہ، اے چارہ گرو، زندہ لاشیں اور سیلانی ارواح وغیرہ وہ نام ہیں جو مصنف کی نفسیات، زرخیز ذہین اور اُردو زبان کے ساتھ اُن کی لگاؤ کا پتہ دیتی ہیں۔(۲۴۷)

مصنف کا انتخاب الفاظ بھی نہایت مناسب ہے وہ کم سے کم الفاظ میں بڑی سے بڑی بات لکھنے کے قائل ہیں۔آپ بیتی پڑھنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ مصنف نے دیگر چیزوں کے ساتھ ساتھ الفاظ و تراکیب کو استعمال کرنے میں بھی بڑی محنت سے کام لیا ہے۔ وہ اکثر عبارات میں فارسی تراکیب اور اصطلاحات کا بھی بے ساختہ استعمال کرتے ہیں:

"راہروان عدم، خیال پریشان، زمزمہ کناں، گرگ باراں دیدہ، طاق زنداں، منقار زیرِپَر، گریہ کناں، سیہ خانہ عالم"(۲۴۸)

مصنف نے کئی شاعرانہ اصطلاحات جیل کے لیے استعمال کی ہیں اور اِتنے بر محل استعمال کی ہیں گویا شعراء نے خاص اس موقع کے لیے یہ اصطلاحات وضع کی تھیں:

" صحن زندان، دار و رسن، حلقۂ زنجیر، تختہ دار، مقتل، جلاد، بخت خُفتہ، چشمِ پاسبان، گوشہ قفس"(۲۴۹)

جیل میں قیدی کچھ ایسی اصطلاحات بھی استعمال کرتے ہیں جو صرف جیل سے مخصوص ہیں۔ عام زندگی میں اُن اصطلاحات کو زیادہ تر لوگ نہیں جانتے نہ اُردو کے اکثر لغات میں اُن کا مفہوم درج ہے۔ مصنف نے اپنی آپ بیتی میں کئی ایسی اصطلاحات کا مطلب اور پس منظر بتایا ہے جن میں چند ایک یہاں درج کرتے ہیں:

" (۱) پھٹے لگانا (صبح کی آذان کے بعد پھانسی دینا)

(۲) رومال لہرانا (جیلر کا جلاد کو رسا کھینچنے کا حکم دینا)

(۳) بیرونی پنجہ (جیل کی چار دیواری سے باہر کی مشقت)

(۴) چھوٹی مشین (کم عمر جیب تراش) ، بڑی مشین (جوان جیب تراش)

(۵) چکی (قیدیوں کے لیے بنائے گئے کمرے، انگریز کے زمانے میں ان کمروں میں باقاعدہ چکیاں نصب تھیں جن پر ہر قیدی کو روزانہ منوں آٹا پیسنا پڑتا تھا)

(٦) پریڈ (جیل کے اعلیٰ حکام کا جیل کا معائنہ کرنا)

(۷) جنگلہ پریڈ (کم عمر لڑکوں کو جنسی فعل کے لیے مجبور کرنا)

(۸) منڈا خانہ (بیس سال سے کم عمر کے لڑکوں کا بارک)''(۲۵۰)

مختصر یہ کہ ''بڑی جیل سے چھوٹی جیل تک'' سیاسی ،تاریخی ، سماجی ، اسلوب اور زبان وبیان کے حوالے سے خصوصی اہمیت کی حامل آپ بیتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ معلوماتِ پاکستان، امتیاز علی، مکتبہ امتیاز لاہور، ۲۰۱۲ء ص۔۱۲۶

۲۔ ایضاً، ص، ۱۲۷

۳۔ ''اور لائن کٹ گئی''، مولانا کوثر نیازی، علم و عرفان پبلشرز لاہور، ۲۰۱۵ء۔ ص۸۔

۴۔ ایضاً، ص۵۱۔

۵۔ ایضاً، ص۴۸۔

۶۔ ایضاً، ص۔۶۰

۷۔ ایضاً، ص۴۹۔۵۲

۸۔ ایضاً، ص۲۵۔

۹۔ ایضاً، ص۳۵۔

۱۰۔ ایضاً، ص۵۷۔۷۱۔

۱۱۔ ایضاً، ص۸۰،۷۹۔

۱۲۔ ایضاً، ص۸۱۔۹۴۔

۱۳۔ ایضاً، ص۱۰۴۔

۱۴۔ ایضاً۱۴۷۔

۱۵۔ ایضاً، ص۱۴۔

۱۶۔ ایضاً، ص۱۵۔

۱۷۔ ایضاً، ص۲۳۔

۱۸۔ ایضاً، ص۳۳۔

۱۹۔ ایضاً، ص۶۳۔۷۱۔

۲۰۔ ایضاً، ص۶۸۔

۲۱۔ ایضاً، ص۱۰۱۔

۲۲۔ ایضاً، ص۱۴۰۔

۲۳۔ ایضاً، ص۱۷۱۔

۲۴۔ ایضاً، ص۱۰۹،۱۰۸۔

۲۵۔ ایضاً، ص۱۵۴۔

۲۶۔ ایضاً، ص۱۶۱،۱۶۰۔

۲۷۔ ایضاً، ص۹۔

۲۸۔ ایضاً، ص۱۰۳،۱۰۲۔

۲۹۔ پس نوشت اور پس پس نوشت، پرویز پروازی، نیازمانہ پبلشرز لاہور ۲۰۰۷ء ص۔۲۷

۳۰۔ ''اور لائن کٹ گئی'' ، مولانا کوثر نیازی، علم و عرفان پبلشرز لاہور، ۲۰۱۵ء، ص۳۹۔

۳۱۔ ایضاً، ص۵۱۔

۳۲۔ ایضاً، ص۱۵۵،۱۵۴۔

۳۳۔ ایضاً، ص۲۵۔

۳۴۔ ایضاً، ص۴۷۔

۳۵۔ ایضاً، ص۹۸۔

۳۶۔ ایضاً، ص۴۷۔

۳۷۔ ایضاً، ص۸۰۔

۳۸۔ ایضاً، ص۱۱۳۔

۳۹۔ ایضاً، ص۱۷۔

۴۰۔ ایضاً، ص۹۷۔

۴۱۔ ایضاً، ص۱۰۵۔

۴۲۔ ایضاً، ص۱۵۶۔

۴۳۔ ایضاً، ص۱۱۰۔

۴۴۔ ایضاً، ص۱۱۱۔

۴۵۔ ایضاً، ص۱۱۲۔

۴۶۔ ایضاً، ص۹۵۔

۴۷۔ ایضاً، ص۶۔

۴۸۔ ایضاً، ص۱۵۰۔

۴۹۔ ’’سفر زندگی‘‘، الطاف حسین، جنگ پبلشرز لاہور، اشاعت دوم، ۱۹۸۸ء، ص۱۱۔

۵۰۔ ایضاً، ص۱۲۔

۵۱۔ ایضاً، ص۱۲۔

۵۲۔ ایضاً، ص۹۹۔۱۰۰

۵۳۔ ایضاً، ص۳۳۔

۵۴۔ ایضاً، ص۲۸۔

۵۵۔ ایضاً، ص۶۲،۶۱۔

۵۶۔ ایضاً، ص۱۶۔

۵۷۔ ایضاً، ص۵۸۔

۵۸۔ ایضاً، ص۹۰۔

۵۹۔ ایضاً، ص۶۳،۶۲۔

۶۰۔ ایضاً، ص۱۰۲،۱۰۱۔

۶۱۔ ایضاً، ص۲۹۔

۶۲۔ ایضاً، ص۵۷۔

۶۳۔ ایضاً، ص۱۰۵۔

۶۴۔ ایضاً، ص۴۷۔

۶۵۔ ایضاً، ص۱۰۰۔

۶۶۔ ایضاً، ص۱۱۱،۲۳۔

۶۷۔ ایضاً، ص۶۶۔

۶۸۔ ایضاً، ص۴۶۔

۶۹۔ ایضاً، ص۴۸۔

۷۰۔ ایضاً، ص۵۶۔

۷۱۔ ایضاً، ص۱۶۔

۷۲۔ قلم کمان ۲، حامد میر، دوست پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۴ء ص۔۵۸

۷۳۔ ''جبر اور جمہوریت'' بیگم کلثوم نواز شریف، سا گر پبلشر ز لاہور ۲۰۰۷ء، ص۱۳۔۱۴

۷۴۔ ایضاً، ص۱۶۔۱۷

۷۵۔ ایضاً، ص۲۹۔

۷۶۔ سب سے پہلے پاکستان، پرویز مشرف، مترجم: ہدایت خویشگی، فیروز سنز لاہور، ۲۰۰۶ء، ص۔۱۵۷

۷۷۔ جبر اور جمہوریت، بیگم کلثوم نواز شریف، سا گر پبلشر ز لاہور، ۲۰۰۷ء، ص۔۲۱

۷۸۔ سچ تو یہ ہے، چودھری شجاعت حسین، فیروز سنز لاہور ۱۹۱۸ء، ص۔۱۷۲

۷۹۔ جبر اور جمہوریت، بیگم کلثوم نواز شریف، سا گر پبلشر ز لاہور، ۲۰۰۷ء، ص۔۴۴

۸۰۔ ایضاً، ص۱۵۱۔۱۵۲

۸۱۔ ایضاً، ص۱۳۵۔

۸۲۔ ایضاً، ص۱۴۹۔۱۵۰

۸۳۔ ایضاً، ص۱۹۔

۸۴۔ ایضاً، ص۲۸۔

۸۵۔ ایضاً، ص۱۲۵۔

۸۶۔ ایضاً، ص۱۲۶۔

۸۷۔ ایضاً، ص۱۴۹۔۱۵۰

۸۸۔ ایضاً، ص۱۵۲۔

۸۹۔ ایضاً، ص۱۷۳۔۱۷۴

۹۰۔ ایضاً، ص۱۷۔۱۸

۹۱۔ ایضاً، ص۲۷۔

۹۲۔ ایضاً، ص۱۴۴۔۱۴۵

۹۳۔ ایضاً، ص۱۷۲۔۱۷۳

۹۴۔ ایضاً، ص۱۵۔۱۶

۹۵۔ ایضاً، ص۹۔۱۳۳

۹۶۔ ایضاً، ص۲۳۔

۹۷۔ ایضاً، ص۲۳۔

۹۸۔ ایضاً، ص۴۵۔

۹۹۔ ایضاً، ص۳۸۔

۱۰۰۔ ایضاً، ص۳۸۔

۱۰۱۔ ایضاً، ص۳۸۔

۱۰۲۔ ایضاً، ص۳۹۔

۱۰۳۔ ایضاً، ص۶۱۔

۱۰۴۔ ایضاً، ص۱۲۸۔

۱۰۵۔ ایضاً، ص۱۳۵۔

۱۰۶۔ ایضاً، ص۹۔

۱۰۷۔ ایضاً، ص۱۷۷۔

۱۰۸۔ ایضاً، ص۱۵۰۔

۱۰۹۔ ایضاً، ص۱۶۶۔

۱۱۰۔ ایضاً، ص۱۷۲۔

۱۱۱۔ ایضاً، ص۱۰۔۱۶۸

۱۱۲۔ ایضاً، ص۹۔۱۷۷

۱۱۳۔ ایضاً، ص۳۰۔

۱۱۴۔ ایضاً، ص۳۱۔

۱۱۵۔ ایضاً، ص۳۳۔۳۴

۱۱۶۔ ایضاً، ص۳۶۔

۱۱۷۔ ایضاً، ص۳۵۔

۱۱۸۔ ایضاً، ص۱۴۵۔

۱۱۹۔ ''وزیر جیل سے اسیر جیل تک'' ، سید قمر عباس، بے نظیر بکس ۸۔ڈیوس روڈ لاہور، جنوری ۲۰۰۹ء، ص۷۔

۱۲۰۔ ایضاً، ص۱۳، ۱۲۔

۱۲۱۔ ایضاً، ص۳۰۔

۱۲۲۔ ایضاً، ص۱۶، ۱۵۔

۱۲۳۔ ایضاً، ص۳۸۔

۱۲۴۔ ایضاً، ص۱۱۷، ۱۱۶۔

۱۲۵۔ ایضاً، ص۱۴۲، ۱۴۱۔

۱۲۶۔ ایضاً، ص۸۵۔

۱۲۷۔ ایضاً، ص۹۴۔

۱۲۸۔ ایضاً، ص۱۱۱۔

۱۲۹۔ ایضاً، ص۱۴۸، ۱۴۷۔

۱۳۰۔ ایضاً، ص۱۳۹۔

۱۳۱۔ ایضاً، ص۱۲۴، ۱۲۳۔

۱۳۲۔ ایضاً، ص۱۷۶، ۱۷۵۔

۱۳۳۔ ایضاً، ص۹، ۸۔

۱۳۴۔ ایضاً، ص۱۶۳۔

۱۳۵۔ ایضاً، ص۱۲، ۱۱۔

۱۳۶۔ ایضاً، ص۱۱۱، ۱۱۰۔

۱۳۷۔ ایضاً، ص۱۴۰۔

۱۳۸۔ ایضاً، ص۱۰۶۔

۱۳۹۔ ایضاً، ص۸۱۔

۱۴۰۔ ایضاً، ص۱۳۵۔

۱۴۱۔ ایضاً، ص۹۰۔

۱۴۲۔ ایضاً، ص۱۰۰۔

۱۴۳۔ ایضاً، ص۱۰۸۔

۱۴۴۔ ایضاً، ص۱۱۵۔

۱۴۵۔ ایضاً، ص۵۵۔

۱۴۶۔ ایضاً، ص۱۵۴۔

۱۴۷۔ ایضاً، ص۱۶۴۔

۱۴۸۔ ایضاً، ص۱۴۸،۱۰۳۔

۱۴۹۔ ایضاً، ص۱۴۸،۱۰۲۔

۱۵۰۔ ایضاً، ص۱۴۸۔

۱۵۱۔ ایضاً، ص۶۰۔

۱۵۲۔ ''ہیں اور بھی دنیا میں سخن اور بہت اچھے''عافیہ جہانگیر، مشمولہ: اُردو ڈائجسٹ کراچی آپ بیتی نمبر، جون ۲۰۱۸ء ص ۲۱۲۔

۱۵۳۔ ''سچ کہوں گا''، چودھری اعتزاز احسن، نگارشات پبلشرز لاہور، اشاعت اول ۲۰۰۹ء، ص ۴۳،۴۲۔

۱۵۴۔ ایضاً، ص۳۰،۲۹۔

۱۵۵۔ ایضاً، ص۳۹۔

۱۵۶۔ ایضاً، ص۳۵۔۳۶

۱۵۷۔ ایضاً، ص۵۱،۵۰۔

۱۵۸۔ ایضاً، ص۵۹۔

۱۵۹۔ ایضاً، ص۹۲،۹۱۔

۱۶۰۔ ایضاً، ص ۸۱۔

۱۶۱۔ ایضاً، ص ۳۵۔

۱۶۲۔ ایضاً، ص ۴۷۔

۱۶۳۔ ایضاً، ص ۶۴۔

۱۶۴۔ ایضاً، ص ۹۵۔

۱۶۵۔ ''جالب بیتی'' حبیب جالب، مقبول اکیڈمی لاہور ۱۹۷۹ء، ص ۱۵۷۔

۱۶۶۔ ''کلیاتِ جالب''، حبیب جالب، مقبول اکیڈمی لاہور، ۱۹۱۳ء ص ۱۱۳۔

۱۶۷۔ ''سچ کہوں گا''، چودھری اعتزاز احسن، نگارشات پبلشرز لاہور ۲۰۰۹ء، ص ۵۵۔۹۹

۱۶۸۔ ایضاً، ص ۳۴۔

۱۶۹۔ ایضاً، ص ۱۲۴۔

۱۷۰۔ ایضاً، ص ۸۱۔

۱۷۱۔ ایضاً، ص ۷۰۔

۱۷۲۔ سچ کہوں گا، ''کچھ معروضات'' ، اصغر عبداللہ، جنگ راولپنڈی، ۹ جون ۲۰۰۹ء

۱۷۳ ''پنجاب کا مقدمہ''، محمد حنیف رامے، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۱۰ء، ص ۲۰۰۔

۱۷۴۔ ایضاً، ص ۲۰۰۔

۱۷۵۔ ایضاً، ص ۲۰۰۔

۱۷۶۔ ''پنجاب کا مقدمہ''، محمد حنیف رامے، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۱۰ء، ص ۱۰۔

۱۷۷۔ ایضاً، ص ۱۱۔

۱۷۸۔ ایضاً، ص ۲۱۔

۱۷۹۔ ''المیہ تاریخ''، ڈاکٹر مبارک علی، فکشن ہاوس لاہور، ۱۹۹۵ء ص ۲۵۱۔

۱۱۸۰۔ ''پنجاب کا مقدمہ''، محمد حنیف رامے، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۱۰ء، ص ۳۶۔

۱۱۸۱۔ ایضاً، ص ۱۰۵، ۱۰۴۔

۱۱۸۲۔ ایضاً، ص ۷۱۔

۱۸۳۔ ایضاً، ص۹۷۔

۱۸۴۔ ایضاً، ص۵۰۔

۱۸۵۔ ایضاً، ص۸۸۔

۱۸۶۔ ایضاً، ص۸۲۔

۱۸۷۔ ایضاً، ص۸۳۔

۱۸۸۔ ایضاً، ص۸۷۔

۱۸۹۔ ایضاً، ص۱۵۱،۱۵۰۔

۱۹۰۔ ایضاً، ص۱۰۲۔

۱۹۱۔ ایضاً، ص۱۹،۱۵۔

۱۹۲۔ ایضاً، ص۶۷۔

۱۹۳۔ ایضاً، ص۶۸۔

۱۹۴۔ ایضاً، ص۶۹۔

۱۹۵۔ ایضاً، ص۸۵۔

۱۹۶۔ ایضاً، ص۱۰۰۔

۱۹۷۔ ایضاً، ص۱۷۔

۱۹۸۔ واقعات، اسلم کمال، مشمولہ: ''ماہنامہ الحمرا''، لاہور اکتوبر ۲۰۱۷ء ص۶۸۔

۱۹۹۔ ''پنجاب کا مقدمہ''، محمد حنیف رامے، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۰۷ء، ص۱۲۔

۲۰۰۔ ایضاً، ص۱۴۔

۲۰۱۔ ایضاً، ص۱۵۔

۲۰۲۔ ایضاً، ص۹۰،۳۳۔

۲۰۳۔ ایضاً، ص۴۰۔

۲۰۴۔ ایضاً، ص۴۱۔

۲۰۵۔ ایضاً، ص۹۱۔

۲۰۶۔ ایضاً، ص۹۷۔

۲۰۷۔ ایضاً، ص۱۴۳۔

۲۰۸۔ ایضاً، ص۱۰۸۔

۲۰۹۔ ایضاً، ص۱۹۵۔

۲۱۰۔ ایضاً، ص۱۹۹۔

۲۱۱۔ ایضاً، ص۱۴۔

۲۱۲۔ ایضاً، ص۱۴۔

۲۱۳۔ ایضاً، ص۱۸۔

۲۱۴۔ ایضاً، ص۲۶۔

۲۱۵۔ ایضاً، ص۲۶۔

۲۱۶۔ ایضاً، ص۱۳۸۔

۲۱۷۔ ایضاً، ص۳۸۔

۲۱۸۔ ایضاً، ص۱۵۔

۲۱۹۔ ایضاً، ص۷۲،۷۱۔

۲۲۰۔ ایضاً، ص۸۷۔

۲۲۱۔ ایضاً، ص۱۱۹،۱۱۸۔

۲۲۲۔ ایضاً، ص۱۱۱۔

۲۲۳۔ روزنامہ جنگ لاہور، شمارہ تین، جولائی ۱۹۸۷ء۔

۲۲۴۔ ''بڑی جیل سے چھوٹی جیل تک''، راجہ انور، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۱۱ء، ص۱۵۔

۲۲۵۔ ''بڑی جیل سے چھوٹی جیل تک''، راجہ انور، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۱۱ء، ص۳۸۔

۲۲۶۔ ایضاً، ص۳۸۔

۲۲۷۔ ایضاً، ص۱۶۔

۲۲۸۔ ایضاً، ص۳۳۔

۲۲۹۔ ایضاً، ص۱۳۳۔

۲۳۰۔ ایضاً، ص۱۰۴۔

۲۳۱۔ ایضاً، ص۴۷۔۴۷

۲۳۲۔ ایضاً، ص۱۰۲۔

۲۳۳۔ ایضاً، ص۲۴،۲۳۔

۲۳۴۔ ایضاً، ص۲۸۔

۲۳۵۔ ایضاً، ص۴۲،۴۱۔

۲۳۶۔ ایضاً، ص۴۴۔

۲۳۷۔ ایضاً، ص۵۸۔

۲۳۸۔ ایضاً، ص۸۷۔

۲۳۹۔ ایضاً، ص۱۳۹۔۱۴۲

۲۴۰۔ ''اسلوبیاتی تنقید'' ،طارق سعید،ایجو کیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی،۱۹۹۳ء، ص۲۸۔

۲۴۱۔ ''بڑی جیل سے چھوٹی جیل تک''،راجہ انور،سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۱۱ء، ص۴۴۔

۲۴۲۔ ایضاً، ص۱۳۸۔

۲۴۳۔ ایضاً، ص۵۶۔

۲۴۴۔ ایضاً، ص۶۱۔

۲۴۵۔ ایضاً، ص۳۰۔

۲۴۶۔ ایضاً، ص۱۵۔

۲۴۷۔ ایضاً، ص۲۱،۸۷۔

۲۴۸۔ ایضاً، ص۲۶،۱۲۰۔

۲۴۹۔ ایضاً، ص۱۱۶۔

۲۵۰۔ ایضاً، ص۲۳،۸۶۔

چوتھا باب

ترجمہ شدہ آپ بیتیاں

ترجمہ شدہ آپ بیتیاں:

ترجمہ شدہ آپ بیتیوں سے مراد وہ آپ بیتیاں ہیں جو دیگر زبانوں سے اُردو میں ترجمہ کی گئی ہیں۔ ہماری زبان میں اِس قسم کی آپ بیتیوں کی ایک طویل فہرست ہے جو ملکی اور بین الاقوامی سطح پر مشہور لوگوں نے لکھی ہیں۔ اکثریت انگریزی سے ترجمہ شدہ آپ بیتیوں کی ہے۔ یہ آپ بیتیاں لکھنے والوں کی پیدائش، خاندان، نجی زندگی، عقائد و نظریات، رسوم ورواج ،تاریخی حقائق، سیاسی صداقتوں، سماجی تغیرات اور اسلوبِ بیان کے حوالے سے نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔ خالص ادبی زاویے سے دیکھا جائے تو ایک طرف ترجمہ شدہ آپ بیتیاں منفرد زبان و بیان، نئے الفاظ و تراکیب، محاورات اور اصطلاحات اُردو زبان کو بخشتی ہیں اور دوسری طرف نئے نظریات، تازہ افکار، جدید علوم اور سائنسی اندازِ فکر سے اُردو قاری کو آگاہ کرتی ہیں۔ ہمارے سیاستدانوں کی درج ذیل آپ بیتیاں ترجمہ شدہ آپ بیتیاں ہیں:

(۱) میری زندگی اور جدوجہد (خان عبدالغفار خان) (۲) جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی (محمد ایوب خان) (۳) کیا میں پاگل تھا؟(اجمل خٹک) (۴) دُختر مشرق (بے نظیر بھٹو) (۵)میں اور میرا پاکستان (عمران خان) (۶)سب سے پہلے پاکستان (پرویز مشرف)۔

ا۔ میری زندگی اور جدوجہد (خان عبدالغفار خان)

بزرگ پشتون سیاسی رہنما اور خدائی خدمتگار تحریک کے بانی خان عبدالغفار خان کی یہ آپ بیتی پہلی مرتبہ ۱۹۶۵ء کو نئی دہلی سے بیک وقت پشتو، ہندی، اُردو اور انگریزی چاروں زبانوں میں شائع کی گئی۔ خان عبدالغفار خان نے اپنی آپ بیتی پشتو زبان میں لکھی تھی، دیگر زبانوں میں پشتو سے ترجمے کیے گئے ہیں۔ پشتو سے اُردو ترجمہ صوبہ سرحد کے مشہور شاعر اور ادیب پروفیسر یار محمد مغموم نے کیا ہے۔ اُردو، انگریزی اور ہندی زبانوں میں ترجمہ شدہ آپ بیتیوں پر مقدمہ مشہور کانگریسی لیڈر، صحافی، ادیب اور بھارت میں عبدالغفار خان کے نام پر بنائی گئی رفاہی تنظیم ''خان عبدالغفار خان سالگرہ سمتی'' کے صدر رجے پرکاش نارائن نے لکھا۔

ہندوستانی اور پاکستانی سیاست میں خان عبدالغفار خان کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ اُس نے آل انڈیا نیشنل کانگریس کے پلیٹ فارم سے انگریز کے خلاف ایک طویل جدوجہد کی۔ صوبہ سرحد کے پٹھانوں کی سیاسی اور سماجی بیداری میں باچا خان کا نہایت اہم کردار رہا ہے۔ یہ باچا خان ہی تھے جس نے صوبہ سرحد کے باشندوں کے دِلوں سے انگریز کا ڈر اور خوف نکالا۔ آپ انگریز دشمنی، عدم تشدد، اہنسا، شجاعت اور اُصول پسندی کی وجہ سے ''سرحدی گاندھی'' کہلائے۔ سیاست

سے ہٹ کر فلاحی کاموں، تعلیم کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنے، سماجی تبدیلیوں کی حوصلہ افزائی کرنے، مختلف پٹھان قبیلوں اور گروہوں کے درمیان لڑائی جھگڑے ختم کرانے اور تمام پٹھانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی بدولت بھی آپ رہتی دنیا تک یاد کیے جائیں گے۔ وہ مہاتما گاندھی کے سچے پیروکار ہونے کے سوا بھی بہت کچھ تھے۔ آپ کو وطن کی آزادی سے پہلے اور بعد میں بھی بارہا قید و بند کی صعوبتوں سے گزرنا پڑا۔ آپ ہندوستان کے سیاستدانوں میں سب سے زیادہ وقت جیل میں گزارنے کا منفرد ریکارڈ رکھتے ہیں۔ خان عبدالغفار خان بین الاقوامی سطح کے رہنما تھے۔ عالمی سیاسیات کی تاریخ میں آپ کا نام عزت اور افتخار سے لیا جاتا ہے۔ گاندھی جی، پنڈت جواہر لال نہرو، ابوالکلام آزاد اور دیگر ہندوستانی سیاسی رہنماؤں کے ساتھ آپ کو بھی عالمگیر شہرت ملی۔ امریکہ کے سابق صدر ''باراک اُباما'' نے اُنہیں اپنا آئیڈیل قرار دیا تھا۔ نیلسن منڈیلا جیسے حریت پسند لیڈر نے برملا یہ اقرار کیا تھا کہ اُس نے حریت کا سبق خان عبدالغفار خان سے سیکھا ہے۔

آج ہم جو آزادی کی سانسیں لے رہے ہیں، آزادی کی عظیم نعمت سے سرفراز ہیں اور سماجی مرتبوں کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ یہ سب ہمارے اُن دلیر اور شجاع سیاستدانوں اور آزادی کے متوالوں کی وجہ سے ممکن ہوا۔ آج کی نئی نسل بڑی حد تک اپنے اکابرین کی جدوجہد اور آزادی کے لیے کی گئی اُن کی کوششوں سے آگاہ نہیں لیکن اِس میں دو رائے نہیں کہ ہندوستان کے آزادی پسند سیاستدانوں کی انتھک کاوش کے بغیر آزادی کا خواب محض خواب ہی رہتا۔ ہندوستان کی آزادی پسند متوالوں کی کہکشاں میں ایک ضوفشاں ستارہ خان عبدالغفار خان بھی ہیں حقیقت یہ ہے کہ باچاخان کے بغیر ہماری متحدہ ہندوستان کی آزادی کی جنگ ادھوری رہتی ہے۔

خان عبدالغفار خان کی آپ بیتی تاریخی، معاشرتی، سیاسی اور تقسیم ہند کے حوالے سے نہایت اہم آپ بیتی ہے۔ آپ بیتیوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ صرف ایک آپ بیتی درجنوں تاریخی کتابوں پر بھاری ہوتی ہے۔ خان عبدالغفار خان کی آپ بیتی پڑھ کر یہ مقولہ سچ لگنے لگتا ہے۔ عبدالغفار خان کا بیانیہ تقسیم ہند سے بہت پہلے یعنی ۱۹۱۹ء سے شروع ہوتا ہے۔ یہ آپ بیتی اِس لحاظ سے کافی اہم ہے کہ اِس میں اختصار اور سچائی پائی جاتی ہے۔ یہاں عبدالغفار خان کی شخصیت ہر جگہ صاف جھلکتی ہے۔ صداقت، خلوص، کھراپن، کھل کر بات کرنا، حق گوئی و بے باکی اور تاریخی ترتیب مذکورہ آپ بیتی کی خصوصیات ہیں۔ موجودہ صوبہ خیبر پختونخوا اور جنوبی افغانستان کے پختون علاقہ قدیم زمانے میں ایک خطہ تھا۔ اِس کے تاریخ کے بارے میں عبدالغفار خان لکھتے ہیں:

> ''ہمارے اِس دیس میں مختلف ثقافتیں اور تمدن گزر چکے ہیں۔ ایک وقت تھا کہ یہ علاقہ آرین تہذیب کا گہوارا تھا۔ پھر اِس ملک میں بدھ مت کا دَور شروع ہوا۔ اِس

دور میں ہمارے ملک نے بہت ترقی کی اور یہ دور ایک عظیم معاشرے کے آثار اپنے پیچھے چھوڑ گیا۔ آج بھی مہاتما بدھ کے دو عظیم الشان مجسمے بامیان میں موجود ہیں جو دنیا بھر میں مہاتما بدھ کے سب سے بڑے مجسمے ہیں اور پہاڑ کے دامن میں فن اصنام کے کمال کی بے مثل نظیر پیش کرتے ہیں۔''(۱)

ایک تجربہ کار خود نوشت نگار کی طرح ''باچا خان'' نے اپنی کہانی اپنی پیدائش سے شروع کی ہے۔ چنانچہ اپنی پیدائش اور تاریخ پیدائش کے بارے میں بڑی صاف گوئی سے کہتے ہیں:

''میں ہشت نگر (آٹھ گاؤں پر مشتمل قصبہ) کے جواب اشتنغر کے نام سے مشہور ہے، اُتمانزئی گاؤں میں خان بہرام خان کے یہاں پیدا ہوا۔ اُس وقت ہمارے ملک میں اول تو یہ رواج نہیں تھا کہ جب بچہ پیدا ہو تو اُس کی سن پیدائش لکھی جائے اور دوسری بات یہ بھی تھی کہ لوگ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ اس لئے میری پیدائش کی تاریخ کسی نے نہیں لکھی لیکن میری ماں مجھ سے کہا کرتی تھیں کہ میرے بھائی (بڑے بھائی) ڈاکٹر خان صاحب کی جب شادی ہوئی تھی تب میں گیارہ سال کا تھا۔ چونکہ اُن کی شادی ۱۹۰۱ء میں ہوئی تھی اِس لیے میں بجا طور پر کہہ سکتا ہوں کہ میں ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوا تھا۔''(۲)

باچا خان کا تعلق ایک جاگیر دار خاندان سے تھا۔ اُن کے باپ کی جاگیر دُور تک پھیلی ہوئی تھی۔ ایک بڑے خان کا بیٹا ہونے کے باوجود اُن میں نواب مزاجی نام کو موجود نہ تھی۔ اُس نے درویشانہ اور قلندرانہ زندگی گزاری۔ باچا خان کے سوانح نگار یہ دلیل دیتے ہیں کہ یہ خوبی اور خصوصیت اُس نے گاندھی جی کی مجلس سے سیکھی تھی تاہم میرا استدلال یہ ہے کہ اُس کو یہ اوصاف اپنے والد سے ورثے میں ملے تھے۔ وہ خود اپنی آپ بیتی میں اِس کی گواہی یوں دیتے ہیں:

''میرے والد صاحب گاؤں کے ایک بہت بڑے خان تھے لیکن اُن میں خانیت کے غرور و نخوت کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ نہایت منکسر المزاج، خدا پرست، متقی اور پرہیز گار انسان تھے۔ وہ ظالم کے بمقابلہ مظلوم کے حمایتی تھے۔ فراخ دِلی اور رحم و کرم اُن کی فطرت کا خاصہ تھا۔ کوئی اُن کا بُرا بھی کرتا تو بدلہ چکانے کے اہل ہونے کے باوجود وہ درگزر کرتے، بُردباری سے کام لیتے اور ہمیشہ بُرائی کا جواب بھلائی سے دیتے۔''(۳)

اُس زمانے کے دستور کے مطابق آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں کی مسجد سے حاصل کی۔ قرآن پاک کا ناظرہ کیا اور پھر پشاور کے مشن ہائی سکول سے میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ اوائل زندگی میں اُنہیں فوجی زندگی سے لگاؤ تھا کیونکہ سپاہیانہ ٹھاٹ باٹ، نظم و ضبط اور قابل رشک زندگی سے دیگر نوجوانوں کی طرح آپ بھی بڑے متاثر ہوئے۔ دسویں جماعت کے بعد اُنہیں انڈین آرمی میں ''ڈائریکٹ کمیشن'' مل گیا لیکن اِس دوران ایک دو واقعات نے اُن کی آنکھیں کھولیں اور اس نے فوج سے بدظن ہو کر کمیشن کو ٹھکرا دیا۔ قدرت اُن سے عظیم الشان کام لینا چاہتی تھی شاید اِس لیے وہ فوج میں بھرتی ہوتے ہوتے رِہ گئے۔ پھر برطانیہ جا کر انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ کیا لیکن ماں نے اُنہیں اِس لیے اجازت نہ دی کہ اُن کا بڑا بھائی ڈاکٹر خان پہلے ہی سے میڈیکل کی تعلیم کے لیے ولایت میں تھا۔ البتہ علی گڑھ یونیورسٹی میں آپ نے کچھ عرصہ گزارا تاہم وہاں بھی اپنی تعلیم کی تکمیل نہیں کر سکا۔

سیاست میں قدم رکھنے سے پہلے '' باچا خان'' نے رفاہی کاموں اور خدمت خلق کا آغاز کر لیا تھا۔ وہ رفاہی کاموں کی طرف راغب ہونے کو اپنے عیسائی مشینری اُستادوں کی رہین منت سمجھتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

> ''میری تعلیم نے مجھ میں ملک و ملت سے پیار و محبت اور خدمت کا جذبہ پیدا کیا تھا۔
> اِس مسئلے پر جتنا بھی غور کیا، میں اِس نتیجے پر پہنچا کہ میرے اندر جو حب الوطنی کا
> جذبہ پیدا ہوا، اِس کے لئے بھی تعریف و توصیف کا حق میرے اُستادوں کو پہنچتا ہے
> جن سے میں متاثر اور فیضیاب ہوا تھا۔''(۴)

خدمت خلق کے آغاز کے ساتھ ہی اُس نے اپنے علاقے میں مولوی عبد العزیز اور حاجی صاحب آف ترنگزئی سے مل کر ایک قومی اور اسلامی مدرسہ قائم کیا اور جلد ہی صوبہ بھر میں اِس مدرسے کی شاخیں کھول دیں تاکہ لوگوں کا علم سے شوق پیدا ہو جائے اور وہ انگریزوں اور نام نہاد مولویوں کی چنگل سے آزاد ہو سکیں۔ انگریز سے نفرت اور وطن کی آزادی باچا خان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ ابھی آپ نے باقاعدہ سیاست کا آغاز تو نہیں کیا تھا لیکن جہاں موقع ملتا انگریز حکومت کے خلاف احتجاج ضرور کرتے۔ ۱۹۱۹ء کے روز ولٹ ایکٹ کے خلاف تہکال پشاور میں ایک بہت بڑا مظاہرہ کرنے کے جرم میں پہلی مرتبہ گرفتار کر لیے گئے۔ پہلی گرفتاری کو اِن الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> ''آخر پولیس کو ہمارا پتہ لگ گیا اور مجھے گرفتار کر کے مردان جیل میں ڈال دیا۔
> دوسرے دِن مجھے پولیس کپتان کے سامنے پیش کیا گیا۔ اُس نے حکم دیا کہ مجھے
> بیڑیاں پہنا دی جائیں۔ مجھے پھر جیل خانے لے جایا گیا لیکن سارے جیل میں

میرے پاؤں کے ماپ کی بیڑیاں نہ ملیں۔ وہ بیڑیاں جو زبردستی میرے پاؤں میں پہنادی گئی تھیں، میرے پاؤں کو ریتنے لگیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میرے پاؤں خون سے لت پت ہو گئے اور جِلد بالکل اُدھڑ گئی۔"(۵)

رہائی کے بعد آپ نے "انجمن اصلاح الافاغنہ" کا قیام عمل میں لایا اور پٹھان علاقوں میں سیاسی اور فکری بیداری کی کوششوں کا آغاز کیا۔ ابھی آپ نے عملی سیاست میں قدم نہیں رکھا تھا صرف لوگوں کی اصلاح اور رفاہی کام کرتے تھے۔ آپ نے افغانستان اور اپنے صوبے کے طول و عرض کے دَورے شروع کیے تاکہ لوگوں کو انگریزوں کے خلاف اُٹھایا جا سکے۔ ۱۹۲۸ء میں پشتو زبان میں پشتون اخبار کا اجراءاِس سلسلے کی ایک کڑی تھی۔

خان عبدالغفار خان نے سیاست اور انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کی جدوجہد تو ۱۹۱۴ء اور ۱۹۱۹ء سے شروع کی تھی لیکن نہ تو اپنی الگ کوئی سیاسی جماعت بنائی تھی اور نہ کسی سیاسی پارٹی میں شمولیت اختیار کی تھی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ تحریک خلافت اور علی برادران سے قریبی تعلق ہونے کے باوجود تحریک خلافت کی بنیادی رُکنیت بھی حاصل نہیں کی تھی۔ باچاخان کا سب سے منفرد کارنامہ "خدائی خدمتگار تحریک" کی تشکیل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اِس تحریک کو پورے صوبے کے ایک ایک گاؤں تک پھیلانے اور پشتونوں میں اِس تحریک کے ذریعے سیاسی شعور بیدار کرنے کی داستان دیومالائی داستان معلوم ہوتی ہے۔ خدائی خدمتگار تحریک خان عبدالغفار خان کی فلاحی کام کرنے، انتظامی صلاحیتوں اور پشتون دوستی کا مظہر ہے۔ پٹھانوں کو عدم تشدد کا سبق دینے اور مخلوقِ خدا کی بے لوث خدمت کرنے کی روایت کو آپ نے خدائی خدمتگار تحریک کے ذریعے رواج دیا۔ آج مذکورہ تحریک کی تعریف اور تنقید کرنے والے قسم قسم کی دلیلیں پیش کرتے ہیں۔ تاہم خود باچاخان اِس تحریک کے اغراض و مقاصد اِس طرح بیان کرتے ہیں:

"بڑے سوچ بچار اور صلاح و مشورے کے بعد ۱۹۲۹ء میں ہم نے یہ جماعت بنائی اور اسے ہم نے خدائی خدمتگار کا نام دیا۔ یہ نام بھی ہم نے اِس جماعت کا ایک خاص غرض سے رکھا تھا کیونکہ ہم پٹھانوں میں خدا کے واسطے اپنی قوم و ملت کا خیال اور جذبہ پیدا کرنا چاہتے تھے۔ دوسری بات یہ تھی کہ پٹھانوں میں تشدد بھرا ہوا تھا اور اُن کا یہ تشدد غیروں کے لیے نہیں بلکہ اپنی قوم اور اپنے بھائی بندوں کے لیے تھا۔۔۔ پٹھانوں میں پارٹی بازیاں تھیں، رجعت پسندانہ رسوم و رواج نے اُن کو تباہ و برباد کیا ہوا تھا۔ اُن میں انتقام کا جذبہ بھی غیر معمولی تھا اور اُن میں اچھی عادات اور اخلاق کا بھی فقدان تھا۔"(٦)

مراد یہ کہ خدائی خدمتگار (اپنی سُرخ یونیفارم کی وجہ سے عرف عام میں اِسے سُرخ پوش تحریک بھی کہتے ہیں) تحریک کا مقصد سیاسی نہیں رفاہی تھا یہ بات اِس کے منشور اور حلف سے بھی واضح ہے۔ خدائی خدمتگار تحریک کا ممبر بننے کے لیے یہ حلف لیناپڑتا تھا :

> "(۱) میں مخلوقِ خدا کی بے لوث خدمت کروں گا۔ (۲) میں تشدد نہیں کروں گا۔ (۳) انتقام نہیں لوں گا۔ (۴) باہمی پھوٹ اور خانہ جنگی سے دُور رہوں گا۔ (۵)سادہ زندگی بسر کروں گا۔ (۶) ہر پختون کو اپنا بھائی اور دوست سمجھوں گا۔"(۷)

خان عبدالغفار خان کو ہمیشہ کٹر کانگریسی، ہندو نواز، غدار اور سرحدی گاندھی جیسے غلط القابات دیئے گئے۔ اُنہیں بائیں بازو کا سیاستدان اور مسلم لیگ مخالف شخص سمجھا گیا۔ اِس میں کچھ سچائی بھی ہوگی لیکن مذکورہ آپ بیتی پڑھ کر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ آپ نے سب سے پہلے مسلم لیگ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھااور مسلم لیگ میں شمولیت کی خواہش ظاہر کی تھی لیکن لیگی قیادت نے اُنہیں اپنے قریب نہ آنے دیا۔ مجبوراً آپ کانگریس کے ساتھ مل گئے اور کانگریس پارٹی نے اُنہیں وہ مقام دیا جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اِس زاویے سے دیکھا جائے تو مسلم لیگ یا دیگر لوگوں کی طرف سے آپ پر غداری کا الزام لگانا سراسر ناانصافی ہے۔ اپنے صوبے میں آپ کا کافی اثر ورسوخ تھا۔ رفاہی کاموں اور خدائی خدمتگار تحریک کے ذریعے آپ سرحد کے بڑے حصے میں مقبول ہو گئے تھے اِس لیے کانگریس پارٹی میں آپ کو دِل سے خوش آمدید کہا گیا۔ مسلم لیگ سے مایوسی اور کانگریس میں شمولیت کا فیصلہ اُن کے الفاظ میں ملاحظہ ہو :

> "ہمارے بعض ساتھی مجھ سے ملنے گجرات جیل آئے تھے۔ میں نے اُنہیں لاہور، دہلی اور شملہ جا کر اُن مسلمان مسلم لیگی بھائیوں کے پاس بھیجا تا کہ اُنہیں ہمارے حال سے آگاہ کر دیں اور اُنہیں کہیں کہ وہ ہماری امداد کریں لیکن مسلم لیگی لیڈر ہماری امداد کے لئے تیار نہ ہوئے کیونکہ ہماری لڑائی انگریز سے تھی اور وہ انگریز کے ساتھ لوہا (پنگا) لینے کے قابل نہ تھے۔ اُنہیں تو انگریز نے ہندوؤں سے لڑانے بھڑانے کے لئے محفوظ رکھا ہوا تھا (تیار کیا ہوا تھا)۔"(۸)

چنانچہ اُنہوں نے مجبوراً کانگریس میں شمولیت اختیار کی۔

زمانہ قدیم سے پٹھانوں کا خطہ مختلف گروہوں میں بٹا ہوا تھا۔ انگریز نے اِس کو آٹھ بڑے حصوں میں تقسیم کر دیا جو

آگے مزید ذیلی گروہوں میں تقسیم در تقسیم ہوا۔ پشتونوں کے مختلف گروہ آپس میں دست و گریبان تھے۔ پشتونوں کی تاریخ میں دو وافراد ایسے ہیں جنھوں نے انھیں ایک جھنڈے تلے جمع کیا۔ پہلے شخص خوشحال خان خٹک اور دوسرے خان عبدالغفار خان تھے۔ پشتون قوم پرستانہ نظریات کے تحت آپ نے وطن پرستی کی بنیاد پر پٹھانوں کو ایک جگہ جمع کرنے کا فیصلہ کیا۔ صوبہ سرحد اور افغانستان کے بعض علاقوں میں لوگوں کو منظم کرنے میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی رہے۔ اپنے سیاسی خیالات، قوم پرستانہ افکار اور اپنے منشور کا دفاع اپنی آپ بیتی میں اِن الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''میرا اہتمام تر مجادلہ آج اِس ظلم کے خلاف ہے۔ آخر اِس قوم نے کون سا گناہ کیا ہے کہ اِسے تاریخ سے مٹایا جا رہا ہے۔ میں بلوچستان سے چترال تک پٹھانوں کے بکھرے ہوئے قبائل کو رشتہ اتحاد میں منسلک کرنا چاہتا ہوں تاکہ اِن میں ایک بھائی چارہ پیدا ہو جائے۔ اِن کا غم والم ایک دوسرے کا مشترکہ درد و رنج بن جائے اور انسانیت کی خدمت کے لیے یہ غیور قوم پشتون دنیا میں اپنا قومی رول ادا کر سکے۔''(۹)

آپ پر منجملہ دیگر الزامات کے ایک الزام یہ بھی لگایا جاتا ہے کہ آپ نے آزاد پختونستان کی بات کی ہے۔ آپ اور آپ کے بیٹے ولی خان نے یہ نعرہ لگایا کہ صوبہ سرحد اور افغانستان کے پٹھان علاقوں پر مشتمل ایک آزاد، الگ اور خود مختار ملک بننا چاہیئے۔ تقسیم ہند سے پہلے اور بعد میں بھی یہ آپ کا سر فہرست مطالبہ رہا۔ مصنف آزاد پختونستان کی خواہش، ضرورت اور تشکیل کے بارے میں کہتے ہیں:

> ''میری دوسری آرزو یہ ہے کہ اِن شریف، بہادر، وطن دوست، غیرتی اور ننگ و ناموس کے پروانوں یعنی پٹھانوں کو غیروں کے ظلم و استبداد سے بچالوں اور اُن کے لئے ایک ایسی آزاد دنیا دوں جہاں وہ ہنستے کھیلتے ہوئے آسودہ زندگی بسر کر سکیں۔''(۱۰)

باچا خان نے اپنی آپ بیتی میں سکندر مرزا کی انگریز سے وفاداری، گاندھی جی سے گھریلو تعلقات، صوبہ سرحد میں ریفرنڈم اور تقسیم ہند کے بعض حقائق کے بارے میں بھی تفصیل سے لکھا ہے۔

انگریز کے خلاف جن اکابرین نے سخت جدوجہد کی، خان عبدالغفار خان اُس ہراول دستے کے سالار نظر آتے ہیں۔ حیران کن بات یہ ہے کہ آزادی حاصل کرنے کے بعد بھی آپ کے مصائب اور مشکلات میں کمی نہیں آئی بلکہ سکندر مرزا اور

ایوب خان سے لے کر ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت تک آپ بارہا پابند سلاسل رہے۔ وہ انگریز حکمرانوں سے زیادہ اپنے پاکستانی حکمرانوں کے رویے، منفی سلوک اور ظلم وستم سے خاصے برگشتہ نظر آتے ہیں چنانچہ آزادی کے بعد اپنے تکالیف اور مشکلات کا تذکرہ کچھ اِس طرح سے کرتے ہیں:

''اِس طرح پندرہ برس تک مجھے پاکستانی جیلوں میں رہنا پڑا (یہ ۱۹۶۵ء تک کا ذکر ہے۔ بھٹو اور یحییٰ کے زمانے کی قید کو ملا کر اٹھارہ یا بیس سال کا عرصہ بنتا ہے)۔ جونہی پاکستان کی حکومت وجود میں آئی تو بغیر کسی تقصیر کے ہم پر ایسے ایسے مظالم توڑے گئے جو فرنگیوں کے عہد حکومت میں بھی ہم پر نہ رکھے گئے تھے۔'' (۱۱)

انگریز کے زمانے میں جیل خانے جہنم سے کم نہیں تھے۔ سیاسی قیدیوں کو آج کل جیل میں اے کلاس دی جاتی ہے لیکن اُس وقت سیاسی قیدیوں کو بدترین تشدد کا نشانہ بنایا جاتا تھا جس سے بڑے بڑے سورماؤں کا پِتا پانی ہو جاتا تھا۔ عبدالغفار خان نے بڑی دلیری سے اِن جیل خانوں کا مقابلہ کیا اور ثابت قدمی دِکھائی۔ اپنی آپ بیتی میں بڑی تفصیل سے اِن بندی خانوں کے ظالمانہ حالات کا ذکر کیا ہے۔ زندان میں انگریز کے ایسے ہی ایک واقعے کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''انگریزوں نے پٹھانوں کی شلواریں اُتار دیں، پٹھانوں کو ننگا کیا، چارسدہ کی پکٹنگ (خدائی خدمتگاروں کے لیے بنائی گئیں مخصوص جیلیں) میں خدائی خدمتگاروں کے تمام کپڑے اُتار لیے اور اُن کے خایوں یعنی فوطوں (عضو تناسل) میں پھندے ڈالے گئے۔ پھندوں اور رسیوں کے ذریعے خدائی خدمتگاروں کے خایوں کو کھینچا جاتا تھا۔ جب وہ بیہوش ہو جاتے تو اُنہیں ٹٹی سے بھرے ہوئے ناند میں پھینک دیتے تھے اور اس میں اُنہیں غوطے دیتے تھے۔'' (۱۲)

آپ اور آپ کے ساتھی نہ صرف ڈٹے رہے بلکہ جیل کے قوانین کا بھی احترام کیا۔ چھوٹے چھوٹے واقعات سے سبق حاصل کرنا آپ کا وطیرہ تھا۔ آپ نے اوائل عمر میں اندازہ لگایا تھا کہ انگریز قابل اعتماد اور قابل بھروسہ قوم نہیں پھر عمر بھر اِس پر قائم رہے۔ آپ بیتی کے کئی واقعات سے آپ کی اُصول پسندی، درویشی، سچائی، قانون کی پاسداری اور جفاکشی کا پتہ چلتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سیاست کو صحیح معنوں میں خدمت اور عبادت تصور کیا جاتا تھا۔ نیز سیاست ابھی منافقت، جھوٹ اور کرپشن سے آلودہ نہیں ہوئی تھی۔

جب ہم مذکورہ آپ بیتی کا فنی تجزیہ کرتے ہیں تو ہمیں اِس آپ بیتی کے ترجمے میں کافی نقائص نظر آتے ہیں۔ مترجم

پروفیسر یار محمد مغموم کو اُردو روزمرہ اور محاورہ پر عبور حاصل نہیں۔ وہ اُردو زبان کے مزاج سے آگاہ ہیں اور نہ قواعد و اصطلاحات کو زیادہ جانتے ہیں۔ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنے کے لیے چار طریقے استعمال کیے جاتے ہیں۔

(۱) لفظی ترجمہ (۲) بامحاورہ ترجمہ (۳) تشریحی و توضیحی ترجمہ (۴) جزوی یا سرسری ترجمہ۔

اِس آپ بیتی میں مترجم نے کہیں کہیں بامحاورہ اور زیادہ تر لفظی ترجمے کا سہارا لیا ہے۔ لفظی ترجمے میں اُن سے کئی غلطیاں بھی سرزد ہوئیں ہیں۔اس آپ بیتی کی لسانی خصوصیات درج زیل ہیں:

۱۔ مترجم نے رواں ترجمہ نہیں کیا۔ چھوٹے جملوں میں تو پھر بھی گزارا ہے لیکن طویل اقتباسات لکھتے ہوئے خیال میں رکاوٹ پیدا ہوئی ہے۔ علاوہ ازیں مترجم مصنف کا مافی الضمیر بھی کھل کر بیان کرنے سے قاصر ہے مثلاً مولانا محمد علی جوہر کے ساتھ عبدالغفار خان کی ہونے والی گفتگو بالکل پلے نہیں پڑتی کہ آخر اِس میں مصنف کہنا کیا چاہتے ہیں۔(۱۳)

۲۔ اِس آپ بیتی میں مترجم نے پشتو سے اُردو میں براہِ راست ترجمہ کیا ہے۔ کئی موقعوں پر ترجمہ بُری طرح کھٹکتا ہے۔ اِتنے اہم خود نوشت کے اُردو ترجمے نے مزہ خراب کر دیا ہے۔ باذوق قاری یہ کتاب پڑھتے ہوئے بار بار اُلجھن میں پڑ جاتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

> ''پولیس ہمارے لیے بیٹھی ہوئی تھی''، ''عباس کے نام پر آواز آئی''، ''فرنگی کا ایک سینگ ٹوٹ گیا ہے پختونو اُٹھو''، ''آؤ باہر آکر اپنے پاؤں آزاد کرنے کے لیے چلیں''۔(۱۴)

اُردو عبارت لکھتے لکھتے بعض جگہوں پر صرف ترجمہ کرنے کی زحمت کی ہے۔ یہ نہیں دیکھا کہ یہ فقرے اور ضمائر اُردو کے مزاج سے مطابقت رکھتے یا نہیں، ملاحظہ ہوں:

> ''ایک دِن آیا کہ ڈاکٹر خان صاحب جب سنٹرل اسمبلی کے ممبر منتخب ہو گئے تب اُنہیں صوبہ سرحد جانے کی اجازت مل گئی۔''(۱۵)

یا مثلاً یہ اقتباس:

> ''یہ آدمی (شیخ محبوب علی) انگریزوں کا بہت بڑا بے ضمیر ایجنٹ تھا۔اُس پر کمینہ پن ختم تھا۔اُس کا نام شیخ محبوب علی تھا جس کے ہاتھوں ہماری قوم نے بڑی تکالیف اور روحانی عذاب اُٹھائے ہیں۔''(۱۶)

۳۔ مترجم نے کتاب میں اکثر جگہوں پر پشتو محاورات کا براہِ راست لفظی تراجم کیے ہیں حالانکہ اُن کے متبادل محاورات

اُردو میں موجود تھے:

''کانگریس ورکنگ کمیٹی نے بھی ہمارے لیے کوئی غیرت نہ کھائی''، ''یہ زبانیں بھی پہلے پشتو زبان کی طرح بچھڑی ہوئی تھیں''، ''رات کافی گزر چکی تھی، یکایک عباس کے نام پر آواز آئی''، ''جب خدا اُنہیں نہیں سمجھا سکا تو میں کیا سمجھاتا۔''(۱۷)

۴۔ حقیقت یہ ہے کہ اِس آپ بیتی کے اُردو ترجمے نے اُردو کو کوئی خوبصورت اور شیریں الفاظ، محاورات اور تراکیب بھی دیئے ہیں۔ مترجم نے دانستہ اور غیر دانستہ طور پر پشتو کے الفاظ و تراکیب کا براہِ راست ترجمہ کیا ہے جس سے کئی نئے الفاظ اُردو میں آ گئے ہیں۔ ہر زبان کی ترقی اور بقا کا انحصار اِس بات پر ہوتا ہے کہ وہ دیگر زبانوں سے خیالات، ذخیرہ الفاظ، محاورات اور ضرب الامثال کس شرح اور کس طریقے سے حاصل کرتی ہے۔ اگر اُردو زبان انگریزی، فارسی اور عربی سے الفاظ اور خیالات لے سکتی ہے تو پشتو سے کیوں نہیں؟ ہماری علاقائی زبانوں کے ادب سے بھی اُردو میں تراجم ہونے چاہیئے۔ اِس سے نہ صرف اُردو ادب ثروت مند ہو گا بلکہ علاقائی زبانوں کے ساتھ اِس کے میل ملاپ کے نئے در وا ہوں گے۔ اگر انگریزی زبان میں دیگر زبانوں سے نئی اصطلاحات، لہجے اور مختلف بولیاں اس میں شامل ہو کر اِس زبان کو توانائی بخش سکتی ہیں تو ہمیں ہماری زبان کے مختلف لہجوں پر ناک بھوں نہیں چڑھانا چاہیئے۔ خان عبدالغفار خان کی آپ بیتی کے پشتو سے اُردو ترجمے نے اُردو کو درج ذیل نئے الفاظ، محاورات، مرکبات اور اصطلاحات دیے ہیں:

''انگریز تو کالا سانپ ہے مجھے اطمینان سے نیند لینے نہیں دے گا''۔(۱۸)

کالا سانپ ہونا، پشتو محاورہ ہے۔ خطرناک آدمی کے لیے استعمال کرتے ہیں یہاں یہ موقع کی مناسبت سے بہت بھلا معلوم ہوتا ہے۔

''ایک آدمی جو دریا میں ڈوب رہا ہو، بہا جا رہا ہو وہ تو ہر ایک بوٹے پر ہاتھ ڈالتا ہے۔''(۱۹)

یہ بھی پشتو ترکیب ہے۔ اُردو میں اگر اِس کا رواج ہو جائے تو اُردو زبان کے لیے مفید ہو گا۔

''فرنگی کا ایک سینگ تو ٹوٹ گیا ہے، پختونو اُٹھو! کمر کس لو اور اِس کا دوسرا سینگ بھی توڑ دو۔''(۲۰)

یا مثلاً:

''انگریز عورتیں بھی گھوم رہی تھیں اور لوگوں سے کہہ رہی تھیں کہ ہم آپ کے

پاس آئی ہیں ہمیں اپنا دوپٹہ دیجئے اور ہمارا دوپٹہ ووٹ ہے۔"(۲۱)

دوپٹہ دینا پشتو اصطلاح ہے۔ پشتو میں اگر کوئی عورت کسی کو کہہ دے کہ میں نے آپ کو اپنا دوپٹہ دیا تو یہ مرتے دم تک وفاداری کی علامت ہے۔ قول دینے یا وعدہ کرنے کے مفہوم میں بھی یہ اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔

"میں نے پر پھل بابو سے کہا کہ یہاں کے لوگ مردے نہیں ہیں مگر اُنہیں زندہ کرنے والا کوئی نہیں ہے۔"(۲۲)

یہاں بھی پشتو کے ایک ضرب المثل کا براہِ راست ترجمہ کرکے عبارت کو خوبصورت اور ترسیل خیالات کو آسان بنایا ہے۔ ہمارے ہاں نام نہاد مولویوں اور مذہب کے ٹھیکیداروں کو حقارت سے دیکھا جاتا ہے اور اُن کے لیے پشتو میں عجیب الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ مترجم نے وہی الفاظ جوں کے توں لکھے ہیں:

"ملانڑوں، ملانٹے، مُلا جان، مُلا گائے۔(۲۳)

۵۔ آپ بیتی کے اصل متن یعنی پشتو متن میں مصنف نے کثرت سے فارسی کے الفاظ، ضرب الامثال اور اشعار دیئے ہیں جس سے خان عبدالغفار خان کی فارسی پر قدرت ظاہر ہوتی ہے۔ مترجم نے بھی ترجمے میں اکثر وہی الفاظ، محاورات اور کہاوتیں دُہرائی ہیں۔

"خربوزہ را خربوزہ دیدہ رنگ مے گیرد"، "قہر درویش برجان درویش"، "بلائے آمد ولے بخیر بگزشت"۔(۲۴)

باچا خان نے اپنی آپ بیتی میں فارسی اشعار کا بھی برمحل استعمال کیا ہے جو ترجمہ کرتے وقت مترجم نے ویسے کے ویسے تحریر کیے ہیں:

"تو ہم شب را بسر کرد برائے شمع کم فرصت
گرفتم سوختی پروانہ آتش چہ جائے را" (۲۵)

بعض جگہوں پر خان عبدالغفار خان نے طویل اقتباسات کا کام فارسی کے چھوٹے چھوٹے مصرعوں سے لیا ہے۔

بریں عقل و دانش بباید گریست (۲۶)

۶۔ اِس آپ بیتی کا پشتو سے اُردو میں ترجمہ کرتے وقت مترجم نے کئی ہندی الفاظ کو بھی استعمال کیا ہے۔ مثلاً دھرم پتنی، پرارتھنا، شُبد، تان چڑھانا، پریم، سیوا گرام، ہریجن، بھرشٹ، گیان شیان، نروان وغیرہ۔

مختصر یہ کہ ۲۰۰ صفحات پر مشتمل یہ آپ بیتی برصغیر پاک وہند کے بلند پایہ سیاسی رہنما کی شب وروز کی داستان ہے

جس نے بڑی سچائی سے اپنے حالات زندگی، انگریزوں کے ظلم و ستم، ہندوستانیوں کی بدحالی، غربت، جہالت، ظلم و جبر، بے روزگاری اور پشتون قبائل کے درمیان جنگ و جدل غرض اپنے عہد کے تمام اہم واقعات کو محفوظ کر لیا ہے۔ ایک زاویے سے دیکھا جائے تو یہ آپ بیتی تشنہ سی لگتی ہے۔ مصنف نے بہت زیادہ اختصار سے کام لیا ہے۔ وہ مقامات جہاں تفصیل از حد ضروری تھی، وہاں بھی وضاحت نہیں دی ہے۔ اپنی غیر سیاسی زندگی کے بارے میں زیادہ تر واقعات اِس آپ بیتی میں شامل نہیں نیز واقعات میں تسلسل موجود نہیں۔ خدائی خدمتگار تحریک اور آزاد سکولوں کا قیام آپ کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اِس کا طویل پس منظر اور معاشرے پر اثرات کا بیان ضروری تھا جو نہیں دیا۔ انگریز دشمنی اور پنجاب سے شدید نفرت اِس آپ بیتی کے ایک ایک صفحے پر نقش ہے۔ قیام پاکستان کے بعد پاکستان کے ساتھ پُر خلوص محبت وقت کی اہم ضرورت تھی۔ دیگر لوگوں کی طرح جنہوں نے قیام پاکستان کی مخالفت کی تھی لیکن بعد میں اِس ملک کے سچے خادم بنے، آپ بھی ایسا کر سکتے تھے لیکن آپ نے آزاد پختونستان کا نعرہ لگا کر ملک دشمن عناصر کو خوش کیا۔ اِس بات کا آپ کے پاس کوئی جواز نہیں حالانکہ اگر آپ چاہتے تو اپنی آپ بیتی میں اِس عنوان پر بھی لب کشائی کر سکتے تھے۔ آپ کے وطن مخالف جذبات اِتنے شدید تھے کہ اِس ملک میں آپ نے دفن ہونا بھی گوارا نہیں کیا اور افغانستان کے شہر جلال آباد میں دفن ہوئے۔ پاکستان دشمنی کے جذبات آخر دم تک اُن کے ساتھ رہے۔ مذکورہ آپ بیتی کا آخری اقتباس اس لحاظ سے قابلِ غور ہے:

> ''میرے نزدیک پاکستان سے دوستی ممکن ہی نہیں کیونکہ پاکستان کی بنیاد نفرت پر رکھی گئی ہے۔ پاکستان کی گھٹی میں نفرت، بغض، حسد، کینہ اور دشمنی کے جذبات بھرے پڑے ہیں۔ پاکستان کی تشکیل انگریز کی مرہونِ منت ہے۔ پاکستان انگریز نے اِس لیے بنایا کہ زندگی بھر کے لیے ہندو اور مسلمانوں میں فسادات ہوتے رہیں۔''(۲۷)

تاہم اب حالات بہت آگے جا چکے ہیں۔ خان عبدالغفار خان نے آخر دم تک پاکستان تسلیم نہیں کیا تھا لیکن اُس کے پوتے اور پڑپوتے اور اُس کی پارٹی نہ صرف یہاں حکومتوں میں شریک ہوتی ہے بلکہ پاکستان کی بقا کی جنگ بھی لڑ رہی ہے۔ حالیہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں سب سے زیادہ قربانیاں عوامی نیشنل پارٹی نے دیں۔ یہ تاریخ کا ایک حسین اتفاق ہے۔

باچا خان کی خدائی خدمتگار تحریک سے متاثر ہو کر دنیا بھر میں اِس تحریک سے ملتے جلتے تحریکوں کا سلسلہ شروع ہوا جو آج بھی کسی نہ کسی شکل میں جاری ہے۔ حالیہ دِنوں میں بھارت میں ''سب کا گھر'' کے نام سے ایک سنٹر قائم کیا گیا ہے جس میں تمام مذاہب کے پیروکار آکر اپنے دُکھ درد اور روحانی و جسمانی پریشانیوں کا علاج کرتے ہیں۔ اِس تنظیم کے چلانے

والوں نےاِن سنٹروں میں ''باچاخان'' کے پوسٹر زآویزاں کیے ہیں اور خدائی خدمتگار کا منشور لکھا ہے۔ ''سب کا گھر'' کی روح رواں ایک سکھ خاتون ہیں جو یہ اعتراف کرتی ہیں کہ اُس نے ''باچاخان'' کے فکر اور فلسفے سے متاثر ہو کر مذکورہ تحریک کا آغاز کیا ہے۔

آخر میں ہم خان عبدالغفار خان کے چند اقوال تحریر کرتے ہیں جس سے اُس کی شخصیت، سوچ اور فلسفے کو سمجھنے میں مدد ملے گی (باچاخان کے پیروکار خان صاحب کی سوچ اور فلسفے کے لیے لفظ باچاخانی استعمال کرتے ہیں)

۱۔ دوسروں کی خدمت کرنے میں کسی کو اختلاف نہیں۔ اختلاف ہمیشہ خود غرضی سے پیدا ہوتا ہے۔

۲۔ جس قوم کو اپنی زبان بے وقعت اور بے توقیر لگے وہ قوم بے توقیر ہو جاتی ہے اور جو قوم اپنی زبان بُھلا دیتی ہے تاریخ بھی اُس قوم کو بھول جاتی ہے۔

۳۔ علم، شعور اور آگاہی روشنی ہے۔

۴۔ جو فرد یا قوم سادہ زندگی بسر کرنے پر آتی ہے وہ کبھی ذلیل و رسوا نہیں ہوتی۔

۵۔ بڑاپن سادہ زندگی میں پوشیدہ ہے (سادہ زندگی بسر کرنے سے ہی انسان بڑا بنتا ہے)۔

۶۔ ہمارے لوگوں میں یہ ایک بڑی کمزوری ہے کہ ہم دوسروں کے عیب ڈھونڈتے ہیں اور اپنی عیبوں پر غور نہیں کرتے۔

۷۔ جس جگہ انصاف ہو نہ قاعدہ قانون وہاں بحث کرنا فضول ہے۔

۸ ۔ ہر آدمی کی عزت اُس کے اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے۔

۹۔ اپنی زبان کے بغیر دُنیا کی کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی۔

۱۰ ۔ انقلاب وہ سیلاب ہے جو سوئے ہوئے لوگوں کو بہالے جاتا ہے اور جاگے ہوئے اِس سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔

۱۱۔ وہ قومیں ہمیشہ منزل تک پہنچتی ہیں جو باتیں کم اور عمل زیادہ کرتی ہیں۔

۱۲۔ بزدل قوم اِس قابل نہیں کہ وہ زندہ رہے۔ یہ دُنیا بزدلوں کے لیے نہیں بنی۔

۱۳۔ انسان کیا عجیب مخلوق ہے جب ہمت ہار جائے تو حیلے بہانوں پہ اُتر آتی ہے۔

۱۴۔ افسوس کہ پٹھانوں کا گلہ بان اور گڈریا نہیں اِس لیے تو اِسے بھیڑیے اُٹھا کر کھا جاتے ہیں۔

۱۵۔ جو پرندہ اپنی ڈار سے الگ ہو جائے وہ گم ہو جاتی ہے۔

۱۶۔ جب تک عورتیں قوم کی خدمت کے لیے آگے نہیں آتیں کوئی قوم اُوپر نہیں جا سکتی۔

۱۷۔ ہر مصیبت کے وقت صبر کیا کرو۔

۱۸۔ جو لوگ پیسے لے کر ووٹ فروخت کرتے ہیں اُن سے ووٹ ڈالنے کا حق واپس لے لینا چاہیئے۔

۱۹۔ پٹھان بِن بلائے اپنے گھر میں بھی کھانا نہیں کھاتا۔

۲۰۔ جس کے دِل میں اللہ تعالیٰ کا خوف ہو اُس کے دِل میں کسی اور کا خوف کیسے آسکتا ہے۔

۲۔ جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی (محمد ایوب خان)

یہ آپ بیتی پاکستان کے سابق صدر، پہلے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹر، پاکستان کے پہلے مسلمان کمانڈر انچیف فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کی خود نوشت ہے جس نے بڑی حد تک سچائی اور صاف گوئی سے اپنے زمانے کے حالات و واقعات تحریر کیے ہیں۔ قیام پاکستان سے پہلے کا زمانہ، انگریزوں کے اقتدار کے آخری شب و روز، دوسری جنگ عظیم، ہندوستان کا بٹوارہ، پاکستان کے ابتدائی ماہ و سال، سیاستدانوں کے اختلافات، نئے ملک کے اندرونی اور بیرونی خطرات غرض ۱۹۴۰ء سے ۱۹۵۵ء تک کا زمانہ متحدہ ہندوستان اور آزاد مملکت پاکستان کا پُر آشوب زمانہ ہے۔ ایوب خان اِس پورے منظر نامے کا نہ صرف عینی شاہد ہیں بلکہ بہت سارے واقعات میں بلواسطہ یا بلاواسطہ شریک بھی رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایوب خان کی آپ بیتی کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ قیام پاکستان سے پہلے کا ایک عشرہ اور قیام پاکستان کے بعد کے ایک عشرے کی تقسیم کی تباہ کاریوں، مہاجرت، معاشرت، اقتصادیات، لگاتار سیاسی تبدیلیوں اور سیاستدانوں کی خود غرضانہ پالیسیوں کی بدولت خاص تاریخی اہمیت ہے۔ اس لیے اِس عرصے میں لکھی گئی آپ بیتیوں کی بھی خصوصی اہمیت ہے۔ چنانچہ ''جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی''، ''شہاب نامہ''، ''گوہر گزشت'' اور اُس زمانے کے دیگر سیاسی اور غیر سیاسی آپ بیتیوں سے لوگ حوالہ جات ثبوت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ مذکورہ آپ بیتی مصنف کی پیدائش سے ۲ جنوری ۱۹۶۵ء کے صدارتی انتخابات تک کے زمانے پر مشتمل ہے۔ اصل آپ بیتی دو سو باسٹھ صفحات کی ہے۔ صفحہ نمبر ۲۶۳ سے صفحہ ۲۹۶ تک کے ۳۳ صفحات مختلف ضمیموں پر مشتمل ہیں جبکہ آخری دس صفحات میں اپنی اور خاندان کی چند یادگار تصاویر شائع کی ہیں۔ اِس کا اُردو ترجمہ غلام عباس نے ''جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی'' کیا ہے۔

ایوب خان کا تعلق پٹھانوں کی ایک شاخ ترین قبیلے سے ہے جو بلوچستان کے علاقے پشین سے آکر ہزارہ کے علاقے میں آباد ہوئے۔ اِس قبیلے کو رنجیت سنگھ اور انگریزوں کے خلاف جنگیں لڑنے کی وجہ سے شہرت ملی۔ ترین قبیلے کے ایک معزز شخص رسالدار میجر داد خان کے ہاں ضلع ہزارہ کے ایک گاؤں ریحانہ میں اُن کی ولادت ہوئی۔ اپنی پیدائش کا ذکر قدرے تفصیل سے کرتے ہوئے محمد ایوب خان لکھتے ہیں:

> ''میں ۱۴ مئی ۱۹۰۷ء کو ریحانہ نامی گاؤں میں پیدا ہوا تھا۔ یہ رمضان کے مہینے کا آخری دِن تھا اور گھر کے لوگ عیدالفطر کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ میرے والد کے چار بچے پہلی بیوی سے تھے جو فوت ہو چکی تھی۔ میں اُن کی دوسری بیوی سے پہلی اولاد تھا۔'' (۲۸)

آپ نے اپنے بچپن کے واقعات اور سکول کے ابتدائی زمانے کے حالات خوب تفصیل اور مزے لے لے کر بیان کیے ہیں۔ اُس زمانے کے اکثر پٹھان گھرانوں کی طرح آپ کا گھریلو ماحول بھی دیندارانہ تھا۔ آپ نے ایک مذہبی ماحول میں آنکھ کھولی۔ اُن کی تربیت اور پرورش میں ماں کا بڑا حصہ تھا لیکن جس شخص نے اُن کی شخصیت پر بہت زیادہ اثرات چھوڑے اور مستقبل کی ذمہ داریوں کے لیے تیار کیا وہ آپ کے والد تھے۔ وہ ساری زندگی شعوری اور لاشعوری طور پر اپنے والد کو کاپی کرتے رہے۔ اِس بات کا اقرار وہ اِن الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''میں اپنی والدہ سے بہت مانوس تھا لیکن جس شخص نے میری سیرت، میرے خیالات اور زندگی کے بارے میں میرے نقطہ نظر پر سب سے زیادہ اثر ڈالا وہ میرے والد مرحوم تھے۔ وہ مشہور رسالے ''ہوڈسن ہارس'' میں رسالدار میجر تھے۔ میرے ذہن میں اُن کی جو تصویر بنتی ہے وہ انتہائی شریف، پاکباز اور شفیق دوست کی ہے۔ وہ ذی احساس، ہمدرد اور زوردار انسان تھے۔ اُن کے پاس بیٹھ کر مجھے ہمیشہ بڑی ذہنی آسودگی حاصل ہوتی تھی۔''(۲۹)

تعلیم حاصل کرنے کے لیے اُنہیں دُور دراز کا سفر طے کرنا پڑا۔ انھیں کئی کئی میل پیدل یا گھوڑے پر جانا پڑتا تھا۔ میٹرک کرنے کے بعد ۱۹۲۲ء میں اُن کے والد نے اُنہیں علی گڑھ یونیورسٹی بھیج دیا۔ جہاں وہ ۱۹۲۶ء تک یعنی چار سال رہے۔ بی۔اے کے آخری سال اُنہیں انڈین فوج میں کمیشن ملی اور فوجی تربیت کے لیے ''سینڈ ہرسٹ'' چلے گئے۔ علی گڑھ میں زمانہ طالب علمی کے بارے میں آپ نے زیادہ تفصیل سے نہیں لکھا البتہ اپنی فوجی زندگی کے ابتدائی دَور، انگلستان اور سنڈ ہرسٹ کے بارے میں خوب تفصیل دی ہے۔ ۱۹۳۹ء میں آپ کی پوسٹنگ بنوں میں تھی جب دوسری جنگ عظیم چھِڑ گئی۔ آپ کو آسام بھیج دیا گیا۔ جاپانیوں کے ساتھ جنگ کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

> ''جن دِنوں ۱۵۔ کور جاپانیوں سے لڑنے کے لیے اراکان میں داخل ہوئی تو میں آسام رجمنٹ کا نائب کمانڈر مقرر ہوا۔ ہم برما پہنچے اور جیسے ہی دریائے چندوِن پار کیا، جاپانیوں سے ہماری گھمسان کی جنگ شروع ہوئی۔ دریائے ایراودی کو عبور کرکے ہم لڑتے بھڑتے مانڈلے پہنچ گئے۔ یہ جنگل میں بڑی تند و تیز دست بدست لڑائی تھی۔''(۳۰)

قیامِ پاکستان کے لیے کی گئی جدوجہد اور تحریک آزادی ہند کو فوج کس نظر سے دیکھ رہی تھی۔ جنرل ایوب خان نے

اپنی آپ بیتی میں اِس کا تفصیلی تجزیہ کیا ہے۔ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد سرحد کے دونوں طرف خوفناک فسادات پھوٹ پڑے جس نے ہندوستان اور پاکستان کے تقریباً سب بڑے شہروں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور اِس کے ساتھ ہی ہندوستان سے مہاجرین کی آمد اور اُن کی آبادکاری کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہندوستان سے کتنے لوگ مہاجر بن کر پاکستان کی طرف آئے، اِس بارے میں متضاد اعداد و شمار پیش کیے گئے ہیں۔ اِس بارے میں جنرل ایوب خان یہ تعداد ۸۰ لاکھ سے ۹۰ لاکھ بتاتا ہے جو زیادہ قابلِ اعتماد ہے کیونکہ اُس وقت وہ پاکستان کی طرف سے نہ صرف باؤنڈری کمیشن کے رُکن تھے بلکہ مہاجرین کی آبادکاری کمیشن کے نگران بھی تھے۔ ویسے بھی فوج کے اعداد و شمار زیادہ قابلِ بھروسہ سمجھے جاتے ہیں۔ مہاجرین کی آمد کے دوران آپ نے کیا ہولناک مناظر دیکھے اور ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں مسلمانوں پر کیا گزری تھی، جنرل ایوب خان کے الفاظ میں ملاحظہ ہوں:

''یہ میری زندگی کا سب سے المناک زمانہ تھا۔ میں نے اِس سے زیادہ ہولناک اور وحشیانہ کاروائی پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ عورتوں اور بچوں کے اعضاء کاٹ دیئے جاتے اور بے گناہ لوگوں کو سخت بے رحمی کے ساتھ قتل کیا جاتا۔ معلوم ہوتا تھا تمام انسانی صفات دنیا سے اُٹھ گئی ہیں اور تہذیب و تمدن کی شاندار عمارت دھڑام سے زمین پر آ رہی ہے۔ فطرتِ انسانی پر میرا ایمان ڈولنے لگا۔''(۳۱)

تقسیم کے بعد نئی مملکتِ پاکستان نے انتہائی کسمپرسی کے ساتھ نئی زندگی کا آغاز کیا۔ ملک کے تمام ادارے انتہائی بے سروسامانی کی حالت میں تھے۔ معمولی اور عام استعمال کی چیزیں بھی ناپید تھیں۔ مشترکہ ہندوستان کا سارا اثاثہ اور انفراسٹرکچر ہندوستان میں رِہ گیا تھا۔ فوج کی حالت تو اور بھی خراب تھی۔ اسلحہ، گولہ بارود، گاڑیاں، راشن غرض ہر لحاظ سے پریشان کن صورتحال تھی۔ سب سے بڑا مسئلہ نئی فوج کو منظم کرنا، تشکیل دینا اور تربیت کا تھا۔ بدقسمتی سے تقسیم کے فوراً بعد کشمیر کی لڑائی شروع ہو گئی۔ پاکستانی فوج تمام اندرونی اور بیرونی خطرات سے نپٹ کر دنیا کی صفِ اول کی فوج کیسے بنی۔ یہ ایک معجزے سے کم نہ تھا۔ جنرل ایوب خان اُس زمانے کو یاد کر کے کہتے ہیں:

''ہماری فوج کے پاس اسلحہ کی بڑی کمی تھی اور وہ سخت غیر منظم بھی تھی۔ پھر اس کے ساتھ ہی اُنہیں مہاجرین کی حفاظت کے لیے جو لاکھوں کی تعداد میں پاکستان آرہے تھے، اُن کے قافلوں کے ساتھ جانا پڑا، پھر زیادہ دِن نہیں گزرتے تھے کہ اُسے کشمیر کی لڑائی میں بھی حصہ لینا پڑا۔ اِس تمام عرصے میں فوج کے ساتھ نہ تو

کوئی منظم یونٹ تھا اور نہ سازوسامان اور گولہ بارود بھی نہ ہونے کے برابر تھا۔
حالت اِتنی خراب تھی کہ شروع کے چند برسوں میں ہر فوجی کو مشق کے لیے
صرف پانچ کارتوس فی سال کی اجازت تھی۔"(۳۲)

پاکستان کے شمال مغربی سرحدی صوبے سے ملحقہ قبائل کا مسئلہ ستر سال سے حل طلب مسئلہ چلا آرہا ہے۔ قبائل کو ریاست کے اندر ریاست بنا کر چھوڑا گیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ مسئلہ انتہائی گھمبیر صورت اختیار کرتا چلا گیا ہے۔ دہشت گردی کے خلاف حالیہ جنگ میں قبائلی علاقوں میں آپریشن کر کے جو جانی اور مالی نقصان اِس ملک کا ہوا ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ آج تک کسی حکومت نے قبائل کو قومی دھارے میں شامل کرنے کی مخلصانہ کوشش نہیں کی بلکہ اُلٹا اِسے سیاست کی نظر کیا گیا۔ ملک بننے کے ساتھ ہی اگر اِس علاقے کو صوبہ سرحد میں شامل کر کے اِسے پاکستانی آئین و قانون کے نیچے لایا جاتا تو آج اِس علاقے کا نقشہ مختلف ہوتا۔ فاٹا میں انگریز حکومت کے زمانے میں سو سال سے فوجیں رہتی چلی آرہی تھیں چنانچہ یہاں سے فوج نکالنا غیر دانشمندانہ فیصلہ تھا۔ بعد میں تاریخ نے ثابت کر دیا کہ فاٹا کے مسئلے پر حکومتوں نے مجرمانہ غفلت کا مظاہرہ کیا تھا۔ فاٹا سے فوج نکالنے کا کام جنرل ایوب خان کے ذمے تھا۔ وہ اُس وقت بھی اور بعد میں اپنی دَور حکومت میں بھی فاٹا کو پاکستان کا حصہ بنا سکتے تھے۔ آپ نے اپنی آپ بیتی میں اِس مسئلے کے بارے میں عُزر لنگ سے کام لے کر بتایا ہے:

"لیفٹیننٹ جنرل سر فرانسس ٹکر کے ماتحت ایک کمیٹی بنائی گئی جس نے اِس مسئلے
کی چھان بین کر کے تجویز پیش کی کہ وزیرستان سے فوجیں ہٹالی جائیں۔ یہ جرأت
مندانہ اور عاقلانہ تجویز پاکستان بننے سے پہلے ہی پیش کر دی گئی تھی۔ جسے پاکستان
کی نئی حکومت نے منظور کر کے اِس پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔"(۳۳)

۱۹۴۸ء سے ہی جنرل ایوب خان فوج میں اعلیٰ عہدوں پر رہے۔ فوج کا کمان سنبھالنے سے پہلے ہی وہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان میں فوج کی طرف سے چند کلیدی عہدوں پر رہے تھے جس کی وجہ سے سیاستدانوں کے ساتھ اُن کا رابطہ رہا اور اُس نے پاکستان کی سیاست اور سیاستدانوں کو بہت قریب سے دیکھا۔ بعد کے واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ سیاستدانوں کی طرف سے اس زمانے میں اُن کے دِل میں میل پیدا ہو گیا تھا۔ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۶ء تک کا زمانہ پاکستان میں سیاسی طوائف الملوکی کا زمانہ ہے۔ سیاستدان آپس میں برسرپیکار رہے اور اقتدار کی جنگ میں سیاستدان بہت آگے نکل گئے۔ میدان سیاست میں زیادہ تر بیوروکریٹ تھے جنہیں عوام سے کوئی غرض نہیں تھی۔ آپ نے اپنی آپ بیتی کے صفحہ نمبر ۴۰ سے ۴۹ تک پاکستان کے سیاستدانوں کے کرتوت اور منفی سرگرمیوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اِس دوران جنرل

گریسی کی ملازمت کی میعاد ختم ہوگئی اور قرعہ فال ایوب خان کے نام نکلا۔ چنانچہ ۱۷ جنوری ۱۹۵۱ء کو آپ کو پاکستانی افواج کا کمانڈر انچیف بنایا گیا۔(۳۴)

فوجی کمانڈر اور خصوصاً فوج کا چیف سیاسی لیڈروں اور سیاست دانوں کو خاطر میں نہیں لاتا حتیٰ کہ ملک کے منتخب وزرائے اعظم اُن کے خوف سے آزادانہ پالیسیاں تشکیل نہیں دے سکتے۔ کسی بھی جمہوری ملک میں فوج کو بے تحاشا اختیارات اور کامل آزادی دینے کا سوچا بھی نہیں جا سکتا لیکن یہاں ہمارے ملک میں کچھ اور ہی دستور ہے۔ پے در پے مارشل لاؤں کے بعد سویلین بالادستی کا خواب و خیال محض خواب ہو کر رہ گیا ہے۔ یہ ہمارے ملک کی بد قسمتی ہے کہ فوج کا سالار اپنے ملک کے وزیر اعظم اور گورنر جنرل سے کس لہجے میں بات کرتا ہے:

> ''سہروردی (اُس وقت کے وزیر اعظم) ایوان صدر میں آئے تو میں نے اُن سے کہا کہ آپ کے بارے میں میرے جو خیالات ہیں یقیناً آپ بھی اُن سے واقف ہوں گے لیکن کمانڈر انچیف کی حیثیت سے میں آپ کے ہر اُس حکم کو بجا لاؤں گا جو قانونی طور پر جائز اور درست ہو گا اور میں یہ اُمید بھی رکھوں گا کہ فوج کے اندرونی معاملات میں کسی قسم کی دخل اندازی نہ کی جائے گی۔ سہروردی نے یہ سمجھوتہ منظور کر لیا۔ اِس پر ہم دونوں نے مصافحہ کیا۔''(۳۵)

پاکستان میں سیاسی ابتری لیاقت علی خان کی شہادت سے شروع ہوئی اور پھر اِس افراتفری کا انجام مارشل لاء پر جا کر ختم ہوا۔ لیاقت علی خان کی شہادت پر بعض حکمرانوں نے سکھ کا سانس لیا کہ اُن کو کھل کھیلنے کے لئے اچھا موقع ہاتھ آیا۔ لیاقت علی خان کے قاتلوں کو پکڑنے کے لیے حکومت نے کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی اور نہ اُس رپورٹ کو منظر عام پر لایا گیا جس میں لیاقت علی خان کے قاتلوں کی نشان دہی کی گئی تھی۔ ایوب خان اپنی آپ بیتی میں لیاقت علی خان کے قتل کا پس منظر بیان کرتے ہوئے افسوس کے ساتھ لکھتے ہیں:

> ''بات تو بیشک تلخ ہے لیکن مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اُن سب لوگوں (وزیر اعظم لیاقت علی خان کے کابینہ کے ارکان) نے اطمینان کا سانس لیا ہو کہ وہ واحد ہستی جو ان سب کو قابو میں رکھ سکتی تھی، دنیا سے اُٹھ گئی ہے اور اب ایک سیاسی دنگل کھل گیا ہے جس میں ہر ایک کو زور آزمائی کی کھلی چھٹی ہے۔''(۳۶)

مصنف نے اپنی آپ بیتی میں صفحہ نمبر ۷۶ سے ۸۷ تک اپنی ڈائری سے کچھ اقتباسات دیئے ہیں۔ یہ ڈائری پُر

آشوب سیاسی زمانے میں لکھی گئی۔آپ کی ڈائری سے بڑی حد تک آپ کی ذہنی کیفیات، جذباتی تموج اور مستقبل کی منصوبہ بندی کا خاکہ اُبھرتا ہے۔ ہر ڈکٹیٹر کی طرح آپ نے بھی اقتدار پر قبضے کی یہ بھونڈی دلیل دی ہے کہ ملک میں سیاسی حالات بہت خراب تھے اور عوام نے اُنہیں بُلایا تھا یا ملک بچانے کا یہ آخری موقع تھا وغیرہ لیکن آپ کی ڈائری سے یہ شہادت ملتی ہے کہ اقتدار آپ کی دیرینہ خواہش تھی اور آپ کی مارشل لاء اتفاقی نہیں تھا۔ مارشل لاء لگانے کے بعد جنرل ایوب نے وعدہ کیا تھا کہ وہ کچھ دِنوں کے بعد اقتدار عوامی نمائندوں کے سپرد کرکے مارشل لاء اُٹھا دے گا لیکن اِس وعدے کو ایفا ہوتے ہوتے دس سال کا عرصہ لگا:

"مارشل لاء جاری کرنے کے دو دِن بعد ۱۰ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو میں نے ایک اخباری کانفرنس میں کہا تھا کہ اقتدار بہت جلد عوام کو لوٹا دیا جائے گا۔"(۳۷)

صدر ایوب خان نے اپنی آپ بیتی میں مارشل لاء کے لیے لفظ "انقلاب" استعمال کیا ہے حالانکہ انقلاب عوام کے دِلوں سے پھوٹتا ہے، اندر سے آتا ہے اور ارد گرد کے سارے نظام کو نیست و نابود کرتا ہے۔ صرف اِتنا نہیں بلکہ پرانے نظام کے کھنڈرات پر نیا سسٹم بنا کر تاریخ میں ایک خط فاصل متعین کر جاتا ہے۔ انقلابات کے اثرات عشروں تک محسوس کیے جاتے ہیں۔ فوجی ڈنڈے سے آنے والی تبدیلی انقلاب نہیں ہوتی۔ ایوب خان نے اپنی آپ بیتی میں اپنی بنائی ہوئی خارجہ پالیسی کو بھی بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے جو ستر سے زیادہ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ آپ بیتی میں چند غیر اہم باتوں کو اہم جان کر بہت زیادہ پھیلانا اور اہم باتوں کو نظر انداز کرنا فن خود نوشت نگاری سے بیگانگی کی دلیل ہے۔ جو تفصیل یہاں دی گئی ہے اُس کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ اِس سے اُن لوگوں کی سیاسی خود نوشتوں پر تنقید ٹھیک معلوم ہوتی ہے جو کہتے ہیں کہ سیاسی لوگ آپ بیتیاں اپنی تشہیر، ذاتی پروپیگنڈے اور ناجائز پالیسیوں کو جائز قرار دینے کے لیے لکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں امریکہ سے سب سے پہلا دفاعی معاہدہ ایوب خان نے کیا تھا۔ ہم کئی عشروں سے امریکی بالادستی اور اقتصادی بلیک میلنگ کا شکار چلے آرہے ہیں۔ اِس کی ابتدا ایوب خان کے زمانے سے ہوئی۔ اِس معاہدے کو ذوالفقار علی بھٹو غلامانہ معاہدے کہتے تھے۔ فوجی امداد اور اسلحے سے قطعہ نظر اِس معاہدے کی رُو سے دونوں ممالک پر لازم تھا کہ بیرونی حملے کے وقت دونوں ملک مل کر اُس کا مقابلہ کریں گے لیکن ۱۹۶۵ء اور بعد میں یعنی ۱۹۷۱ء کو امریکہ ہماری مدد کو نہ آیا بلکہ اُلٹا انڈیا کی حمایت کی۔ جنرل ایوب خان لکھتے ہیں:

"۱۹۵۹ء میں پاکستان نے امریکہ کے ساتھ دو طرفہ معاہدے پر دستخط کیے۔ اِس معاہدے کے تحت امریکہ کے لیے بعض حالات میں یہ لازمی ہو گیا تھا کہ اگر پاکستان کسی حملے کا شکار ہوا تو امریکہ اُس کی مدد کرے۔"(۳۸)

ایوب خان کی دس سالہ دَور حکومت کے چند قابل ذکر کارنامے بھی ہیں جن میں ملک میں صنعتوں کا پھیلاؤ، نہری

نظام، معاشی اصلاحات ، زرعی اصلاحات وغیرہ شامل ہیں لیکن اسلام آباد کو دارالخلافہ بنانا اور چین کے ساتھ سرحدی تنازعات ختم کرکے سرحد کی نشاندہی کرنا اُن کا بڑا کارنامہ ہے آج پاک چین دوستی مثالی سمجھی جاتی ہے۔ ہمارے ملک کا ہر فرد اِس دوستی پر نازاں ہے بلکہ اب تو سی پیک کی توسط سے پاکستان اور چین کا تعاون اور بھی بڑھ چکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اِس دوستی کا آغاز صدر ایوب خان نے کیا تھا۔ وہ مذکورہ آپ بیتی میں یہ ذکر اِن الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''سرحد کی نشان بندی کا معاہدہ پاکستان اور چین کے درمیان دوستانہ روابط کی ترقی کا پہلا قدم تھا۔ اِس کا واحد مقصد یہ تھا کہ آئندہ دونوں ملکوں میں کسی قسم کی اختلافات کی وجہ پیدا نہ ہونے پائے۔''(۳۹)

ایوب خان پارلیمانی طرز حکومت کے سخت مخالف اور صدارتی طرز حکومت کے حامی تھے۔ اُس نے پاکستان کے لیے پارلیمانی طرز حکومت کو خطرناک قرار دیا ہے اور اِس کے ثبوت میں قائداعظم محمد علی جناح کے جھوٹے بیانات کا حوالہ دیا ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ حالانکہ قائداعظم نے ایک سے زیادہ مرتبہ کہا تھا کہ اِس ملک کی تقدیر صرف اور صرف پارلیمانی نظام ہے۔ بعد میں تاریخ نے ثابت کر دیا کہ ایوب خان کا فیصلہ ذاتی فائدے کے لیے تھا، ملک کے وسیع تر مفادات کے لیے نہیں تھا۔ آج یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اگر ایوب خان ون یونٹ قائم نہ کرتا، ۱۹۵۶ء کا آئین اُس شکل میں نہ آتا اور ایوب خان اور یحییٰ خان کا مارشل لاء نہ لگتا تو مشرقی پاکستان بنگلہ دیش کے نام سے الگ ملک نہ بنتا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا ایوب خان اور مارشل لاء کے خلاف عوامی آوازیں اُٹھنا شروع ہوئیں۔ علماء کی طرف سے سب سے توانا آواز مولانا مودودی کی تھی۔ ایوب خان نے اُنہیں پابند سلاسل کر دیا۔ اپنی کتاب میں مولانا مودودی کے بارے میں بہت سخت خیالات کا اظہار کیا ہے:

> ''آنے والوں میں جماعت اسلامی کے امیر مولانا ابو الاعلیٰ مودودی بھی تھے جو پاکستان کے زبردست مخالف رہ چکے تھے۔ موصوف نے آخر وہی آکر پناہ لی اور پھر جلد ہی پاکستان کے بدنصیب عوام کو مسلمان بنانے کی مہم شروع کر دی۔ ان بزرگ نے پاکستان میں جو کچھ دیکھا، بڑا روح فرسا تھا۔ غیر اسلامی ملک ، غیر اسلامی حکومت۔ چنانچہ اُنہوں نے لوگوں کو ان کی خامیوں ، کوتاہیوں اور اُن کی عام پستی کا احساس دِلانے کی مہم شروع کر دی۔''(۴۰)

آپ نے یکم مارچ ۱۹۶۲ء میں ملک کو نیا آئین دیا۔ یہ واقعہ ہمارے ملک کی سیاسی، آئینی اور پارلیمانی تاریخ کا ایک اہم

سنگ میل ہے۔آئین کی رُو سے ملک میں صدارتی نظام نافذ کیا گیا جو ایوب خان کی کافی عرصہ سے خواہش تھی۔ ملک کے طول و عرض میں یہ آئین نافذ کیا گیا اور سرکاری خرچے پر اِس کی تشہیر شروع کی گئی تاہم یہ آئین بڑی عجلت میں تیار کیا گیا تھا اور اِس میں کئی سُقم تھے۔اِس آئین کی سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ اِس میں فیڈریشن یا مرکز کو مضبوط کر کے صوبوں کی جائز خود مختاری کو نظر انداز کیا گیا تھا۔ اِس آئین کی وجہ سے علاقہ پرستی اور عصبیت کو ہَوا ملی۔ خصوصاً مشرقی پاکستان کی احساس محرومی میں اضافہ ہو گیا جو بالآخر مشرقی پاکستان کی علیٰحدگی پر ختم ہوا۔ ایوب خان اپنی آپ بیتی میں جگہ جگہ اِس آئین کی خوبیاں بیان کرتا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''جو آئین میں نے تیار کیا ہے وہ کوئی باہر سے لائی ہوئی جڑی بوٹی نہیں بلکہ گھر کا پروان چڑھا ہوا پودا ہے۔ یہ ملکی حالات، ملکی تقاضوں اور عوام کے مزاج سے مطابقت رکھتا ہے۔ اِس میں جمہوریت کے تمام عناصر موجود ہیں۔ یہ قابل عمل ہے اور ملک کو استحکام بخشے گا۔''(۴۱)

اِس قدر تعریفیں کرنے کے باوجود اپنے تیار کیے گئے آئین کو ۱۹۶۸ء میں خود ہی معطل کر کے نئے دستور ساز دستاویز بنانے کا منصوبہ بنایا۔ اگر یہ آئین اِتنا اچھا اور نقائص سے پاک تھا تو اِس کو ختم کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

پاکستان کے سابق صدر جنرل ایوب خان کی آپ بیتی کا اصل متن انگریزی میں Friends not masters تھا جس کا اُردو ترجمہ غلام عباس نے ''جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی'' کے نام سے کیا اور آج تک وہی مارکیٹ میں رائج ہے۔ نیز اِس کو معتبر ترجمہ تصور کیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر سیاستدانوں اور حکمرانوں کی خود نوشتوں کو جو انگریزی یا دیگر زبانوں میں لکھی گئی تھیں، اُردو زبان میں ترجمہ کر کے نہ لایا جاتا تو اِس ملک کا بڑا حصہ متذکرہ حضرات کے افکار، بود و باش، کارناموں، مجاہدوں، مجادلوں، گھریلو حالات اور سب سے بڑھ کر ملک کے تاریخ کے ایک اہم دَور سے بے خبر اور محروم رہتا۔ ہمارے ہاں کم لکھے پڑھے، معمولی لکھے پڑھے اور انگریزی سے نابلد لوگ سیاست یا سیاسی اُمور میں پڑھے لکھے لوگوں سے زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ ملک کی سیاسی اور معاشرتی تاریخ سے بھی یہ لوگ شغف رکھتے ہیں۔ بدقسمتی یہ ہے کہ وطن عزیز میں منظم طور پر تاریخ لکھنے کا رواج نہیں۔ علاوہ ازیں مختلف اوقات میں رونما ہونے والے تاریخی، ثقافتی، سیاسی اور سماجی حادثات کو بھی اِس کے اصل پس منظر میں ریکارڈ نہیں کیا جاتا۔ لے دے کے ایک آپ بیتیاں رہتی ہیں جو کافی حد تک ہماری تشنگی کو پورا کرتی ہیں۔ اِس لیے ضرورت اِس امر کی ہے کہ دیگر زبانوں میں شائع ہونے والی تمام آپ بیتیوں کا باقاعدہ ترجمے کرنے والے ماہرین کی خصوصی ٹیم کے ذریعے تراجم کیے جائیں۔ یہ اُردو خوان طبقے پر بڑا

احسان ہوگا۔ صدر ایوب خان کی آپ بیتی کے ترجمے کے حوالے سے خاص خاص باتیں نیچے درج کی جاتی ہیں۔

۱۔ غلام عباس نے مذکورہ کتاب کا ترجمہ کرتے وقت صرف ایک قسم کے ترجمے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ لفظی، بامحاورہ اور تشریحی تینوں قسم کے ترجمے پر طبع آزمائی کی ہے۔ زیادہ تر یعنی کتاب کے بڑے حصے کا بامحاورہ ترجمہ کیا ہے۔ ترجمہ کرتے وقت آپ اکثر اُردو اشعار بھی استعمال کرتے ہیں۔ ظاہر ہے اصل متن میں یہ شعر موجود نہیں تھے۔ وہ زیب داستان کے لیے اشعار لاتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جہاں اِس قسم کی کوشش کی گئی ہے مفہوم اور مطلب واضح ہونے میں سہولت پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ آپ بیتی کی اہمیت میں بھی اضافہ ہوگیا ہے۔ چونکہ مترجم عبارت کی روانی کو برقرار رکھتا ہے اس لیے قاری کو یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ کسی انگریزی کتاب کا اُردو ترجمہ پڑھ رہا ہے۔ کہیں کہیں ایک مصرعے یا شعر سے پورے عبارت کا کام لیتے ہیں:

''خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو'' (۴۲)

ایوب خان نے کہیں کہیں اصل متن میں اُردو اور پنجابی کے اشعار اور گانوں کے بول بھی لکھے ہیں جس کو مترجم نے جوں کا توں دُہرایا ہے:

''سورنگ تماشے تکدے اکھیاں نئیں رجیاں''۔(۴۳)

ترجمہ کرتے وقت مترجم نے چند ایک مقامات پر فارسی کے مصرعے بھی استعمال کیے ہیں جو موقع و محل کے اعتبار سے بڑے برمحل ہیں:

''دشمن اگر قوی است نگہبان قوی تر است'' (۴۴)

۲۔ ترجمہ کرنے پر مترجم کو قدرت حاصل ہے اور ترجمہ کرتے وقت اُس نے نہ صرف اُردو روزمرہ اور محاورے کا خیال رکھا ہے بلکہ زبان کی نزاکتوں اور لطیف کیفیات کو بھی مدنظر رکھا ہے۔ چونکہ یہ آپ بیتی مصنف نے اپنا بیانیہ لوگوں پر واضح کرنے، اپنا زاویہ نظر دینے اور اپنے سیاسی فکر کے ترویج کے لیے لکھی گئی ہے اس لیے یہاں لفظی گلکاری اور عبارت آرائی کی تو گنجائش نہیں نکل سکتی تھی اِس کے باجود مترجم کو جہاں جہاں موقع ملا ہے ترجمہ کرتے ہوئے خوبصورت وشیرین الفاظ اور عمدہ محاورات کا استعمال ضرور کیا ہے :

''میں نے دِل میں کہا آپ بھی بڑے حضرت ہیں۔'' (۴۵)

یا مثلاً:

''خدا آپ سے سمجھے پچھلے آٹھ برس سے تو آپ کو ہوش نہ آیا۔''(۴۶)

اِس طرح کئی جگہوں پر تحریر میں بے تکلف اور بول چال والا انداز پیدا ہو گیا ہے جو زبان و بیان اور ترجمہ نگاری کے لحاظ سے اِس آپ بیتی کی کامیابی کی دلیل ہے۔

۳۔ اِن سب باتوں کے باوجود ترجمے میں کچھ غلطیاں اور سُقم بھی موجود ہیں۔ بامحاورہ اور تشریحی ترجمے میں تو یقیناً مترجم نے اچھی کاوش کی ہے لیکن لفظی ترجمے میں کئی جگہ خرابیاں پیدا ہوئی ہیں۔ جہاں مترجم لفظی ترجمہ کرتا ہے وہاں مصنف کا نقطہ نظر پوری طرح بیان نہیں کر سکتا۔ ترجمے میں تعقید کی مثالیں بھی عام ہیں۔ تعقید سے مراد صاف بات نہ کہنا یا گرہ لگانا ہے۔ جہاں جہاں ترجمے میں تعقید کا نقص آیا ہے مفہوم سمجھنے میں دِقت پیش آتی ہے۔ یہاں تعقید لفظی اور تعقید معنوی دونوں صورتیں عام ہیں۔

"وزیراعظم کو گورنر جنرل کا پیغام ملا کہ فوراً واپس آؤ کہ خیریت ہے نہیں۔" (۴۷)

مترجم نے کئی اہم واقعات اور یادداشتوں کو قلمبند کرتے ہوئے لفظی ترجمے پر اکتفا کیا ہے۔ حالانکہ وہاں بامحاورہ ترجمہ کرنے کی ضرورت تھی :

"میرا دِل سکندر مرزا کے لئے بھی کڑھتا تھا۔ آپ نے خود تو چھنگلی تک نہ اُٹھائی مگر وہ فوٹو کام کر گیا۔" (۴۸)

ترجمہ کرتے وقت مترجم کو اپنے تمام حواس بیدار کر کے لکھنا پڑتا ہے۔ تھوڑی سی کوتاہی اصل متن کے مفہوم کو غارت کر دیتی ہے۔ مذکورہ آپ بیتی میں مترجم نے بعض جگہوں پر ادھورے جملے لکھے ہیں جس سے مفہوم کی وضاحت نہیں ہوتی۔ دیکھا جائے تو یہ ایک فاش غلطی ہے۔ قاری اِس قسم کے ترجمے سے غلط نتیجہ بھی نکال سکتا ہے:

"غرض یہ تھی کہ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں ہمارے ملک کی صورتحال۔" (۴۹)

اس جملے میں بھی لفظی ترجمہ سے پریشان کن صورتحال پیدا ہو گئی ہے:

"ہمارے ہاں کا یہی دستور ہے بڑی سہولت ہے اِس دستور میں مسٹر پرائم منسٹر، میں نے کہا۔" (۵۰)

کتاب میں کتابت کی بھی کئی غلطیاں ہیں جو اِتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی نئی ایڈیشنوں میں نہیں نکالی گئیں جیسے صفحہ نمبر ۹۲ اور صفحہ ۹۳ پر۔ یہ تو لفظی ترجمے کے چند نقائص تھے البتہ بامحاورہ ترجمہ میں مترجم نے بڑی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔

۴۔ ترجمہ کرتے ہوئے مترجم نے اُردو زبان کو انگریزی کی کئی اصطلاحات اور محاورے دیے ہیں۔ یہی دراصل وہ

مقام ہے جہاں ترجمہ شدہ کتابوں کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا ہے۔ ترجمہ کرنے سے زبانیں نئے ذائقوں سے آشنا ہوتی ہیں۔ مترجم نے درج ذیل نئے محاورے اُردو کو دیے ہیں:

''کایاپلٹ نہیں کر سکتا''۔ ''جینے کا ڈھپ نکالنا ہوگا''، ''پاکستان کی ڈومینین اور ہندوستان کی ڈومینین''۔ ''بھلے مانسوں کا سا نباہ کرنا''، ''ہم ایک ہی چھتری کے نیچے تھے''۔ ''رسی اِتنی دراز نہ ہونے پائے۔''(۵۱)

۵۔ اِس آپ بیتی کے ترجمے نے ہماری زبان کو کئی نئے الفاظ و تراکیب بھی دیئے ہیں جیسے:

''آفریشائی'' (افریقہ اور ایشیاء کو ملا کر لکھا اور پڑھا جاتا ہے)۔

''یوریشیا''(یورپ اور ایشیاء)

''امریکہ پر سواری کرنا''۔ ''مرکزی گرمائش(Central Heating)''۔

''مسلک اقتدار(Cult of Power)۔''(۵۲)

۶۔ آپ بیتی کے اُردو ترجمے نے انگریزی کے چند ضرب الامثال کو بھی اُردو میں ڈھال کر اُردو زبان کا دامن وسیع کیا ہے:

''اُن کی کیفیت اُن بہت سی جنگلی بلیوں جیسی تھی جن کی دُمیں ایک دوسرے کے ساتھ باندھ دی گئی ہوں۔''(۵۳)

اِس ترجمے میں خوبصورت نثر کے بھی چند اچھے نمونے ملتے ہیں:

''میں چپ چاپ بیٹھا اپنے اِرد گرد کی خاموشی کو اپنے اندر جذب کرتا رہا۔ دُور سمندر کی بے خروش موجیں خلیج بنگال کے ساحل کی نرم ریت پر دھیرے دھیرے بَل کھا رہی تھیں۔ لمحہ بھر کے لیے زندگی کے ہنگامے جیسے تھم سے گئے تھے اور میں سمندر کی خاموشی میں ڈوب گیا۔''

بحثیت مجموئی غلام عباس کی ادبیت اور زبان دانی کا اندازہ مزکورہ آپ بیتی سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

۳۔ کیا میں پاگل تھا؟ (اجمل خٹک)

اجمل خٹک پشتو زبان کے ایک اچھے شاعر، بڑے سیاستدان، خدائی خدمت گار، عوامی نیشنل پارٹی کے سابق صدر اور جنرل سیکرٹری تھے۔ ہمارے صوبے میں جن لوگوں نے قلم، زبان اور سیاست ہر زاویے سے ملک و قوم کی خدمت کی اُن میں اجمل خٹک کا نام بھی شامل ہے۔ اُن کی زندگی کے دو بڑے رُخ تھے، سیاست اور شاعری۔ اب یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ بڑے سیاستدان تھے یا بڑے شاعر تاہم یہ ضرور ہے کہ اُن کی شاعری سیاست اور سیاست شاعری کو توانائی دیتی رہی۔ خدمت خلق کرنا اور پشتون قوم کو متحد کرنا اُس کی زندگی کا بڑا مقصد تھا اور یہ سبق اُس نے خان عبدالغفار خان عرف باچا خان کی تحریک خدائی خدمتگار سے سیکھا تھا۔ وہ غفار خان اور پھر خان عبدالولی خان کے بڑے قریب رہے۔ اجمل خٹک کا تعلق سیاستدانوں کے اُس دَور اور اُس نسل سے تھا جن کی سیاست کا مقصد لوگوں کی خدمت کرنا تھا۔ یہ لوگ حقیقی جمہوریت، عوامی حکمرانی اور شخصی آزادی کے علمبردار تھے۔ یہ وہ دَور تھا جب سیاست ہر قسم کی بدعنوانی سے پاک تھی، پلاٹ، پرمٹ، ٹھیکوں، گھپلوں، خورد بُرد، کالے دَھن اور اقربا پروری کی سیاست ابھی وطن عزیز میں شروع نہیں ہوئی تھی۔ انگریز کے خلاف جن لوگوں نے جدوجہد کی اُن سب میں ایک بات مشترک تھی کہ وہ مخلص لوگ تھے۔ چونکہ اقتدار کا خون ابھی اُن کے منہ کو نہیں لگا تھا اِس لیے بدعنوانی سے پاک تھے بلکہ اِن میں اکثریت اُن لوگوں کی تھی جن کی انانیت، خودداری، اخلاق، بلند کرداری، اُصول پرستی اور قابلیت کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ چنانچہ اجمل خٹک کا رشتہ بھی سیاست میں اُن ہی لوگوں سے جاملتا ہے اس لیے تو اُن کی وفات پر بی بی سی اُردو سروس نے اِس طرح کی خبر نشر کی:

> ''پاکستان اور صوبہ سرحد آج نہ صرف ایک عظیم انسان سے محروم ہو گیا بلکہ
> صوبے میں شرافت کی سیاست بھی آج ختم ہو گئی۔''(۵۴)

اجمل خٹک ۱۰ ستمبر ۱۹۲۵ء کو نوشہرہ کے قریب اکوڑہ خٹک نامی ایک گاؤں میں پیدا ہوئے اور فروری ۱۹۱۰ء کو انتقال کیا۔ آپ کا تعلق خٹک قبیلے سے تھا۔ وہ خوشحال خان خٹک کی اولاد میں سے تھے۔(۵۵) آپ ۱۹۴۲ء میں پشاور شہر کے ایک ہائی سکول میں زیر تعلیم تھے جب انگریز کے خلاف ''نوجوان بھارت سبھا'' تحریک کی طرف سے احتجاج میں شامل ہو گئے۔ جس پر اُنہیں سکول سے نکال دیا گیا اور وہ اپنی تعلیم مکمل نہ کر سکے۔ اُن کے دادا نے بھی انگریز کے خلاف عملی جدوجہد کی تھی۔ اُس نے انگریز کے خلاف افغانستان کے صدر شاہ شجاع کا ساتھ دیا تھا جس کی پاداش میں اُنہیں جیل کی سزا ہوئی تھی۔

اجمل خٹک آزادی سے پہلے ہی خدائی خدمت گار تحریک میں شامل ہو گئے تھے۔ وہ نیشنل عوامی پارٹی

کے جنرل سیکرٹری، صدر، خزانچی، رہبر اور دیگر انتظامی عہدوں پر کافی عرصہ فائز رہے ہیں۔۱۹۷۰ء کے الیکشن میں آپ نے قومی اسمبلی کی سیٹ پر کامیابی حاصل کی تاہم وہ۱۹۷۷ء کا الیکشن مولانا عبدالحق سے ہار گئے تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو کے دَور میں آپ گرفتاری سے بچنے کے لیے افغانستان فرار ہوگئے اور وہاں سیاسی پناہ حاصل کی۔آپ نے ایک طویل عرصہ جلاوطنی میں گزارا۔۱۹۸۹ء میں آپ وطن واپس آئے اور ۱۹۹۰ء کا الیکشن لڑا جس میں آپ نے کامیابی حاصل کی اور قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوگئے۔آپ تین بار اپنی پارٹی کی طرف سے سینیٹر بھی رہے۔آپ ۲۰۰۰ء میں اپنی پارٹی سے کچھ اُصولی اختلافات کی بنا الگ ہوگئے تام بہت جلد دوبارہ اِس پارٹی میں شامل ہوگئے۔آپ کو آخری عمر میں مختلف بیماریوں نے آگھیرا اور عملی سیاست سے تقریباً کنارہ کش ہوگئے۔افغانستان میں جلاوطنی کے دوران آپ کو نہ صرف بادشاہ کا اعتماد حاصل رہا بلکہ وہاں کی سیاست میں بھی آپ فعال کردار ادا کرتے رہے۔افغانستان ڈیموکریٹک پارٹی کے ساتھ آپ کے قریبی روابط تھے۔علاوہ ازیں آپ کو اُس وقت کے افغان صدر نور محمد ترکئی، ببرک کارمل اور ڈاکٹر نجیب کے ساتھ بھی قریبی تعلق رہا۔ حیران کن بات یہ ہے کہ بائیں بازو سے تعلق رکھنے کے باوجود آپ سوویت یونین کا فغانستان میں داخل ہونے کے سخت خلاف تھے۔ اجمل خٹک نے اپنی آپ بیتی ''کیا میں پاگل تھا''(ده څه شۀ پاګل ووم)کے علاوہ درج ذیل کتابیں لکھیں۔

(۱) دَ افغان ننګ (۲) ګل پرهر (۳) ګلونه تکلونه (۴) دَ غیرت چغه (۵) دَ ژوند چغه

''کیا میں پاگل تھا'' اجمل خٹک کی زندگی اور جیل کے دِنوں کے سر گزشت ہے جس میں آپ نے، عقوبت خانوں کے بدترین حالات، قیدیوں پر کیے جانے والے دردناک مظالم،ہمارے تھانوں کی حالت زار ، مختلف مواقعوں پر اپنے محسوسات،اپنی ذہنی کیفیات اور دوستوں کے حالات بیان کیے ہیں جبکہ جگ بیتی میں آپ نے اپنے دیگر ساتھیوں کے علاوہ خان عبدالغفار خان اور عبدالولی خان کے بارے میں بتایاہے۔عبدالغفار خان مصنف کے دل ودماغ پر چھائے ہوئے تھے۔ اُس کی شخصیت کاآپ نے گہرا مطالعہ کیا تھا۔آپ نے اپنی آپ بیتی میں اُن کے بارے میں بھی خوب لکھا ہے۔

اجمل خٹک نے اپنی آپ بیتی میں اپنی نجی زندگی، بچپن، مشاغل اور گھریلو حالات کے بارے میں بہت کم لکھا ہے۔ اُصولی طور پر اُنہیں پہلا باب اپنے خاندانی پس منظر، پیدائش اور بچپن کے خاص خاص واقعات کے بارے میں لکھنا چاہیئے تھا۔ اپنے والدین، بہن بھائیوں، پرائمری اور ہائی سکول کی تعلیم ، کاروبار، ادبی مشاغل، ادب کی طرف میلان غرض کئی بنیادی عنوانات آپ نے چھوئے تک نہیں جن کے بغیر کسی بھی فرد کے ذہنی، فکری، سیاسی اور سماجی ارتقاء کو سمجھنے میں مدد نہیں ملتی۔ یہ آپ بیتی جیل کے دِنوں سے شروع ہو کر جیل کے دِنوں پر ختم ہوتی ہے۔ یہ آپ کی پہلی قید وبند کی سزا تھی۔

۔جیل میں زیادہ سختی اور تشدد کی وجہ سے آپ تقریباً نیم پاگل ہو گئے تھے۔اجمل خٹک نے اپنی آپ بیتی میں اپنی ابتدائی زندگی اور سیاست میں آنے سے پہلے کے جو واقعات لکھے ہیں اُن میں چند ایک یہ ہیں:

۱۔ اجمل خٹک کی عمر پانچ یا چھ سال تھی جب غفار خان اُن کے گاؤں اور حجرے میں آئے تھے۔غفار خان کے ساتھ یہ آپ کی عقیدت کی انتہا ہے کہ اپنی آپ بیتی وہاں سے شروع کرتے ہیں جب اُن کے ساتھ بچپن میں اُن کی پہلی ملاقات ہوتی تھی۔اُس ملاقات کا ایک ایک لمحہ اُن کے ذہن میں محفوظ ہے:

> ''میری عمر پانچ یا چھ سال تھی جب باچا خان کو میں نے پہلی دفعہ دیکھا اور جو خوشی مجھے ملی تھی۔اُس کی شدت آج بھی نس نس میں موجود ہے۔ہوا یوں تھا کہ باچا خان پشتون علاقوں میں اپنے طوفانی دوروں پر تھا اور اِس سلسلے میں ہمارے گاؤں اکوڑہ خٹک بھی آرہا تھا۔ ہمارے حجرے کے باہر کچھ لڑکے اُس کے استقبال کو کھڑے تھے۔اُس نے میرے سر اور چہرے پر ہاتھ پھیرا اور کہا: بچو! آپ لوگوں کے لیے ہی تو ہم یہ ساری جدوجہد کر رہے ہیں۔''(۵۶)

اُس دِن سے لے کر زندگی کے آخری لمحات تک اجمل خٹک غفار خان کی پکار پر لبیک کہتا رہا۔غفار خان نے صحیح معنوں میں جو خدائی خدمتگار اور اپنے پیروکار پیدا کیے تھے اُن میں اجمل خٹک سب سے منفرد پیروکار ہیں۔خٹک صاحب خدمت خلق، تہذیب، شائستگی، اخلاق، عادات، نظریات، ادب غرض ہر چیز میں اپنے سیاسی مرشد غفار خان کے سچے پیروکار تھے۔

۲۔ اجمل خٹک نے اپنے کھیل کود اور بچپن کے بارے میں اختصار سے بتایا ہے۔آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ بچپن میں جب ہم لڑکے کھیلتے تھے تو ہمارے کھیلوں میں بھی کانگرس کے جلسے جلوس نکالے جاتے تھے۔سرخ کاغذوں سے ٹوپیاں بناتے، جھنڈیاں لگاتے اور گلیوں میں جلوس نکال کر سرخ پوشوں کی طرح پریڈ کرتے تھے۔چیونٹیاں لڑائیں، مرغ لڑائے اور اپنے ہم عمروں کے ساتھ کبڈیاں کھیلیں۔چنانچہ لکھتے ہیں:

> ''ایک دن اپنے گھر کے سامنے کے میدان میں اپنے ہم عمر دوستوں کے ساتھ مٹی میں بیٹھ کر اپنا پسندیدہ شغل کر رہے تھے۔آپ کو پتہ ہے ہمارا پسندیدہ مشغلہ کیا تھا؟ چلیں میں آپ کو بتاتا ہوں۔چیونٹی لڑانا ہمارا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ایسے میں کوئی خبر لایا ہے کہ ہاشم بابا کے حجرے میں مرغ لڑائے جا رہے ہیں۔پھر کیا تھا ہم سب بھاگ کر یہ لڑائی دیکھنے گئے۔''(۵۷)

۳۔ اجمل خٹک اوائل عمر میں پبّی میں ایک پرائمری سکول میں مدرس بھی رہے جس کے بارے میں آپ نے کچھ زیادہ نہیں بتایا کہ کتنا عرصہ آپ نے سکول ماسٹری کی البتہ اِتنا ضرور بتایا ہے کہ اُس نے بہت جلد اِس پیشے سے جان چھڑائی کیونکہ اُن کا مزاج اور طبیعت اس پیشے کے لیے موزوں نہ تھی۔ اجمل خٹک نے اپنی شادی اور شادی کے موقع پر کیے گئے ہنگاموں کے بارے میں تفصیل سے بتایا ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ آپ کی بیوی کا نام مجاز بیگم تھا اور جس وقت اُنہیں قید کیا گیا تو اُن کی تین مہینے کی چھوٹی بیٹی بھی تھی جو آپ کی پہلی اولاد ہیں۔(۵۸)

۴۔ اجمل خٹک سیاسی کارکن ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بڑے ادیب اور نامور شاعر بھی تھے۔ آپ نے پشتو ڈراموں میں اُس وقت کام کیا تھا جب آپ پشاور میں ہائی سکول کے طالب علم تھے۔ یہ ڈرامے خدائی خدمتگار تحریک سٹیج کرتی تھی تاکہ پٹھانوں میں بیداری پیدا کی جاسکے۔ اُس وقت سے آپ نے پشتو مشاعروں میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ پشتو کے تقریباً سارے نامی گرامی ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ آپ کے قریبی مراسم رہے۔ ضیاء جعفری، فارغ بخاری، رضا ہمدانی، خاطر غزنوی، مرزا برلاس، ڈاکٹر مرزا محمود اور مجید کا نام لے کر اُن کی دوستی، تعلق، مجالس اور محافل کا ذکر کیا ہے۔(۵۹)

اجمل خٹک نے اپنی آپ بیتی میں اپنے بارے میں یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ اُس نے سیاست اور شاعری کو دو الگ الگ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ دو مختلف بلکہ متضاد دھاروں کو اجمل خٹک نے اپنے سر میں کس طرح جگہ دی ہے اُن کے الفاظ میں:

> ''میری ذہنی کیفیات بدلتی رہتی ہیں۔ جب میں فکرِ سخن کی وادی گلگشت میں نکل جاتا ہوں تو پھر یہ بھول جاتا ہوں کہ اِس دنیا سے باہر ایک اور دنیا بھی ہے جس میں بچے یتیم ہوتے ہیں، مائیں خیرات مانگتی ہیں اور اہل سیاست دھوکہ دہی و فریب میں مبتلا ہیں۔ ہاتھوں میں رباب اُٹھائے گلے میں کشکول ڈالے اپنی بدصورت دنیا سے کوسوں دُور نکل جاتا ہوں۔ پھر یکایک اندر جیسی گھنٹی بجتی ہے اور سیاست کا پیریڈ شروع ہو جاتا ہے اور میں رندی و سرمستی کی خوبصورت دنیا چھوڑ کر سیاست کی سنگلاخ اور پُر خار راستوں پر واپس آتا ہوں۔''(۶۰)

۵۔ اجمل خٹک نے **پښتون ليگ** (پشتون لیگ) کے نام سے ایک خفیہ جماعت بنائی تھی۔(۶۱) جس میں پشتو زبان کے سرکردہ ادیبوں کو شامل کیا گیا تھا۔ آپ اِس جماعت کے صدر تھے۔ آپ اِس جماعت کے ذریعے پروپیگنڈہ کر کے پٹھان نوجوانوں کو انقلاب کے لیے تیار کرتے تھے۔ آپ موجودہ پختونخوا اور افغانستان کے پٹھان علاقوں پر مشتمل ایک

الگ ملک بنانے کے متمنی تھے۔آپ نے کبھی کھل کر بغاوت اور غداری کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ یہ کہہ کر صفائی پیش کی ہے کہ ہم پٹھانوں کے حقوق کے لیے یہ جدوجہد کر رہے تھے لیکن آزاد ذرائع اِس کے خلاف گواہی دیتے ہیں۔آپ کو پہلی مرتبہ اِسی پاداش میں گرفتار کیا گیا تھا۔

۶۔ ۱۹۵۶ء یا ۱۹۵۷ء میں اجمل خٹک کو پہلی بار گرفتار کر کے نظام پور تھانے کے حوالات میں بند کیا گیا۔اُس زمانے میں چھ مہینے تک ایک ملزم ریمانڈ پر پولیس کے پاس رِہ سکتا تھا(آج کل سولہ دِن مقرر ہیں اس سے زیادہ پولیس کسی ملزم کو اپنے پاس نہیں رکھ سکتی)۔آپ کی مذکورہ آپ بیتی اِس پہلی گرفتاری کے موقع پر لکھی گئی ہے اور یہ آپ کی زندگی کے ابتدائی ستائیس یا اٹھائیس سالوں کا احاطہ کرتی ہے۔افسوس کہ بعد میں آپ نے باقی زندگی کی سرگزشت نہیں لکھی جو کافی دلچسپ اور قیمتی ہو سکتی تھی۔

جیل میں آپ پر بے پناہ تشدد کیا گیا جس سے آپ تقریباً نیم پاگل ہو گئے تھے۔اِس لیے تواِس آپ بیتی کا عنوان بھی ''دہ خہ شۀ پاګل ووم''(کیا میں پاگل تھا) رکھا ہے۔اِن چھ مہینوں میں آپ کو پشاور اور نوشہرہ کے مختلف حوالاتوں میں رکھا گیا۔پولیس آپ پر نہ تو فرد جرم عائد کرتی اور نہ جیل بھیجتی بلکہ آپ کو تڑپا تڑپا کر جینے پر مجبور کر رہی تھی۔تاکہ اپ سے جرم کا اقرار کروایا جا سکے۔حوالاتوں میں آپ کو مارا پیٹا گیا، جنگلے کے ساتھ باندھا گیا، چھت کے ساتھ اُلٹا لٹکایا گیا، مرچوں کا دھواں سونگھایا گیا، اپ پر سانپ اور بچھو چھوڑے گئے۔(۶۲)تاہم پولیس آپ سے اپنی مرضی کا بیان نہیں لکھوا سکی۔

۷۔ اجمل خٹک نے جیل میں اپنے ساتھیوں کے قید و بند کا ذکر بھی کیا ہے۔آپ نے عبدالولی خان اور غنی خان کا بھی اختصار سے ذکر کیا ہے۔آپ نے ولی خان کی اُصول پسندی اور جیل قوانین کے احترام کے واقعات بھی لکھے ہیں۔(۶۳)

۸۔ اجمل خٹک نے اپنی آپ بیتی میں بر سبیل تذکرہ اپنی ایک عجیب عادت کا بھی انکشاف کیا ہے کہ اخبار اُن کی زندگی میں سانس لینے کی طرح ضروری ہے۔وہ لکھتا ہے کہ اخبار میری زندگی میں سب کچھ ہے۔اخبار کو اپنا دوست، عزیز، آشنا، خوراک، زندگی، شغل اور سب کچھ بتایا ہے۔آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ مجھ سے سب کچھ چھین لو میں زندہ رِہ سکتا ہوں، مجھ پر کھانا پینا بند کر و میں زندہ رِہ سکتا ہوں مگر میں اخبار اور اخبار بینی کے بغیر زندہ نہیں رِہ سکتا۔(۶۴)

''کیا میں پاگل تھا'' اجمل خٹک کی قید و بند کے زمانے کی سرگزشت ہے جس میں اس نے سیاست پر کم اور دیگر موضوعات پر زیادہ لکھا ہے۔اِس کی کئی وجوہات ہیں۔اول یہ کہ وہ دنیا کو بتانا چاہتا تھا کہ ہمارے تھانوں اور جیلوں میں انسانوں پر کتنے خوفناک ظلم کیے جاتے ہیں۔دوم یہ کہ پولیس والوں کو لامحدود اختیارات حاصل ہیں وہ جس سے چاہے اپنی مرضی کا بیان لکھوا سکتے ہیں۔تیسرا یہ کہ ابھی اُن کی عمر ستائیس یا اٹھائیس سال تھی۔سیاست اور عملی زندگی میں اُن کا زیادہ

تجربہ نہیں تھا۔آخری عمر میں لکھی گئی آپ بیتیاں زیادہ دلچسپ، معلوماتی، مفید اور پُر اثر ہوتی ہیں۔ بہر حال اس آپ بیتی میں بھی پڑھنے والوں کے لیے بہت کچھ ہے۔

اجمل خٹک جس گھرانے سے تعلق رکھتے تھے وہ ایک عرصے سے سیاست میں تھا۔اکوڑہ خٹک اور اِرد گرد کے علاقوں میں اُن کے خاندان کا بڑا اثر ورسوخ تھا۔آپ کے دادا نے بھی انگریز کے خلاف جدوجہد کی تھی جس کے متعلق اجمل خٹک نے اپنی آپ بیتی میں چند سطروں سے زیادہ نہیں لکھا۔اِس طرح آپ کے چچا اور خاندان کے دیگر لوگ کانگرس پارٹی اور پھر خدائی خدمتگار تحریک میں شامل ہو کر انگریز کے خلاف صف آرہ ہو گئے تھے۔آپ نے اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے کہ ۱۹۴۲ء میں جب پشاور کے گورنمنٹ ہائی سکول نمبر ۲ میں آپ ساتویں یا آٹھویں جماعت کے طالب علم تھے تو وہ کانگرس پارٹی کے جلسے جلسوں اور خدائی خدمتگاروں کے ساتھ مل کر احتجاج کیا کرتے تھے۔اُن کے سکول میں اُن دِنوں یونس جان خدائی خدمتگار تحریک کے صدر اور آپ نائب صدر تھے۔کانگرس کے ایک جلسے میں شرکت کی وجہ سے سکول انتظامیہ نے کچھ لڑکوں کو سکول سے خارج کر دیا۔اِس میں آپ کا نام بھی شامل تھا۔یہاں سے آپ عملی سیاست میں آئے۔نیشنل عوامی پارٹی سے اپنی وابستگی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''۱۹۵۵ء میں جب باچاخان طویل قید سے رہا ہو کر آرہے تھے تو خیر آباد پُل پر اُن کا جو تاریخی استقبال ہوا۔اُس استقبالیہ کمیٹی کا میں صدر اور آرگنائزر تھا۔اکوڑہ خٹک میں سڑک کے کنارے ایک میدان میں پُر ہجوم لوگوں کے سامنے باچا خان نے تقریر کی۔اُس موقع پر میں نے بھی ایک جذباتی تقریر کی۔جلسے کے بعد باچا خان نے مجھے اپنے ساتھ اپنی موٹر میں بٹھایا۔وہ دِن اور آج کا دن میں پارٹی کا ضلعی صدر رہا۔جنرل سیکرٹری رہا، صوبائی جنرل سیکرٹری رہا اور پھر پارٹی صدر بن گیا۔غرض اُس دِن کے بعد میں باچاخان کی گاڑی سے کبھی نہیں اُترا۔''(۶۵)

اجمل خٹک ساری زندگی خان عبدالغفار خان عرف باچاخان سے متاثر رہے۔غفار خان کے ساتھ اُن کا بہت قریبی تعلق رہا۔آپ نے اُنہیں خلوت، جلوت، تنہائی، سفر، قیام ہر موقع پر نزدیک سے دیکھا اِس لیے آپ نے اُن کے بارے میں اور اُن کی ذاتی زندگی، کردار اور شخصیت کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ قابل غور ہے۔آپ نے لکھا ہے کہ باچاخان کی خدائی خدمتگار تحریک اصلاحی بھی تھی اور سیاسی بھی، ادبی بھی تھی اور سماجی بھی۔اجمل خٹک یہ بھی لکھتے ہیں کہ کوئی بھی تحریک اُس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک لوگوں کو ذہنی طور پر تیار نہ کیا جائے۔غفار خان نے اِس سلسلے میں آزاد

سکول بنائے، مشاعرے کرائے، سٹیج ڈرامے کیے تاکہ لوگوں کا ذہن تبدیلی کے لیے تیار کیا جاسکے۔اجمل خٹک یہ بھی لکھتے ہیں کہ باچا خان کی تعلیمات اور فکر و فلسفے کا بنیادی مقصد انگریزوں سے اپنا وطن آزاد کرانا، پشتونوں میں اتفاق واتحاد پیدا کرنا اور لوگوں کو خدمت خلق کے لیے تیار کرنا تھا۔(٦٦)

باچاخان کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی کہ وہ پٹھانوں کی عادات، اُٹھنے بیٹھنے، بودوباش، معاشرت، معیشت اور ادب میں صحت مند تبدیلی لائے۔ وہ اپنی قوم کو روشن خیال بنانے کے آرزومند تھے۔اِس سلسلے میں اُس نے عملی اقدامات کیے اور اپنی ذات سے آغاز کیا۔ چنانچہ اجمل خٹک لکھتے ہیں:

> ''باچاخان کی بڑی کوشش تھی کہ کس طرح پشتون تجارت اور کاروبار کی طرف آئیں۔اِدھر پٹھان کاروبار اور دُکانداری سے نفرت کیا کرتے تھے۔ لوگ برملا کہتے کہ ہم ہندوؤں کی طرح ترازو لے کر بیٹھیں گے؟ یہی وجہ تھی کہ باچاخان چارسدہ اور مردان کے منڈیوں میں جاتے وہاں ترازو ہاتھ میں لے کر بیٹھ جاتے تاکہ لوگوں کے ذہنوں سے عار نکل جائے۔''(٦٧)

غفار خان نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ہشت نگر کے اِس سے بڑے زمیندار اور خان نے اپنا سب کچھ تیاگ کرکے قوم کی خدمت کے لیے خود کو وقف کر دیا تھا۔ایک گٹھڑی جس میں ایک جوڑا کپڑے ہوتے تھے اپنے پاس رکھتے تھے۔ وہ لوگوں کو بھی ہر وقت یہ سبق دیتا تھا کہ ''اپنا کام ہمیشہ خود کریں'' ۔ چنانچہ اجمل خٹک اپنی آپ بیتی میں تحریر کرتے ہیں:

> ''باچا خان اپنا سامان ہمیشہ خود اُٹھاتے اور اگر کوئی اُن کا بوجھ اُٹھاتا تو سخت غصہ ہوتے۔ ایک دفعہ میں اور باچا خان نماز پڑھ کر ایک مسجد سے نکل رہے تھے کہ ایک شخص نے آگے بڑھ کر باچاخان کے جوتے اُٹھانے چاہے۔ باچاخان نے انکار کیا اور پوچھا میں اپنے جوتے آپ کو کیوں اُٹھانے دوں؟ اُس شخص نے کہا کہ ثواب کا کام ہے اِس لیے۔ باچا خان نے فوراً جواب دیا کہ اگر دوسروں کے جوتے اُٹھانا ثواب ہے تو تم اپنے جوتے مجھے دے کر مجھے ثواب کمانے کا موقع کیوں نہیں دیتے۔''(٦٨)

اجمل خٹک نے لکھا ہے کہ باچا خان انتہائی سادہ اور عام فہم انداز میں لوگوں سے مخاطب ہوتے مثلاً ایک دفعہ

پشتونوں کے مجمعے کے سامنے کہا:

"آپ کو معلوم ہے کہ انگریز کے دو منہ ہیں۔ ایک کھانے کے لیے اور دوسرا لوگوں کو ہڑپ کرنے کے لیے۔ جلسے سے آوازیں اُٹھیں نہیں فرنگی کو تو ہم نے دیکھا ہے اُن کا تو صرف ایک ہی منہ ہے۔ اس پر آپ نے غضبانک ہو کر کہا کہ پھر آپ فرنگی سے اِتنا خوف کیوں کھاتے ہو؟ اگر فرنگی کسی کو کھاتے نہیں تو تم ان کے خلاف احتجاج کے لیے گھروں سے باہر کیوں نہیں آتے۔" (۶۹)

حقیقت یہ ہے کہ باچاخان نے پشتون قوم کی اصلاح کے لیے بہت کچھ کیا۔ اُن کی یہ کوشش تھی کہ اُس کی قوم ہر طرح کے بُرے رسوم ورواج کو ترک کر دے۔ پشتون ذات پات میں تقسیم تھے۔ باچاخان نے اُن کمہاروں، موچیوں، جولاہوں اور نچلے طبقے کے لوگوں کو اپنی تنظیم میں بڑے بڑے عہدے دیے اور اُن میں آزادی کی تڑپ پیدا کی۔ اجمل خٹک نے یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ جب تک انگریز کے خلاف آزادی کی جنگ میں پٹھان شامل نہیں ہوئے تھے۔ یہ تحریک نتیجہ خیز نہیں تھی لیکن جب کانگرس کے شانہ بشانہ پشتون بھی آزادی کی جنگ میں شامل ہو گئے تو پھر انگریز کا جانا یقینی ہو گیا۔ اجمل خٹک نے یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ باچاخان میں نفرت، تعصب اور تخریبی سوچ بالکل نہیں تھی۔ وہ کسی طرح بھی اِس دنیا کے انسان نہیں لگتے تھے۔ وہ اپنے شدید ترین مخالفین اور دشمنوں کے ساتھ بھی خندہ پیشانی اور محبت سے پیش آتے تھے۔ اِس سلسلے میں اجمل خٹک ایک واقعہ لکھتے ہیں:

"ایک دفعہ ہم داودزئی میں پیدل جارہے تھے۔ ایک جگہ باچاخان نے رُک کر کہا کہ وہ سامنے فلاں شخص کا حجرہ نہیں؟ ہم نے کہا، ہے (وہ آدمی کبھی ہماری پارٹی میں تھا۔ اب وہ مسلم لیگی ہو گیا تھا اور گھر پر اُس نے مسلم لیگ کا جھنڈا لگایا تھا)۔ کسی نے کہا کہ وہ آدمی اب مسلم لیگ میں شامل ہو گیا ہے۔ باچاخان نے کہا تو کیا ہوا، ہے تو ہمارا دوست۔ اُس نے ہمیں چھوڑا ہو گا لیکن ہم نے تو اُنہیں نہیں چھوڑا۔ سیدھا اُن کے حجرے میں گئے نہ اُن سے کوئی گلہ کیا اور نہ شکایت کی۔ وہ شخص سخت شرمندہ تھا۔ اِسی اثنا میں اُس نے اپنے بیٹے کو اشارہ کیا کہ گھر پر لگا ہوا مسلم لیگی جھنڈ اُتار کر کانگرس پارٹی کا جھنڈا لگا دے۔ باچاخان کچھ وقت اُن کے ساتھ رہے اور جب تک وہاں رہے وہ آدمی سخت نادم نظر آرہا تھا۔ باچاخان اپنے مخالفین کو اِس

قسم کے اخلاقی شکست دیا کرتے تھے۔''(۷۰)

اجمل خٹک نے خدائی خدمتگار تحریک کا طویل تجزیہ پیش کیا ہے کہ کس طرح اِس تحریک نے لوگوں میں آزادی کی تڑپ، بیداری اور ذہنی آزادی پیدا کی۔اِس تحریک نے قوم کو متحد کیا اور اُن کے دِلوں سے انگریز کا خوف مٹایا۔ تاہم خٹک صاحب نے یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ اِس تحریک نے وہ اہداف حاصل نہیں کیے جو باچا خان کے پیش نظر تھے اور آخر میں خدائی خدمتگار تحریک کے خاتمے کے اسباب بیان کیے ہیں۔

عوامی نیشنل پارٹی میں غفار خان کے بعد اُن کا بیٹا ولی خان اُن کا سیاسی جانشین بنا۔ ولی خان کی شخصیت پر بھی اُن کے باپ کا گہرا اثر تھا۔ پاکستان کے جن سیاستدانوں کو اُصول پرست، جمہوریت پسند، اور ہر قسم کے خوف اور دباؤ سے آزاد سیاست دان ہونے کا فخر حاصل ہے اُن میں ایک نام ولی خان کا بھی ہے۔ ولی خان کی ساری جدوجہد کا مقصد یہ تھا کہ یہ ملک فوجی حکمرانی، بیوروکریسی، اسٹبلشمنٹ اور ہر قسم کے جبر وخوف سے نکل کر صحیح معنوں میں ایک جمہوری ریاست بن جائے۔اِس مقصد کے لیے اُس نے طویل قربانیاں دی ہیں۔ اُنہیں جیلوں میں ڈالا گیا، اُن کی ذات کو نشانہ بنایا گیا، اُنہیں غدار اور غیر ملکی ایجنٹ قرار دیا گیا تاہم ولی خان نے اپنے باپ کی طرح جس منزل کا تعین کیا تھا کوئی چیز اُنہیں اپنے مقصد سے نہ ہٹا سکی۔ اجمل خٹک کو باچا خان اور ولی خان دونوں سے قریبی تعلق رہا بلکہ ولی خان کے تو وہ ''یارِ غار'' تھے۔ ولی خان کے ساتھ اُن کی دوستی چالیس سال کے عرصے پر محیط تھی۔ جیل، گھر، سفر، قیام ہر جگہ دونوں ساتھ ساتھ رہے۔ تاہم ''کیا میں پاگل تھا'' اجمل خٹک کی اُس وقت کی یادگار ہے جب اُس کی عمر ستائیس یا اٹھائیس سال تھی اور ولی خان کے ساتھ اُن کی دوستی کی ابھی شروعات تھی لیکن پھر بھی ولی خان کی شخصیت اور کردار کے بارے میں اُس نے چند بنیادی باتیں بتائی ہیں:

> ''وہ (ولی خان) بین الاقوامی لیول کا لیڈر رہے۔ اُن کا مطالعہ حیرت انگیز ہے۔ ولی خان نے آج کل اپنے طوفانی دوروں سے سارے بنگال کو لرزہ کر رکھ دیا ہے۔ میرا دوست میرا بھائی ولی خان مجھے ڈھونڈ رہا ہوگا اُنہیں معلوم نہیں کہ سی۔آئی۔ڈی کے کارندوں نے مجھے چوروں کی طرح اغوا کر لیا ہے اور اس تنگ وتاریک عقوبت خانے میں تشدد کرتے کرتے پاگل کر دیا ہے۔'' (۷۱)

غرض مصنف نے اپنی آپ بیتی میں ولی خان کے کردار اور اُصول پرستی کی بڑی تعریف کی ہے۔

۴۔ اجمل خٹک نے لڑکپن میں سٹیج ڈراموں میں بھی حصہ لیا تھا۔آپ نے اپنی سرگزشت میں یہ بھی لکھا ہے کہ جب آپ پشاور میں سکول کے طالب علم تھے اور وہاں کے ہاسٹل میں رہائش پذیر تھے تو سکول کی طرف سے سٹیج ڈراموں میں بھی حصہ لیا کرتے تھے۔آپ نے خدائی خدمت گار تحریک کے نیچے ترتیب دیے گئے ڈراموں میں بھی حصہ لیا۔اُس زمانے میں

نشتر ہال نہیں بنا تھا بلکہ چوک یادگار کے قریب ایک اڈیٹوریم میں ڈرامے پیش کیے جاتے تھے۔آپ نے یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ بچپن میں اُنہیں بھیس بدلوا کر جاسوسی کے لیے بھی استعمال کیا گیا۔ کانگرس کے بڑے بڑے لیڈر یا تو گرفتار تھے یا روپوش، اُن تک پیغام رسانی کے لیے کئی لڑکوں کو استعمال کیا گیا جن میں مصنف بھی شامل تھے۔ اس بارے میں اجمل خٹک لکھتے ہیں:

''ہمیں چند لڑکوں کو ناٹک کے سلسلے میں دہلی لے جایا گیا۔ ہمیں تو یہ بتایا گیا تھا کہ ایک ڈرامے میں آپ لوگوں کو کاسٹ کیا گیا ہے۔ میں یونس جان، طارق لالہ، امیر اور کئی اور لڑکے اس ٹولی میں شامل تھے۔ دہلی پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہ تو کوئی اور ڈرامہ تھا۔ ہمیں قطب مینار کے پاس فقیروں اور بھکاریوں کی شکل میں بٹھایا گیا۔ ایک ہندو لڑکا شانتی مرد اور میں عورت کا کردار کر رہے تھے۔ عام لوگوں کے لیے تو ہم بھکاری تھے لیکن دراصل کچھ لوگ آکر ہماری جیبوں میں بند لفافے ڈالتے پھر تھوڑی دیر بعد کچھ اور لوگ آکر ہمارے جیبوں سے یہ لفافے نکال لیتے۔ یہ دراصل کانگرس کے روپوش رہنماؤں اور دیگر لوگوں کے درمیان رابطوں کا ذریعہ تھا۔ شام تک ہم یہ ناٹک کرتے رہے۔آج بھی جب یاد آتا ہے تو کلیجہ منہ کو آجاتا ہے کہ ہم بہت خطرناک ڈرامہ کھیل رہے تھے۔ بھانڈا پھوٹ جانے کی صورت میں اس کا انجام بھی خوفناک ہو سکتا تھا۔''(۷۲)

اجمل خٹک نے شکوہ کیا ہے کہ آزادی حاصل کرنے کے بعد انڈیا کے لیے آزادی کی جنگ لڑنے والے متوالوں کو بڑے بڑے منصب عطا کیے گئے۔ اُنہیں سپیشل کارڈز دیئے گئے تھے اور خصوصی مراعات سے نوازا گیا تھا جبکہ دوسری طرف پاکستان میں آزادی کی جنگ لڑنے والوں کی سختیاں ختم نہ ہو سکیں۔ اُن پر اُس سے بھی بدترین تشدد کیا گیا۔

مصنف نے لکھا ہے کہ پاکستان بننے کے بعد تو اس ملک میں سیاست ہی ختم ہو گئی۔ کابینہ میں تقریباً سارے نوکر، بیوروکریٹ اور نوکر شاہی کے دیگر افراد شامل تھے جنہوں نے قائدِ اعظم اور لیاقت علی خان کو مروایا۔ اُن دونوں کی موت کے ساتھ ہی یہاں سیاست بھی ختم ہو گئی۔

حوالات میں بھی اجمل خٹک کی غیرت اور خودداری میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ حوالات میں اُن پر تشدد کر کے بھی پولیس کے کارندے ناکام رہے تو آپ کو دیگر طریقوں سے ٹارچر کرنا شروع کیا۔ اُنہیں معلوم تھا کہ ''غفار خان'' ان

کی سب سے بڑی مجبوری ہے چنانچہ غفار خان کی شان میں گستاخی کر کے ایک طرف توآپ کو مشتعل کیا جاتااور دوسری طرف یہ دیکھا جاتا کہ واقعی آپ پاگل ہوگئے ہیں یا پاگل ہونے کاڈرامہ رچارہے ہیں۔اسی سلسلے میں جب ایک پولیس کپتان نے غفار خان کو گالیاں دیں تو مصنف نے بھی وہ ترکی بہ ترکی جواب دیا کہ آس پاس کے لوگ انگشت بہ دنداں رہ گئے۔ مصنف اس واقعے کاذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دورے پر آنے والے پولیس کپتان نے میرے حوالات کے انچارج تھانیدار سے کہا کہ اس کو میرے حوالے کردو اس کا علاج میرے پاس ہے میں نے اس کے بڑے پنڈت کو ٹھیک کیا ہے۔ میں نے جنگلے کے اندر سے آواز دی کون سا پنڈت ؟ اس افسر نے جواب دیا وہ تیرا باپ۔ وہ بیس گز لمبا۔ وہ گاندھی کا بیٹا۔ یہ سن کر میرا بھی صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میں نے تڑ سے کہا۔ پنڈت ہو گا تیرا باپ، گاندھی کا بیٹا تو تیرا وہ ٹوڈی دادا ہو گا اور بیس گز لمبا تیرا انگریز کا تالی چٹ بابا ہو گا۔ بے غیرت میں تمھیں نہیں جانتا؟ ساری عمر تیرے باپ دادا نے انگریزوں کے کاسہ لیسی کی ہے۔ تیری ماں اور دادی نے انگریزوں کی خدمت کی۔آج تم بھی افسر ہو کر میرے بزرگوں کی شان میں گستاخی کر رہے ہو۔'' (۷۳)

اس طرح مصنف نے ایک اور پولیس کپتان اور تھانے کے انچارج کو اُس وقت اپنے دانتوں سے کاٹا جب وہ جنگلہ پکڑ کر غفار خان اور ولی خان کی شان میں مغلظات بک رہے تھے۔ اجمل خٹک نے پڑھنے والوں کو یہ باور کروایا ہے کہ وہ اپنے باپ دادا کی گالیاں تو برداشت کر سکتے ہیں لیکن غفار خان اور ولی خان کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سن سکتے۔

''کیا میں پاگل تھا'' کے مصنف نے لکھا ہے کہ ہمارے تھانوں کا ماحول سخت خراب ہے اور ملزموں پر بے پناہ تشدد کیا جاتا ہے۔ ساری دنیا میں جیل خانے اصلاحی مراکز ہوتے ہیں جہاں جرائم پیشہ لوگوں کی نفسیاتی اور جسمانی اصلاح کر کے اُنہیں تعمیری سرگرمیوں کی طرف راغب کیا جاتا ہے جبکہ ہمارے ہاں تھانے ظلم و بربریت کی نشانیاں ہیں۔ یہاں اچھے بھلے لوگ جرائم پیشہ اور منشیات کے عادی بن جاتے ہیں۔ حقوق انسانی کی تنظیموں کی طرف سے بھرپور دباؤ کے باوجود آج کل کے تھانہ کلچر اور انگریز زمانے کے تھانوں میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی ہے۔ جن حوالاتوں میں آپ کو بند رکھا گیا اُن تھانوں کا خراب ماحول اور قیدیوں کے ساتھ انسانیت سوز سلوک کے بارے میں اپ نے جو نقشہ کھینچا ہے اُس کے سامنے فرعون اور چنگیز خان کے عقوبت خانے بھی کچھ نہیں تھے چنانچہ تحریر کرتے ہیں:

''اس تھانے میں دو حوالات ہیں مردانہ اور زنانہ۔ مجھے زنانہ حوالات میں ڈالا گیا ہے۔اِس حوالات میں ایک ٹٹی بھی ہے جس کی ساری غلاظت دروازے سے بہہ کر حوالات کے فرش پر آتی ہے۔ جگہ اِتنی تنگ ہے کہ بہ مشکل دو آدمی ساتھ لیٹ سکتے ہیں۔ سارے فرش پر بول و براز اور چھوٹا پیشاب پھیلا ہوا ہے۔ جس کی بُو سے دماغ پھٹا جاتا ہے۔ دوسرا ظلم یہ کیا گیا ہے کہ دوسرے مردانہ حوالات کے سارے کمبل، لحاف اور رضائیاں یہاں ڈھیر کر دی گئی ہیں جن پر لگے کٹمل اور جوئیں آزدانہ گھوم پھیر رہی ہیں۔ میرے حوالات میں آدھی جگہ جوؤں، بچھوؤں، لال بیگوں اور دیگر حشرات الارض نے گھیر رکھی ہے اور آدھی جگہ پر بول و براز بہہ رہا ہے۔اِس میں میری جگہ کہاں ہے لیکن بہر حال ایک دِن، ایک ہفتہ یا ایک گھنٹے کی بات تو ہے نہیں پورے چھ مہینے کا عرصہ میں نے اِس غلیظ جگہ گزارنا ہے۔ میں نے مجبوراً آنکھیں بند کر لیں۔ اپنے اُوپر اپنا برسوں کا رفیق، اور غمخوار چادر ڈال دیا۔اِس جہنم میں مجھے باقی چھ مہینے گزارنے ہیں۔''(۷۴)

اجمل خٹک کا مشاہدہ نہایت تیز ہے۔ وہ اپنے اِرد گرد کے ماحول کا ہر وقت جائزہ لیتے رہتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں پر بھی اُن کی نظریں جاتی ہیں۔وہ چیونٹیوں سے بھی بڑا سبق حاصل کرتے ہیں۔ چیونٹیوں کی عادات، ملنا، الگ ہونا، لڑنا اور اتفاق واتحاد پر آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ آپ کے گہرے مشاہدے کی دلیل ہے۔اِس کے علاوہ آپ نے پاگلوں اور سودائی لوگوں کی نفسیات اور روزمرہ معمولات کی جو بھرپور عکاسی کی ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی نظر کتنی تیز ہے اور آپ اپنے اِرد گرد کے ماحول کا کتنی باریک بینی سے مشاہدہ کرتے ہیں۔(۷۵)

اخبار بینی اُن کی زندگی کا سب سے دلچسپ مشغلہ ہے۔ اخبار اُن کی زندگی میں سب کچھ ہے۔اِس لیے اخبار کو اپنا دوست، عزیز، آشنا، خوراک، زندگی اور شغل سب کچھ بتایا ہے۔ چنانچہ حوالات میں ٹھیک پانچ مہینے بعد جب ایک پرانے اخبار کا تراشا مل جاتا ہے تو اِتنے خوش ہو جاتے ہیں گویا دنیا کا بڑا خزانہ ہاتھ آیا ہو۔اِس وقت کے اپنے احساسات بڑی سچائی سے بیان کیے ہیں۔اخباری تراشے میں جب وہ پشاور میں منعقدہ ''انجمن ترقی اُردو'' کے کسی اجلاس کے بارے میں پڑھتے ہیں تو اُنہیں پشاور کے اپنے ادیب دوست اور شاعر ایک ایک کرکے یاد آجاتے ہیں۔اِس موقع پر اجمل خٹک نے پشاور کے شاعر دوستوں ضیا جعفری، فارغ بخاری، رضا ہمدانی، خاطر غزنوی، مظہر برلاس، ڈاکٹر مرزا محمود وغیرہ کا ذکر بڑی عقیدت سے کیا ہے۔ اُن

کے ساتھ اپنا تعلق، دوستی، مجالس، محافل اور ادبی سرگرمیوں کا ذکر نہایت اختصار سے کیا ہے۔(۷۶)

۸۔ اجمل خٹک کسی بھی موقع پر حق بات کہنے سے نہیں جھجکتے۔ حق گوئی اُن کی زندگی کا سب سے بڑا وصف تھی۔ اُن کی چند خصوصیات ایسی ہیں کہ بڑے سے بڑا مخالف بھی اُس کا اعتراف کرتا ہے۔ اُن کی درویشی، قناعت، سچائی، ہر قسم کی بدعنوانی سے پاک سیاسی زندگی اور شاعرانہ عظمت ایسی خوبیاں ہیں جو اُن کی شخصیت کو مثالی بناتی ہیں۔ یہ وہ خصوصیات ہیں جو اُنھوں نے اپنے بڑوں، خدائی خدمتگار تحریک اور کانگرس کے لیڈروں سے سیکھی تھیں۔ نئے زمانے کے ساتھ ساتھ حالات بھی تبدیل ہوگئے ہیں۔ آج کل کے سیاسی لوگ ایک دِن ایک سیاسی پارٹی اور دوسرے دِن کسی دوسرے سیاسی پارٹی کے گیت گا رہے ہوتے ہیں اور کوئی سبکی محسوس نہیں کرتے۔ نظریاتی سیاست پرانی پود کے ساتھ تقریباً دفن ہو چکی ہے۔ اپنی بات سے مکر جانے اور جھوٹ بولنے (یوٹرن لینا) کا زمانہ ہے۔ باوقار اور سنجیدہ سیاست کی محفل میں خال خال لوگ رہ گئے ہیں۔ اجمل خٹک حق بات کہنے میں اِس قدر بے خوف تھے کہ ہر بڑے سے بڑے خطرے کو مول لینے کو تیار رہتے تھے۔ ایک مرتبہ جب اُنہیں حوالات سے عدالت میں جج کے سامنے پیش کیا گیا تو جج نے اُن کی بڑھی ہوئی داڑھی، دھول سے اَٹے ہوئے لمبے بال، پاگلوں جیسا حلیہ اور ہیت کزائی کو دیکھ کر تعجب سے پوچھا۔ یہ کیا اچھے بھلے شریف آدمی کو کیا بنا کر لائے ہو تو اِس موقع پر اجمل خٹک نے جج کو مخاطب کرکے انتہائی بے باکی سے کہا:

> ''میں نے اپنی لمبی داڑھی، بڑی بڑی مونچھوں، لمبے ناخنوں، گندے پھٹے ہوئے بدبودار کپڑوں اور اپنے غلیظ وجود کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ یہ آپ کی پولیس اور انتظامیہ کے کارنامے ہیں۔ یہ اسلامی جمہوری مملکت کے برکات ہیں اور یہ آزادی کا ثمر ہے اور آخر میں جب یہ شعر پڑھا:
>
> کل کتنی اُونچی قیمت پر لوگ فروخت ہو رہے تھے
> اور ہم پاگل مفت میں اپنے سروں کی قربانیں دے رہے تھے
>
> تو جج صاحب کا چہرہ متحیر ہوگیا۔''(۷۷)

''کیا میں پاگل تھا'' اصل آپ بیتی پشتو زبان میں لکھی گئی ہے اور یہ اِس کا اُردو ترجمہ ہے۔ ظاہر ہے کہ جو مٹھاس، شیرنی، روانی اور دلپذیری اصل کتاب میں ہے وہ ترجمہ شدہ کتاب میں نہیں۔ ترجمہ شدہ تصنیف میں جو خامیاں ہوسکتی ہیں وہ سب مذکورہ کتاب میں موجود ہیں جس کی طرف آگے چل کر اشارے کیے جائیں گے۔ ترجمہ انتہائی مہارت کا کام ہے۔ ترجمہ کرنے والے نہ صرف ایک زبان کی لذت دوسری زبان میں من و عن منتقل کرتے ہیں بلکہ بعض اوقات تو ترجمے میں اپنا تخلیقی رنگ شامل کرکے ترجمہ شدہ تصنیف کو اصل تخلیق کے قریب قریب پہنچا دیتے ہیں۔ لیکن اِس کے باوجود

کسی بھی صنف ادب کا اصل زبان میں پڑھنے کا مزا ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ بڑے سے بڑا ترجمان بھی درمیان میں خلا چھوڑ دیتا ہے جس سے ترجمے میں سخت تشنگی اور ادھورے پن کا احساس موجود رہتا ہے۔ فرانسیسی، روسی، عربی اور دیگر زبان کے ادب سے اُردو میں کیے گئے تراجم اِس کی بڑی مثال ہیں لیکن اِن سب باتوں کے باوجود اُردو میں دیگر زبانوں سے تراجم کا سلسلہ جاری ہے بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ اِس کی رفتار میں تیزی آئی ہے۔ تراجم کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ دونوں زبانوں کے لسانی روابط بڑھتے ہیں۔ خود ہماری زبان اُردو دیگر زبانوں سے ذخیرہ الفاظ، روزمرے، محاورے، الفاظ، تراکیب اور نئی اصطلاحات لے کے ثروت مند ہو رہی ہے جو کسی بھی ترقی یافتہ اور زندہ زبان کے لیے شرط اولین ہے۔

اِس بات میں تو کوئی شک نہیں کہ پشتو زبان کے محاورات اور تراکیب کا ذخیرہ اُردو زبان سے زیادہ ہے۔ اِس زبان کے ضرب المثال، کہاوتوں اور تراکیب کا دائرہ کار بھی دنیا کے کسی بھی ترقی یافتہ زبان کے ہم پلہ ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ پشتون بحیثیت مجموعی اَن پڑھ چلے آئے ہیں۔ اُن کی زبان کا تحریری سرمایہ زیادہ نہیں لیکن سینہ در سینہ منتقل ہونے والے ادب میں اس زبان کا جواب نہیں۔ ایک روایتی پٹھان غیور، باتونی، بات سے بات نکالنے والا، بے دھڑک بولنے والا، حاضر جواب، بات بات پر کہاوت کہنے والا اور شیرین زبان ہوتا ہے۔

مذکورہ آپ بیتی کا ترجمہ کرتے وقت مترجم نے بڑی حد تک کوشش کی ہے کہ اُردو کے اُن الفاظ اور تراکیب سے مفہوم واضح کرے جو مصنف کے مزاج کے بے حد قریب ہوں تاہم کئی موقعوں پر وہ اپنے مقصد میں ناکام رہا ہے۔ جہاں جہاں مترجم کو اُردو کے متبادل الفاظ اور محاورات نہیں ملتے وہ پشتو سے براہ راست ترجمے پر اکتفا کرتا ہے۔ ترجمے کے باب میں یہ بڑی غلطی تصور ہوتی ہے۔ مصنف نے غیر ارادی طور پر اُردو کو نئے محاورات، انوکھے تراکیب اور خوبصورت الفاظ دے کر ایک طرح سے اُردو زبان کا دامن مالا مال کیا ہے۔ اس کی چند مثالیں یہ ہیں:

۱۔ وہ ایک تھپڑ کا آدمی نہیں تھا (حالانکہ اردو میں اِس کے متبادل کم حیثیت اور کم تر جیسے الفاظ موجود تھے)۔(۷۸)

۲۔ اگر آپ نے درست حال بتایا تو سفید باز رہو گے (بغیر کسی خوف و خطرے کے رہو گے)۔(۷۹)

۳۔ میں تمہیں آسمان کے تارے دکھاؤں گا (اُردو میں یہ محاورہ تارے گننا ہے۔)۔(۸۰)

۴۔ میں اُنہیں پنڈلیوں سے پہچانتا ہوں (میں اُسے خوب جانتا ہوں)۔(۸۱)

۵۔ کوئی ہمت کرے تو سوئی کے سم سے بھی نکل سکتا ہے (بڑی سے بڑی کامیابی حاصل کرنا)۔(۸۲)

۶۔ اُس وقت میں دِل ہی دِل میں بویائی اور کٹائی میں مصروف تھا (قسم قسم کے اندیشوں اور وسوسوں میں گھرا ہوا تھا)۔(۸۳)

۷۔ جب ساری محنت دریا بہالے جائے (دریا بُرد ہو جائے)۔(۸۴)

۸۔ گویا آدھی زمین اور آدھا آسمان اُس کا ہو (گویا وہ سیاہ و سفید کا مالک ہو)۔(۸۵)

۲۔ ضرب الامثال:

ضرب الامثال پشتو زبان میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں جو مقرر یا مصنف پشتو زبان میں ضرب الامثال روانی اور برجستگی سے استعمال کرتا ہو اُن کی تعریف کی جاتی ہے جو فصاحت و بلاغت اور زبان پر بے پناہ قدرت کی دلیل ہے۔ خیبر پختونخوا کے دُور دراز علاقوں اور گاؤں میں رہنے والے بوڑھے اَن پڑھ مگر جہاندیدہ لوگ اور بوڑھی عورتیں جس کمال مہارت سے اپنی زبان میں محاورات، ٹپے اور کہاوتوں کا استعمال کرتے ہیں اچھے بھلے تعلیم یافتہ نوجوان اُن کے سامنے طفلِ مکتب معلوم ہوتے ہیں۔ اجمل خٹک جو پشتو کے ایک اچھے لکھاری، شاعر، ادیب، مقرر اور صحافی ہیں اِس میدان میں کیسے پیچھے رِہ سکتے تھے۔ چنانچہ اپنی آپ بیتی میں آپ نے قدم قدم پر ضرب الامثال کا استعمال کیا ہے۔ مترجم نے اُن کے زیادہ تر محاورات کا رواں اردو ترجمہ دیا ہے جبکہ بعض کا اُردو میں متبادل کہاوتیں ڈھونڈ کر پیش کی ہیں اور اکثر پشتو سے اردو میں براہ راست لکھا ہے:

۱۔ تم سو کہو گے یا ہزار اِس سلوک کا سامنا کرو گے (مرے پہ سوڈرے)۔(۸۶)

۲۔ میں کیا کہہ رہا ہوں اور میرا باجا کیا کہہ رہا ہے (من چہ گویم و تنبور من چہ سراید)۔(۸۷)

۳۔ ایک طرف لٹھ اور دوسری طرف بھیڑیا تھا (ایک طرف کنواں اور دوسری طرف کھائی)۔(۸۸)

۴۔ ناک سے پکڑو تو دَم نکلے (کاٹو تو بدن میں لہو نہیں)۔(۸۹)

۵۔ بھیڑیا مر گیا ہے اور بھیڑیں بے فکر چَر رہی ہیں (لیوۀ مړ دے گډې وچې وچې سري)۔(۹۰)

۶۔ وہ اپنی دستار سے لوگوں پر رُعب ڈالتا تھا (په پګړۍ دې شوم غلطه . . . .)۔(۹۱)

۷۔ کچھ اُن کے لیڈر گندے تھے اور کچھ عوام (څۀ مېچن خچنه څۀ مېرمن خچنه)۔(۹۲)

۸۔ دُنیا اِن سے ناک چھپائے گی (دُنیا به ترې پوزه پټه کړي)۔(۹۳)

اجمل خٹک کے اسلوب کی ایک بڑی خصوصیت اس کا افسانوی انداز ہے۔ وہ ایک عام واقعے کو جان بوجھ کر داستان کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔ مصنف کو کہانی سنانے کا اِس قدر اشتیاق ہے کہ کہانی سناتے سناتے خود بھی دُور چلا جاتا ہے اور قاری کو بھی اپنے ساتھ کسی اَن دیکھی دنیا کے سفر پر روانہ کر دیتا ہے۔۔ مزے مزے سے اپنی اور دوسروں کی کہانی سنانا اُنہیں مرغوب ہے اور وہ قاری سے یہ توقع رکھتا ہے کہ اُس کے قصے میں بھرپور دلچسپی لیں گے۔ ایک مرتبہ جب آپ

نے حوالات میں پانی مانگا تو پانی کی جگہ اُنہیں کوئی غلیظ اور بدبودار چیز پلائی گئی۔ پھر اس نے پورا دِن پانی مانگنے کی جرأت نہ کی۔ گرمی کے دِن تھے جب پیاس حد سے بڑھ گئی تو اپنی آنکھیں بند کر لیں اور پھر قصہ سنانے بیٹھ گیا:

> ''میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور ذہن میں دنیا جہان کے پانی کے ذخیرے یاد آنے لگے۔ کبھی امیرو کے نیلے ٹھنڈے چشمے کے کنارے پہنچ جاتا اور کبھی اپنے گاؤں کے سب سے یخ بستہ تالاب تک چلا جاتا۔ کبھی دریائے سندھ کے شیرین پانی سے چُلو بھرتا اور کبھی غور بند دریا کے پانی میں گلچھڑے اُڑا تھا۔ زندگی میں جتنے کنویں، دریا، جھیل اور پنگھٹ دیکھے تھے سب ایک ایک کر کے ایسے یاد آنے لگے گویا کل کی بات ہو۔ میں نجیب آباد کے اُس چھ گز گہرے کونویں تک بھی پہنچا جو میں نے آخری مرتبہ آج سے پندرہ سال پہلے دیکھا تھا اور جو لق ودق صحرا میں مسافروں کے لیے کسی آبِ حیات کے چشمے سے کم نہ تھا۔ اس کونویں کے پانی کو دیکھ کر منہ سے بے اختیار چیخ نکلی اور جب آنکھ کھولی تو نجیب آباد کے کنویں کی بجائے میرے سامنے کالا سنگلاخ جنگلا تھا اور چاروں طرف بلند ترین مضبوط دیواریں۔'' (۹۴)

اجمل خٹک چونکہ بنیادی طور پر شاعر ہیں اس لیے وہ شاعرانہ اسلوب سے اپنا دامن نہیں بچا سکے۔اُس نے اصل متن میں خود اپنے سوا خوشحال خان خٹک اور دیگر شاعروں کے اشعار یا مصرعے تحریر کیے ہیں۔ وہ کبھی اپنا بیان رنگین بنانے، کبھی اپنی بات کو موئثر بنانے اور کبھی مخالفین کو لاجواب کرنے کے لیے اشعار کا برمحل اور بروقت استعمال کرتے ہیں۔افسوس کہ مترجم نے ترجمہ کرتے وقت اشعار کا منظوم اُردو ترجمہ کرنے کے بجائےاِن اشعار کا مفہوم اور سادہ نثر نقل کیا ہے ورنہ منظوم ترجمے کا زیادہ مزا آتا۔اجمل خٹک اپنی تحریر میں شاعرانہ اور دِل کو چھو لینے والی طرز تحریر کو کام میں لاتے ہیں:

> ''جب اِس گھٹن اور حبس زدہ ماحول میں میرے دردناک نالوں کا جواب تھانیدار نہیں دے رہا تھا تو اِس قیامت خیز ماحول میں اور کون تھا جس سے میں انصاف کی توقع کرتا۔اللہ پاک اُوپر آسمانوں میں تھا اور انصاف زمین پر ظالموں کی ظالم بادشاہی میں دونوں آنکھوں سے اندھا ہو چکا تھا۔ میری آواز کون سنتا۔''(۹۵)

اچھی تحریر کا یہ خاصا ہے کہ تحریر نگار اپنے اِرد گرد کے ماحول کی منظر کشی کر کے قاری کو اپنے ساتھ اُس جگہ ،

مقام، ماحول اور فضا میں لے جاتا ہے جس کا بیان مقصود ہو۔ اکثر ایک عبارت پر مشتمل بہترین منظر نگاری درجن بھر صفحات سے زیادہ موئثر اور کامیاب ہوتی ہے۔ ادب کا ایک مقصد ابلاغ بھی ہے۔ تخلیق کار جو کچھ پڑھنے والے کو پہنچانا چاہتا ہے اگر وہ متاثر کون اور مختصر مگر جامع انداز میں پہنچے تو یہ اُس کی بڑی کامیابی ہے۔ منظر نگاری بھی ایک ہنر ہے۔ اِس ہنر کو گنتی کے چند لوگ بروئے کار لا سکتے ہیں اور اجمل خٹک اُن فنکاروں میں سے ہیں۔ منظر نگاری میں اگر بیان اور اِرد گرد کے ماحول کی منظر کشی زیادہ طوالت اختیار کر لے یا قدم قدم پر مصنف منظر کشی کی طرف توجہ دیتا رہے تو یہ سخت نقصان دِہ ہے۔ آپ بیتی جیسی نازک اور حساس صنف نثر اِس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اکثر نقاد آپ بیتی کے لیے یہ زہر قاتل تصور کرتے ہیں جیسے جمیل یوسف نے لکھا ہے:

> ''آپ بیتی لکھنے والا نہ تو ناول نگار ہے اور نہ افسانہ نگار۔ حق تو یہ ہے کہ وہ انشائیہ نگار اور خاکہ نگار بھی نہیں، اس لیے نثری ادب کے بنیادی خصائص کی پابندی سے وہ آزاد ہوتا ہے اِس لیے تو عرصے تک اِسے ایک الگ صنف ادب کی حیثیت سے تسلیم ہی نہیں کیا گیا۔ آپ بیتی لکھنے والا اپنی کہانی بے کم و کاست اور سچائی کے ساتھ رقم کرتا جائے یہی آپ بیتی کی اصل روح ہے۔''(۹۶)

لیکن اِس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ آپ بیتی میں بیان کی گئی کہانی ہر قسم کی رعنائی اور دلچسپی سے خالی رہے۔ آپ بیتی میں تھوڑی بہت منظر نگاری کی گنجائش دی جا سکتی ہے بشرطیہ کہ وہ مبالغے کے حدود میں داخل نہ ہو جائے اور اصل کہانی پر اِس کا غلط اثر نہ پڑے۔ مرقع نگاری اور منظر نگاری ایسے ہتھیار ہیں جس کا استعمال نقصان دِہ بھی ہو سکتا ہے۔ جہاں تک مذکورہ آپ بیتی کا تعلق ہے۔ اجمل خٹک نے غلو سے کام نہیں لیا اور اپنی کہانی فطرت کے عین مطابق رکھی۔ پٹھان اکثر چادر کندھے پر ڈالے رکھتے ہیں۔ چادر گویا اُن کے لباس کا لازمی جزو ہوتا ہے۔ چادر کی اہمیت بتاتے ہوئے حوالات کی اندر کی منظر کو یوں بیان کرتے ہیں:

> ''سخت ترین گرمی میں جب سورج کی گرم کرنیں سیدھے بنگلے کے اندر آتیں، حوالات کی موٹی موٹی اور کالے کریخت دیواریں کسی تنور کی طرح گرم ہو جاتیں۔ حوالات کا فرش اور اینٹیں گرم لو میں توے کی طرح دہک جاتیں، ملحقہ ٹٹی سے بدبو کی بھبکے اُٹھنے لگتے۔ گرمی، تشدد اور بدبودار فضا سے میں عاجز آجاتا۔ بھاگنے کے سارے راستے بند ہو جاتے تو میں اپنا عزیز چادر اُٹھالیتا۔ اِسے سر سے پیر تک اُڑلیتا

اور اِس میں ایسی آرام و راحت محسوس کرتا گویا ائیر کنڈیشنڈ کے کسی آرام دِہ
کمرے میں مزے سے لیٹا ہوا ہوں۔"(۹۷)

بات سے بات نکالنا، اپنے موضوع سے ہٹ کر دور نکلنا، اصل موضوع یا عنوان اور مین شاہراہ کو چھوڑ کر بغلی راستوں اور پگڈنڈیوں پر نکل جانا، غیر معروف راستوں پر تانک جھانک کرنا، اصل عنوان کے اِرد گرد ذیلی عنوانات کا جال بننا اور موضوع سے گریز اختیار کرنا ادبی اصطلاح میں Digression یا آوارہ قلمی کہلاتا ہے۔ انگریزی ادب میں تو یہ مثالیں عام ہیں لیکن اُردو میں مختار مسعود اور مشتاق احمد یوسفی کی تحریریں آوارہ قلمی کی بہترین مثالیں ہیں۔ آوارہ قلمی اور بات سے بات نکالنا بعض اوقات تحریر کی کمزوری خیال کی جاتی ہے لیکن اکثر مصنف اِن سے اپنے اسلوب کو تقویت دیتے ہیں۔ اِس قسم کے حربوں سے قاری کو بے تحاشا معلومات اور عنوان سے وابستہ یا غیر وابستہ بہت ساری چیزوں کا پتہ چلتا ہے۔ اجمل خٹک کے اسلوب میں آوارہ قلمی کی مثالیں بھی عام ہیں۔ وہ بات سے بات نکالتے ہیں اور قاری کو اپنے ساتھ اِتنا دُور لے جاتے ہیں کہ اصل عنوان کہیں پیچھے رہ جاتا ہے اجمل خٹک بنیادی طور پر شاعر ہیں۔ نثر میں وہ دو ٹوک بات غالباً نہیں کر پاتے اور اختصار کے بجائے طوالت کی طرف آتے ہیں۔ یہی سے اُن کی تحریر میں گریز اور آوارہ پن شروع ہو جاتا ہے۔ جہاں جہاں مصنف نے اختصار اور تلخیص نگاری سے کام لیا ہے وہ زیادہ کامیاب ٹھہرے ہیں۔ مصنف کے آوارہ قلمی کا نمونہ ملاحظہ ہوں:

"حوالات کے کھردرے اور سخت فرش پر لیٹے لیٹے یکسانیت سے اُکتا گیا ہوں۔ معلوم نہیں آج کون سا دِن ہے جو اِس طرح سے پڑا ہوں۔ اب تو دِن گننے بھی چھوڑ دیئے ہیں۔ چھت کو مسلسل تک رہا ہوں۔ جو بھی اندیشہ، فکر یا سودا سر میں سما جائے اُس کے پیچھے لگ جاتا ہوں۔ وہ بات اُس وقت چھوڑتا ہوں جب کوئی دوسری بات یاد آجاتی ہے یا سوچتے سوچتے نیند آجاتی ہے۔ پھر نیند مجھے کسی انجان وادیوں میں لے جاتی ہے۔ آج بھی میں خود اور بے خودی کے درمیانی منزلوں میں بھٹک رہا ہوں حتیٰ کہ فکر مجھے میرے بچپن کے ایام میں واپس لے گئی ہے۔ گاؤں کی چھوٹی چھوٹی گلیوں میں دوڑ رہا ہوں۔۔۔۔۔"(۹۸)

اجمل خٹک کے اسلوب کی ایک اور خصوصیت خطیبانہ انداز ہے۔ لاشعوری طور پر اُنہیں احساس ہے کہ وہ دنیا کو اپنی رام کہانی سنا رہا ہے۔ بسا اوقات مصنف یہ بھول جاتا ہے کہ وہ تقریر نہیں تحریری طور پر اپنی داستان قلمبند کر رہا ہے۔ وہ

قاری کو سامع تصور کرتا ہے اور بار بار آپ خود سوچیے، آپ فکر کریں، آپ خود اندازہ لگائیں، آپ سمجھ گئے ہوں گے وغیرہ جیسا انداز تخاطب خٹک کی تحریر کو تقریر کا سا انداز دیتا ہے۔ اِس قسم کی تحریر کا جہاں یہ فائدہ ہے کہ قصے کا ربط برقرار رہتا ہے اور بیان کہیں ٹوٹتا نہیں وہاں ایک بڑا نقصان یہ ہے کہ مصنف کے استدلال اور بیان پر پڑھنے والے کا اعتبار اُٹھ جاتا ہے۔ جو کسی بھی آپ بیتی کے لیے سخت مضر اور ضرر رساں ہے:

> ''آپ بتائیں نا! یہاں اللہ سے کون ڈرتا ہے۔ اگر یہ پولیس کے کارندوں کے دل میں ذرا خدا کا خوف ہوتا تو مجھے سے یہ سلوک کرتے؟ میں نے کیا کیا ہے؟ میں نے اِن کے ماں باپ قتل کیے ہیں؟ میں نے تو آج تک کسی کو معمولی نقصان تک نہیں پہنچایا۔ میں نے تو آج تک کسی کو سخت بات بھی نہیں کی ہے۔ لوگو! اگر اللہ سے کوئی ڈرتا تو میرے ساتھ یہ سلوک کیا جاتا جو سلوک اُنہوں نے مجھ سے کیا ہے کوئی جانور سے بھی روا نہیں رکھتا۔''(۹۹)

''کیا میں پاگل تھا'' کے اسلوب میں ایک اور نمایاں خصوصیت مبالغہ ہے۔ اجمل خٹک نے اپنی ساری آپ بیتی میں مبالغے سے بہت کام لیا ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی اِس طرف اشارے کیے گئے ہیں کہ مبالغہ ادب کے کسی دوسری صنف کے لیے شرط اولین ہے کیونکہ مبالغے اور تخیل کے بغیر ادب تخلیق نہیں ہو سکتا لیکن آپ بیتی کے لیے مبالغہ سُم قاتل ہے۔ جب بھی آپ بیتی لکھنے والا مبالغہ اختیار کرتا ہے تو وہ سچائی، صداقت اور اثر آفرینی سے دُور نکل جاتا ہے۔ روسو کے الفاظ میں جب بھی کہانی سنانے والا نسیان کا شکار ہو جائے یا بات چھپانے کی کوشش کرے یا واقعات میں ردوبدل کرے یا جھوٹ کا سہارا لے تو اُس کی سر گزشت میں خلا پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ اِس خلا کو رنگین بیانی، لفاظی یا مبالغے سے پُر کرنے کی کوشش کرتا ہے اور نتیجتاً ناکام ہو جاتا ہے۔ یہاں سے آپ بیتی کے قدم اپنی دھرتی سے اُٹھتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

اجمل خٹک نے پشتو میں لکھی گئی اصل آپ بیتی میں گالم گلوچ کا بھی بے دریغ استعمال کیا ہے یہ تو شکر ہے کہ مترجم نے اُن کی گالیاں من و عن اردو میں ترجمہ نہیں کروائیں ورنہ بڑی عجیب صورتحال پیدا ہو جاتی ہے۔ مترجم نے اِس آپ بیتی کا زیادہ تر لفظی ترجمہ کیا ہے تاہم آپ بیتی کے بعض حصوں کی تشریحی ترجمے اور بعض کی صرف تلخیص پر اکتفا کیا گیا ہے۔ مترجم نے بعض جگہوں پر غیر شائستہ، نامہذب اور اخلاق باختہ الفاظ کا جوں کا توں ترجمہ کیا گیا ہے جو طبع نازک پر گراں گزرنے کا سبب بن گئے۔(۱۰۰)

اجمل خٹک تکرار الفاظ سے بھی کام لیتے ہیں۔ کبھی تو پورا پورا صفحہ مقفیٰ ہوتا ہے۔ وہ تکرار الفاظ سے آہنگ اور

موسیقیت پیدا کرتا ہے۔اس آپ بیتی میں اس انداز کے بھی خوبصورت نمونے ملتے ہیں۔(۱۰۱)

''کیا میں پاگل تھا'' کا آخری باب ''میرا چادر میرا سب کچھ ہے'' کے نام سے ہے۔ چادر پٹھانوں کے لباس کا ایک اہم جزو ہے۔ جو سردی سے بچنے، سر پر باندھ کر پگڑی کا کام لینے، منہ ہاتھ دھونے کے بعد بطور تولیہ استعمال کرنے، نیچے لحاف بنا کر لیٹنے، اُوپر ڈال کر کمبل کا کام لینے، تہہ بند بنانے اور اِس طرح کے بے شمار کام لینے کے لیے استعمال میں لایا جاتا ہے۔ جیل میں اُن کا واحد مونس اور دم ساز اُس کا چادر تھا جو ہر مشکل گھڑی اُس کے کام آیا۔ بظاہر تین گز طول اور دو گز عرض رکھنے والا یہ معمولی سا کپڑے کا ٹکڑہ کس قدر جامع کمالات ہے یہ اجمل خٹک کو معلوم ہے۔ اسی چادر کو اپنے اُوپر ڈال کر آپ نے کتنی رنگین دنیاؤں کی سیر کی، بارش ہو یا طوفان، گرمی ہو یا تیز دھوپ، مچھر یا مکھیوں کی بہتات ہو یا گرم لو، ہر موقع پر یہ چادر ہی اُس کے کام آیا۔ اجمل خٹک اپنی چادر ایک لحظے کے لیے بھی خود سے جدا نہیں کرنے دیتے کیونکہ اس کے ساتھ اُن کے بہت سارے راز اور ماضی کی تلخ و شیرین یادیں وابستہ ہیں۔ اجمل خٹک کے الفاظ ہیں:

> ''یہ چادر میرا چادر ہے، میرا سرہانہ ہے، میرا کمبل ہے، میرا لحاف ہے، میرا اوڑھنا بچھونا ہے، میرا یار ہے، میرا رازدار ہے، میرا آشنا ہے، مجھے نیند لاتا ہے۔ یہ چادر مجھے نئی اور اَن دیکھی دُنیاؤں کی سیر پر لے جاتا ہے، یہ مجھے گرمی سردی سے بچاتا ہے، مجھے سانپ بچھوں سے محفوظ کرتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ یہ چادر مجھ سے خوف، بزدلی، ڈر اور کمزوری نکال کر مجھے نڈر، بے خوف اور مردانہ وار جینے کے لیے تیار کرتا ہے۔''(۱۰۲)

اجمل خٹک کا یہ باب ''میرا چادر میرا سب کچھ ہے'' پڑھ کر ذہن میں شفیق الرحمٰن کا ''برساتی'' والا مضمون یاد آجاتا ہے۔ اجمل خٹک کا یہ باب ایک الگ انشائیہ ہے۔ اگر اِس باب کو مذکورہ آپ بیتی سے نکال کر الگ شائع کیا جائے تو تھوڑی سی ترمیم کے بعد ایک خوبصورت انشائیہ بن سکتا ہے۔

''کیا میں پاگل تھا'' ترتیب وار اور مربوط نہیں۔ ابواب بھی زمانی ترتیب سے نہیں لکھے گئے ہیں بلکہ مصنف کو جب اور جہاں سے کہانی یاد آئی ہے لکھی ہے۔ آخری باب ''میرا چادر میرا سب کچھ ہے'' اگر سترویں نمبر کے بجائے سولہویں نمبر پر رکھتے تو بیان زیادہ مؤثر ہوتا۔ اِس ساری آپ بیتی پر غم، دُکھ اور درد کی فضا چھائی ہوئی ہے۔ نیز اِس آپ بیتی پر افسانوی رنگ غالب ہے۔ بحیثیت مجموعی مذکورہ آپ بیتی یک رُخی اور غیر جذباتی ہے۔ یہ اجمل خٹک کی ساری زندگی، پیدائش، بچپن، جوانی، والدین، بہن بھائیوں، قریب ترین دوستوں، عزیزوں اور پسند و مشاغل کی باریکیوں کا احاطہ نہیں کرتی۔ اجمل

خٹک جیسے منجھے ہوئے صحافی، شاعر اور لکھاری اگر چاہتے تو اس آپ بیتی کو بہتر شکل میں ترتیب دے سکتے تھے۔آپ بیتی کی رہی سہی کسر اُردو ترجمے نے پوری کر دی ہے۔ مترجم نے زیادہ تر لفظی ترجمہ کیا ہے۔ حالانکہ اِس قسم کی شاعرانہ اور افسانوی تحریر کا بہترین ترجمہ بامحاورہ یا توضیحی ممکن تھا۔جہاں جہاں اُردو کے متبادل روزمرے، محاورے اور تراکیب آسانی سے مل سکتے تھے وہاں پشتو زبان سے براہ راست ترجمہ سمجھ میں نہیں آتا۔

اِن سب خامیوں، کوتاہیوں اور کمی بیشی کے باوجود ''کیا میں پاگل تھا'' آپ بیتیوں میں ایک اچھا اضافہ ہے۔ اجمل خٹک کو جاننے والے ،اُن سے محبت کرنے والے اور اُنہیں قریب سے جاننے کی خواہش مند حضرات کے لیے یہ آپ بیتی یقیناً غنیمت ہے۔اِس آپ بیتی کے ذریعے کئی سیاسی، معاشرتی، سماجی اور تاریخی واقعات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

مزکورہ آپ بیتی میں نہ صرف اجمل خٹک بلکہ اُن کے قریب ترین لوگوں غفار خان اور ولی خان جن کے ذکر کے بغیر اجمل خٹک کی اپنی سر گزشت نامکمل ہے، کے بارے میں بھی ہمیں کئی اہم باتیں معلوم ہوتی ہیں اور اُن کی زندگیوں کے نئے رُخ ہمارے سامنے آتے ہیں۔اجمل خٹک نے بڑی ہنگامہ خیز زندگی گزاری۔افسوس کہ وہ اپنی سر گزشت میں بعد کی زندگی کو ملا کر اضافے اور ترمیم کے ساتھ دوبارہ پیش نہ کر سکے۔اگر وہ ایسا کر لیتے تو یہ یقیناً اُن کا تاریخی کارنامہ ہوتا۔

۴۔دخترِ مشرق(بے نظیر بھٹو)

دخترِ مشرق Daughter of the East کا اُردو ترجمہ ہے جو پاکستان کی سابق وزیراعظم اور پاکستان پیپلز پارٹی کی چیئرپرسن بے نظیر بھٹو شہید کی سیاسی آپ بیتی ہے۔دومرتبہ پاکستان کی وزیراعظم رہنے والی، بین الاقوامی شہرت کی حامل خاتون سیاستدان کی زندگی بڑی ہنگامہ خیز گزری۔پاکستان کے ایک متمول سیاسی خاندان میں پیدا ہونے والی بے نظیر بھٹو کی سیاسی تربیت گھر پر ہوئی۔اُن کی آپ بیتی سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کے والدین اُنہیں بچپن ہی سے سیاست کے لیے تیار کر رہے تھے۔بے نظیر بھٹو ۱۹۷۹ء میں ضیاءالحق کے ہاتھوں پھانسی چڑھنے والے ملک کے ہر دلعزیز سیاسی رہنما ذوالفقار علی بھٹو کی سیاسی جانشین بنیں اور اِس دِن سے اُن کی آزمائشوں اور ابتلا کا دَور شروع ہوا۔ہارورڈ اور آکسفورڈ یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے والی بے نظیر بھٹو سالہا سال تک جنرل ضیاءالحق کے مارشل لاء کے دَور میں جیلوں میں رہیں۔جمہوریت کے لیے سخت جدوجہد کرنے کے بعد بالآخر اُس نے ۱۹۸۸ء میں ملک کی پہلی خاتون وزیراعظم ہونے کا شرف حاصل کیا۔ملک کے رجعت پسند، جمہوریت مخالف اور بنیاد پرست عناصر نے اُنہیں کبھی دِل سے تسلیم نہیں کیا اور اُن کے خلاف مسلسل سرگرم رہے حتیٰ کہ اُن کو مارنے سے بھی گریز نہیں کیا تاہم یہ بہادر خاتون تمام مخالف قوتوں کے سامنے ڈٹ گئیں۔۲۰۰۷ء میں اُنہیں راولپنڈی میں اُس وقت قتل کیا گیا جب وہ ایک سیاسی جلسے میں شرکت کے لیے آئی تھی۔اِس طرح آپ نے جان تو دے دی لیکن شدت پسندوں کے آگے سر نہیں جھکایا۔بے نظیر بھٹو کی یہ آپ بیتی آج سے تیس سال پہلے شائع ہوئی تھی تاہم موجودہ ایڈیشن میں ایک اور باب کا اضافہ کیا گیا جس میں ۲ دسمبر ۱۹۸۸ء سے ۲۰۰۷ء تک کے اُن کی سرگرمیوں، ۹/۱۱ کے بعد پاکستان کے بدلتے ہوئے حالات اور عالمی سطح پر اُس کے کردار کا ذکر کیا گیا ہے۔ مذکورہ باب نہایت اختصار سے قلمبند کر کے زیادہ تر واقعات کو نظرانداز کیا گیا ہے۔

سترہ ابواب پر مشتمل یہ آپ بیتی فنی لحاظ سے کافی ناقص ہے۔مصنفہ کا سارا زور سیاسی حالات اور سیاسی تبدیلیوں پر ہے۔وہ اپنے تاثرات، کیفیات، واقعے کے ساتھ ذاتی وابستگی کا زیادہ تر اظہار نہیں کرتیں۔نیز اِس آپ بیتی میں بے ترتیبی بھی ہے۔وہ زمانی ترتیب سے اپنی سرگزشت آگے نہیں بڑھاتیں بلکہ جہاں جو واقعہ اُن کے ذہن میں آتا ہے تحریر کرتی ہیں۔آپ نے جیل کے چند مہینوں کو چھوڑ کر باقی آپ بیتی اپنی یادداشت کی بنیاد پر لکھی ہے۔جس معاشرے کے زیادہ تر سیاستدان کم لکھے پڑھے ہوں اور جہاں اپنی بائیو گرافی لکھنا شجرِ ممنوعہ ہو وہاں ''دخترِ مشرق'' ایک غنیمت سے کم نہیں۔'' دخترِ مشرق''ایک سخت جان، ہر محاذ پر جی جان سے لڑنے والی،آزادی کی روح کو زندہ رکھنے والی اور مشکلات کے بھنور میں پھنسے ہوئے لوگوں کو ہمت دینے والی بہادر خاتون کی سرگزشت ہے۔

بے نظیر بھٹواپنی آپ بیتی والد کے قتل سے شروع کرتی ہے۔آپ نے ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف قومی اتحاد کی تشکیل، مارشل لاء، قید خانے میں اُن کے والد کے شب و روز، اپنی جیل کی زندگی غرض ہر عنوان پر روشنی ڈالی ہے۔اصل آپ بیتی دوسرے باب سے شروع ہوتی ہے جس میں اپنا خاندانی پس منظر، والد کی تعلیم، اپنی پیدائش اور بہن بھائیوں کے ساتھ بچپن کی زندگی کو مختصر مگر جامع الفاظ میں پیش کیا ہے۔ بھٹو خاندان کے بارے میں لکھتی ہیں:

''ہمارے آباؤاجداد کا تعلق ۷۱۲ء میں مسلمانوں کے ہندوستان پر حملہ کرنے کے ساتھ براہِ راست بنتا ہے۔ہمارا تعلق ہندوستان کے جنگجو نسل راجپوت سے ہے۔ ہمارا قبیلہ سندھ کا سب سے بڑا قبیلہ ہے۔ہمارا خاندان بھٹو قبیلے کے مورث اعلیٰ سردار ڈوڈو خان کی براہِ راست اولاد میں سے ہے۔ جن کی بالائی سندھ کے متعدد دیہات اور میرپور کے علاقے میں اراضی سینکڑوں برسوں سے چلی آرہی ہے۔''(۱۰۳)

بھٹو خاندان سندھ کا ایک قدامت پسند خاندان تھا،اُن کی عورتیں سخت پردہ کرتی تھیں اور وراثت میں اُن کا حق تسلیم نہیں کیا جاتا تھاتاہم آپ کے والد اور والدہ نصرت بیگم نے خاندان کے پرانے اقدار اور رسومات کا خاتمہ کر دیا۔آپ نے اپنی ابتدائی تعلیم، اپنے گھریلو ماحول اور بھائیوں کے ساتھ گزارے گئے ماہ و سال کو پُر تاثیر انداز سے بیان کیا ہے۔ ۱۹۶۹ء کو ذوالفقار علی بھٹو نے آپ کو اعلیٰ تعلیم کے لیے ہارورڈ یونیورسٹی امریکہ بھیج دیا۔ قیام امریکہ نے اُن کی تعلیم، مزاج، نشست و برخاست اور مستقبل پر جو اثرات مرتب کیے وہ آپ نے دلکش الفاظ میں بیان کیے ہیں:

''امریکہ۔۔۔یہ امریکہ ہی تھا جہاں پہلے پہل مجھے جمہوریت کا تجربہ حاصل ہوا اور جہاں میں نے زندگی کے چار پُر مسرت سال گزارے۔ میں آنکھیں بند کر کے ہارورڈ ریڈ کلف کے کیمپس کا تصور کر سکتی ہوں اور دیکھتی ہوں کہ خزاں زدہ اشجار قرمزی زرد رنگ، موسم سرما میں برف کا پھیلا ہوا نرم کمبل اور وہ ہیجانی کیفیت جہاں بطور ایک طالبہ میں نے تیسری دنیا کے ملکوں کی بے بسی نزدیک سے دیکھی اور دونوں عالمی طاقتوں کی خود غرضیوں کا تماشا بھی کیا۔''(۱۰۴)

محترمہ اپنی آپ بیتی میں قدرے تفصیل سے بیان کرتی ہیں کہ فن سفارتکاری اور سیاست کے اسرار و رموز آپ نے اُس وقت سے سیکھنے شروع کیے جب اُن کے والد وزیر خارجہ کے منصب پر تھے اور بیرونی دَوروں میں آپ کو اپنے ساتھ

رکھتے تھے۔ آپ مختلف عالمی رہنماؤں سے ملتیں، حالات کا تجزیہ کرتیں اور ڈرافٹ وغیرہ لکھنے میں اپنے باپ کا ساتھ دیتیں۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں چونکہ آپ ملک میں تھیں اور ذوالفقار علی بھٹو کی ٹیم کا حصہ تھیں اس لیے مشرقی پاکستان کی علیٰحدگی کے اسباب اور واقعات کا آنکھوں دیکھا حال لکھا ہے۔ یہاں مصنفہ نے بعض ایسے رازوں سے بھی پردہ اُٹھایا ہے جو کسی کتاب میں درج نہیں۔ ذوالفقار علی بھٹو جب جنگی قیدیوں کی واپسی اور ہندوستان کے ساتھ کئی معاملات میں تصفیہ کرنے شملہ معاہدے کرنے کے لیے انڈیا گئے تو بے نظیر بھٹو بھی اُن کے ہمراہ تھیں۔ تاریخی شملہ معاہدے کا چشم کشا واقعہ یوں تحریر کرتی ہیں:

> ''میں اپنے بیڈ روم میں اُوپر کی منزل پر تھی جب پوری قیام گاہ آدھی رات کو 12:40 پر لڑکا ہے، لڑکا ہے (مذاکرات کامیاب ہونے کے کوڈ ورڈ جو پاکستانی عملے نے تجویز کیے تھے) کے نعروں سے گونج اُٹھی۔ میں دوڑتی ہوئی نچلی منزل میں آئی لیکن صحافیوں اور ٹیلی ویژن کیمرہ مینوں کے ہجوم میں گرتی پڑتی کمرے تک اُس وقت نہ پہنچ سکی جب اپنے والد اور اندرا گاندھی کو اِس معاہدے پر دستخط کرتے ہوئے دیکھ سکتی جسے بعد میں شملہ معاہدہ کے نام سے موسوم کیا گیا۔''(۱۰۵)

۱۹۷۹ء کو ضیاء الحق نے ملک میں مارشل لاء نافذ کرکے بے نظیر بھٹو کے خاندان کو جیلوں میں ڈال دیا۔ اِس فوجی بغاوت کے بعد ملک کے حالات، اپنے باپ کے تاثرات، اُن کی قید تنہائی اور اپنے بھائیوں کے روزمرہ مشاغل کو بیان کیا ہے۔ اپنی آپ بیتی میں بے نظیر نے صراحت کے ساتھ تحریر کیا ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو اگر چاہتے تو حکومت کے ساتھ خفیہ ڈھیل یا این آر او کر سکتے تھے جو بعد میں نواز شریف اور بے نظیر بھٹو نے پرویز مشرف کے ساتھ کیا لیکن اُس دلیر شخص نے زندگی کی آخری سانسوں تک فوجی آمر کے آگے جھکنے سے انکار کیا۔ مصنفہ نے بھٹو کی سزائے موت اور اِس کا ملک اور خاندان پر پڑنے والے اثرات کا بڑی باریک بینی اور مُدبرانہ انداز سے تجزیہ کیا ہے۔ اِس باب میں اُن کا تجزیہ اِتنا مفصل ہے کہ معمولی واقعات کو بھی نظرانداز نہیں کیا۔ پیپلز پارٹی کی حکومت ختم ہونے کے بعد وہ سات سال تک سکھر جیل، کراچی جیل اور دیگر جیلوں میں قید تنہائی میں رہیں۔ اپنی آپ بیتی میں بے نظیر بھٹو نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو بہن بھائیوں میں اُن کو اپنا سیاسی وارث بنانے کے آرزومند تھے۔

سیاست بڑی عجیب چیز ہے۔ اِس میں آج کے دشمن کل کے دوست اور آج کے دوست کل کے دشمن ہو سکتے ہیں

اور یہ کہ سیاست کے سینے میں دِل نہیں ہوتا۔اُن تمام سیاسی پارٹیوں کے صدور جنھوں نے آپ کے باپ کے خلاف محاذ بنایا تھااور جن کے احتجاج کی وجہ سے نہ صرف اُن کی حکومت جاتی رہی تھی بلکہ اُن کو زندگی سے ہاتھ دھونے پڑے تھے پھر ایک دِن بھٹوہاؤس میں ضیاءالحق کے خلاف احتجاج کرنے اور ایم آر ڈی بنانے کے لیے سر جھکائے بیٹھے تھے:

''میں نے اپنے والد کے مخالفین کو اُن کے گھر میں اُن کی بیوی جو پی پی پی کی چیئرپرسن تھی اور بیٹی سے سیاسی معاہدہ کرتے ہوئے دیکھا، سیاست بھی کیا عجیب چیز ہے؟''(۱۰۶)

کسی بھی معیاری آپ بیتی کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ خود نوشت نگار اپنی زندگی کا کوئی واقعہ ادھورا نہیں چھوڑتا۔ آپ بیتی نگار دوسرے لوگوں کے تجزیوں، رپورٹوں اور میڈیا کی خبروں پر انحصار نہیں کرتابلکہ واقعہ بے کم وکاست تحریر کرتا ہےاور واقعے کے حوالے سے اپنی قلبی تاثرات سچائی سے رقم کرتا ہے حتیٰ کہ اپنی نجی معاملات کو بھی نہیں چھپاتا۔ جہاں تک ہماری زبانوں میں سیاسی آپ بیتیوں کا تعلق ہے وہ اِس خصوصیت سے عاری نظر آتی ہیں۔ بے نظیر بھٹو بھی اپنی خود نوشت میں زیادہ تر سیاست کو زیرِ بحث لاتی ہیں تاہم جہاں اُنہیں موقع ملتا ہے اپنی نجی حالات و واقعات بھی تحریر کرتی ہیں حتیٰ کہ جیل میں اپنی نسوانی بیماریوں کا بھی کھلے بندوں ذکر کیا ہے۔ جہاں جہاں وہ اِس قسم کی کاوش کرتی ہیں اُن کی آپ بیتی حقیقت کے مطابق اور فنِ آپ بیت نگاری کے زیادہ قریب نظر آتی ہے:

''مجھے بالوں کا برش، کنگھا، ٹوتھ برش، ٹوتھ پیسٹ کچھ بھی لینے نہیں دیا گیا۔ میں متواتر نسوانی اُلجھنوں میں مبتلا ہونے کی وجہ سے زیرِ علاج تھی مگر یہاں نہ کوئی دوا تھی نہ کوئی ڈاکٹر یا ایسی خاتون جسے میں اپنی ضرورت بتا سکتی۔''(۱۰۷)

پی آئی اے کے طیارے کا اغوا کیس ہو یا افغانستان میں روسی مداخلت، افغان مجاہدین کی کاروائیاں ہوں یا افغان مہاجرین کا سیلاب، امریکہ کی ایک فوجی امر ضیاءالحق پر مہربانیاں ہوں یا پی پی پی کے کارکنوں پر سختیاں، وہ ہر موضوع پر اظہارِ خیال کرتی ہیں۔ اُس نے بڑی سچائی سے یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ اُن کے بھائی میر مرتضیٰ بھٹو اور شاہنواز بھٹو پاکستان دشمن ممالک میں بیٹھ کر دہشت گرد کاروائیاں کرتے تھے۔ نیز دونوں اپنی ماں، بہن اور پارٹی کے لیے سخت مشکلات پیدا کر رہے تھے۔ آپ جیل کے زمانے کے اکثر واقعات اخبارات کے حاشیوں اور چھوٹے کاغذ کے ٹکڑوں پر رقم کرتیں جو بعد میں اپنی آپ بیتی میں جیل کی ڈائری سے اقتباسات کے نام سے شائع کروائے۔ نیز جیل میں اپنے کپڑے خود سیتی اور اُن پر کشیدہ کاری کرتی۔

''دخترِ مشرق''پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے سات سال کا عرصہ سندھ کے مختلف جیلوں اور نظر بندیوں میں گزارا۔اس کے بعد اُنہیں جلاوطن کر دیا گیا۔اِتنے عرصے بعد آزاد فضاؤں میں سانس لینے اور اپنے بکھرے ہوئے خاندان کے ساتھ مل کر آپ کے کیا احساسات تھے،وہ آپ نے بڑی صداقت سے رقم کیے ہیں۔مصنفہ جب بھائیوں کے ساتھ کئی سالوں بعد ملنے کا جذباتی منظر بیان کرتی ہیں تو ایک آہنی اعصاب کی مالک سیاسی لیڈر ہونے کی بجائے ایک مشرقی عورت،رحم و مروت کا پتلا اور محبت کرنے والی بہن کے روپ میں نظر آتی ہیں۔اپنے جواں سال بھائی شاہنواز بھٹو کی موت کا منظر کتنے درد انگیز الفاظ میں لکھا ہے:

> ''شاہنواز رہائشی کمرے میں کافی کے میز کے ساتھ قالین پر لیٹا ہوا تھا۔اُس نے کل شب والی سفید پتلون ابھی تک پہنی ہوئی تھی۔اُس کا خوبصورت بھورے رنگ کا ہاتھ باہر کو پھیلا ہوا تھا۔وہ سوتے ہوئے ہنس کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔گوگی (شاہنواز کا عُرف) میں چلائی،اُسے جگانے کی کوشش کی لیکن بے سود،پھر میں نے اُن کی ناک دیکھی جو چاک کی طرح سفید تھی اور اُس کی سرخ ناک سے بالکل مختلف''۔(۱۰۸)

بے نظیر بھٹو دس اپریل 1986ء کو طویل جلاوطنی کے بعد ملک واپس آئی اور لاہور ایئرپورٹ پر عوام نے اُن کا فقید المثال استقبال کیا۔ فوجی حکومت، خفیہ ایجنسیوں اور خاندان والوں نے اُن کی خوب مخالفت کی کہ ان حالات میں پاکستان جانا قرین مصلحت نہیں لیکن آپ نہ مانی اور دوبارہ ملک میں آکر جمہوریت اور 1973ء کے آئین کو بحال کرنے کے لیے سرگرم عمل ہو گئی۔اُن دنوں آصف علی زرداری کے ساتھ اُن کی شادی ہوئی۔ہارورڈ اور کیمبرج کی تعلیم یافتہ اور زندگی کے فیصلوں میں آزاد بے نظیر بھٹو نے والدہ اور خالہ کی خواہش پر آصف علی زرداری کا انتخاب کر کے ثابت کیا کہ وہ مشرقی اقدار پر عمل کرنے والی خاتون ہیں۔اپنی آپ بیتی میں اِس موقع پر آپ نے شادی کے بارے میں وسوسے،بیرون ملک کے خاتون ساتھیوں کے ساتھ اس موضوع پر کی گئی گفتگو اور اپنی نجی باتوں کو قلمبند کیا ہے۔آصف زرداری کے ساتھ اپنی پہلی ملاقات میں بڑی سچائی کے ساتھ اپنی دلی کیفیات،تاثرات،احساسات اور وسوسوں کو تحریر کیا ہے۔

17 اگست 1988ء کو جنرل ضیاء کے طیارے کو حادثہ پیش آیا جس سے ملک کا سارا منظر نامہ تبدیل ہو گیا۔آپ نے اُس وقت کے سیاسی، معاشرتی اور معاشی صورتحال پر بھی تبصرے کیے ہیں۔آپ بیتی کے اس حصے میں آپ نے اپنی نجی زندگی کو اختصار سے بیان کیا ہے۔مصنفہ کی خوبی یہ ہے کہ جہاں سیاسی حوادث پر بات کرتی ہیں تو واقعہ خوب پھیلا کر لکھتی

ہیں لیکن ذاتی زندگی سے پردہ اُٹھانا مقصود ہو تو اُن کا قلم مائل بااختصار ہو جاتا ہے۔ پہلے بچے کی پیدائش زچگی سے پہلے کے جسمانی حالات، حاملہ ہونے کے باوجود دن رات جلسے جلوسوں میں شرکت اور بے احتیاطی غرض مصنفہ نے کسی بات کو صیغہ راز میں نہیں رہنے دیا:

''یہ عجیب بات تھی کہ پورے حمل کے دوران میں نے بچے کی حرکت کو پیٹ میں محسوس نہیں کیا تھا۔ جب میں نے ایک دوست سے اس کا ذکر کیا تو اُس نے کہا اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لڑکا ہے کیونکہ لڑکے عموماً حرکت نہیں کرتے جب میں نے ڈاکٹر سے اس بارے میں استفسار کیا تو اُس نے بتایا کہ تم اپنے کاموں میں اس قدر مصروف رہتی ہو کہ تمہیں بچے کی حرکت کا احساس نہیں ہوتا''۔(۱۰۹)

دہشت گردوں نے آپ کو مارنے کا پہلا منصوبہ اُس وقت بنایا تھا جب آپ اپنے انتخابی جلسوں میں ملک بھر کے دورے کر رہی تھیں۔ مصنفہ نے انکشاف کیا ہے کہ یہ منصوبہ ایک افغان کمانڈر گلبدین حکمت یار نے تیار کیا تھا جو لا محالہ پاکستان کی خفیہ ایجنسیوں کے لیے کام کر رہا تھا۔ خوش قسمتی سے آپ اپنی گاڑی میں بیٹھنے کے بجائے دوست کی گاڑی میں بیٹھ گئی، راکٹ لانچر سے آپ کی گاڑی کے پرخچے اڑ گئے لیکن آپ دوست کی گاڑی میں ہونے کی وجہ سے محفوظ رہی۔ آپ نے ایک بڑے مدبر کی طرح بعض پیشن گوئیاں کی تھیں جو حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئیں:

''تصورات خواب ہو سکتے ہیں لیکن جس کسی کو پاکستان سے محبت ہے وہ اپنے ملک اور اپنے لوگوں کے لیے ایک عظیم اور خوشحال مستقبل کا خواب دیکھے بغیر نہیں رہ سکتا، 2000ء تک موجودہ دس کروڑ کی آبادی 15 کروڑ پچاس لاکھ ہو جائے گی، آبادی کا 44 فیصد حصہ 15 سال سے کم عمر کے بچے ہوں گے، شہری آبادی تین گناہ زیادہ ہو جائے گی جبکہ 85 سے 90 فیصد پاکستانیوں کی صاف پانی تک رسائی نہیں ہو گی لیکن ایک بات سورج کی طرح عیاں ہے کہ آمریت ہمیشہ کے لیے نیست و نابود ہو گی اور جمہوریت کا خواب پاکستان میں حقیقت بن کر جلوہ گر ہو گا''۔(۱۱۰)

بے نظیر بھٹو نے اپنی آپ بیتی میں پاکستانی معاشرے کے سماجی تغیرات اور مسائل پر بھی ذاتی تجربے کی روشنی میں اظہار خیال کیا ہے۔ آپ نے کسی زیرک ماہر اقتصادیات کی طرح افغان مہاجرین کی آمد، اسلحہ کے انبار، منشیات کی سمگلنگ، اداروں کی تباہی اور باہر کی دنیا سے مجاہدین کے نام سے عالمی شدت پسندوں کا پاکستان و افغانستان میں اجتماع کا آپس

میں گہرا تعلق ثابت کرکے مستقبل کے حوالے سے اس کے مضر اثرات کا جائزہ لیا ہے۔آپ نے اپنی آپ بیتی کو 16 نومبر 1988ء کے عام انتخابات کے دن پر ڈرامائی انداز سے ختم کیا ہے تاہم دوسرے ایڈیشن میں ایک اور باب کا اضافہ کیا ہے جس میں 1988ء سے 2007ء تک بیس سال کے اہم واقعات کو ترتیب وار قلم بند کیا ہے۔ اس باب میں مصنفہ نے اختصار سے بتایا ہے کہ وطن عزیز میں دہشت گردی کے ابتدائی جراثیم 1980ء سے اس کے جسم میں مختلف طریقوں سے داخل کروانے شروع کیے گئے تھے،1980ء سے 1990ء تک حکومت کی سرپرستی میں مسلکی اختلافات کو ہوا دی گئی، نوجوانوں کو دہشت گرد بنانے کے لیے فوجی تربیت اور پُر تشدد نظریات کا پرچار کیا گیا اُن کی برین واشنگ کی گئی، تعلیمی نصاب میں جان بوجھ کر ایسی چیزیں داخل کی گئیں جن سے شدت پسندی کو فروغ حاصل ہوا اور آہستہ آہستہ یہ ملک دہشت گردی کے دلدل میں پھنستا چلا گیا۔اس سلسلے میں برطانوی وزیر اعظم جان میجر سے ایک سرکاری ملاقات کا ذکر کرکے لکھتی ہیں:

> ''جب میں برطانوی وزیر اعظم جان میجر سے ملی تو اُسے مساجد کو چیک کرنے کا مشورہ دیا جہاں کے امام پاکستانی تارکین کو نفرت اور تشدد کا درس دیتے تھے مجھے یاد ہے کہ وہ سُن کر بوکھلا گیا''۔(۱۱۱)

اس باب کے آخر میں آپ نے اپنے ممکنہ قتل کے خدشات بھی بیان کیے ہیں۔اُنہیں یقین تھا کہ اُنہیں جلد یا بدیر راستے سے ہٹا دیا جائے گا۔اُس نے القائدہ اور دیگر شدت پسند تنظیموں کا نام لے کر بتایا ہے کہ اُنہیں ان کی طرف سے مسلسل دھمکیاں مل رہی ہیں اور یہ کہ اُنہیں ایئرپورٹ پر یا کسی اور عوامی جگہ پر قتل کیا جائے گا۔اُن کے یہ وسوسے بھی سچ ثابت ہوئے۔سیاسی لوگ بظاہر بڑے خوش و خرم نظر آتے ہیں اور اُن کی زندگیوں پر لوگ رشک کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ عوامی لوگوں کی ذاتی زندگیاں پریشان کن ہوتی ہیں ان لوگوں کے اپنے خوفناک مسائل ہیں۔وہ خواہش کے باوجود اپنی زندگیوں سے تناؤ اور بے سکونی ختم نہیں کر سکتے۔ان لوگوں کی آپ بیتیاں پڑھ کر اُن کے گہرے دکھ کا احساس ہوتا ہے۔بے نظیر بھٹو اپنی زندگی کے اِس خوفناک اور کربناک پہلو کا اظہار ان الفاظ میں کرتی ہیں:

> ''ہمارے بتائے بغیر دونوں بچے سمجھ گئے تھے کہ کیا فیصلہ ہونے والا ہے۔میں زندگی بھر یہ نظارہ نہیں بھول سکتی کہ بلاول سفید قمیض، نیلی دھاریدار پتلون، سفید جرابوں اور کالے بوٹوں میں راہداری کے فرش پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا ہوا تھا، وہ خاموشی سے مجھے گھور رہا تھا جب میں نے بختاور کو اُٹھایا اور اُسے پیچھے چھوڑ دیا کوئی

ماں اپنے دو سالہ بیٹے کو پیچھے نہیں چھوڑ سکتی"۔(۱۱۲)

بے نظیر بھٹو ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون تھی اور اُن کا عالمی ادب کا مطالعہ بھی خاصا وسیع تھا اُس نے اپنی آپ بیتی میں جگہ جگہ بین الاقوامی ادیبوں اور سیاست دانوں کے اقوال قلمبند کیے ہیں۔ وہ اپنی آپ بیتی کا خاتمہ بھی مارٹن لوتھر کنگ کے اس لافانی جملے پر کرتی ہیں:

"ہماری زندگیاں اُس روز ختم ہو جاتی ہیں جب ہم (اہم) معاملات کے سامنے خاموش ہو جاتے ہیں، مجھے اپنے خدا پر یقین ہے اور میں اپنی قسمت لوگوں کے حوالے کرتا ہوں"۔(۱۱۳)

یہ جملہ بے نظیر بھٹو کی ذہنی کیفیات، شخصیت، مستقبل کی ذمہ داریوں اور مزاج کی بو قلمونی کے وسیع امکانات کا پتہ دیتا ہے۔

اب ہم "دختر مشرق" کی لسانی خصوصیات، اُردو زبان کو دیے جانے والے نئے الفاظ، محاورات، ضرب المثال، ادبی مقام اور دیگر متفرق خصوصیات سے بحث کرتے ہیں۔ اس آپ بیتی سے یہ ضرب الامثال ہماری زبان میں آئے:

۱۔ "جب تک سورج چمکتا ہے کوئی چیز بھی نئی نہیں"۔(۱۱۴)
(اس کا مطلب ہے کہ جب تک سانس تب تک آس)

۲۔ "جب تک ماریا تھرکتی رہے گی ہم بھی رقص کناں ہوں گے"۔(۱۱۵)
(دوستوں کی محفل سے آسانی سے بندہ نہیں اُٹھ سکتا، دوستوں کے ہاں میں ہاں ملانا پڑتا ہے۔)

۳۔ "جو شخص شیر کی کمر پر سوار ہونا چاہتا ہے اُس کا انجام اُس شیر کا خوراک بننا ہوتا ہے"۔(۱۱۶)
(سانپوں سے کھیلنے والا سانپ ہی کے ڈسنے سے ہلاک ہوتا ہے۔)

۴۔ "میرے اُفق پر کوئی بادل اندھیرا کیے ہوئے نہیں ہے"۔(۱۱۷)
(حالات کا موافق ہونا، کوئی خطرہ محسوس نہ کرنا۔)

۵۔ "آج کل میرا وقت ذرہ ذرہ کرتے بے پیندے کے گھڑے سے ٹپک رہا ہے"۔(۱۱۸)
(وقت مشکل سے کٹنا۔)

۶۔ "آنکھوں میں روحوں کا آئینہ تھا"۔(۱۱۹)
(ایک ایسی نعمت جو اچانک ملے، نعمت غیر مترقبہ۔)

۷۔ ''اُس کے دیواروں پر تو ابھی شرارتی پتلیاں آویزاں ہیں''۔(۱۲۰)

(مراد ہے کہ ابھی تو اُس کے بچپن اور کھیلنے کودنے کے دن ہیں۔)

۸۔ ''جب تم کتوں میں بیٹھو گے تو لا محالہ کاٹے بھی جاؤ گے''۔(۱۲۱)

(مقابلے میں ہر قسم کے خطرات کے لیے تیار بھی رہو گے۔)

۹۔ ''تیز ہوائیں ہمیشہ بلند ترین پہاڑوں کی چوٹیوں پر چلتی ہیں''۔(۱۲۲)

(دلیر اور جوانمرد لوگ ہی خطرات کا مقابلہ کرتے ہیں۔)

۱۰۔ ''جب ایک مرتبہ دریا میں چھلانگ لگا ہی دی تو اب نہنگوں سے کیا ڈرنا''۔(۱۲۳)

(بڑے مقصد کے حصول کے لیے راستے کی مشکلات رکاوٹ نہیں بننے چاہیے۔)

مترجم نے دخترِ مشرق کا ترجمہ کرتے ہوئے آسان اور عام فہم زبان کا استعمال کیا ہے۔اِس آپ بیتی کا اُردو ترجمہ کرتے وقت مترجم نے زیادہ تر بامحاورہ ترجمہ کرنے کی سعی کی ہے اور ترجمہ کرتے ہوئے اُردو کے تراکیب اور محاورات انگریزی کے متبادل کے طور پر تحریر کیے ہیں۔ تاہم مترجم نے کئی جگہ انگریزی محاورات کو جوں کا توں لکھا ہے جس سے انگریزی زبان کے کئی محاورات اس ترجمے کی بدولت اُردو میں آئے

۱۔ ''اونچی پرواز کرنا''۔(۱۲۴)
۲۔ ''زرد موسم کا سامنا کرنا''۔(۱۲۵)
۳۔ ''جذبات کا پنڈولم کی طرح آگے پیچھے ہونا''۔(۱۲۶)
۴۔ ''وقت کے خلاف دوڑ لگانا''۔(۱۲۷)
۵۔ ''دل بھاری ہونا''۔(۱۲۸)
۶۔ ''ہرن کی ران پر چراغ رکھنا''۔(۱۲۹)
۷۔ ''آنکھ میں جھنڈا آنا''۔(۱۳۰)

بے نظیر بھٹو نے اپنی آپ بیتی میں ججوں، عدالتوں اور فوج کے لیے کچھ نئی اصطلاحات استعمال کیں جو دیکھتے ہی دیکھتے ملک کے طول و عرض میں مشہور ہو گئیں:

۱۔ حق استرداد (ویٹو کرنے کے لیے یہ لفظ استعمال کیا ہے۔)(۱۳۱)

۲۔ ''جمہوریت کی فاختائیں'' (اپنی پارٹی کے سرگرم ارکان کے لیے یہ اصطلاح استعمال کی ہے۔)(۱۳۲)

۳۔ ''جیالے'' (پی پی پی کے کارکنوں کے لیے اپنی آپ بیتی میں یہ اصطلاح استعمال کی۔)(۱۳۳)

۴۔ کینگروز کورٹ: (متعصب اور جانبداری کرنے والے ججز کے لیے یہ اصطلاح ایجاد کی۔)(۱۳۴)

۵۔ چمک: (اپنے خلاف اور نواز شریف کے حق میں فیصلہ دینے والے سپریم کورٹ کے ججز کے لیے یہ اصطلاح استعمال

کی ہے جن کے بارے میں بے نظیر کا خیال تھا کہ اُنہیں بھاری رقوم دے کر اپنے ساتھ ملایا گیا ہے) (۱۳۵)

اس کے علاوہ ''دخترِ مشرق'' کے اُردو ترجمے سے کچھ نئے الفاظ و تراکیب بھی اُردو میں آئے ہیں:

۱۔ Red Carpet کے لیے اُردو میں سرخ قالین کا ترجمہ مستعمل ہے لیکن اس آپ بیتی میں سرخ غالیچہ کا نہایت موزوں ترجمہ کیا گیا ہے۔(۱۳۶)

۲۔ کمینہ سارق (کینہ پرور)۔(۱۳۷)

۳۔ افسر مہمانداری (پروٹول آفیسر کا معیاری ترجمہ کیا ہے)(۱۳۸)

۴۔ وہ منہ سے جھاگ پھینکتا ہے (سخت غصہ ہے)(۱۳۹)

۵۔ عدالتی خلوت خانہ (ریڈنگ روم)(۱۴۰)

۶۔ فیاض آمر (ڈکٹیٹر کے لیے استعمال کیا ہے)(۱۴۱)

۷۔ تصوراتی تصویر (کسی آن دیکھے شخص کی خیالی تصویر)(۱۴۲)

۸۔ مسمریزم (جادو یا دیگر کالے علوم)(۱۴۳)

۹۔ مردانہ حاوی معاشرہ (مردوں کی حکمرانی والا معاشرہ)(۱۴۴)

۱۰۔ دماغ چیخ آدمی (مایوس اور پریشان آدمی)۔(۱۴۵)

بے نظیر بھٹو کو انگریزی زبان پر کافی عبور حاصل تھا۔اُن کا انگریزی ادب کا مطالعہ بھی وسیع تھا اس لیے انگریزی زبان میں بھی اس کتاب کو زبان و بیان کے حوالے سے خصوصی اہمیت حاصل ہے تاہم ترجمہ کرتے وقت سکوارڈن لیڈر (ر) عبدالعلی نے مہارت کا ثبوت دیتے ہوئے اس کا معیاری اُردو ترجمہ کیا ہے۔پڑھنے والے کو یہ احساس نہیں ہوتا ہے کہ یہ ترجمہ شدہ کتاب ہے۔مترجم نے ترجمہ کرتے ہوئے آپ بیتی کا مجموعی تاثر برقرار رکھا ہے۔ایک اقتباسات ملاحظہ ہو:

> ''ایک متحرک انسان کی یہ کمزوری ہے کہ وہ صحرا کو حدت کے بغیر اور پہاڑوں کو برف کے بغیر دیکھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا، تم اپنی دھوپ کی چمک، اپنی قوس قزح، اپنی باطنی اقدار اور اخلاقیات میں تلاش کرو گی اور یہی تمہیں کاملیت کا حصول ممکن ہو گا''۔(۱۴۶)

بے نظیر بھٹو امریکہ میں ہارورڈ یونیورسٹی میں قیام کے زمانے اور کالج کے احاطے کے سبزہ زاروں کو یاد کر کے جذباتی ہو جاتی ہیں چنانچہ مترجم نے مصنفہ کے جزبات کو بڑی حد تک پیش کیا ہے:

> ''میں آنکھیں بند کر کے ہارورڈ ریڈ کلف کے کیمپس کا تصور کر سکتی ہوں اور دیکھتی

ہوں خزاں زدہ اشجار کے قرمزی زرد رنگ، موسم سرما میں برف کا پھیلا ہوا نرم کمبل اور وہ ہیجانی کیفیت جو ہم سب موسم بہار میں کونپلوں کے پھوٹنے پر محسوس کرتے ہیں"۔(۱۴۷)

"دُختر مشرق"میں مصنفہ نے کئی جگہ کامیاب منظر نگاری کی ہے جس کو مترجم اُردو کا جامہ پہنانے میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں:

"میرے دائیں اور بائیں کوٹھڑیاں جو عام طور پر بیٹھک اور باورچی خانہ کے طور پر استعمال ہوتی تھیں اب خالی اور مقفل ہیں۔ کوٹھڑی جس میں مجھے رکھا گیا ہے چھوٹی اور گندی ہے۔ بیت الخلا میں فلش سسٹم نہیں وہ ہر وقت لال بیگوں اور مکھیوں سے بھرا رہتا ہے۔ اس کی بدبو کوٹھڑی کے باہر صحن میں بہتی ہوئی گندی نالی کی بدبو سے مل کر فضا کو متعفن رکھتی ہے۔ پانی کی بالٹی میں مردہ کیڑوں کی بھرمار ہے"۔(۱۴۸)

غرض "دختر مشرق" بین الاقوامی سطح پر مشہور خاتون سیاست دان کی کامیاب خودنوشت ہے اور مترجم نے اس کا معیاری اُردو ترجمہ کرکے اس کی اہمیت میں اضافہ کیا ہے۔

۵۔میں اور میرا پاکستان (عمران خان)

''میں اور میرا پاکستان'' پاکستانی کرکٹ ٹیم کے سابق کپتان، سیاسی رہنما، سماجی کارکن، بین الاقوامی شہرت یافتہ شخصیت، وزیراعظم پاکستان عمران خان کی سرگزشت ہے۔ جو شہرت اور عزت زندگی میں عمران خان کو ملی وہ مشرق اور مغرب میں کم لوگوں کو نصیب ہوئی ہوگی۔ وہ اپنی پرکشش شخصیت اور جارحانہ باؤلنگ کی وجہ سے جیتے جی افسانوی کردار بن گئے۔ عمران خان گنتی کے اُن چند ایشیائی لوگوں میں سے ہیں جن پر انگریز بھی رشک کرتے رہے۔ کرکٹ، کینسر ہسپتال اور پھر سیاست کی وجہ سے وہ ملکی اور بین الاقوامی میڈیا میں توجہ کا مرکز رہے ہیں۔ عمران خان ایک متحرک شخصیت کے حامل انسان ہیں اور متحرک شخصیت کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ کسی ایک مقام پر مستقل ٹھہرنے پر قانع نہیں ہوتی نیز ایسے لوگ قسم قسم کی نفسیاتی پیچیدگیوں کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں۔ کچھ نفسیاتی عوارض اُن کے حق میں مثبت اور کچھ لوگوں کی نظروں میں اُنہیں مشکوک بنانے والی ہوتی ہیں۔ بہر حال نابغہ روزگار لوگوں کی اپنی ایک دنیا ہوتی ہے باقی لوگوں سے منفرد اور الگ۔

عمران خان نے موجودہ مقام تک پہنچنے کے لیے ایک طویل اور صبر آزما سفر کیا ہے وہ دیگر سیاست دانوں کی طرح سیاسی خاندان کے فرد نہیں ہیں اس لیے وہ روایتی سیاست دانوں کی طرح نہیں۔ چونکہ بنیادی طور پر وہ ایک کھلاڑی ہیں اس لیے اکثر کھیل کے اُصول سیاست پر لاگو کرتے ہیں جس سے کبھی اُنہیں حیرت انگیز کامیابیاں حاصل ہوتی ہیں اور کبھی ناکامی۔ سخت محنت اور تقدیر پر کامل اعتماد کی بدولت کھیل میں بھی کامیاب رہے اور اب سیاست میں بھی اُس نے ملک کے چوٹی کے سیاست دانوں میں خود کو لا کھڑا کیا ہے۔

مقناطیسی شخصیت، حسن، کشش، دولت، شہرت اور قسمت یہ ساری نعمتیں ایک ذات کے اندر کم کم جمع ہوتی ہیں۔ عمران خان اُن خوش نصیبوں میں سے ہیں کہ جب شہرت طلب کی تو چار عالم میں مشہور ہوئے۔ جب دولت کی خواہش کی تو مٹی کو ہاتھ لگایا تو سونا بن گئی۔ وہ حقیقی معنوں میں کرشماتی شخصیت کے مالک ہیں۔ پاکستانی قوم کرکٹ کی دلدادہ ہے بلکہ پورے ایشیاء میں کرکٹ کے کھلاڑی سب کی توجہ کا مرکز ہوتے ہیں اور میڈیا بھی اُن کے پَل پَل کی خبر کو نشر کرنا اپنی سعادت سمجھتا ہے۔ کرکٹ کے کھلاڑی ہمارے ملک میں بہت پذیرائی حاصل کرتے ہیں اور جہاں جاتے ہیں لوگ اُنہیں دیکھنے کے لیے جمع ہو جاتے ہیں۔ تاہم کرکٹ کے ستاروں میں جو مقبولیت عمران خان کو ملی وہ کسی دوسرے کھلاڑی کو نہ مل سکی۔ ملک کے نوجوان تیز گیند بازی، جارحانہ انداز، بالوں کا سٹائل، جوتے، کپڑے غرض ہر چیز میں اُن کی نقل کیا کرتے ہیں۔ حیران کن بات یہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُن کی مقبولیت میں کمی نہیں آئی بلکہ اُن کی شہرت کا

گراف بڑھتا رہا۔ عمران خان کی زندگی کے تین رُخ ہیں۔ بطور کھلاڑی، بطور فلاحی کارکن اور بطور سیاست دان۔ اُس نے ہر میدان میں کامیابی کے جھنڈے گاڑ کر لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنے اثر میں لیا ہے۔

عمران خان نے ''میں اور میرا پاکستان'' میں اپنی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو ہمارے سامنے رکھا ہے۔ آپ نے بڑی تفصیل سے اپنی زندگی کے شب و روز کو بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ کس طرح سے کھیل، پھر کھیل سے کینسر ہسپتال کے مشن میں لگ گئے اور فلاحی کام کرتے کرتے میدان سیاست میں آئے۔ عمران خان جیسے قومی ہیروز کے بارے میں لوگوں کو بڑا تجسس ہوتا ہے۔ لوگ اُن کی ذاتی اور نجی زندگی کے بارے میں بہت کچھ جاننا چاہتے ہیں اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ایسے لوگوں کی آپ بیتیاں غنیمت ہوتی ہیں، چاہے وہ مختصر، جزوی اور سرسری ہی کیوں نہ ہوں۔ بڑے لیڈروں، کھلاڑیوں، فلمی ستاروں، سیاست دانوں اور سماجی کارکنوں کی آپ بیتیاں عام لوگوں کے علاوہ، نفسیات دانوں، سیاسی لوگوں، تاجروں، طالب علموں اور صحافیوں سب کے لیے یکساں اہمیت کی حامل ہیں۔

دس ابواب پر مشتمل یہ آپ بیتی آخر سے شروع ہوتی ہے جب عمران خان کو مشرف کے زمانے میں قید میں ڈالا گیا تھا۔ یہ آپ بیتی کسی منصوبہ بندی اور ترتیب کے بغیر لکھی گئی ہے۔ مصنف اپنی آخری دور سے زندگی کی کہانی سناتا ہے۔ پیدائش، ابتدائی تعلیم، ثانوی تعلیم، جوانی، یونیورسٹی کی تعلیم اور کرکٹ کے میدانوں میں داخلے کو انتہائی بے ترتیبی اور عجلت سے لکھا گیا ہے۔ ساری آپ بیتی کو پڑھنے کے بعد ان موضوعات اور مباحث کو یکجا کرنا پڑتا ہے۔ آپ کا تعلق پٹھانوں کے ایک قبیلے نیازی سے ہے۔ وہ باپ کی طرف سے ''نیازی'' اور ماں کی طرف سے ''برکی'' ہیں جو جنوبی وزیرستان کے علاقے کانی گورم میں آباد ہیں (مشہور دینی بزرگ اور مجاہد پیر روشان کا تعلق بھی برکی قبیلے سے تھا) اپنا خاندانی پس منظر عمران خان کچھ اِس طرح بتاتے ہیں:

> ''میری والدہ کے برکی خاندان کا تعلق کانی گورم سے تھا جو وزیرستان کا سب سے بڑا قصبہ ہے۔ بہت فخر سے وہ کہا کرتیں کہ ہمارے اجداد نے انگریزوں کی غلامی قبول نہ کی۔۔۔۔ میرے والد کا نیازی قبیلہ پندرھویں صدی میں افغان فاتحین کے ساتھ اس سرزمین میں وارد ہوا۔ نیازیوں کی اکثریت اب بھی میانوالی میں آباد ہے''۔(۱۴۹)

عمران خان کی پیدائش اور پرورش پٹھانوں کی اکثر خاندانوں کی طرح ایک مشترکہ خاندانی نظام میں ہوئی جہاں اُن کے ساتھ اُن کے قریبی رشتہ دار، چچازاد بھائی، ماموں زاد بھائی اور خالہ زاد بھائی وغیرہ رہائش پذیر تھے۔ اس قسم کے نظام

میں محبت، اخوت اور بھائی چارے کو تقویت ملتی ہے۔ خاندان کے سب بڑے چھوٹوں پر نظر رکھتے ہیں اور اُن کی اخلاقی تربیت اور نظم و ضبط کی طرف توجہ دیتے ہیں۔ مغرب زدہ گھرانے اس نظام پر سخت اعتراضات کرتے ہیں تاہم اس کی افادیت سے انکار ممکن نہیں۔ عمران خان کا خاندان مالی لحاظ سے کافی مستحکم اور مشرقی روایات کا پاسدار تھا۔ یہاں سب کچھ بڑوں کی مرضی اور خواہش پر طے ہوتا۔ بچوں کو دینی اور دنیاوی دونوں قسم کی تعلیم سے آراستہ کیا جاتا تھا۔ لاہور میں آبادی سے دور ایک مخصوص جگہ پر عمران خان کے خاندان والوں نے اپنے گھر تعمیر کر کے اس جگہ کا نام عمران خان کے نانا کے ایک بھائی زمان خان کے نام پر ''زمان پارک'' رکھا تھا۔ اس آپ بیتی میں عمران خان نے بتایا ہے کہ اُن کے دادا اپنے خاندان کے ساتھ میانوالی سے انڈیا چلا گیا تھا اور جلندھر کے قریب کسی گاؤں میں آباد تھا۔ 1947ء کے تقسیم ہند کے بعد یہ پورا خاندان ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آیا اور ''زمان پارک'' کو رہائش کے لیے منتخب کیا۔ مصنف نے اپنے آباؤ اجداد حتیٰ کے والد کے روزگار یا بود و باش کے بارے میں بھی کچھ نہیں لکھا، البتہ اپنی ابتدائی تعلیم کے بارے میں صراحت سے لکھا ہے:

> ''جب میں سات سال کا ہوا تو مجھے اور میری بہنوں کو قرآن پاک پڑھانے کے لیے ایک عالم دین ہمارے ہاں آنے لگے۔ سکول میں ایک مذہبی تعلیم کا پیریڈ تھا اور دن کا آغاز تلاوت سے ہوا کرتا''۔(۱۵۰)

اپنی پیدائش، بچپن اور بچپن کے مشاغل اور زمان پارک کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''جب میں پیدا ہوا، پاکستان پانچ سال کا ہو چکا تھا۔ لاہور میں اپنے خوشحال خاندان کے ساتھ آسودہ زندگی جیتا۔ کھیل کود کی آزادی اور وہ تحفظ جو ایک پھیلے ہوئے تگڑے خاندان میں ہوتا ہے۔ یہاں چند ایک مکان تھے باقی ارد گرد ہریالی ہرے بھرے کھیت تھے اور آب رواں۔ زمان پارک میں سب سے پہلا مکان میرے نانا کے بھائی نے بنایا تھا جن کا نام احمد زمان تھا۔ 1947ء میں ہجرت کے بعد میرے نانا کا خاندان بھی یہیں آن بسا۔ میں گرما کی تپتی دوپہروں اور شاموں میں چھرے والی بندوق لے کر کبوتروں کے شکار پر جاتا یا نہر میں نہایا کرتا اور شام کو اپنے بھائیوں (کزنز) کے ساتھ کرکٹ کھیلتا''۔(۱۵۱)

عمران خان کی سر گزشت پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے نسبتاً خوشحال اور مالی لحاظ سے آسودہ خاندان میں آنکھ

کھلی۔ پانچ بہنوں کے وہ اکلوتے بھائی تھے اس لیے وہ خاندان بھر کے لاڈلے تھے۔ باپ نے اُنہیں ابتدا ہی سے ایچی سن کالج میں تعلیم دلائی جو انگریز نے جاگیرداروں اور وڈیروں کے بچوں کے لیے بنایا تھا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ عمران خان کو باپ سے زیادہ اپنی ماں سے اُنس رہا۔ آپ نے اپنی سر گزشت میں اپنی ماں کا ایک خاص اُلفت سے ذکر کیا ہے صرف اتنا نہیں بلکہ ''شوکت خانم میموریل کینسر ہسپتال'' کی صورت میں ایک فرمان بردار بیٹے کا اپنی محبوب ماں کے لیے ایک جیتا جاگتا تحفہ بھی دنیا کے سامنے ہے۔ ماں سے محبت کا وہ ان الفاظ میں اعتراف کرتا ہے:

> ''میری زندگی پر سب سے زیادہ اثر میری ماں کا ہے۔ ہم پانچ بہن بھائی تھے اور میں اُن کا اکلوتا فرزند۔ وہ ایک مکمل ماں تھی۔ ہر چیز اپنے خاندان پر قربان کر دینے والی۔ مجھے خوب یاد ہے میں اپنے زخم اُن سے چھپا لیا کرتا تھا تاکہ اُنہیں صدمہ نہ پہنچے''۔(۱۵۲)

کرکٹ اور عمران خان ایک دوسرے کے لیے لازم اور ملزوم ہیں اگرچہ کینسر ہسپتال اور پھر سیاست کی وجہ سے وہ کرکٹ سے دور ہو گئے لیکن اُن کا بنیادی حوالہ آج بھی کرکٹ ہے اور اس بات میں بھی شک وشبہ نہیں کہ اگر وہ کرکٹ میں شہرت کی بلندیوں تک نہ پہنچتا تو آج دوسرے میدانوں میں بھی اُن کے نام تک سے کوئی واقف نہ ہوتا۔ عمران خان کرکٹ میں کیسے آئے؟ وہ اپنی آپ بیتی میں اس بارے میں کہتے ہیں:

> ''کرکٹ اور تیتر کے شکار سے میری محبت، رشتے کے بھائیوں اور چچاؤں کی وجہ سے پروان چڑھی۔ میری ماں کے خاندان والے کرکٹ کے جنونی تھے۔ 9 سال کی عمر میں، میں نے ٹیسٹ کرکٹر بننے کا ارادہ کر لیا۔ یہ اُس دن ہوا جب میں نے اپنے خالہ زاد جاوید برکی کو اس میدان میں انگلینڈ کے خلاف سنچری بناتے دیکھا جو اب قذافی سٹیڈیم کہلاتا ہے''۔(۱۵۳)

عمران خان نے ایچی سن کالج لاہور سے ''اے لیول'' کرنے کے بعد آکسفورڈ یونیورسٹی برطانیہ سے گریجویشن کیا۔ کرکٹ کا آغاز اُس نے ایچی سن کالج کے زمانے میں ثانوی جماعتوں سے اسی کالج کے ٹیم سے کیا تھا اس طرح وہ آکسفورڈ یونیورسٹی برطانیہ میں بھی مختلف کاؤنٹیوں کی طرف سے متواتر کھیلتے رہے۔ آپ نے 1971ء کے موسم گرما میں انگلینڈ کے خلاف پہلا انٹرنیشنل میچ کھیلا۔ اس موقع پر اپنی آپ بیتی میں بڑی سچائی سے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ وہ اپنے خالہ زاد ماجد خان کی سفارش سے جو اُس وقت پاکستانی کرکٹ ٹیم کے کپتان تھے ٹیم میں منتخب کیے گئے۔ آپ نے زمانہ طالب علمی

خصوصاً یونیورسٹی کے زمانے کے واقعات تفصیل سے قلمبند نہیں کیے البتہ یونیورسٹی میں اپنے چند دوستوں اور اپنے حلقہ احباب کا مختصر ذکر کر کے بتایا ہے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو بھی آپ کے گروپ میں شامل تھیں اور یہ کہ اُن کے ساتھ آپ کا قریبی رابطہ تھا۔ بے نظیر بھٹو نے اپنی آپ بیتی ''دختر مشرق'' میں اس بات کا ذکر نہیں کیا صرف اتنا لکھا ہے کہ میں جس وقت آکسفورڈ میں پڑھتی تھی تو مشہور کرکٹر عمران خان بھی وہاں زیر تعلیم تھے۔ جبکہ عمران خان کچھ اس طرح لکھتے ہیں:

> ''ہم تین آدمی قریب آگئے۔ وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی بیٹی بے نظیر بھٹو میں اور اکرم۔ صرف اس لیے نہیں کہ ہمارا پس منظر ایک تھا بلکہ اس لیے بھی کہ ہمارے مضامین بھی ایک تھے۔ ہر اتوار کو لیڈی مار گریٹ ہال میں ہم بے نظیر سے ملنے جایا کرتے۔ سہ پہر دوسرے لوگ بھی اُس سے ملنے آتے اور ضیافت اُڑایا کرتے۔ وہ ہمیں پنیر اور سینڈوچ پیش کرتی۔ بے نظیر تب بھی ویسے ہی خواب دیکھا کرتی جیسے کہ بعد کے ادوار میں''۔(۱۵۴)

عمران خان اکیس سال تک انٹرنیشنل کرکٹ میں رہے اس دوران اُس نے کرکٹ کے میدانوں میں حیرت انگیز کامیابیاں حاصل کیں اور ایک متوسط قسم کی کرکٹ ٹیم کو دنیا کے بڑے بڑے ٹیموں کے مقابلے میں لا کھڑا کیا یہ اُن کی بے مثال قائدانہ صلاحیتوں کی دلیل ہے۔ کرکٹ کی زندگی دراصل اُنہیں آئندہ زندگی کے بڑے بڑے چیلنجوں کے لیے تیار کر رہی تھی۔ آپ نے اس بات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے کہ کس طرح آدمی کو ہائی سکول کی تربیت کالج کی زندگی، کالج کی ٹرئینگ یونیورسٹی کے لیے اور یونیورسٹی عملی زندگی کے لیے تیار کرتی ہے۔ مزید یہ کہ آپ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتے بلکہ اپنے لیے نئے نئے اہداف خود تیار کرتے ہیں۔ عمران خان کا عقیدہ ہے کہ دنیا میں کوئی شارٹ کٹ نہیں سخت محنت ہی آپ کو منزل تک پہنچاتی ہے۔ آپ نے اپنی آپ بیتی میں کئی جگہوں پر اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ جُہد مسلسل اور چیلنجز کا مردانہ وار مقابلہ کرنے اور اُصولوں پر عمل کر کے ہی آپ نے ساری زندگی کامیابیاں سمیٹیں:

> ''اعلیٰ عزائم کے لیے جہد مسلسل کا تصور میرے دل کو بھا گیا۔ سب سے پہلے میں نے کوشش کی کہ پاکستان کے لیے کھیلوں، پھر میرا مقصد یہ تھا کہ میں اپنے ملک کا سب سے اچھا آل راؤنڈر بنوں، پھر سب سے اچھا فاسٹ باؤلر، یہی سے میرے اندر اس خواہش نے جنم لیا کہ دنیا کا سب سے اچھا آل راؤنڈر اور فاسٹ باؤلر بھی بنوں۔ جب میں کپتان بنا تو یہ آرزو ہوئی کہ میں پاکستان کو دنیا کی سب سے برتر ٹیم بناؤں۔

جب ماں کی یاد میں قائم ہونے والا کینسر ہسپتال کامیاب ہوا تو میں نے پشاور اور کراچی میں بھی ایسے ہی دو ہسپتال بنانے کا ارادہ کر لیا۔ اب میری زندگی کا چیلنج یہ ہے کہ میں پاکستان میں ایک مبنی پر انصاف اور انسانیت دوست معاشرہ بناؤں۔ جب ایک مقصد حاصل ہوتا ہے تو کرنے کے لیے ہمیشہ بہت کچھ باقی ہوتا ہے''۔(۱۵۵)

عمران خان مشرقی پاکستان کی علیحدگی کو تاریخ پاکستان کا بدترین واقعہ اور ۱۹۹۲ء میں کرکٹ ورلڈ کپ جیتنے کو بہترین واقعہ بتاتے ہیں۔(۱۱۳) سقوط مشرقی پاکستان پر آپ نے اپنی آپ بیتی میں ایک سے زیادہ مرتبہ روشنی ڈال کر اِسے موجودہ حالات کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ آپ نے بتایا ہے کہ جب پریس پر بے جا پابندیاں لگ جائیں، اپنی ہی فوج اپنے عوام پر ظلم ڈھائے اور لوگوں کی احساس محرومی انتہا کو پہنچ جائے تو ملک ٹوٹ جاتے ہیں مشرقی پاکستان کی علیٰحدگی سے کچھ دِن پہلے آپ پاکستان کی انڈر ۱۹ کرکٹ ٹیم کے ساتھ ڈھاکے میں تھے اُس وقت وہاں لوگوں کے جذبات اور تاثرات کو یوں بیان کیا ہے:

''میں پاکستان کی انڈر ۱۹ کرکٹ ٹیم کے ساتھ ڈھاکہ سے آنے والی آخری پرواز میں واپس آیا۔ جب وہاں ہم کھیل رہے تھے تو نہ صرف تماشائیوں بلکہ مقابل کھلاڑیوں میں بھی مخاصمت کے جذبات آشکارہ تھے۔ مشرقی پاکستان کی ٹیم کے کپتان اشرف الحق نے جو بعد میں میرا دوست بن گیا ایک دن رات کے کھانے پر مجھے ان تلخ احساسات کے بارے میں بتایا جو اب چاروں طرف جھلک رہے تھے اُس نے کہا مجھ ایسے لوگ پاکستان سے وابستہ رہنے کے خواہش مند ہیں بشرط یہ کہ ہمارے حقوق ہمیں دیے جائیں۔ وگرنہ آزادی کی فعال تحریک اُٹھ کھڑی ہوگی یہ سن کر میں ہکا بکا رِہ گیا''۔(۱۵۶)

عمران خان کی پرورش ایک مشرقی گھرانے میں ہوئی تھی۔ گھر سے اُن پر مذہب کی طرف جھکاؤ کے لیے کوئی دباؤ نہیں تھا۔ البتہ ماں کو اُن کی تعلیم اور تربیت کی کافی فکر تھی تاہم آپ کی دینی تعلیم واجبی سی رہ گئی۔ آپ نے اپنی سرگزشت میں کھل کر اعتراف کیا ہے کہ نماز پنج گانہ اور روزے یا زکوٰۃ کی آپ کو پرواہ ہی نہیں تھی۔ گھر کی طرف سے بھی آپ پر نماز پڑھنے اور روزے رکھنے کی سختی نہیں تھی پھر جب ''اے لیول'' کی تکمیل کے بعد آپ آکسفورڈ یونیورسٹی میں جا داخل ہوئے

تو وہاں ماحول ہی کچھ اور تھا۔ 1970ء کے بعد کے انگلینڈ میں پرانی تہذیب کے آثار تیزی سے مٹتے جا رہے تھے اور لوگ پرانی اقدار کو منافقت کہہ کر مسترد کر رہے تھے۔ نئی نسل جنسی آزادی، منشیات اور راک اینڈ رول کی طرف راغب تھی۔ اس ماحول میں دیگر ممالک اور قدامت پسند معاشروں سے آنے والے نوجوانوں میں بغاوت کے عناصر کا پھیلنا لازمی امر تھا۔ اس موقع پر عمران خان اپنے خیالات، احساسات، ذہنی کشمکش اور دلی کیفیات کسی کم و کاست کے بغیر لکھتے ہیں:

> ''اللہ تعالیٰ پر میرا جو تھوڑا سا اعتقاد تھا اس ماحول میں وہ کمزور تر ہونے لگا۔ جو کچھ میں بچا سکا وہ ایک مسلمان کی حیثیت سے میری بنیادی شناخت تھی۔ میرا اسلام اتنا ہی تھا کہ کبھی کبھار مسجد چلا جایا کرتا وہ بھی لاہور میں۔ مسجد کے باہر میری زندگی سے باری تعالیٰ کا کوئی تعلق باقی نہیں رہا تھا''۔(۱۵۷)

اپنے کرکٹ کیریئر کے طویل زمانے میں ساری دنیا گھومنے والے عمران خان نے ان اسفار کی کوئی تفصیل دی ہے نہ انگلینڈ میں مختلف کاؤنٹیوں کے ساتھ گزرے ہوئے وقت کے بارے میں کچھ بتایا ہے۔ عمران کی آپ بیتی کا بڑا نقص یہ ہے کہ وہ فوراً خطاب کرنے پر آجاتا ہے اور مشرق و مغرب کے نامور لوگوں یا تاریخ دانوں کی کتابوں سے اقتباسات دے کر اپنے بیانیے کو تقویت دینے لگتا ہے۔ دیگر سیاسی آپ بیتیوں کے برعکس آپ نے اپنی زندگی کے مختلف ادوار کو الگ الگ ابواب میں تقسیم کر کے اپنی کہانی آگے نہیں بڑھائی ہے بلکہ جہاں کوئی بات زندگی کا کوئی واقعہ یا حادثہ ذہن میں آیا ہے تحریر کیا ہے۔ آپ نے کئی جگہوں پر کچھ دلچسپ انکشافات بھی کیے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اُن کا ایک کزن قمر خان بے نظیر بھٹو سے شادی کرنے کا خواہشمند تھا۔ اُنہوں نے بے نظیر بھٹو سے قمر خان کی ملاقات کرائی لیکن درمیان میں ایک حادثہ ہوا جس سے یہ شادی نہ ہو سکی:

> ''ایک اچھے شوہر کا حصول اُن کے لیے سہل نہ تھا۔ اُن کی عمر 34 سال ہو گئی تھی۔ روایتی خاندانوں کے ساتھ گھل مل جانا بے نظیر کے لیے مشکل تھا ایک مرحلے پر اپنے ایک کزن قمر خان سے میں نے محترمہ کی ملاقات کرائی شادی کے بارے میں اُس نے سوچا مگر ایک حادثہ ہو گیا۔ اُن کے بھائی مرتضیٰ بھٹو نے اپنے والد کی موت کا انتقام لینے کے لیے ''الزوالفقار'' کے نام سے ایک تنظیم بنا رکھی تھی۔ پی آئی اے کا ایک طیارہ اُس نے اغوا کر لیا۔ جب تک اس معاملے سے اُڑنے والا گرد و غبار بیٹھتا، قمر خان شادی کر چکا تھا''۔(۱۵۸)

دنیا بھر میں شہرت رکھنے والے عمران کے لیے دنیا کے کسی بھی ملک کی شہریت حاصل کرنا آسان تھا لیکن اُس نے کبھی یہ کوشش نہیں کی۔ وہ لاہور کو اپنا پسندیدہ شہر بتاتا ہے نیز پاکستان کے شمالی علاقہ جات اور سلسلہ ہمالیہ کو سیر و سیاحت کے لیے من پسند جگہ تصور کرتا ہے۔ آپ نے اپنی آپ بیتی میں اپنی ذات اور شخصیت کی کچھ کمزوریوں کا بھی ذکر کیا ہے کہ میں سخت ضدی انسان ہوں اور تنقید بالکل برداشت نہیں کر سکتا، تاہم سیاست میں آنے کے بعد بڑی حد تک اِن کمزوریوں اور اپنے شرمیلے پن پر قابو پایا ہے۔ ایسے واقعات بھی بیان کیے ہیں کہ جب کوئی صحافی اُن کے بارے میں کوئی تنقیدی مضمون لکھتا تو اُنہیں وہ تھپڑ جڑنے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ آج بھی عمران خان پر غرور، تکبر، انانیت اور اپنی رائے دوسروں پر زبردستی مسلط کرانے کا الزام لگایا جاتا ہے۔ وہ خود بھی اپنی شخصی کمزوریوں کا اعتراف کرتے ہیں کہ مذہب سے رجوع کرنے اور دکھی انسانیت کی خدمت نے اُن کی اِن کمزوریوں کی شدت کو کم کر دیا ہے۔ ۱۹۸۷ء میں آپ نے اُس وقت کرکٹ کو خیر باد کہا اور کینسر ہسپتال کی تعمیر میں مصروف ہو گئے جب اُن کے عروج کا زمانہ تھا۔ اُس وقت کے صدر مملکت ضیاء الحق کی درخواست پر اُنہیں دوبارہ کرکٹ کے بوٹ پہننے پڑے۔ علاوہ ازیں آپ نے اس بات کا بھی اعتراف کیا ہے کہ ۱۹۸۸ء میں ضیاء الحق نے اُنہیں اپنی کابینہ میں شمولیت کی دعوت دی تھی۔ (۱۵۹)

جس طرح ہم نے پہلے ذکر کیا کہ عمران خان کی زندگی میں تین اہم سنگ میل آئے۔ کرکٹ، کینسر ہسپتال کا قیام اور الگ سیاسی پارٹی پاکستان تحریک انصاف بنانا۔ شوکت خانم میموریل ہسپتال کی تعمیر آپ کا وہ کارنامہ ہے جس پر آج بھی لوگ حیرت زدہ ہیں۔ وہ کام جو بڑی بڑی ریاستیں نہیں کر سکتیں وہ کام آپ نے یک و تنہا کر کے دکھایا۔ خطرات مول لینا چونکہ آپ کی فطرت کا خاصہ ہے اس لیے اس منصوبے کو بھی ایک بڑا چیلنج سمجھ کر قبول کیا اور پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ آپ نے اس منصوبے کے آغاز سے تکمیل تک کن مشکلات کا سامنا کیا، بے شمار مراحل پر ڈاکٹروں اور ماہرین نے اِسے ناممکن منصوبہ کہہ کر آپ کو اس خیال سے دستبردار ہونے کا مشورہ دیا لیکن آپ بضد رہے اور بے شمار مشکلات کے باوجود اس منصوبے کو کامیابی سے مکمل کیا۔ ۱۹۸۸ء میں ملک بھر سے چوٹی کے ڈاکٹروں اور کینسر کے علاج سے منسلک دیگر ماہرین کو بلا کر جب اُن کے سامنے ہسپتال بنانے کی تجویز رکھی تو تقریباً سب نے یہ منصوبہ ناقابل عمل قرار دیا تاہم کسی صورت ہار نہ ماننے والے کھلاڑی نے اُن ڈاکٹروں کے مشوروں کو اہمیت نہ دی اور ہسپتال بنانے کا اعلان کر دیا۔

۱۹۸۴ء میں آپ کی ماں شوکت خانم کینسر کے مرض میں مبتلا ہو کر وفات ہوئی۔ اُن کی ماں کا علاج لندن میں ہوا لیکن پھر بھی وہ نہ بچ سکی۔ اس قدر اذیت اور تکلیف میں اپنی ماں کو مرتے دیکھ کر آپ کو پاکستان میں عام لوگوں کے لیے کینسر ہسپتال بنانے کا خیال آیا جہاں ایک عام آدمی کا مفت علاج ہو اور سہولیات بھی بین الاقوامی معیار کے ہوں۔ عمران خان نے

کب اور کیوں اس عظیم الشان منصوبے کا ارادہ کیا؟اُن کی زبانی سنیے :

''ماں کو میں برطانیہ لے گیا تو انکشاف ہوا کہ مرض کی جس نوعیت میں وہ مبتلا تھی، بروقت اگر تشخیص ہو جاتی تو شافی علاج ممکن تھا۔ یہ بات بڑی تکلیف دہ تھی کہ علاج کے لیے ملک سے باہر جانا پڑا۔ جو بھی اس تجربے سے گزرا ہے وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ دولت کی فراوانی کے باوجود مریض اور اُس کے پیاروں پر کیا گزرتی ہے۔ یہی وہ وقت تھا جب میں نے فیصلہ کیا کہ پاکستان میں ایک کینسر ہسپتال بناؤں گا جہاں علاج کے اخراجات کی فکر مفلس مریض کے لواحقین کو فکر مند نہ رکھے اور دولت مند بھی وطن سے دور جاپڑنے پر مجبور نہ ہوں''۔(۱۶۰)

عمران خان نے ۱۹۸۸ء سے ہسپتال بنانے کا باقاعدہ آغاز کیا۔ اُن کے مطابق اُنہیں والد، بہنوں، رشتہ داروں اور دوستوں کی طرف سے مسلسل ڈرایا گیا کہ آپ یہ منصوبہ ترک کریں۔ اِس عظیم الشان کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانا آپ کے بس کی بات نہیں۔ کرکٹ سے کمائی ہوئی دولت اور عزت خاک میں مل جائے گی لیکن خواب دیکھ کر پورا کرنے والے عمران خان نے کسی کی ایک نہ سُنی اور اپنی تمام تر توجہ ہسپتال کی تعمیر پر مرکوز کردی۔ اپنا سب کچھ ہسپتال میں ڈالنے کے بعد اور مخیر حضرات سے چندے اکٹھے کرنے کے باوجود مطلوبہ رقم کی فراہمی ناممکن امر تھا۔ اِس ہسپتال پر ستر کروڑ روپے کی لاگت کا تخمینہ لگایا گیا تھا جبکہ عمران خان کے پاس صرف ایک کروڑ روپیہ تھا۔ ۱۹۹۲ء کا ورلڈ کپ جیتنے کے بعد حالات یکدم تبدیل ہو گئے۔ عمران خان نے اِس ضمن میں بیرون ملک پاکستانیوں سے چندہ مانگا۔ کرکٹ ٹورنامنٹ کروائے اور بین الاقوامی مشاہیر مثلاً لیڈی ڈیانا وغیرہ کو چندہ مہم میں شامل کر لیا۔ آخر جب اِس سے بھی اُن کا ہدف پورا نہ ہوا تو آپ نے ایک اور قدم اُٹھایا جس کی نظیر ہمارے ملک کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

آپ نے ملک بھر کے سکولوں کے بچوں سے چندہ جمع کرنے کا آغاز کیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ستر کروڑ سے زیادہ رقم ہسپتال کے فنڈ میں جمع ہو گئی۔ ۲۹ دسمبر ۱۹۹۴ء کو کینسر کی ایک دَس سالہ مریضہ ''سمیرہ'' سے ہسپتال کا افتتاح کروایا۔ عمران خان اِس لمحے کو زندگی کا بہترین لمحہ تصور کرتے ہیں۔ آپ نے اپنی آپ بیتی کے پانچویں باب میں بائیس صفحات پر ہسپتال بنانے کے واقعے کا ذکر کیا ہے۔ یہاں آپ نے بڑی تفصیل سے اُن تمام کامیابیوں، ناکامیوں، مشکلات اور رکاوٹوں کا تذکرہ کیا ہے جو ہسپتال بنانے میں اُنہیں درپیش ہوئیں۔

جمائما کے ساتھ شادی بھی آپ کی زندگی کے اہم واقعات میں سے ہے۔ عمران خان ہمیشہ سے ملکی اور غیر ملکی میڈیا

میں موضوع بحث رہے ہیں۔ اُن کی شادی کو بھی خاص خبر کے طور پر پیش کیا گیا۔ مغربی میڈیا کو جمائما کے قبول اسلام پر اعتراض تھا جبکہ پاکستانی ذرائع ابلاغ نے غیر ملکی بیوی لانے پر اُنہیں آڑے ہاتھوں لیا۔ عمران خان پر آج بھی اُن کے مخالفین یہودیوں کا ایجنٹ، یہودیوں کا داماد ہونے کے الزامات لگاتے ہیں جبکہ عمران خان لکھتا ہے کہ جمائما کے والد جمی گولڈ سمتھ کا باپ یہودی تھا اور ماں کیتھولک عیسائی تھی جبکہ جمائما کی اپنی تربیت غیر مذہبی، سیکولر اور لادین ماحول میں ہوئی اور حقیقت میں وہ یہودی نہیں تھی۔ جمائما سے اپنی پہلی ملاقات اور شادی کے بارے میں عمران خان لکھتے ہیں:

> ''ایک ایرانی دوست شاریا کی جانب سے لندن میں دیئے گئے ایک ڈنر پر میری ملاقات جمائما سے ہوئی۔ پہلی ہی نظر میں وہ مجھے پُرکشش اور ذہین لگی۔ اِس بات نے مجھے متاثر کیا کہ اُس میں ایک رکھ رکھاؤ تھا اور اپنی اقدار پر بہت یقین رکھتی تھی۔ اِتنی چھوٹی سی عمر میں وہ روحانیت میں دلچسپی رکھتی تھی۔ مجھے یہ فکر تھی کہ میں جمائما کے والدین کو راضی نہ کر پاؤں گا۔ اِس کی وجہ عمروں کا فرق نہ تھا، سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ شادی کے بعد جمائما کو پاکستان میں سکونت اختیار کرنا ہوگی۔ مجھے اِس بات نے حیرت زدہ کر کے رکھ دیا کہ اُس کی ماں لیڈی اینابل اور والد جمی گولڈ سمتھ نے اپنی بیٹی کے فیصلے کی کھل کر حمایت کی۔''(۱۶۱)

کرکٹ سے ہسپتال اور ہسپتال سے سیاست تک کا سفر عمران خان کی شہرت کا سفر ہے۔ ہسپتال بننے کے بعد جب اُنہیں اندازہ ہوا کہ اب میں میڈیا کا مرکزی موضوع نہیں رہوں گا تو آپ نے سیاست کے کوچے میں قدم رکھنے کا فیصلہ کیا۔ تقریباً آغازِ جوانی سے لے کر آج کے دِن تک عمران خان میڈیا میں کسی نہ کسی حوالے سے موجود رہے ہیں۔ کھلاڑی یا سماجی لوگ جب تک میدانِ عمل میں ہوں عوام کی توجہ کا مرکز ہوتے ہیں لیکن جب وہ پردے کے پیچھے چلے جاتے ہیں۔ لوگ بھی اُنہیں بھول جاتے ہیں۔ پھر یہی وقت کھلاڑیوں، سیاستدانوں، صحافیوں اور شوبز سے تعلق رکھنے والوں کے لیے انتہائی سخت ہوتا ہے۔ کئی ماہرین نفسیات کے تجزیوں کی روشنی میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ عمران خان جیسے لوگوں کی سب سے بڑی مجبوری دائمی شہرت ہے اور وہ شہرت کی دیوی کو کسی صورت اپنے آپ سے جدا نہیں کرنے دیتے۔

عمران خان کی کرکٹ، فلاحی کام، سیاست، شادیاں، طلاقیں اور دیگر اقدامات میڈیا میں اِن رہنے کے لیے ہی تو ہیں۔ کھیل اور فلاحی کاموں میں انسان زیادہ دیر تک میڈیا کی توجہ کا مرکز نہیں ہوتا کیونکہ ایک دِن اُس نے ریٹائر ہونا ہوتا ہے لیکن سیاست وہ میدان ہے جہاں آپ مرتے دم تک موضوع بحث ہوتے ہیں۔ عمران خان کی آپ بیتی پڑھ کر یہ تاثر زیادہ

قوی ہو جاتا ہے کہ سیاست میں آنا اُس کا میڈیا میں اِن رہنے کے لیے تھا۔ شہرت کا نشہ انسان کو کیا کچھ کرانے پر مجبور کرتی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ اِس ضمن میں اپنی رائے کچھ اِس طرح سے پیش کرتے ہیں:

"زندگی کے آخری دِنوں میں پاکستانی فلم انڈسٹری کا نامور ہیرو وحید مراد میڈیا کی توجہ کا مرکز نہ رہا اِس لیے بے حد رنجیدہ تھا۔ بعدازاں ایک حادثے کے دوران اُس کے چہرے پر چوٹیں آئیں اور یہ وہ چہرہ نہ رہا جس پر لاکھوں لوگ جان دیتے تھے۔ چہرے کا یہ بگاڑ اُسے سکون آور ادویات کی زیادتی تک لے گیا اور پھر وہ مر گیا۔ یہ صرف شہرت کی بے وفائی تھی جس نے اُسے مار ڈالا۔"(۱۶۲)

۱۹۹۰ء تک عمران خان نے سیاست میں آنے کے متعلق سوچا بھی نہ تھا بلکہ وہ اِس بات کا بھی اعتراف کرتا ہے کہ میں سیاست کو ایک گندہ کھیل کہتا تھا اور سوچتا تھا کہ وہ لوگ سیاست میں آتے ہیں جو تعلیم اور کھیل کے میدان میں ناکام ہوئے ہوں۔ عمران خان کا سیاست میں آنے کے پہلے دِن سے یہ بیانیہ رہا ہے کہ چونکہ اِس ملک کی دولت اور وسائل سیاستدانوں نے لوٹے ہیں اِس لئے ملک کو بڑے بڑے ڈاکوؤں اور بدعنوان لوگوں سے بچانے کے لیے اُنہیں خوب سوچ بچار کے بعد میدانِ سیاست میں آنا پڑا۔ سیاست میں آمد، الگ سیاسی پارٹی کا قیام اور اِس کے اغراض و مقاصد عمران خان کچھ اِس طرح بتاتے ہیں:

"جب ۲۵، اپریل ۱۹۹۶ء کو میں نے اپنی جماعت تحریک انصاف کے قیام کا اعلان کیا تو اِسی دِن میرے دِل سے موت کا خوف نکل گیا۔ میں اِس بات سے آگاہ تھا کہ سیاست میں مجھے کیا کرنا ہے۔ جس کسی نے سیاسی مافیا پر ہاتھ ڈالا، پہلے ہی اُسے تیار پایا۔ اُن کا نظریہ اِس بارے میں یہ ہے کہ اگر کوئی اُن کے لئے خطرہ بنے تو اُسے کرید لو یا ختم کر دو۔ میں اور میری پارٹی کے بانی ارکان نے ایک ایسی وسیع البنیاد تحریک برپا کی جو ملک میں تبدیلی لانے پر تُلی تھی۔ ہمارا مقصد ایک آزاد معاشرے کی تشکیل ہے جس میں خود مختار عدلیہ کو بنیادی حیثیت حاصل ہو گی۔"(۱۶۳)

حیران کن بات یہ ہے کہ تبدیلی اور نئے پاکستان کی تشکیل کا نعرہ لگانے والے عمران خان بھی روایتی سیاستدانوں کی طرح میڈیا کوریج اور الیکشن میں کامیابی کے لئے مالی وسائل پر یقین رکھتے ہیں:

"کوئی بھی پارٹی خواہ کتنی ہی مقبول کیوں نہ ہو، نچلی سطح تک سیاسی تنظیم کے بغیر

الیکشن نہیں جیت سکتی۔ ہمارے مالی وسائل نہ ہونے کے برابر تھے۔ اُن لوگوں نے اپنے دَورِ اقتدار میں خوب پیسہ جمع کر لیا تھا۔ میڈیا پر کوریج کے حوالے سے بھی ہمیں مسائل کا سامنا تھا۔"(۱۶۴)

سیاست میں آنے کے بعد ابتدائی سالوں میں اُنھیں سخت مسائل اور رُکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا۔ چونکہ آپ کا سیاست میں کوئی تجربہ نہیں تھا اور نہ لوگوں کی پہچان اور پرکھنے کی مہارت رکھتے تھے۔ اِس لیے ابتدا میں سیاست کے میدان میں ناکام رہے۔ ۱۹۹۶ء کے انتخابات میں پی ٹی آئی چند ایک سیٹیں جیت سکیں اور ۲۰۰۲ء میں تو عمران خان صرف اپنا سیٹ ہی جیت سکے۔ غرض آپ کے پارٹی کی کارکردگی تسلی بخش نہیں تھی۔ اُس وقت ملک میں چوٹی کی جماعتوں پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ "ن" کا طوطی بولتا تھا تاہم عمران خان نے کرکٹ کی طرح سیاست میں بھی ہار نہ مانی۔ جہد مسلسل اور بے خوفی یہ وہ دو ہتھیار تھے جن کے بل بوتے پر کرکٹ اور ہسپتال تعمیر کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ چنانچہ یہاں بھی اِن ہتھیاروں کو بروئے کار لایا اور پھر ۲۰۱۳ء تک عمران خان نے مسلسل کوشش، مستقل مزاجی اور محنت کی بدولت اپنی پارٹی کو ملک کی دوسری سیاسی پارٹی بنادیا۔ ملک میں بالخصوص صوبہ خیبر پختونخوا میں اپنے جاندار منشور سے نوجوان طبقے کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اِس سارے عرصے میں اُن سے کئی سیاسی غلطیاں بھی ہوئیں جن کا اعتراف اپنی آپ بیتی میں جابجا کیا ہے۔ عمران خان نے اپنی آپ بیتی میں اپنے زمانے کے تقریباً تمام چھوٹے بڑے واقعات مثلاً پرویز مشرف کا اقتدار پر قبضہ کرنا، بے نظیر بھٹو کی موت، امریکہ کا افغانستان پر یلغار اور اِس کے نتیجے میں وطن عزیز میں برپا ہونے والی دہشت گردی، قبائلی علاقوں میں فوجی آپریشنز، طبقاتی تقسیم، طالبان کی اُٹھان، دو بڑی سیاسی پارٹیوں کا آپس میں گٹھ جوڑ، اُسامہ بن لادن کی ہلاکت کا واقعہ وغیرہ کو خوب تفصیل سے بیان کیا ہے۔

پرویز مشرف کے ریفرنڈم کی حمایت کرنے، اپنی بیوی جمائما کو طلاق دینے اور فوج کا منتخب حکومتوں پر مسلسل دباؤ ڈالنے جیسے واقعات میں نڈر عمران خان مصلحت کا شکار نظر آتے ہیں یا غلط تاویلات دینے لگتے ہیں۔ عمران خان علامہ اقبال کو اپنا حقیقی رہنما مانتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ اُس کی فکری رہنمائی تعلیمات اقبال نے کی۔ ثبوت میں اقبال کے اشعار پیش کر کے کہتے ہیں کہ کس طرح اقبال کی شاعری نے اُنھیں راہِ راست پر ڈالا:

"جوں جوں عمر گزرتی گئی، اقبال میرے رہنما بنتے گئے۔ زیادہ سے زیادہ میں اُن سے اکتساب فیض کرنے لگا۔ گویا ایک القائی اور الہامی آواز۔ وہ مغربی جمہوریت کی اندھی تقلید کے قائل نہ تھے۔ اسلامی تعلیمات کے بارے میں اقبال کی تعبیر

درحقیقت اس سے کہیں زیادہ بلند اور وسیع تناظر کی حامل ہے جیسا کہ عام طور پر
پیش کی جاتی ہے۔"(۱۶۵)

عمران خان نے اعتراف کیا ہے کہ وہ عمر کے بیالیسویں سال سے روحانیت اور تصوف کی طرف آئے۔ آپ نے بڑی سچائی سے اِس بات کا بھی اعتراف کیا ہے کہ وہ مکمل طور پر مغرب زدہ تھے، اُن کی تعلیم، نشست و برخاست، اندازِ فکر، لباس، بعام، حلقہ احباب غرض سب کچھ مغربی تھا۔ آپ نے اِس معاملے میں وضاحت سے لکھا ہے کہ اُن کے ساتھ پے در پے ایسے واقعات ہوئے جس کی وجہ سے وہ روحانیت کی دنیا میں آئے۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ زندگی میں کوئی بھی بڑا کام یا منصوبہ شروع کرنے سے پہلے روحانی لوگوں سے مشورہ لیتے۔ میاں بشیر نامی ایک روحانی آدمی اُس کی زندگی پر ایسا اثرانداز ہوا کہ اُس کی زندگی یکسر تبدیل ہوئی۔ یہ اسی کا فیض تھا کہ ایک مادہ پرست اور مذہب سے برگشتہ آدمی کے خیالات اور معمولات میں انقلاب برپا ہو گیا۔ میاں بشیر سے مسلسل رابطہ، اقبال اور دیگر اسلامی سکالرز کی تعلیمات پڑھتے پڑھتے بالآخر عمران خان مذہب کی طرف آئے۔ اِس تبدیلی کے بارے میں عمران خان لکھتے ہیں:

"مطالعہ اور ادراک کا یہ عمل میرے لیے دریافت کا ایک ولولہ انگیز تجربہ تھا جبکہ دوسروں کے لیے سمجھانا مشکل ہو رہا تھا۔ میری بہنیں اور خاص طور پر میرے والد مجھے دیکھتے اور ہنستے کہ کیا یہ وہی ہے جو مذہب سے مکمل طور پر دُور تھا۔ پاکستان اور برطانیہ میں میرے دوست حیرت زدہ تھے کہ شاید میں کچھ جنونی سا ہو گیا ہوں۔ وہ یہ نہیں سمجھ سکے کہ مجھ پر کیا بیت رہی ہے۔ میں اِس پر لوگوں سے اُلجھتا نہیں تھا لیکن جب لوگوں نے بہت زیادہ بحث مباحثہ کیا تو میں تنگ آگیا اور میں نے فیصلہ کیا، میں اپنے ایمان کو اِن لوگوں کے سامنے بیان نہیں کروں گا۔"(۱۶۶)

اِس آپ بیتی کا آخری باب آپ بیتی سے کچھ میل نہیں کھاتا۔ ویسے تو ساری آپ بیتی میں انتشار سا ہے اور سرگزشت میں کوئی ربط نہیں لیکن آخری باب میں مصنف نے اِدھر اُدھر کی ہانکی ہے۔ آپ بیتی کے اس حصے میں اپنی کہانی، ذاتی واقعات، نجی حالات کے بجائے علامہ اقبال کے افکار، اشعار اور مغربی مفکرین کی کتابوں کے اقتباسات درج کیے ہیں۔ آپ بیتی لکھنے کا خیال اُنہیں جیل کی تنہائی اور کال کوٹھڑی میں آیا جب مشرف کے مارشل لاء کے زمانے میں اُنہیں ڈیرہ غازی خان جیل میں بند کیا گیا تھا۔ عمران خان کے اِس پورے سرگزشت سے بطورِ ایک طالب علم ہم نے جو سبق سیکھا وہ اُن کی بے مثال رجائیت ہے۔ عمران خان بدترین حالات میں بھی مایوس اور نااُمید نہیں ہوتے۔ صرف اِس ایک وصف کی بنا پر آپ نے زندگی کی سب

چھوٹی بڑی کامیابیاں حاصل کیں۔ عمران خان اپنی شخصیت کی اِس خوبی کو کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

''ساری زندگی مجھے عملیت پسندی کا درس دیا جاتا رہا۔ اپنے کرکٹ کیریئر اور بعد ازاں ہسپتال کی تعمیر کے دوران بھی ہمیشہ مجھے سے یہی ایک تقاضا تھا مگر میں ہمیشہ سے ایک خواب پرست رہا۔ جب بھی میری زندگی میں ایسے مراحل آتے ہیں اور مایوسی انتہا کو چھونے لگتی ہے تو میں پیچھے مڑ کر اپنے کرکٹ کیریئر اور ہسپتال کے لئے جدوجہد کے یہ مواقعے یاد کیا کرتا ہوں اور اپنے مالک کو جو مہربان ہے اور نہایت رحم کرنے والا ہے اور اُس سے اُمید رکھنے والا کبھی نامراد نہ ہو گا لیکن جو اُس سے نااُمید ہے اُس کی اُمید بر نہ آئے گی۔ ہر چند کہ چاندنی کی طرح اُس کی رحمت سب پر برستی ہے، کھیتوں اور کھلیانوں میں ، پہاڑوں اور بستیوں پر ، دریاؤں اور رہگزاروں پر، گھروں اور چھتوں پر لیکن اگر کوئی خود کو تنگ وتاریک کمرے میں بند کر کے کنڈی چڑھالے تو چمکتا ہوا چاند اُسے کیونکر دکھائی دے گا۔''(۱۶۷)

عمران خان کی اِس آپ بیتی کا اُردو ترجمہ معروف صحافی اور اُردو میں کئی کتابوں کے مصنف ہارون الرشید نے کیا ہے۔ ہارون الرشید کو چونکہ اُردو زبان پر کافی عبور حاصل ہے اِس لیے وہ بڑی حد تک معیاری ترجمہ کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ بہر حال ترجمے کے اپنے مسائل ہیں۔ بڑے سے بڑا ادیب بھی ترجمہ کرتے وقت اصل زبان کی حدت، مٹھاس، خوبصورتی اور اثر کو جوں کا توں نہیں رکھ سکتا۔ مترجم نے ترجمہ کرتے وقت اکثر مقامات پر الفاظ کے چناؤ، عبارت کے تسلسل، مفہوم اور مصنف کے احساسات کو مجروح کیا ہے۔ کتاب کے اُردو ترجمے میں کی گئی بعض غلطیوں کی نشاندہی اگلے سطور میں کی جائے گی۔

صفحہ نمبر ۲۳ پر اُن کے والد کے لندن سے پڑھنے کے بعد واپس آنے اور ریلوے سٹیشن پر اُن کے استقبال کا بیان بڑا گنجلک قسم کا ہے۔ یہاں دو مختلف واقعات کو گڈ مڈ کیے گئے ہیں۔ اِس طرح صفحہ نمبر ۱۲ پر اقبال کے تصور پاکستان کے بارے میں نہایت غلط ترجمہ کیا ہے جو عمران خان کے نقطہ نظر سے میل نہیں کھاتا:

''کم از کم ہندوستان کی حدود میں ایک ایسی ریاست جہاں وہ اپنے خوابوں کی ردا بن سکیں۔''(۱۶۸)

یا مثلاً:

''زندگی گزارنے کا یہ کون سا طریقہ ہے جو ترقی اپنے ساتھ لائی ہے۔''(۱۶۹)

مترجم نے کئی جگہوں پر نامناسب اور غلط الفاظ استعمال کیے ہیں جیسے اِس جملے میں وزارت کی جگہ نوابی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

''نوابی کی پیشکش نے مجھے حیرت زدہ کر دیا۔''(۱۷۰)

اس طرح ان جملوں میں بھی مناسب محاورے اور روز مرے کا استعمال نہیں کیا گیا ہے:

''کرکٹ تمام ہوئی لیکن سیاست اب بھی میرے تعاقب میں تھی۔''(۱۷۱)

''عہد شباب کے عروج سے میں آگے نکل رہا تھا۔''(۱۷۲)

''کھلاڑی کے ہاتھ ڈھنگ سے بروئے کار نہیں آتے۔''(۱۷۳)

علاوہ ازیں مزکورہ آپ بیتی میں کچھ ایسے جملے بھی ملتے ہیں جو اُردو قواعد کے لحاظ سے سراسر غلط ہیں۔

ہارون الرشید صاحب کو اُردو محاورے، روزمرہ اور فقرے کی نشست و برخاست نیز اُردو زبان کے مزاج کی واقفیت ہے اِس لیے زیادہ تر زبان و بیان پر حاوی نظر آتے ہیں لیکن بعض جگہوں پر انتہائی غلط محاورات اور روزمروں کا استعمال کرتے ہیں حتیٰ کہ سلِنگ یا عامیانہ روزمرہ درج کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ کتاب میں جہاں جہاں یہ مقامات آتے ہیں صاف معلوم ہوتا ہے کہ مترجم عجلت میں ہیں یا سر سے بوجھ اُتار رہے ہیں۔

۱۔ ''۱۹۹۹ء میں نواز شریف حکومت کا بوریا بستر گول کر دیا گیا۔''(۱۷۴)

۲۔ ''میں بھی اکثر ہم وطنوں کی طرح ملک کو مایوسی کے عالم میں ڈھلوان سے اُترتا ہوا دیکھتا رہا۔''(۱۷۵)

۳۔ ''جھٹکا ۱۹۷۱ء میں لگا۔''(۱۷۶)

مزکورہ آپ بیتی میں مترجم نے زیادہ تر آزاد، رواں اور بامحاورہ ترجمہ کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک زبان دوسری زبانوں سے طاقت اور توانائی لے کر ہی پھلتی پھولتی ہے۔ ترجمہ کرنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ دوسری زبانوں سے ترجمے میں تازہ ہوائیں آتی ہیں جو اپنے ساتھ نئے محاورے، الفاظ اور کہاوتیں لا کر زبان کے ذخیرے کو بڑھاتی ہیں۔ جہاں تک ''میں اور میرا پاکستان'' کا تعلق ہے، اس آپ بیتی کے اُردو ترجمے سے انگریزی زبان سے کئی نئے محاورے اور تراکیب اُردو زبان میں آئے ہیں:

۱۔ ''خواب وقت کے کسی لمحے میں قید نہیں ہوتا۔''(۱۷۷)

۲۔ ''میں آخر کار اپنا رُخ بدل چکا تھا۔''(۱۷۸)

۳۔ ''انسانوں کے جنگل میں اُسے تنہا نہ چھوڑ دیا گیا ہو۔''(۱۷۹)

۴۔ ''سواتی لڑکے کا باپ کس دِل فگار کشمکش سے دوچار ہے۔''(۱۸۰)

۵۔ ''وقت کا فہم وادراک ہونا۔''(۱۸۱)

۶۔ ''میڈیا نے مجھے بھون کرر کھ دیا۔'' (۱۸۲)

۷۔ ''یہ اختتام کا آغاز ہے۔'' (۱۸۳)

۸۔ ''ناکامی میں ہمیشہ منفی قیادت کی فصل اُگاتی ہے۔'' (۱۸۴)

۹۔ ''جیسے پتھر کا جگر چیر کے جھرنا پھوٹے۔'' (۱۸۵)

۱۰۔ ''صحراؤں میں کپاس نہیں اُگتے۔'' (۱۸۶)

۱۱۔ ''امریکہ کے لیے مصنف ''انکل سام'' کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔'' (۱۸۷)

ہمارے چوٹی کے سیاستدان خصوصاً وہ جو ملکوں ملکوں گھومے ہوں، جنھوں نے سرد و گرم دیکھے ہوں اور جنھوں نے اپنی محنت و لگن سے اپنا مقام بنایا ہو، کو لوگ زیادہ توجہ سے سنتے ہیں۔ اُن کی تقریروں پر اُنہیں داد دیتے ہیں اور اُن کے فقرے یاد کر کے دہراتے ہیں۔ عمران خان اور اُن کی پارٹی پر مختلف حلقوں سے یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ اُس نے سیاست میں گالی گلوچ، عدم برداشت اور دھرنوں کے کلچر کو فروغ دیا ہے اور اِس بات میں بڑی حد تک صداقت بھی ہے لیکن جہاں تک مذکورہ آپ بیتی کا تعلق ہے اِس میں عمران خان نے کافی شائستگی کا ثبوت دیا ہے اور اپنے مخالفین کے لیے کوئی اخلاق باختہ لفظ استعمال نہیں کیا بلکہ اِس آپ بیتی میں کئی فقروں کو اگر ''اقوال زرین'' کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

''۱۔ ایک سپاہی جو موت سے ڈرتا ہے کبھی کسی اعزاز کا مستحق نہیں ہوتا۔

۲۔ زندگی میں کوئی مختصر راستہ نہیں۔ کامیابی کے لیے امتحان کے مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔

۳۔ لیڈر کا اصل کردار بحران میں ہوتا ہے۔

۴۔ اگر آپ ہار نہ مانیں تو کوئی چیز بھی ناممکن نہیں ہوتی۔

۵۔ آپ اُس وقت ناکام ہوتے ہیں جب آپ حوصلہ ہار دیتے ہیں۔

۶۔ زندگی کسی مقصد اور جنون کے بغیر بسر نہیں کی جاسکتی۔

۷۔ زمانہ بدلتا ہے تو مسائل بھی بدل جاتے ہیں لیکن اُصول وہی رہتے ہیں۔

۸۔ علم کی ہر جستجو عبادت ہی کی ایک قسم ہے۔'' (۱۸۸)

دُنیا کی ہر زبان میں اصطلاحات کی خصوصی اہمیت ہے۔ اصطلاحات ہر قوم کی اپنی ثقافت، تہذیب، عقائد اور دیگر عوامل کی روشنی میں تشکیل پاتے ہیں۔ ہماری اُردو زبان میں ہر طبقے کی اپنی مخصوص اصطلاحات ہیں۔ عالموں، جاہلوں، اُستادوں، طالب علموں، کھلاڑیوں، سیاستدانوں اور ڈرائیوروں سب کی اپنی اپنی اصطلاحات ہیں۔ عمران خان چونکہ بنیادی طور پر کرکٹر ہیں اِس لیے آپ نے کرکٹ کی کئی اصطلاحات سیاست میں رائج کیں۔ آج وہی الفاظ اور اصطلاحات لوگوں کی زبان پر ہیں:

"۱۔ وکٹیں اُڑانا (مخالف پارٹی کے ممبروں کو اپنی پارٹی میں شامل کرنا)۔

۲۔ بیک فٹ پر آنا (حکمت عملی نرم کرنا)۔

۳۔ وکٹ کے چاروں طرف سٹروکس کھیلنا (تمام سیاسی پارٹیوں کے لئے قابل قبول ہونا)۔

۴۔ میچ فکس کرنا (مخالف پارٹی کے ساتھ درپردہ ملنا)۔

۵۔ ٹمپرینگ کرنا (سیاست کے اُصولوں پر عمل نہ کرنا)۔

۶۔ امپائر کی اُنگلی بلند ہونا (کسی غیر سیاسی طاقت کا سیاسی لوگوں کے درمیان فیصلہ دینا)۔" (۱۸۹)

عمران خان نے اپنی آپ بیتی میں علامہ اقبال کے ایک درجن کے قریب اشعار لکھے ہیں جو ہارون الرشید نے ترجمہ کرتے وقت بغیر کسی ردوبدل کے تحریر کیے ہیں۔ اِس کے علاوہ عمران خان نے اصل متن میں مولانا روم کے چند اشعار انگریزی ترجمے کے لکھے ہیں۔ ہارون الرشید نے اُس انگریزی ترجمے کا آزاد اُردو ترجمہ کیا ہے۔

مختصر یہ کہ "میں اور میرا پاکستان" پاکستان کے اُس فرزند کی آپ بیتی ہے جس کو اپنی زندگی ہی میں مختلف حوالوں سے اِتنی شہرت ملی جس کا کوئی تصور ہی نہیں کر سکتا۔ اخباری رپوٹر ہمیشہ اُن کے پیچھے رہے تاکہ اُس کی کوئی خبر اخبار کی زینت بنائیں اور عوام و خواص کو اُسے قریب سے دیکھنے اور اُن کی نجی زندگی پڑھنے سے دلچسپی رہی۔ ایسے میں "میں اور میرا پاکستان" اُن لوگوں کو عمران خان کی زندگی سے باخبر ہونے کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔ یہ آپ بیتی تِشنہ اور منتشر سہی لیکن اگر یہ بھی نہ ہوتی تو اِس ملک کے کروڑوں لوگ عمران خان کی زندگی، جدوجہد، احساسات، تاثرات، اندازِ فکر، بود و باش اور سب سے بڑھ کر اُن کے سیاسی بیانیے کو پڑھنے سے محروم رہتے۔

۶۔ سب سے پہلے پاکستان (جنرل ریٹائرڈ پرویز مشرف)

جنرل پرویز مشرف پاکستانی فوج کے سابق سپہ سالار اور صدر پاکستان رہے ہیں۔ پاکستان پر جن فوجی جرنیلوں نے حکمرانی کی ہے اُن میں پرویز مشرف چوتھے فوجی حکمران تھے۔ ۱۹ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو اُس وقت کے وزیر اعظم نواز شریف کے ساتھ ایک ڈرامائی تصادم کے نتیجے میں ملک کے سربراہ بنے۔ پرویز مشرف کی یہ آپ بیتی ''سب سے پہلے پاکستان'' اُن کی پیدائش ۱۹۴۳ء سے یکم اکتوبر ۲۰۰۶ء تک کے اُن کے ذاتی، سیاسی، غیر سیاسی، ملکی، علاقائی اور بین الاقوامی واقعات پر مشتمل ہے۔ اِس آپ بیتی میں آپ نے بڑی تفصیل سے یہ بتایا ہے کہ قیام پاکستان کے وقت چار سال کی عمر میں وہ ہجرت کر کے پاکستان آ گئے۔ اُن کی زندگی میں کئی اُتار چڑھاؤ آئے۔ پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول سے تربیت حاصل کرنے کے بعد وہ سپیشل سروسز گروپ (SSG) میں کمانڈو بنے اور ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء میں بھارت کے ساتھ ہونے والی جنگیں لڑیں۔ پاک فوج میں ترقی کی منزلیں طے کرتے ہوئے وہ جنرل، چیف آف آرمی سٹاف اور پھر آٹھ سال تک پاکستان کے سب سے بڑے انتظامی انچارج (چیف ایگزیکٹیو) رہے۔ پرویز مشرف سے پہلے جتنے سربراہان مملکت نے یادداشتیں لکھیں ہیں وہ ''سب سے پہلے پاکستان'' کی طرح انقلاب آفرین، سچائی پر مبنی، مفصل، مربوط اور قابل توجہ نہیں تھیں۔ اِس آپ بیتی میں قارئین کو دہشت گردی کے اسباب اور عوامل، القاعدہ اور دہشت گردی کے خلاف جاری منظم مہم، فوج کی حکمت عملی، مخبروں کی گرفتاری، مؤثر جاسوسی نظام اور خونی مقابلوں کی تفصیلات پڑھنے کو ملتی ہیں۔ پرویز مشرف نے اگر ایک طرف ملک کے سب سے بڑے باثر اور اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز لوگوں پر قاتلانہ حملوں کی تفصیل، منصوبہ بندی اور قاتلوں کی گرفتاری سے پردہ اُٹھایا ہے تو دوسری طرف غیر ملکی سراغ رساں ایجنسیوں کے کرتوت کو بھی طشت از بان کیا ہے اور ساتھ ساتھ اپنی زندگی کے شب و روز اور وہ واقعات جنہوں نے آپ کی زندگی بدل ڈالی حتیٰ کہ اپنے چھوٹے چھوٹے عشقیہ مہم جوئیوں کو بھی بیان کیا ہے۔

مشرف کی مذکورہ آپ بیتی کی سب سے اہم خوبیاں، صداقت، لکھنے کا انداز، واقعات کے درمیان ربط اور اندازِ بیان ہے۔ وہ ہر واقعے کا پس منظر بتاتے ہیں اور کسی ماہر وکیل کی طرح اپنی بات پوری قطعیت، مکمل دلائل اور مؤثر انداز کے ساتھ قاری کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ وہ حیرت انگیز حد تک ہر چھوٹے بڑے واقعے کے ساتھ اپنا قلبی لگاؤ اور نظریاتی وابستگی دکھاتے ہیں۔ اُس کے بیان کردہ واقعات جزئیات کی حد تک مکمل ہیں۔ اِس آپ بیتی کی دوسری اہم خوبی یہ ہے کہ پرویز مشرف دیگر سیاستدانوں کی طرح نہ تو بات کو چھپاتے ہیں اور نہ گمراہ کن دلیلیں یا تاویلیں پیش کرتے ہیں۔ جہاں جہاں اُن سے غلطیاں ہوئی ہیں، اُس کا اعتراف بھی کرتے ہیں مثلاً القاعدہ کے ممبران کو امریکہ کے حوالے کرنے کے پیسے وصول

کرنا، ریفرنڈم میں دھاندلی کرنا، مسلم لیگ نواز اور پیپلز پارٹی کے لوگوں کو توڑ کر مسلم لیگ ''ق'' میں لانا، احتساب بیورو کے ذریعے مخالفین کو ڈرانا اور بے نظیر اور نواز شریف کے ساتھ این آر او یاڈھیل کرنا۔

اِس آپ بیتی کا اُردو نام ''سب سے پہلے پاکستان'' بھی کافی دلچسپ ہے۔ دہشت گردی اور امریکہ کا افغانستان پر حملہ کرنے کے دِنوں میں جب پرویز مشرف نے امریکہ اور اتحادی ممالک کے تمام جائز اور ناجائز مطالبات مان لیے اور پاکستان نے اِس جنگ میں ''فرنٹ لائن ریاست'' بننے کا فیصلہ کیا۔ پرویز مشرف نے یہ شوشہ چھوڑا کہ ہم پاکستان کو بچانے کے لیے افغانستان پر حملے میں امریکہ کا ساتھ دے رہے ہیں حالانکہ روس اور ایران نے امریکہ کو فوجی اڈے دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اِس موقع پر پرویز مشرف اور اُس کے حواریوں نے یہ نعرہ لگایا کہ ''سب سے پہلے پاکستان'' (اُس کا یہ نعرہ اسلام، اخلاقیات اور علامہ اقبال کے افکار کے خلاف تھا)۔ یوں اپنی آپ بیتی In the line of Fire کا اُردو ترجمہ کرتے وقت ''گولیوں کی بوچھاڑ میں'' کے بجائے ''سب سے پہلے پاکستان'' کیا۔

پرویز مشرف نے اپنی آپ بیتی چھ حصوں میں تقسیم کی ہے جو اُن کی زندگی کے چھ مختلف ادوار ظاہر کرتی ہیں۔ ''بچپن''، ''فوج میں کمیشن''، ''حکومت اور سیاست میں آمد''، ''عہدِ صدارت''، ''دہشت گردی اور اس کے تباہ کن اثرات'' اور ''ملک میں اُن کے کیے گئے مختلف اقدامات''۔ مشرف اپنی کہانی بچپن سے شروع کرتا ہے۔

پرویز مشرف کی پیدائش اپنے نانا کے تاریخی مکان نہر والی حویلی میں ۱۱؍اگست ۱۹۴۳ء کو ہوئی۔ اِس موقع پر آپ نے اپنے خاندان دادا، دادی، نانا، نانی اور اُن کے بچوں کی تفصیل درج کی ہے۔ آپ کی اور آپ کے والدین کی مادری زبان اُردو ہے۔ آپ بیتی کے اِس حصے میں آپ نے واقعات کی زمانی ترتیب کا خیال رکھا ہے اور واقعات کے انتخاب میں احتیاط کے ساتھ ساتھ مہارت کا بھی ثبوت دیا ہے اور ساتھ اِس بات کا بھی اعتراف کیا ہے کہ اُنہیں بچپن کے زیادہ تر واقعات یاد نہیں۔ آپ نے یہ بھی بتایا ہے کہ میں بچپن میں کوئی غیر معمولی استعداد کا لڑکا نہیں تھا۔ ذہن اور صلاحیتوں کے اعتبار سے اوسط درجے کا تھا۔ پڑھائی میں جی نہیں لگتا، ماں سخت مجبور کر کے پڑھائی کراتی اور یہ کہ کبھی جماعت میں پوزیشن حاصل کرنے والا طالب علم نہیں رہا، پرویز مشرف کے بڑے بھائی جاوید البتہ انتہائی ذہین اور پڑھاکو تھے۔ بچپن میں پرویز مشرف اپنے بڑے بھائی کی شخصیت، تعلیمی ترقی اور قابلیت سے کافی متاثر تھے۔ پرویز مشرف کا خاندان ایک نچلے درجے کا متوسط خاندان تھا جس کے والدین اپنے بچوں کی تعلیم اور روشن مستقبل کے لیے ہمہ وقت فکر مند رہتے۔ گھر کی گاڑی چلانے کے لیے ماں باپ دونوں نوکری کرتے۔ اُن کی ماں اپنے بچوں کے لیے کتنی قربانی دیتی، پرویز مشرف اِس کا اظہار اِس طرح کرتے ہیں:

''اپنی آمدنی بڑھانے کے لیے میری والدہ ایک سکول ٹیچر بن گئیں، میرے والدین ہم خیال تھے اور اُن دونوں کی دِلی خواہش تھی کہ اُن کی اولاد کی پرورش بہترین ہو جس میں ہماری غذا، ہماری تعلیم، ہماری تربیت اور خاندانی اقدار شامل تھیں۔ میری والدہ پیسے بچانے کے لیے تانگے میں سکول جانے کی بجائے گھر سے دو میل پیدل جاتیں اور دو میل پیدل آتیں تاکہ جو پیسے بچیں اُن سے ہمارے لیے پھل خرید سکیں۔ ہم ہمیشہ اُن پھلوں کے منتظر رہتے تھے۔''(۱۹۰)

پرویز مشرف کے والد ترکی میں پاکستانی سفارت خانے میں تبدیل ہو کر چلے گئے اور وہ اپنے خاندان کو بھی ترکی لے گئے۔ ترکی میں آپ اپنے خاندان کے ساتھ اکتوبر ۱۹۵۶ء تک سات سال مقیم رہے۔ ترکی میں ذریعہ تعلیم انگریزی ہے لیکن دوستوں کے ساتھ آپ نے ترکی زبان بھی سیکھی۔ آپ کو اِس بات پر فخر ہے کہ وہ ترکی زبان کافی روانی سے بول سکتا ہے۔ ترکی کے پاکستانی سفارت خانے میں آپ نے ملٹری اتاشی کرنل اسماعیل، کرنل مصطفیٰ اور جونیئر کمشنڈ آفیسر حمید کو قریب سے دیکھا۔ اِن لوگوں کی رُعب داب، باوردی ٹہلنا، رکھ رکھاؤ اور چستی سے چھوٹے پرویز اِتنے متاثر ہوئے کہ اُسی عمر میں فوج میں جانے کا فیصلہ کیا۔ آپ کو فوج میں جانے کا، ٹینس کھیلنے کا، فٹ بال اور کتے پالنے کا شوق ترکی سے ہوا۔ اِس موقع پر آپ نے بڑی ایمانداری سے بتایا ہے کہ میری والدہ بڑی خوش آواز تھی اور اُنہیں ہارمونیم بجانے میں بھی کمال حاصل تھا۔ اُن کے بقول اُن کی والدہ رقص بھی خوب کرتی تھیں۔ آپ کی آپ بیتی شائع ہونے کے بعد اِس قسم کی باتیں لکھنے پر ملک کے ایک بڑے حصے کی طرف سے آپ پر سخت تنقید بھی ہوئی لیکن آپ نے اِن باتوں کی کوئی پروا نہیں کی۔ آپ کے کچھ نقادوں کا خیال ہے کہ مغربی دنیا کے سامنے اپنا آپ لبرل ظاہر کرنے کے لیے آپ نے اپنی کتاب میں اِس قسم کی باتوں کو شامل کیا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ پرویز مشرف دیگر سیاستدانوں کے برعکس سچی بات کہتے ہیں اور اِس کے بدلے بڑے سے بڑے نقصان کے لیے تیار رہتے ہیں۔ یہی خوبی پرویز مشرف کی سرگزشت کو فن آپ بیتی میں اہم مقام سے سرفراز کرتی ہے۔ اپنے والدین کے شوقِ ڈانس کو اِس طرح بیان کرتے ہیں:

''میرے والدین کو موسیقی اور بال روم ڈانس کا بھی شوق تھا۔ ملکہ برطانیہ کی تاج پوشی کے جشن کے سلسلے میں ڈانس کا ایک مقابلہ منعقد کیا گیا جس میں ہمارے سفارت خانے کے بہت سے لوگوں نے حصہ لیا۔ اِس مقابلے میں میرے والدین نے بال روم ڈانسنگ میں پہلا انعام جیتا۔''(۱۹۱)

پرویز مشرف نے کراچی کے سینٹ پیٹرک سکول(St. Patrick School) سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور پھر لاہور کے مشہور کالج ایف سی کالج (Forman Christian College) سے ایف ایس سی کی سند حاصل کی۔ اِس موقع پر پرویز مشرف نے اپنے ہلکے پھلکے معاشقوں کا بھی ذکر کیا ہے اور بتایا کہ اُس نے اِس زمانے میں دیگر جذباتی نوجوانوں کی طرح عشق کیا۔ اپنی دوسری عشق کے بارے میں لکھتے ہیں:

"گارڈن روڈ پہنچتے ہی میں دوسرے عشق میں مبتلا ہو گیا۔ وہ مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) کی ایک خوبصورت بنگالی لڑکی تھی۔ یہ کافی پوچ اور بے معنی عشق تھا۔ میں نے بعد میں سُنا کہ وہ خاتون بنگلہ دیش میں خوش و خرم ازدواجی زندگی گزار رہی ہے۔ میرے خیال میں میری والدہ کو میری اِس حرکت کا شُبہ ہو گیا تھا کیونکہ اچانک میرا تعلیمی ریکارڈ گر گیا تھا۔"(۱۹۲)

پرویز مشرف نے ۱۸ سال کی عمر میں ۱۹۶۱ء کو فوج میں کمیشن حاصل کیا۔ پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول(PMA) میں دو، ڈھائی سال کی لازمی فوجی ٹریننگ حاصل کرنے کے بعد آرٹلری (توپ خانہ) رجمنٹ کے ساتھ منسلک ہوئے۔ آپ نے اکیڈمی کے شب و روز کو خوب مزے سے بیان کیا ہے۔ آپ نے ملٹری اکیڈمی کاکول کو کمہار کا چاک کہا ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح مختلف مزاجوں، عادتوں، قوموں، خاندانوں اور صلاحیتوں کے حامل لڑکے اکیڈمی میں آتے ہیں اور اُنہیں جسمانی، ذہنی اور نفسیاتی ٹریننگ کے بعد مستقبل کی ذمہ داریوں کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں کوئی بھی فرد ضائع نہیں ہوتا بلکہ ایک عظیم مقصد کے لیے سانچے میں ڈال کر نکال دیا جاتا ہے۔ کاکول میں تربیت حاصل کرنے کے بعد پرویز مشرف ملک کے مختلف جگہوں پر رہے۔ دریں اثنا اُس کا انتخاب خصوصی کمانڈو یونٹ ایس ایس جی (SSG) میں ہوا۔ اُنہیں اِس دوران کئی سخت جسمانی اور دماغی محنت و مشقت سے گزرنا پڑا۔ اِس موقع پر پرویز مشرف نے کافی صاف گوئی سے بتایا ہے کہ کس طرح وہ کوٹ مارشل سے بال بال بچے۔

مشرف کی آپ بیتی سے ایک بات عیاں ہے کہ وہ بچپن ہی سے نہایت لااُبالی نوجوان تھے۔ فوجی زندگی نے اُنہیں چست، ذمہ دار اور حساس بنایا۔ جب وہ کپتان تھے تو ایک دفعہ اپنے C.O کی اجازت کے بغیر چھٹی پر چلے گئے۔ فوج میں یہ حکم عدولی تصور ہوتی ہے اور اس کی سزا نوکری سے برخاستگی بھی ہو سکتی ہے۔ عین اُن دِنوں ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ چھیڑ گئی۔ جنگ میں مشرف نے ایسی بہادری دکھائی کہ نہ صرف آپ کی سزا ٹل گئی بلکہ اُنہیں تمغہ شجاعت سے بھی نوازا گیا۔ مصنف نے جنگ ۱۹۶۵ء کا آنکھوں دیکھا حال بھی بیان کیا ہے۔ صرف وہ واقعات بیان کیے ہیں جو اُن پر گزرے ہیں۔

پرویز مشرف نے دیگر فوجی آفسروں کی طرح اخباری رپورٹ اور دیگر کتابوں کے اقتباسات نہیں دیے صرف وہ لکھا ہے جو دیکھا ہے۔اِس زاویے سے دیکھا جائے تو ''سب سے پہلے پاکستان'' سیاسی خودنوشتوں میں زیادہ قابلِ اعتماد اور معیاری خودنوشت ہے۔ مصنف ۲۲ ستمبر کی ایک رات جب جنگ زوروں پر تھی اور دشمن کی طرف سے شدید گولہ باری ہو رہی تھی، کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اِس دوران مجھے خطرے سے کھیلتے دیکھ کر میرے تمام سپاہی جو محفوظ جگہ چلے گئے تھے، واپس آگئے۔ ہم سب نے پہلے تو آگ بجھائی اور شہیدوں کی لاشوں کو باہر نکالا۔ میں نے دیکھا کہ ایک جوان ابھی زندہ تھا۔ میں نے اُس کا سر اپنے بازوؤں میں لے لیا لیکن جب میں اُس کے زخم پر پٹی باندھ رہا تھا، اُس کا انتقال ہوگیا۔ یہ مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ جنگ میں ایسے بے رحم واقعات کا نقش ہمیشہ کے لئے ذہن پر کندہ ہو جاتا ہے۔ مجھے جانیں اور سامان حرب بچانے کے انعام میں بہادری کا تمغہ ملا۔ جس سپاہی نے میرا ساتھ دیا، اُسے بھی بہادری کا تمغہ ملا۔ وہ ایک ناقابل فراموش رات تھی۔''(۱۹۳)

اِس کے بعد مصنف اپنی شادی، بچوں کی پیدائش اور مشرقی پاکستان کی علیٰحدگی کا ذکر کرتے ہیں۔آپ نے اعتراف کیا ہے کہ اُن کی کامیابی کے پیچھے اُن کی بیوی کا ہاتھ ہے کیونکہ ''بیگم صہبا'' نے ایک بے فکرے، جلد باز اور اکھڑ مزاج پرویز مشرف کو ایک متوازن اور ذمہ دار انسان بنایا۔ پرویز مشرف نے ذوالفقار علی بھٹو حکومت کی برخاستگی اور جنرل ضیاء الحق کے طویل مارشل لاء پر بھی اظہارِ خیال کر کے بتایا ہے کہ ضیاء الحق کے مارشل لاء میں غریب اور ادنیٰ قسم کے سیاسی ارکان کو کوڑے لگائے جاتے تھے اور بڑے بڑے بدمعاشوں کو کوئی ہاتھ نہیں لگاتا۔ وہ راولپنڈی میں ڈپٹی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے ساتھ رہے۔ اُن کا تجزیہ ہے کہ فوج کے پیشہ ورانہ زندگی پر مارشل لاء کے بہت بُرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ پرویز مشرف فوجی افسر ہونے کے باوجود ضیاء الحق کے مارشل لاء اور پالیسیوں پر تنقید کرتے ہیں۔ ایک جگہ تو ضیاء الحق کی منافقت بیان کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا:

> ''ضیاء کا کوئی سیاسی حلقہ نہیں تھا۔ بھٹو کو پھانسی دینے سے اُنہوں نے اُن کو شہید بنایا اور اُن کی سیاسی جماعت پیپلز پارٹی کو پہلے سے بھی زیادہ مضبوط۔ اُنہیں یہی راستہ آسان معلوم ہوا کہ وہ اپنے آپ کو دائیں بازو کی مذہبی جماعتوں سے منسلک کر کے

اُنہیں اپنا حمایتی بنالیں۔اُنہوں نے مذہبی حلقوں کے ساتھ اپنی یگانگت دکھانے کے لیے مذہبی تقریبات میں بہت زور شور سے شرکت کرنی شروع کر دی۔ حتیٰ کہ موسیقی اور عام تفریح بھی ایک طرح سے ممنوع ہو گئی حالانکہ میں نے سنا ہے کہ ذاتی طور پر وہ کلاسیکی موسیقی پسند کرتے تھے۔"(۱۹۴)

پرویز مشرف نے اگلے عہدوں پر ترقی اور مختلف عہدوں پر تعیناتی کے حوالے سے اپنے تجربات، مشاہدات اور کارناموں کے بارے میں تفصیل دی ہے۔آپ نے اپنی آپ بیتی میں فوج کے اندرونی طریقہ کار، میکنزم اور خصوصی استعداد پر روشنی ڈالی ہے۔ پرویز مشرف کی آپ بیتی جو انہیں اپنے ہم عصر اور ہم پیشہ خودنوشتوں سے ممتاز بناتی ہے، وہ ہے سچائی۔ مشرف نہ تو اپنی خامیوں کو چھپاتا ہے اور نہ ہی اِس کے لیے اُلٹے سیدھے دلائل کا سہارا لیتا ہے۔ فوج کے ساتھ بے پناہ اُلفت و محبت رکھنے کے باوجود اِس بات کا اقرار کرتا ہے کہ فوج میں اُونچے عہدوں پر تقرری کے لیے سفارشیں چلتی ہیں۔ نیز فوج میں بھی من پسند افراد کو نوازنے کا کلچر موجود ہے۔(۱۹۵)

پرویز مشرف خود کو دوسرے کمانڈنگ افسروں اور جی او سی (GOC) وغیرہ سے مختلف بتاتا ہے اور کہتا ہے کہ میں اپنے نچلے درجے کے سپاہیوں اور ماتحتوں کے ساتھ ہمیشہ پیش پیش ہوتا حالانکہ GOC خود سپاہیوں کو براہِ راست کمان نہیں کرتا بلکہ جونیئر افسر یہ کام کرتے ہیں۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ میں فوجی مشقوں کے دوران عام سپاہیوں کے ساتھ ساتھ ہوتا۔ اگر کوئی نہر عبور کرتا تو میں اگلے تیراکوں کے ساتھ رہتا۔اِس چیز کا سپاہیوں پر مثبت اثر پڑتا اور اُن کا اعتماد بڑھتا۔البتہ جب آپ "جی ایچ کیو" میں ملٹری آپریشنز تھے تو اُس وقت کے وزیراعظم بے نظیر بھٹو کو آپ نے مقبوضہ کشمیر پر حملہ کرنے کے حوالے سے ایک بریفنگ دی تھی جس پر بے نظیر بھٹو نے آپ کو ٹوکا تھا اور شدید برہمی کا اظہار کیا تھا۔آپ نے اِس واقعے کا ذکر نہیں کیا البتہ بے نظیر بھٹو اپنی آپ بیتی "دُخترِ مشرق" میں اِس بریفنگ کے بارے میں لکھتی ہیں:

"اِس بریفنگ میں ایک مرتبہ پھر دُہرایا گیا کہ پاکستان سری نگر پر قبضہ کیسے کرے گا۔ڈائریکٹر آف ملٹری آپریشنز میجر جنرل پرویز مشرف (جو بعد میں چیف آف سٹاف اور صدر مملکت بنا) کے آخری الفاظ کے مطابق جنگ بندی ہو جائے گی جب سری نگر پاکستان کے قبضے میں ہو گا،اِس کے بعد کیا ہو گا؟ میرا سوال تھا۔وہ میرے سوال پر حیران ہوا اور کہنے لگا۔ اگلا قدم یہ ہو گا کہ پاکستان کا جھنڈا سری نگر پارلیمنٹ پر لہرا رہا ہو گا۔اس کے بعد کیا ہو گا؟ پھر میں نے سوال کیا۔آپ اقوام متحدہ کا دَورہ کریں

گی اور اُنہیں بتائیں گی کہ سری نگر پر پاکستان کا قبضہ ہے۔اور پھر کیا ہوگا؟ میں نے پھر سوال کیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ جنرل مشرف نے ایسے سوالات کے جوابات کی تیاری نہیں کی تھی۔ وہ گھبرا گیا تھا۔"(۱۹۶)

۷ اکتوبر ۱۹۹۸ء کو چیف آف آرمی سٹاف جہانگیر کرامت سے اُس وقت کے وزیر اعظم نواز شریف نے استعفیٰ لیا اور جنرل پرویز مشرف کو نیا آرمی چیف بنایا۔ وزیر اعظم کا خیال تھا کہ انڈیا سے ہجرت کرنے والا اور ایک متوسط خاندان سے تعلق رکھنے والا پرویز مشرف جو نہ تو سیاسی پس منظر رکھتا ہے نہ سماجی حلقہ، اُن کے لیے پریشانی کا سبب نہیں بنے گا تاہم اُن کے تمام اندازے غلط نکلے۔ مشرف نواز شریف کے اندازوں سے کہیں زیادہ چالاک، ضدی، سرکش اور تیز طرار نکلا۔

دنیا کے کسی بھی مہذب یا جمہوری ملک کے برعکس پاکستان میں آرمی چیف کا عہدہ کئی لحاظ سے اہم اور طاقت کا محور تصور کیا جاتا ہے۔ مشرف نے بتایا ہے کہ کس طرح عوامی نمائندے، سماجی حلقے، پارٹیوں کے سربراہان اور سیاستدان آرمی چیف کو سیاسی اور دیگر قومی معاملات میں ملوث کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم اکثر اخبارات، مختلف مضامین اور ٹی وی ٹاک شوز میں اِس قسم کی خبریں سنتے رہتے ہیں لیکن پرویز مشرف نے اپنے تجربے کی روشنی میں یہ معلومات فراہم کی ہیں۔

پرویز مشرف کا آرمی چیف بننے کے بعد معرکہ کارگل اُس کی سب سے ناکام مہم جوئی تھی جس کی وجہ سے فوج، حکومت اور ملک کو سخت بدنامی اور ذلت کا سامنا کرنا پڑا۔ آپ نے کارگل کی جغرافیائی اہمیت اور اِس جنگ کا پورا پس منظر بیان کیا ہے۔ اِس جنگ کے دوران حکومت پاکستان، فوج اور ملکی میڈیا بار بار کہہ رہی تھی کہ یہ دراصل کشمیری مجاہدین ہیں جو ہندوستانی افواج سے لڑ رہے ہیں تاہم انڈیا اور بین الاقوامی مبصرین کا اصرار تھا کہ یہ دراصل پاکستانی افواج ہیں جو ہندوستان کے علاقوں میں دراندازی کر رہے ہیں۔ پرویز مشرف نے مذکورہ آپ بیتی میں بہر حال یہ راز ظاہر کر کے کہا ہے کہ مجاہدین کا صرف بہانہ تھا جنگ تو پاک فوج لڑ رہی تھی۔ اِس جنگ پر پورا ایک باب قلمبند کیا گیا ہے۔ حکومت وقت نے یہ الزام لگایا تھا کہ مشرف نے حکومت کو بتائے بغیر یہ جنگ شروع کی تھی۔ آپ پر پانچ بڑے الزامات لگائے گئے تھے لیکن آپ نے سب کا باری باری جواب دے کر ان الزامات کی نفی کی ہے۔

۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کا دِن تھا اور وقت تھا شام کے پونے سات بجے۔ جب اُس وقت کے وزیر اعظم محمد نواز شریف نے پرویز مشرف کو چیف آف آرمی سٹاف کے عہدے سے برخاست کر کے ایک اور جنرل ضیاء الدین کو نیا چیف بنایا۔ اُس وقت پرویز مشرف ایک جہاز میں سری لنکا سے ملک واپس آرہے تھے۔ ہوائی جہاز میں ایندھن بہت کم رِہ گیا تھا اور پائلٹ کو ہدایت تھی کہ آپ یہ جہاز پاکستانی حدود سے باہر لے جائیں۔ اُس وقت پرویز مشرف نے تناؤ، اضطراب اور سخت بے بسی

کی صورتحال کو انتہائی دلنشین انداز میں بیان کیا ہے۔ اُس وقت اگر کور کمانڈر اور دیگر جنرل حرکت میں نہ آتے تو آپ کے جہاز کو حادثہ پیش آنا یقینی تھا۔ جب آپ کا جہاز کراچی ایئرپورٹ پر اُترا تو حالات تبدیل ہو چکے تھے اور ملک ایک مرتبہ پھر جمہوریت سے آمریت کے دَور میں داخل ہو گیا تھا۔ آپ نے پچھلے فوجی جرنیلوں کی طرح ملک کا آئین معطل نہیں کیا بلکہ اِس کے کچھ حصے یا شقیں توڑ ڈالیں۔ مصنف نے اپنے عہدے سے ہٹائے جانے کی ڈرامائی صورتحال کو آپ بیتی میں یوں بیان کیا ہے:

''تاریخ میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ کسی آدمی نے زمین پر بیٹھے بیٹھے محوِ پرواز ایک ہوائی جہاز کو اغوا کر لیا ہو اور وہ بھی کوئی معمولی آدمی نہیں بلکہ ایک وزیراعظم نے جس نے اپنے ملک کے عوام کی زندگیوں کی حفاظت کرنے کی قسم کھائی ہو۔ جواب کے انتظار کرنے کے دوران جب ہم ۲۱۰۰۰ فٹ کی بلندی پر پہنچ گئے تو جواب یہ آیا کہ تم پاکستان میں کہیں بھی نہیں اُتر سکتے ہو۔ تم نے پاکستانی فضائی حدود کو فوراً چھوڑ دینا ہے۔ ہمیں یقین نہ آیا۔ کیا صرف مجھ سے چھٹکارا پانے کے لئے وہ واقعی ہم سب کو مارنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اب پائلٹ نے ایک اور خبر سنائی اور وہ یہ کہ ۲۱۰۰۰ فٹ کی بلندی پر چڑھتے ہوئے ہم نے اِتنا ایندھن خرچ کر دیا تھا کہ اب ہمارے پاس پاکستان سے باہر جانے کے لئے ایندھن باقی بچا ہی نہیں۔ اب یہ ممکن ہی نہیں، پائلٹ نے بتایا۔ ماحول مزید کشیدہ ہو گیا۔''(۱۹۷)

اقتدار سنبھالنے کے بعد پرویز مشرف نے قومی اسمبلی، سینٹ اور چاروں صوبائی اسمبلیوں کو برخاست کر کے نواز شریف اور دیگر مسلم لیگی لیڈروں کو گرفتار کر لیا۔ آپ نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ میں نے چاروں صوبوں کے مرد اور خواتین پر مشتمل ایک متوازن کابینہ بنائی جن کا انتخاب خالصتاً میرٹ کی بنیاد پر ہوا تھا اور یہ کہ میں کابینہ کے دو ریٹائرڈ جنرلوں کے علاوہ کسی کو نہیں جانتا تھا۔ اپنی آپ بیتی کے اِس حصے میں پرویز مشرف نے اپنی اصلاحات اور کارنامے بڑھا چڑھا کر بیان کیے ہیں۔ اقتدار سنبھالتے ہی پرویز مشرف نے قوم کو سات نکات دیے لیکن مارشل لاء اُٹھانے، دوبارہ انتخابات کرانے یا حکومت کو نواز شریف کے بغیر بحال کرنے کی کوئی بات نہیں کی۔ صاف لگ رہا تھا کہ آپ لمبے عرصے تک حکومت میں رہنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور پھر یہ ثابت بھی ہو گیا۔

مشرف کا قومی احتساب بیورو (NAB) بنانا تاکہ طاقتور لوگوں سے ملک کا لوٹا ہوا پیسہ واپس لیں، ایک بڑا کارنامہ

تھا۔ تاہم ابتدا میں جن لوگوں کو نیب نے پکڑا اُن سب کے ساتھ NRO کر کے اُنہیں وزیر اور مشیر لگایا گیا۔ نواز شریف اور بے نظیر بھٹو کے ساتھ ڈھیل کرنا، مسلم لیگ "ق" بنانا، مخالف پارٹیوں کے لوگوں کو توڑ کر مسلم لیگ "ق" میں شامل کروانا، وعدہ خلافی کرنا، یہ بے اُصولی، بے ایمانی اور سیاسی ہتھکنڈے ایک سپاہی یا کمانڈر کے لیے زیبا نہ تھے۔ ۳۰ اپریل ۲۰۰۲ء کا ریفرنڈم (استصوابِ رائے) جس میں پرویز مشرف اگلے پانچ سال کے لئے صدر منتخب ہوگئے، میں ریکارڈ دھاندلی کی گئی تھی، جس کو عالمی میڈیا نے بھی رپورٹ کیا۔ آپ نے تسلیم کیا ہے کہ ریفرنڈم میں بڑے پیمانے پر بے قاعدگیاں ہوئی ہیں۔ آپ نے اپنی آپ بیتی میں اپنی تمام ناکامیوں کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے دِلی معذرت پیش کی ہے۔ اِس موقع پر آپ نے یہ دلیرانہ اعتراف بھی کیا ہے کہ "سچائی کتنی کڑوی ہی کیوں نہ ہو غلط بیانی سے کہیں زیادہ بہتر ہوتی ہے۔"(۱۹۸)

۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کا دِن جدید انسانی تاریخ کا وہ دِن ہے جس دِن دنیا بدل گئی۔ دنیا کے سب سے طاقتور ملک امریکہ دہشت گردوں کے نشانے پر تھا۔ اینڈھن سے بھرے مسافر بردار بوئنگ ہوائی جہازوں کو اغوا کر کے دانستہ Twin Towers سے ٹکرایا گیا اور دو اور ہوائی جہازوں کو بھی اغوا کیا گیا تاکہ پینٹا گون اور وائٹ ہاؤس کو نشانہ بنایا جاسکے تاہم اِن دونوں کو ٹارگٹ پر پہنچنے سے پہلے ہی مار گرایا گیا یہ ایک بڑا المیہ تھا اور امریکہ زخمی سانپ کی طرح بَل کھا رہا تھا۔ اُس نے "القاعدہ" کو اِن حملوں کا ذمہ دار ٹھہرایا اور افغانستان میں القاعدہ کے ٹھکانوں کو ختم کرنے، اِس تنظیم کے بڑے رہنماؤں کو گرفتار کرنے اور طالبان سے نجات حاصل کرنے کے لیے سخت قدم اُٹھانے کا فیصلہ کیا۔ ۹/۱۱ کا دِن دنیا نے دہشت گردی کے خلاف جنگ کا آغاز کر دیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ جنگ ساری دنیا میں پھیل گئی۔ اٹھارہ سال گزرنے کے باوجود دہشت گردی آج بھی دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ اِس دوران صلیبی جنگوں کا نعرہ بھی بلند ہوا اور تمام دنیا مسلمانوں خصوصاً انتہا پسند اور بنیاد پرست مسلمانوں کے خلاف صف آرا ہو گئی۔ اِس دِن کے بعد سیاست، معاشرت، معیشت اور دیگر بے شمار چیزوں میں تغیر و تبدل آیا۔ دہشت گرد ایک انتہا پر تھے جبکہ یورپی اقوام اور مغربی سوچ کے علمبردار جدیدیت کے حامی لوگ دوسری انتہا پر۔ مختصر یہ کہ ۹/۱۱ کے فوراً بعد امریکہ کا رویہ انتہائی جارحانہ تھا۔ اُنہوں نے القاعدہ پر الزام لگایا اور اُن کو ختم کرنے کے لیے کسی بھی حد تک جانے کا عندیہ دیا۔ امریکہ نے پاکستان کو صاف الفاظ میں بتایا کہ تم ہمارے ساتھ ہو یا دہشت گردوں کے ساتھ؟ اگر ہمارے ساتھ ہو تو پھر ہمیں ہوائی، اڈے، انٹیلی جنس اور لاجسٹک سپورٹ دو گے۔ اُس وقت چونکہ پرویز مشرف کی حکومت تھی۔ اِس لئے سارا دباؤ مشرف پر آیا۔ پرویز مشرف کو ہمیشہ اِس بات پر تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے کہ اُس نے ایک ٹیلی فون کال پر گھٹنے ٹھیک دیے اور کسی سے مشورہ کیے بغیر امریکی صدر کے ایک بیان کے بعد سارا

ملک غیروں کے جنگ میں جھونک دیا۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ پرویز مشرف نے اپنی حکومت کو دوام بخشنے کے لیے اتحادی ممالک کا ساتھ دیا تھا۔ جمہوری حکومتیں اِس قسم کا فیصلہ کرنے سے پہلے سینکڑوں مرتبہ سوچتی ہیں کیونکہ اُنہیں پھر الیکشن میں عوام کے پاس جانا ہوتا ہے لیکن مطلق العنان حکمران کسی کو جواب دِہ نہیں ہوتے۔ امریکہ کو ابتدا میں پاکستان میں مارشل لاء پر اعتراض تھا لیکن افغان جنگ میں پاکستان کا فرنٹ لائن سٹیٹ کا کردار ادا کرنے پر اُنہوں نے پرویز مشرف سے آنکھیں بند کر لیں۔

پرویز مشرف اِن تمام اعتراضات کو مسترد کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ طالبان اور القاعدہ کے خلاف امریکہ کا ساتھ دینا انتہائی دانشمندی اور وقت کی ضرورت تھی۔ اگر ہم ایسا نہ کرتے تو افغانستان کے ساتھ ساتھ امریکہ ،اتحادی ممالک اور بھارت سب مل کر پاکستان کو بھی تباہ و برباد کر دیتے۔ امریکی وزیر خارجہ ''کولن پاؤل'' اور سیکرٹری آف سٹیٹ ''رچرڈ آر میٹیج'' نے سفارتی آداب کے خلاف پاکستان کو کھلم کھلا دھمکی دی کہ اگر آپ نے دہشت گردوں کی مدد کی تو ہم آپ کو پتھر کے دَور (Stone Age) میں واپس بھیج دیں گے۔ پرویز مشرف نے سچائی سے ان باتوں کو ذکر کیا ہے اور اعتراف کیا ہے کہ مجھ پر ملک کے اندر سے افغانستان کی مدد کرنے اور باہر دنیا سے امریکہ کی مدد کرنے کا سخت دباؤ تھا اور یہ بھی بتایا ہے کہ ایسے وقت میں رہنما بے حد تنہا ہوتا ہے کیونکہ آخری فیصلہ خود اُس نے ہی کرنا ہوتا ہے اور پھر پرویز مشرف نے امریکہ کا بھرپور ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ اپنے اِس فیصلے کا دفاع پرویز مشرف کچھ اِس طرح سے کرتے ہیں:

> ''میرا فیصلہ اپنے عوام کی خوشحالی اور میرے وطن کے بہترین مفاد پر مبنی تھا۔ سب سے پہلے پاکستان، میں نے امریکہ کے ساتھ ایک مدمقابل کی طرح بازی کھیلی۔ اگر ہم نے ساتھ نہ دیا تو اُس کا ردعمل غیض و غضب سے بھرپور ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ اگر ہم اُن کا ساتھ نہ دیتے تو کیا ہم اُن کے حملے کا مقابلہ کر سکتے ہیں؟ اِس سوال کا جواب نفی میں تھا اور اِس کی تین وجوہات تھیں۔ اول ہماری افواج تباہ ہو جاتیں، دوم امریکی حملہ کی صورت میں ہماری معیشت زندہ نہیں رِہ سکتی تھی، سوم ہم میں اُس وحدت کی کمی تھی جو پوری قوم کو دشمن کے مقابلے پر سینہ سپر کر دیتی ہے۔ ہم کسی طرح امریکہ کا فوجی مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔''(۱۹۹)

اپنی آپ بیتی میں پرویز مشرف نے بڑی تفصیل سے بتایا ہے کہ نائن الیون کے حملوں میں کون کون ملوث تھے اور اُنہوں نے کس طرح یہ منصوبہ پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ ہم اخباری کالموں اور دیگر غیر مستند ذرائع سے اِن حملوں کی منصوبہ

سازوں اور حملہ آوروں کے بارے میں پڑھتے رہتے ہیں لیکن مشرف کا بیان زیادہ قابل اعتماد ہے۔ وہ اِس لیے کہ اُن القاعدہ رہنماؤں میں زیادہ تر پاکستان سے گرفتار ہوئے اور چونکہ پرویز مشرف اُس وقت صدر مملکت اور آرمی چیف تھے اِس لیے اُن کی معلومات اور ذرائع زیادہ مستند ہیں۔ پرویز مشرف کے مطابق اِن حملوں کی منصوبہ بندی القاعدہ کے نمبر ۳ خالد شیخ محمد نے کی تھی جو ایک ایرانی شہری تھا اور جس کی پیدائش کویت میں ہوئی تھی۔ وہ امریکہ کی یونیورسٹیوں سے پڑھا تھا۔ اُس نے اپنے بھتیجے رمزی یوسف کے ساتھ ۱۹۹۳ء میں نیویارک کے ورلڈ ٹریڈ سنٹر کو اُڑانے کی کوشش بھی کی تھی۔ ۹/۱۱ کے بعد بھی وہ خاموش نہیں بیٹھا بلکہ لندن کے ہیتھرو ایئر پورٹ اور انڈر گراؤنڈ ریل کے نظام میں دھماکے کرنے کا منصوبہ بھی تشکیل دیا تھا لیکن وہ اِس سے پہلے راولپنڈی سے گرفتار ہو گیا۔ ۹/۱۱ کا منصوبہ کس نے کہاں اور کیسے بنایا تھا؟ پرویز مشرف اِس کے بارے میں یہ انکشافات کرتے ہیں:

> ''۱۹۹۸ء یا ۱۹۹۹ء میں غالباً ابو حفص المصری کے جسے اب اُس کے لقب محمد عاطف کے نام سے جانا جاتا ہے، اصرار پر اُسامہ بن لادن نے نائن الیون کے منصوبے کی منظوری دے دی حالانکہ اُس وقت اس کے حتمی تاریخ کا تعین نہیں کیا گیا تھا۔ جیسے ہی KSM (خالد شیخ محمد) کو معلوم ہوا کہ اُسامہ اب آمادہ ہو گیا ہے تو وہ اپنے خاندان کو قطر سے قندھار لے آیا۔ نائن الیون کا منصوبہ صرف اُسامہ بن لادن، محمد عاطف اور کے ایس ایم کے درمیان ہی خفیہ رکھا گیا تھا۔ ملا عمر کو تھوڑا سا اندازہ ہو گیا تھا کہ امریکہ کی سرزمین پر کوئی بڑا آپریشن ہونے کی منصوبہ بندی ہو رہی ہے لیکن اس کی تفصیلات اُسے معلوم نہیں تھیں۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ وہ اِس بات سے خوش نہیں تھا لیکن غالباً وہ کچھ کر نہیں سکتا تھا۔''(۲۰۰)

افغانستان کے علاقے تورا بورا پر بمباری کے بعد جہاں القاعدہ نے پہاڑوں میں سرنگیں کھود کر محفوظ پناہ گاہیں بنائی تھیں، وہاں سے القاعدہ کے بہت سے کارکن بھاگ کر پاکستان چلے آئے۔ پاکستان میں اُنہیں گرفتار کر کے امریکہ کے حوالے کر دیا گیا۔ مشرف نے ان کی تعداد ۶۸۹ بتائی ہے (بعد میں یہ تعداد ہزار تک پہنچ گئی)۔ مشرف نے اِس بات کا بھی اعتراف کیا ہے کہ ہم نے اُن کے بدلے امریکہ سے ڈالر اور دیگر مراعات حاصل کیں۔ اِس طرح آپ نے ایک امریکی صحافی ڈینیل پرل اور خود اپنے اُوپر حملے کرنے والے افراد کا سراغ لگا کر اُنہیں گرفتار کیا۔ اِن واقعات میں القاعدہ ملوث تھا۔ مشرف کے بیان کردہ واقعات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عرب اور دیگر غیر ملکی باشندے کس طرح ہمارے ملک میں

دندناتے پھرتے تھے اور جس شہر میں جہاں چاہتے دہشت گردی کے واقعات کرواتے۔

اپنی آپ بیتی کے آخری حصے میں پرویز مشرف نے ہمارے ملک کے نیوکلیائی طاقت کے بارے میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ پرویز مشرف کے زمانے میں ایک اور قضیے نے سر اُٹھایا تھا جب مغربی ممالک اور امریکہ نے پاکستان پر الزام لگایا تھا کہ پاکستان دیگر ممالک کو غیر قانونی طور پر نیوکلیائی صلاحیت فراہم کر رہا ہے۔ یہ بھی ہمارے ملک کی تاریخ کا ایک رسوا کن باب ہے اب یہ تاریخ کا حصہ بن چکا ہے لیکن جب بھی اِس حوالے سے بات ہوگی پرویز مشرف کی آپ بیتی کو بنیادی ماخذ کے طور پر لیا جائے گا۔ پرویز مشرف نے پاکستان کے ایٹمی ہتھیار بنانے کی ابتدا سے کامیابی تک سب کچھ صراحت سے بیان کیا ہے۔ اِس کے بعد یہ بتایا ہے کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے شمالی کوریا، ایران اور لیبیا کو برق رفتار مشینیں اور یورینیم فروخت کی تھیں۔ عبدالقدیر خان کو پاکستان کے سارے حکمرانوں نے بے انتہا آزادی اور خودمختاری دی تھی تاکہ وہ یکسوئی سے اپنا کام جاری رکھ سکیں مگر اُس نے اِس اعتماد سے ناجائز فائدہ اُٹھایا۔ مشرف کے مطابق اے کیو خان اور اُس کی لیبارٹری (KRL) کے بارے میں مجھے خفیہ اطلاعات مل رہی تھیں لیکن ہمارے پاس کوئی واضح ثبوت نہیں تھے۔ دوسرا یہ کہ وہ عوام میں ہیرو تھا اِس لئے ہم اُن پر آسانی سے ہاتھ نہیں ڈال سکتے تھے۔ ۲۰۰۲ء میں اُن کی سرگرمیوں کے بارے میں پریشان کن انکشافات سامنے آئے۔ بیرونی ممالک کی طرف سے اور خود اپنے خفیہ اداروں کی جانب سے عبدالقدیر خان کے بارے میں ثبوت آنے کے بعد مشرف نے اُنہیں نہ صرف KRL سے الگ کر کے ریٹائرڈ کر دیا بلکہ اٹامک انرجی ڈیپارٹمنٹ کو پہلی بار ریگولرائز کر کے اِس میں کمانڈ اینڈ کنٹرول (SPD) کا سسٹم بنادیا۔ نیز تمام لیبارٹریاں براہِ راست حکومت کے زیر نگرانی آئیں۔ مشرف کا دعویٰ ہے کہ اب اُس طرح کی غلطی کوئی نہیں کر سکتا۔ اِس سارے قضیے کا خلاصہ پیش کر کے پرویز مشرف ''سب سے پہلے پاکستان'' میں تحریر کرتے ہیں:

> ''میں نے طے کیا کہ اے کیو خان سے بات چیت کے لیے میں خود اُن سے ملوں۔ جب ہم ملے اور میں نے اُن کے سامنے ثبوت رکھے تو وہ جھاگ کی طرح بیٹھ گئے اور اقرار کیا کہ وہ اپنے آپ کو انتہائی قصوروار سمجھتے ہیں۔ اُنہوں نے مجھ سے کہا کہ اُنہیں باضابطہ طور پر معاف کر دیا جائے۔ میں نے جواب دیا کہ اُنہیں براہِ راست پاکستانی عوام سے معذرت کرنی اور معافی مانگنی چاہیئے۔ یہ طے کیا گیا کہ اِس کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہوگا کہ وہ ٹیلی ویژن پر پیش ہو کر ملک کو تمام دنیا کے سامنے شرمندہ کرنے اور صدمہ پہنچانے کی پاداش میں پوری قوم سے معافی مانگیں۔ اِس

کے بعد میں نے اُن کی مقدمہ نہ چلانے کی درخواست قبول کرلی لیکن اُن کے اپنے
تحفظ کے لیے اور آئندہ ہونے والی تفتیش کو مد نظر رکھ کر اُنہیں حفاظتی حراست
میں لے لیا۔''(۲۰۱)

مختصر یہ کہ پرویز مشرف کی آپ بیتی ''سب سے پہلے پاکستان'' سیاسی اور تاریخی دونوں حوالوں سے نہایت اہمیت کی حامل آپ بیتی ہے۔ ایسا وقت بھی آئے گا کہ یہ آپ بیتی یقیناً ہمارے نصاب کا حصہ ہو گی۔ تاریخ دان، فوجی مبصرین اور سماجی کارکن اِس کتاب سے حوالے کے طور پر اقتباسات نقل کریں گے (اب بھی ہمارے عسکری اداروں اور وار کالجوں میں یہ کتاب پڑھائی جاتی ہے)۔ اِس آپ بیتی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ مصنف نے انتہائی ایمانداری سے اپنی خامیوں اور شخصیت کی منفی پہلوؤں کا بھی برملا ذکر کیا ہے۔ صاف گوئی اور کھرے انداز سے بات کرنا پرویز مشرف کا خاصہ ہے۔ یہ خوبی اُن کی آپ بیتی میں بھی تلاش کی جاسکتی ہے۔

''سب سے پہلے پاکستان'' کے بارے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ سیاسی آپ بیتیوں میں ایک معیاری آپ بیتی ہے جس کی اہمیت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی جائے گی۔

جہاں تک ''سب سے پہلے پاکستان'' کی زبان وبیان اور اسلوب کا تعلق ہے پرویز مشرف نے یہ آپ بیتی انگریزی زبان میں لکھی ہے جس کا اُردو ترجمہ ہدایت خویشگی نے کیا ہے۔ مترجم نے آپ بیتی میں شامل مواد میں کوئی تبدیلی نہیں کی بلکہ اپنی اصلی حالت میں شائع کی۔ ہدایت خویشگی نے اِس آپ بیتی کا بہت معیاری ترجمہ کیا ہے اور ترجمے میں اپنی بھرپور مہارت اور صلاحیت کا ثبوت دیا ہے۔ مترجم کا کمال یہ ہے کہ انگریزی محاورات اور تراکیب کے متبادل اُردو تراکیب درج کیے ہیں اور کئی جگہوں پر جہاں اُردو متبادل موجود نہیں تھے یا اُن کے ذخیرہ الفاظ میں شامل نہیں تھے، کو براہِ راست انگریزی سے اُردو میں تبدیل کر کے اُردو اصطلاحات، محاورات اور تراکیب کا دامن وسیع کیا ہے۔ اصطلاحات کا اُردو ترجمہ کرتے وقت خویشگی نے اُردو زبان کے قواعد اور مزاج کا بھرپور خیال رکھا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اُنہیں اصطلاحات اُردو پر بھی دسترس حاصل ہے۔ اِن تمام خوبیوں کی بدولت کتاب کا اُردو ترجمہ اِتنا معیاری ہے کہ بادی النظر میں معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ ترجمہ شدہ کتاب ہے۔

یہ آپ بیتی ڈرامائی اسلوب میں لکھی گئی ہے۔ مشرف نے اپنی یادوں کی پٹاری سے زیادہ تر اُن واقعات کا انتخاب کیا ہے جن میں سنسنی خیزی، مہم جوئی، ڈرامائیت، تجسس اور شوخی پائی جاتی ہو۔ پرویز مشرف کی کہانی اُن کی فوجی زندگی اور سیاست پر مشتمل ہے۔ سیاست میں وہ ڈرامائی طور پر آئے۔ ایک فوجی کی زندگی تو ویسے بھی خطرات اور مہم جوئی سے بھرپور

ہوتی ہے۔اِس لیے ڈرامائیت کا عنصر اِس آپ بیتی میں پایا جانا لازمی تھا۔پرویز مشرف اپنی آپ بیتی کا ہر باب انتہائی ڈرامائی انداز سے ختم کرتا ہے یا کہانی کو ایک ایسے موڑ پر چھوڑ دیتا ہے کہ قاری خود بخود اگلے باب کو پڑھنے پر مجبور ہو جائے۔اقتدار پر قبضہ کرتے وقت جب فوج نے وزیراعظم ہاؤس، چاروں صوبوں کے وزرائے اعلیٰ اور گورنروں کے گھروں کا گھیراؤ کر لیا تو سیکرٹری دفاع کو پنجاب کے وزیراعلیٰ شہباز شریف کا فون آیا۔ صورتحال جاننے کے لئے سیکرٹری دفاع نے کیا جواب دیا؟ اِس بات پر باب نمبر ۱۳ کو ختم کیا ہے:

> ''اُن کے (چیف سیکرٹری) موبائل فون پر شہباز شریف کا فون آیا کہ کچھ سپاہیوں نے پرائم منسٹر ہاؤس کے گیٹ بند کر دیئے ہیں۔ یہ کون سی فوج ہے؟ شہباز نے پوچھا۔ سیکرٹری دفاع فوراً سمجھ گئے کہ فوج کا ردِ عمل شروع ہو گیا ہے۔اُنہوں نے جواب دیا، صرف ایک ہی فوج ہے پاکستان آرمی''۔(۲۰۲)

پرویز مشرف نے اپنی آپ بیتی میں ابواب کے نام بھی مہم جویانہ قسم کے رکھے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کی نفسیات میں بڑی حد تک مہم جوئی کا عناصر بھی شامل ہے جو آپ کی تحریر اور تقریر میں اسانی سے تلاش کیا جا سکتا ہے:

''(۱) وار (۲) جوابی وار (۳) آشیانہ (۴) آشیانے سے پرواز (۵) کمہار کا چاک (۶) بھٹی کے اندر (۷) آتشین زندگی (۸) القاعدہ پہاڑوں میں (۹) تعاقب (۱۰) گھیراؤ۔''(۲۰۳)

پرویز مشرف اکثر و بیشتر کسی واقعے یا روداد کو افسانے کا رنگ دے کر دلچسپ بناتے ہیں تاکہ قاری واقعے کو آخر تک پڑھے بغیر ختم نہ کرے۔ بچپن میں اپنے والدین کے ساتھ ہندوستان سے پاکستان ہجرت کرنے کے واقعے کو سادہ انداز کی بجائے افسانوی اسلوب میں بیان کیا ہے:

> ''یہ دہلی سے ہجرت کرنے والے شوہر، بیوی اور تین بیٹوں پر مشتمل خاندان کی داستان ہے۔ دوسرے بیٹے کی عمر صرف چار سال اور تین دِن تھی۔اُس لڑکے کو اپنے پورے سفر کے دوران صرف اپنی والدہ کی بے چینی اچھی طرح یاد ہے کیونکہ اُس کی والدہ کو سکھوں کے ممکنہ قاتلانہ حملوں کا خوف تھا۔''(۲۰۴)

اِس طرح اپنے تُرکی سفر کے بیان میں بھی اِس اسلوب کا سہارا لیا ہے کہ تین کم عمر لڑکوں کے لئے ترکی کا سفر حیرت سے بھرپور تھا۔ وہ فلاں فلاں جگہ سے گزرے اور یہ یہ مقامات دیکھے۔

پرویز مشرف مدلل اور مفصل گفتگو کرنے کے لیے مشہور ہیں۔ وہ جب کسی عنوان پر بات کرتے ہیں تو اس کے ہر

پہلوپر روشنی ڈالتے ہیں۔ لیکن اِس کے ساتھ ساتھ مشرف جب کسی واقعے کی تفصیل دیتے ہیں تو تھوڑی بہت منظر کشی بھی کرتے ہیں۔ کبھی کبھی تو اُس کا نقشہ اِتنا مکمل ہوتا ہے کہ پورا واقعہ آنکھوں کے سامنے گزرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کی شام جب اُس کا جہاز محوِ پرواز تھا تو جہاز کے اندر کا منظر کچھ اِس طرح سے پیش کیا ہے کہ قاری خود کو اُس منظر کا حصہ تصور کرتا ہے:

"یہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کا دِن تھا، وقت پونے ساتھ بجے شام، پرواز پی کے ۸۰۵ تھی۔ ہوائی جہاز ایک ائیر بس تھی۔ اِس پر ۱۹۸ مسافر سوار تھے جس میں سکول کے بہت سے بچے بھی تھے، کچھ بچے ہوائی جہاز کے اگلے حصے میں آئے اور میرے ساتھ فوٹو کھنچوائے اور آٹو گراف لیے۔ تھوڑی دیر بعد جہاز کے اندر روشنیاں مدھم کر دی گئیں اور سب اپنی اپنی جگہ آرام کرنے لگے۔ جہاز کے انجن کی دھیمی دھیمی آواز نے لوگوں کو سکون دیا اور وہ یا تو اپنے خیالات میں مگن ہو گئے یا سونے کی تیاری کرنے لگے۔ صہبا نے بھی جو میرے پاس کھڑکی کی طرف بیٹھی تھی، اپنی آنکھوں کو روشنی سے بچانے کے لئے ڈھانپ لیا اور سو گئیں۔ میں اپنے خیالات میں گم تھا۔ جہاز کے اندر سب کچھ ٹھیک اور پُر سکون تھا۔" (۲۰۵)

"سب سے پہلے پاکستان" ایک فوجی کی سیدھی سادی، سچی اور کھری سر گزشت ہے جس نے بناوٹ یا زیب داستان کے لیے جھوٹ کا سہارا نہیں لیا۔ مصنف نے ساری کہانی میں انگریزی اور اُردو اشعار بھی درج نہیں کیے ہیں۔ البتہ ایک موقع پر جب ہوائی جہاز سے نیچے اُترے تو اُنہیں معلوم ہوا کہ فوج نے نواز شریف کی حکومت کا خاتمہ کر دیا ہے۔ اِس طرح مشرف نہ صرف موت کے منہ میں جاتے جاتے بچ گئے بلکہ اقتدارِ اعلیٰ کے بھی مالک بن گئے۔ اِس موقع پر مصنف نے اصل انگریزی متن میں عمر خیام کی ایک فارسی رُباعی درج کی ہے جس کو مترجم نے جوں کا توں تحریر کیا ہے:

"زین پیش نشان بود نیہا بودست
پیوستہ قلم بہ نیک و بد فرسودست
اندر تقدیر آنچہ بایست بد اُؤ
غم خوردن و کوشیدن ما بیہودست" (۲۰۶)

بعض ناقدین ترجمے پر اعتراض کر کے کہتے ہیں کہ اِس سے مصنف کا اصل مقصد اور مفہوم مجروح ہوتا ہے۔ اِن کی یہ بات اس قدر تو درست ہے کہ ادب پارے کا جو مزا اپنی زبان میں ہوتا ہے وہ ترجمے میں نہیں ہوتا لیکن یہ بھی تو حقیقت ہے کہ

ترجمہ کرنے سے ایک زبان کے الفاظ، محاورات، اصطلاحات، خیالات اور موضوعات دوسری زبان میں آتے ہیں۔ اگر کسی زبان میں دیگر ترقی یافتہ زبانوں کے اثرات نہ آئیں تو وہ زبان مردہ زبانوں کی فہرست میں شامل ہو جاتی ہے۔ انگریزی زبان اُردو سے زیادہ ترقی یافتہ اور زیادہ اثر و نفوذ رکھتی ہے یہی وجہ ہے کہ ہر گزرتے دِن کے ساتھ تراجم کی اہمیت بڑھ رہی ہے۔ اِس زاویے سے جب ہم مذکورہ آپ بیتی کو پڑھتے ہیں تو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے ترجمے سے کئی نئے الفاظ، محاورات، ضرب الامثال اور اصطلاحات کو انگریزی سے اُردو میں منتقل کیا گیا ہے جن میں چند کی تفصیل درج کی جاتی ہے:

۱۔ ''پن مینڈھ''(۲۰۷) [Water shed] کا اُردو متبادل لکھا ہے۔ بعض جگہوں پر بے تکلفی سے واٹر شیڈ کا لفظ بھی استعمال کیا ہے۔ یہ اصطلاح اُس دریا یا ندی نالے کے لئے استعمال ہوتی ہے جو دو ملکوں کے درمیان سرحدی لکیر کے طور پر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کشمیر کی سرحد پر (کنٹرول لائن پر) اِس قسم کی سرحدی لائن کئی جگھوں پر پائی جاتی ہے۔

۲۔ ''God Father'' کے لیے اُردو میں سرپرست کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اِس آپ بیتی کے مترجم ہدایت خویشگی نے ''نگہبان''(۲۰۸) کا لفظ استعمال کیا ہے۔ میرے خیال میں ''نگہبان'' زیادہ بہتر لفظ ہے جس میں گاڈ فادر کا پورا مفہوم بہتر طریقے سے ادا ہو سکتا ہے۔

۳۔ ایک اور انگریزی لفظ کا ''پست ترین'' ترجمہ کیا ہے جو انگریزی میں تو استعمال ہوتا تھا، اُردو میں استعمال نہیں تھا۔ پورا جملہ اِس طرح سے لکھا ہے ''یہ پاکستانی سیاسی تاریخ کے پست ترین لمحات میں سے ایک تھا''۔(۲۰۹)

۴۔ ''Safety Valve'' کا اُردو ترجمہ ''حفاظتی وسیلہ'' کیا ہے جس کا اُردو متبادل موجود نہیں۔ اُردو میں یہ مفہوم کسی اور Sense میں آتا ہے۔(۲۱۰)

۵۔ ''پن دھارا''(۲۱۱) [Water Folowing] کا ترجمہ کیا ہے۔ اب تک ہم نے تیز دھارا ہی پڑھا تھا۔

۶۔ مال برداری کے لیے استعمال ہونے والے کنٹینر (Container) کے لئے ''آہنی صندوق''(۲۱۲) کا لفظ استعمال کیا ہے۔

۷۔ ''شکم سیر لفظ''(۲۱۳) نظر ثانی کے لیے استعمال کیا ہے حالانکہ اُردو میں اِس کے لئے پیٹو اور بسیار خور کے الفاظ آتے ہیں۔

۸۔ خودکش جیکٹ کا ترجمہ ''بارود کی پیٹیاں''(۲۱۴) کیا ہے۔ جملہ اِس طرح ہے ''دونوں نے بارود کی پیٹیاں اپنے جسموں سے باندھیں تھیں۔''

۹۔ ''دستی آلہ'' [Hand Set]کااُردو ترجمہ کیا ہے۔ (۲۱۵)۔

۱۰۔ ''ریڈیائی صوتی اشارے''[Codecoords]خفیہ ٹیلی فونک اشارے کا ترجمہ ہے۔(۲۱۶)۔

۱۱۔ ''نشریاتی کھمبے'' [Transmission Towers] (۲۱۷)۔

مترجم نے بعض جگہوں پر انگریزی سے ہو بہو لفظی ترجمہ کیا ہے:

''اِس کے بعد صورتحال احمقانہ سے بے ہودہ ہو گئی''۔(۲۱۸)

'' سرکشی دبانا'' (۲۱۹)

''سب سے پہلے پاکستان'' کے مترجم نے ترجمہ کرتے وقت کئی نئے محاورات انگریزی زبان سے براہِ راست ترجمہ کر کے ہماری زبان کو دے کر اُردو کا دامن خوبصورت محاورات سے مالامال کیا ہے:

۱۔ بھاری پتھر سمجھ کر چھوڑنا(ناممکن جان کر کوئی کام ترک کرنا)۔(۲۲۰)

۲۔ دماغ کا ایک دم قدغن لگانا(زقند لگانے کی جگہ قدغن لگانا لفظ لکھا ہے مراد ہے کہ فوراً کوئی نکتہ یاد آنا)۔(۲۲۱)

۳۔ مقدر اور واقعات کا سنگھم ہونا(حالات موافق ہونا، قسمت مہربان ہونا)۔(۲۲۲)

۴۔ نوشتہ تقدیر کا بدلنا(حالات تبدیل ہونا، وقت کا پلٹا کھانا)۔(۲۲۳)

۵۔ مقدر کی لکیر کا ہٹنا(قسمت کا مہربان ہونا)۔(۲۲۴)

۶۔ زخمی ریچھ کی طرح انگڑائی لینا(اُردو میں ''زخمی سانپ کی طرح بَل کھانا'' محاورہ ہے)۔(۲۲۵)

۷۔ ناقابل تنسیخ موڑ پر آنا(حالات کا اُس نہج پر آنا جہاں سے واپسی ممکن نہ ہو)۔(۲۲۶)

۸۔ پتھر کے دَور میں بھیجنا(تباہ و برباد کرنا)۔(۲۲۷)

۹۔ گونج دار نہیں کی آواز گونجنا(نفی میں جواب دینا)۔(۲۲۸)

۱۰۔ خوف سے پھریری آنا(سخت خوفزدہ ہونا)۔(۲۲۹)

۱۱۔ دو ملکوں کا تلواریں لہرانا(دو ممالک کا جنگ کے لیے تیاری کرنا)۔(۲۳۰)

۱۲۔ غلط گھوڑے کی لگام کھینچنا(غلطی، ظلم یا ناانصافی کرنا)۔(۲۳۱)

۱۳۔ کھلے دماغ کا آدمی ہونا(اُردو میں کھلے دِل کا آدمی محاورہ مستعمل ہے اور انگریزی میں کھلے دماغ کا۔ مترجم نے انگریزی کا محاورہ لا کر اچھی کاوش کی ہے)۔(۲۳۲)

''سب سے پہلے پاکستان'' کے مترجم نے ترجمے سے کئی آسان، خوبصورت اور دلکش ضرب الامثال بھی اُردو زبان کو دیے ہیں:

۱۔ ''بلی کی نو سانسیں (زندگیاں) ہوتی ہیں۔''(۲۳۳)(یہ ضرب المثل انگریزی کے علاوہ دیگر مغربی زبانوں میں بھی مستعمل ہے۔ پشتو میں تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ (بلی کی چھ زندگیاں ہوتی ہیں) بولا جاتا ہے۔ پرویز مشرف نو مرتبہ موت کے منہ سے نکل آئے تھے۔ مترجم نے اُس موقع پر یہ کہاوت لکھی ہے۔)

۲۔ ''سوچے انسان اور کرے خدا''(۲۳۴)۔ (یہ انگریزی کہاوت Man Proposes and God Disposes کا اُردو ترجمہ ہے جس کا مشہور اُردو متبادل کہاوت ہے ''تدبیر کنند بندہ تقدیر زنند خندا''۔ فارسی کہاوت سے مزکورہ ترجمہ زیادہ آسان اور عام فہم ہے۔)

۳۔ ''وقتی فائدے کے لیے دائمی تکلیف کو دعوت دینا بے وقوفی ہے''۔(۲۳۵)(یہ بھی خالصتاً انگریزی ضرب المثل ہے جو اُردو میں ان الفاظ میں مستعمل نہیں۔ اِس مفہوم کے اُردو میں اِس سے ملتے جلتے دیگر کہاوتیں موجود ہوں گی۔ اِس کتاب کے ترجمے کے بعد مذکورہ کہاوت کا استعمال عام ہو گیا۔)

۴۔ ''دوستوں سے نجات پانے کا اِس سے سستا طریقہ کوئی نہیں''۔(۲۳۶)

۵۔ ''حق کی جنگ میں قتل و غارت کو قبول کرنا چاہیئے''۔(۲۳۷)

۶۔ ''کلب میں خوش آمدید''(کسی کو اپنے قریبی حلقہ احباب میں شامل کروانے کے موقع پر بولا جاتا ہے۔)(۲۳۸)

۷۔ ''بھوسے کے ڈھیر میں سوئی ڈھونڈنا''(لاحاصل کوشش کرنا۔)(۲۳۹)

۸۔ ''دو ہاتھیوں کی لڑائی میں گھاس روندی جاتی ہے''(دو طاقتوروں کے درمیان کمزور کچلا جاتا ہے۔)(۲۴۰)

۹۔ ''زندگی گلابوں بھرا بستر نہیں''(یہ Life is not bed of Roses کا اُردو ترجمہ ہے۔ اُردو میں اصل کہاوت ہے ''زندگی پھولوں کی سیج نہیں۔) (۲۴۱)

۱۰۔ ''جاؤ اور جو چاہو کر لو''(جاو جو مرضی ہو کرو۔)(۲۴۲)

اِس آپ بیتی کے اُردو ترجمے میں سب اچھا بھی نہیں۔ ترجمہ کرتے وقت درج ذیل مقامات پر سنگین غلطیوں کا ارتکاب کیا گیا ہے:

۱۔ ''یہ کافی پوچ اور بے معنی عشق تھا''۔(۲۴۳)(عشق پوچ اور بے معنی کیسے ہو سکتا ہے؟)

۲۔ ''ہماری روایتی فوجیں تصادم کے علاقے کے قریب قریب تک نہیں تھیں''۔(۲۴۴)
(شورش زدہ علاقے میں ہماری فوجیں موجود نہیں تھیں)

۳۔ ''اُس نے کہا اور یہ واقعی اب کافی عیاں تھا''(۲۴۵) (اُس نے جو کچھ کہا یہ ہر آدمی سمجھ سکتا تھا)۔

۴۔ ''اُنہیں میری نظروں کا انداز اچھا نہیں لگا تھا''(۲۴۶) (اُس کو میں بالکل اچھا نہیں لگا)۔

۵۔ ''عزیز خان، محمود اور شاہد عزیز کے دماغوں میں نواز شریف کی چال ناکام بنانے میں کوئی ابہام نہیں تھا'' (۲۴۷)۔

۶۔ ''وہ اِس سے زیادہ غلط نہیں ہو سکتے تھے''(۲۴۸)۔

۷۔ ''سلگتی ہوئی نشست کے لیے متعین کرنا''، ''دھماکہ خیز طریقے سے احساس ہونا''، ''ایک ایسی جنگ جس میں سائے ہمارے مد مقابل ہوں گے''۔(۲۴۹)

۸۔ ''ہمارے کلب کی رُکنیت دو پر محدود ہے''(۲۵۰) (میرا حلقہ احباب صرف ہم دو آدمیوں پر مشتمل ہے)

۹۔ ''اُس کے سر پر پانچ ملین ڈالر کا انعام تھا''(۲۵۱) (اُس کی سر کی قیمت پانچ ملین ڈالر تھی)۔

۱۰۔ ''صورتحال احمقانہ سے بے ہودہ ہو گئی'' ، ''اُسے بتایا گیا کہ وہ اُس سے فارغ ہو گئی ہے''(۲۵۲)۔

یہ اور اس طرح کئی جگہ انتہائی غلط اُردو ترجمہ کیا گیا ہے جس سے قاری غلط نتیجے پر پہنچ کر گمراہ بھی ہو سکتا ہے۔

اِن تمام خامیوں، غلطیوں، کوتاہیوں اور نقائص کے باوجود ''سب سے پہلے پاکستان'' ایک اچھی آپ بیتی ہے جس میں اُردو پڑھنے والے لوگوں کے لیے نہ صرف دلچسپی کا سامان موجود ہے بلکہ یہ ہماری عسکری، سیاسی، سماجی اور ثقافتی تاریخ کا ایک اچھا مرقع بھی ہے۔ یہ ایک بہادر فوجی کی داستان حیات ہے جس نے زندگی کے تمام مشکلات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، بارہا موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر حالات کو اپنے موافق کر لیا۔ پرویز مشرف نے اپنی خود نوشت میں اِس بات کو ثابت کیا ہے کہ ایک اوسط یا نچلے طبقے کا بچہ بھی اپنی انتھک محنت اور قسمت کی وجہ سے ترقی کر کے ملک کا سربراہ ہو سکتا ہے اور یہ کہ زندگی میں ترقی کرنے کے لیے سفارش، رشوت اور شارٹ کٹ کام نہیں آتیں۔ ذاتی لیاقت، صلاحیت، محنت اور اللہ تعالیٰ کی مدد شاملِ حال ہو تو کیا نہیں ہو سکتا۔ پرویز مشرف کا اپنا ایک بیان جو اُس کی ساری سرگزشت کا خلاصہ ہے غور سے پڑھنے کے لائق ہے:

> ''میں نے دہلی سے کراچی تک کے پُرخطر سفر کے آغاز سے اب تک ایک تلاطم خیز زندگی گزاری ہے۔ نہ تو مجھ میں وہ ذہانت نظر آتی تھی اور تھی بھی نہیں جس سے (بچپن سے ہی) میرے شاندار مستقبل کی نشاندہی ہوتی۔ فوج میں، میں ایک سنجیدہ اور پیشہ ور افسر کی بجائے ایک بے قاعدہ، خوش و خرم اور اعتراضات کرنے والا افسر سمجھا جاتا تھا۔ میں نے زندگی کو کبھی سنجیدگی سے نہیں لیا۔ میں اپنی ملازمت کے شروع میں ہر تھوڑے عرصے کے بعد نظم و ضبط کے معاملات میں ملوث ہو جاتا تھا۔ اگر میرا ریکارڈ دیکھا جائے تو یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ میرا مستقبل روشن ہو گا۔''(۲۵۳)

۷۔اور بجلی کٹ گئی (سیدہ عابدہ حسین)

''اور بجلی کٹ گئی''، سیدہ عابدہ حسین کی خود نوشت ہے جس میں اُس نے ملک کے اہم سیاسی اور غیر سیاسی واقعات پر قلم اُٹھایا ہے۔اصل آپ بیتی ''power failure'' کے نام سے انگریزی زبان میں ہے جو پہلی بار اکسفورڈ یونیورسٹی پریس سے چھاپی گئی تھی۔''اور بجلی کٹ گئی''اِس کا اُردو ترجمہ ہے جس کو جون ۲۰۱۷ء میں الفیصل پبلشرز لاہور نے شائع کیا۔

سیدہ عابدہ حسین ایک جاگیر دارانہ پس منظر رکھتی ہیں اور اُن کا تعلق ایک سیاسی گھرانے سے ہے۔سیدہ عابدہ حسین کی زندگی کے کئی رُخ ہیں۔وہ ایک سیاست دان، زراعت کار، سفارت کار، مویشیوں کی افزائش نسل کی ماہر اور فلاحی کارکن ہیں۔اُن کا تعلق صوبہ پنجاب میں واقع علاقہ جھنگ سے ہے۔وہ ضلع کونسل جھنگ کی اولین خاتون چیرپرسن بنیں، قومی اسمبلی کی رکن رہیں، 1991ء سے 1993ء تک امریکہ میں پاکستان کی سفیر رہیں۔اس کے علاوہ وزیر تعلیم اور وزیر سائنس و ٹیکنالوجی (1996ء)، وزیر خوراک وزراعت (1997ء) وزیر برائے بہبود و آبادی (1999ء) اور کئی اہم عہدوں پر تعینات رہیں۔آپ نے تعلیم سب کے لیے، صنفی مساوات اور فرقہ ورانہ ہم آہنگی کے لیے ملکی سطح پر کافی کام کیا ہے۔مردوں کی حاکمیت والے علاقے دیہی پنجاب سے سیاست کا سفر شروع کرنے والی عابدہ حسین نے اپنی آپ بیتی "اور بجلی کٹ گئی" میں بڑی باریک بینی سے پاکستان کے اداروں کی انحطاط و انہدام کی تفصیلات مہیا کی ہیں۔وہ انتہا پسندی میں اضافے کے بارے میں الگ سوچ رکھتی ہیں، آپ نے بڑی تفصیل سے اس آپ بیتی میں مذہب میں عسکریت پسند گروہوں کے ظہور، انتہا پسندی، غربت، سماجی ساخت میں عدم مساوات، مفادات کے لیے سازشیں، افغانستان کے ساتھ مستقل آویزش، سیاسی قوتوں کی ناکامی، فوجی حکمرانوں کے عروج وزوال غرض تمام ممکنہ سیاسی اور غیر سیاسی موضوعات کو بیان کیا ہے۔مصنفہ نے ذاتی نوٹس، ڈائریوں اور دیگر ذاتی ماخذات پر انحصار کر کے اپنی خود نوشت ترتیب دی ہے۔آپ کی پیدائش 1946ء میں ہوئی۔چنانچہ یہ آپ بیتی آپ کی بچپن سے لے کر بے نظیر بھٹو کی موت یعنی 2008ء تک کے طویل مدت کا احاطہ کرتی ہے۔سیاسی، تاریخی اور سماجی اعتبار سے یہ ایک اہم خود نوشت ہے۔

سیدہ عابدہ حسین اپنی پیدائش، خاندان اور ابتدائی تعلیم کے بارے میں لکھتی ہیں:

> ''میں عمر میں پاکستان سے ایک سال بڑی ہوں (1946ء)۔میں نے پُر آسائش اور احساس وراثت والے ماحول میں جنم لیا، میں نے بعد آز نو آبادیاتی دور کے پاکستان میں پرورش پائی۔میرے دادا کو وسطی پنجاب کے علاقے میں ایک بہت

بڑی جاگیر وراثت میں ملی جو بارہ پشتوں سے چلی آ رہی تھی میرے نانا نے اپنی
زندگی اپنے ہاتھوں سے بنائی تھی وہ واجبی سے پڑھے لکھے تھے مگر اپنے کاروبار میں
بڑے کامیاب تھے۔ جونہی میں نے لاہور کے سکول سے ''اولیول'' میں کامیابی
حاصل کی۔ میرے والدین نے مجھے سوئٹزرلینڈ میں لڑکیوں کے ایک بین الاقوامی
سکول میں بھجوا دیا تاکہ میں مانترو Montreaus سے ''اے لیول'' کر
سکوں۔'' (۲۵۴)

عابدہ حسین کے باپ ایک بڑے سیاسی رہنما ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بڑے زمیندار اور عمدہ گھوڑ پال بھی تھے۔ سیاست اور گھوڑ سواری اُس کو باپ سے وراثت میں ملی۔ گھوڑوں کی افزائش نسل کے لیے سٹڈ تیار کرنا، گھوڑے پالنا، گھوڑ دوڑ اور ریس اُن کے شوق رہے ہیں۔ اُس نے اپنی زمینوں پر گھوڑوں کا اصطبل اور مویشوں کا فارم بنایا تھا۔

عابدہ حسین کی اپنے کزن سید فخر امام کے ساتھ شادی کے بندھن میں بندنے سے گریجویشن مکمل نہ ہو سکی جو اُن کا برطانیہ کے کسی یونیورسٹی سے کرنے کا پروگرام تھا۔ گریجویشن نہ کرنا بعد میں اُن کو مہنگا پڑ گیا جب پرویز مشرف نے 2002ء کے عام انتخابات میں الیکشن لڑنے والے اُمیدواروں کو گریجویشن بنیادی شرط رکھی۔ وہ اُس سال انتخابات نہ لڑ سکیں۔ عابدہ حسین نے اپنی آپ بیتی میں اپنی شادی، محترمہ فاطمہ جناح سے ملاقات، 1965ء کی پاک بھارت جنگ اور دیگر چھوٹے بڑے وہ واقعات جنہوں نے اُن کی آئندہ آنے والی زندگی پر انموٹ نقوش چھوڑے کو موضوع سخن بنایا ہے۔ آپ نے اپنی نجی زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں حتیٰ کہ اپنے ''اسقاط حمل'' کا بھی ذکر کیا ہے۔ اہل تشیع کے جنازے اور رسومات مرگ کو بیان کرکے کہتی ہیں:

''ان سب کے رشتہ دار اور خدام ڈھول پر ماتمی دھنیں بجاتے ہوئے آئے۔ ان
کے ساتھ لوگ مرثیوں میں مخدوم اور پیر آف شاہ جیونہ کے اُس عالی شان اور عالی
مرتبت کرنل عابد حسین شاہ کے گزر جانے کا ماتم کر رہے تھے جو شاہ جیونہ کے لیے
تکریم کا باعث بنا۔۔ اُن کے پاس ڈھول تھے جو ماتم اور نوحہ کناں تھے۔ عورتیں
سینہ کوبی کر رہی تھی اور مرد سر پیٹ رہے تھے۔'' (۲۵۵)

آپ بیتی کے پہلے دو باب جو اس آپ بیتی کا پہلا حصہ ہیں انتہائی بے ترتیب اور ڈھیلے ڈھالے ہیں۔ اپنے والد کی آخری دنوں کی غیر ضروری تفصیل کو صفحہ نمبر 33 سے صفحہ نمبر 61 تک پھیلا دیا ہے۔ فن آپ بیتی کے لیے یہ بھی شرط

ہے کہ تمام واقعات کو یکساں وقعت دی جائے۔ تاہم ان واقعات کے بیان سے ایک بات عیاں ہے کہ آپ کو اپنے والد سے کتنا لگاؤ تھا

سیدہ عابدہ حسین اپنے والد کی اکلوتی اولاد تھیں اس لیے لامحالہ انہیں میدان سیاست میں آنا تھا چنانچہ والد کی وفات کے بعد آپ نے فروری 1972ء کو پنجاب اسمبلی میں پیپلز پارٹی کی طرف سے خواتین کی مخصوص نشست پر حلف اُٹھایا تو عملی سیاست میں اُن کا داخلہ ہو گیا۔ عملی سیاست میں آنے کے اغراض و مقاصد یوں بیان کرتی ہیں :

> ''میں نے فروری 1972ء میں پنجاب کی رکن صوبائی اسمبلی کے طور پر حلف اُٹھایا اور اُس وقت خود کو کچھ معتبر محسوس کیا جبکہ جھنگ سے لوگ مسرت کا اظہار کرنے آئے کہ میرے والد کے گھرانے کی شمع روشن رہے گی اور اس کے دروازے اُن پر کھلے رہیں گے۔''(۲۵۶)

سیدہ عابدہ حسین نے ذوالفقار علی بھٹو کے عروج و زوال، اُن کی پھانسی اور جنرل ضیاء الحق کی حکومت کے زمانے کو موضوع بحث بنایا ہے۔ آپ نے تمام واقعات تفصیل سے بیان کر کے ذاتی تجربے کی روشنی میں نتائج اخذ کیے ہیں۔ تیز مشاہدہ اور خلوص اس آپ بیتی کو معتبر بناتی ہے۔ بیگم عابدہ حسین کا کمال یہ ہے کہ وہ ہر اہم واقعے پر نظر رکھتی ہیں اور اکثر قصے کا وہ پہلو قاری کے سامنے لاتی ہیں جو زیادہ ضروری ہو۔ ضیاء الحق کے زمانے میں وہ بنیادی سطح کی جمہوریت اور گاؤں محلے کی سیاست کی طرف متوجہ ہوئیں۔ یہاں انہیں اگر ایک طرف عام لوگوں کی زندگی اور مسائل سمجھنے کا تجربہ ہوا تو دوسری طرف انہیں معاشرے کے لوگوں کی نفسیات کا بھی پتہ چلا۔ یہ تجربہ بعد کی سیاست میں اُن کے بے حد کام آیا۔ 1974ء کے آئین کی منظوری کے بعد ذوالفقار علی بھٹو کا ایک بڑا کارنامہ اسلامی ممالک کے سربراہان کی کانفرس منعقد کرانا تھا۔ تیس ممالک سے آئے ہوئے سربراہوں میں سے دس کو سرکاری اور بیس کو لوگوں کے نجی رہائش گاہوں میں ٹھہرایا گیا۔ عابدہ حسین کے مطابق لاہور میں یہ اُن کا خاندان تھا جنہوں نے حکومت کو چار گھر کچھ دنوں کے لیے دیے تھے۔ بیگم نصرت بھٹو نے انہیں ایک لنچ کا نگران مقرر کر دیا جو سربراہان مملکت کی بیگمات کو گورنر ہاؤس میں دیا گیا تھا۔ یہاں مصنفہ نے کرنل قذافی، لبنانی وزیر اعظم اور دیگر رہنماؤں کی بیگمات پر بہت خوبصورت تبصرے کیے ہیں۔ ایرانی انقلاب، ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی، ضیاء الحق کا مارشل لا، افغان روس جنگ، انتہا پسندی ان سب واقعات میں بیگم صاحبہ قریبی ربط دیکھتی ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ یہ سب وقعات ایک ہی تسلسل کی مختلف کڑیاں تھیں۔ چنانچہ لکھتی ہیں:

> ''۹ برس تک واشنگٹن نے ضیاء الحق کو پاکستانی اُمور چلانے کے لیے کھلی چھوٹ دے رکھی تھی صاف لگ رہا تھا کہ سرمایہ دار مغربی دنیا نے ایران کے انقلاب اور

افغانستان میں سویت افواج کی آمد کے درمیان ایک تعلق فرض کر لیا تھا۔ ایک فرنٹ لائین سٹیٹ کے طور پر پاکستان سے تقاضا کیا گیا کہ خطرناک سویت کو بحرہ عرب کے گرم پانیوں والی بندر گاہوں تک پہنچنے سے روکے...... جیسے جیسے بھٹو ایک افسانوی اقلیم میں داخل ہوا۔ ضیاء ایک زندہ حقیقت بنتا چلا گیا۔ پاکستان مستقبل کی طرف نظر رکھنے والی لبرل ریاست کی بجائے ایک رجعت پسند اور مذہبی رسومات انجام دینے والی ریاست بن گیا۔'' (۲۵۷)

فرقہ وارانہ نقطہ نظر سے ضلع جھنگ پاکستان کا ایک حساس ضلع ہے۔ شیعہ سنی فرقہ وارانہ اختلافات جس قدر ضلع جھنگ میں ہیں شاید پاکستان میں کہیں اور ہوں گے۔ دونوں فرقوں میں کٹر تشدد پسند عسکری تنظیمیں اس ضلع میں بنیں اور پھر سارے ملک میں پھیل گئیں چاہے وہ سنی فرقے کی ''لشکر جھنگوی'' ہو یا شیعوں کی ''تحریک فقہ جعفریہ'' کی تنظیم ہو۔ فرقہ وارانہ قتل عام جتنا ضلع جھنگ میں ہوا ہے پاکستان کے کسی دوسرے ضلع میں نہیں ہوا۔ شیعہ ہونے کی وجہ سے بیگم عابدہ حسین کتنے خوفناک ماحول میں رہیں اُس نے سچائی سے اسے بیان کیا ہے۔ ''لشکر جھنگوی'' سپاہ صحابہ کی متحارب شاخ تھی۔ جو شیعہ فرقے کے لوگوں پر قاتلانہ حملے کرتی تھی۔ اس کی تشکیل اور مقاصد کے بارے میں بیگم عابدہ حسین تحریر کرتی ہیں:

''انہوں نے (سپاہ صحابہ) نے اپنا ایک عسکری بازو بنانے کا اعلان کیا جس نے مسلم دنیا کو تمام کافروں سے پاک کرنے کا نصب العین اپنایا۔''(۲۵۸)

مولانا حق نواز جھنگوی کی ہلاکت کے بعد عابدہ حسین نے کمال بہادری کا مظاہرہ کیا اور اُن کے گھر اُن کی تعزیت کے لیے جانے کا پروگرام بنایا حالانکہ جھنگوی کو شیعوں نے قتل کیا تھا اور جھنگ میں دونوں فرقوں کے درمیان سخت کشیدگی تھی۔ بہر حال انہیں بڑی مشکل سے اس ارادے سے باز رکھا گیا۔ بیگم صاحبہ کے مطابق اُس نے حق نواز جھنگوی کی بیوہ سے فون پر تعزیت کی اور جب اُن کے گھر آکر فاتحہ پڑھنے کی تمنا ظاہر کی تو بیوہ نے جو جواب دیا اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فرقہ واریت پھیلانے والے عسکری جماعتوں سے القاعدہ کے رابطے بہت پہلے قائم ہو چکے تھے:

''آنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ فون پر ہی سورۃ فاتحہ پڑھ سکتی ہیں۔ مجھے آپ کی مدد کی ضرورت نہیں۔ میرا بھائی اُسامہ بن لادن میری تمام ضرورتوں کا خیال رکھتا ہے۔ آپ نے اُن کا نام سن رکھا ہو گا۔ وہ بہت مشہور اور امیر سعودی ہیں آپ سب کافروں سے بھی زیادہ امیر۔'' (۲۵۹)

سیدہ عابدہ حسین نے بڑی سچائی سے دونوں فرقوں کے اصل مقاصد اور بیرونی ممالک سے روابطہ کا پول کھولا ہے کہ کس طرح طالبان اور دیگر سنی گروپوں کی سرپرستی سعودی عرب اور شیعہ کی ایران کرتا ہے:

''اس کانفرس (ایران میں منعقد کی گئی) میں ضلع اٹک سے دو شیعہ عالم علامہ ساجد نقوی اور مولانا افتخار نقوی بھی شامل تھے جو ایک سیاسی تنظیم نفاذ فقہ جعفریہ کی قیادت کر رہے تھے۔ یہ تنظیم بہت حد تک رد عمل میں بنی تھی۔ اس کی فنڈنگ ایران کر رہے تھے۔'' (۲۶۰)

"اور بجلی کٹ گئی" بنیادی طور پر ایک سیاسی خود نوشت ہے جو سیاسی مقاصد کے لیے لکھی گئی ہے (ایک سیاسی خود نوشت خالصتاً اس اساسی نقطہ نظر سے لکھی جاتی ہے کہ مصنف اس کے ذریعے اپنا موٗقف پیش کر کے اپنے خلاف اُٹھائے گئے اعتراضات کا جواب دے سکے۔ تاہم وہ اپنے سیاسی بیانیے سے ہٹ کر بھی بہت کچھ قلمبند کر جاتا ہے اور یہی سیاسی خود نوشت کی شہرت کا راز ہے) لیکن مصنفہ نے اپنے عہد کے تاریخی حالات، آئینی بحران، حکومت اور فوج کے درمیان کشمکش، ثقافتی تبدیلیوں، اقربا پروری، محلاتی سازشوں، سیاسی و معاشرتی تبدیلیوں اور ان تمام باتوں کا معاشرے پر پڑنے والے اثرات کے حوالے سے ذاتی تجربے کی روشنی میں باریک بینی سے جائزہ لیا ہے۔ وہ 1978ء سے 1908ء تک تیس سال بلواسطہ یا بلاواسطہ ایوان اقتدار کے مشاہدات میں شریک رہیں یہی وجہ ہے کہ وہ ایسے قومی رازوں سے بھی پردہ اُٹھاتی ہیں جس کا کسی اور ذریعے سے پردہ کشائی ممکن ہ نہیں۔

آپ 1991ء سے 1993ء تک کے عرصے میں پاکستان کی طرف سے امریکہ میں سفیر رہیں چنانچہ اپنی آپ بیتی کی صفحہ نمبر 292 سے صفحہ نمبر 357 تک امریکہ میں اپنی سفارت کاری کے زمانے کو موضوع بحث بنایا ہے۔ آپ نے امریکہ پاکستان پالیسیوں کی نزاکت، امریکی امداد، ہماری جوہری پروگرام، دونوں ممالک میں تعلقات کی نوعیت اور اس قسم کے لاتعداد متنوع موضوعات پر بات کی ہے۔ پاکستان کا امریکہ میں کیا امیج (تشخص) ہے، امریکی حکمران کس طرح طوطا چشمی کرتے ہیں، امریکہ کی سماجی روایات، تقریبات، پاکستان اور امریکہ کے درمیان خفیہ معاہدوں وغیرہ کو خوب صراحت سے بیان کیا ہے۔ اس آپ بیتی کی انفرادیت یہ ہے کہ بیگم عابدہ حسین دیگر سیاست دانوں کی طرح باتیں چھپاتی نہیں حتیٰ کہ امریکہ خصوصاً وائٹ ہاؤس میں اپنی ڈانس پارٹیوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس آپ بیتی میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یورپی ممالک اور امریکہ میں سفیر کی تعیناتی کے لیے سیاسی پس منظر رکھنے کے علاوہ کچھ اور بھی چاہیے، یہ ''کچھ اور'' سیدہ عابدہ حسین کی زبانی سنیے:

''انکل امجد (مصنفہ کے حقیقی ماموں) نے کہا لیکن واشنگٹن توجہ حاصل کرنے کے لیے کوئی آسان جگہ نہیں۔ایک موئثر سفیر بننے کے لیے آپ کو توجہ کا مرکز بننا پڑتا ہے آج سے دس سال پہلے تم باآسانی توجہ حاصل کر لیتی جب تم جوان تھی لیکن اب تم عمر کے پانچویں عشرے میں ہو اور موٹی ہو لہٰذا تمہیں اور حربے استعمال کرنا پڑیں گے۔'' (۲۶۱)

آپ بیتی کا یہ حصہ بھی کافی طویل ہو گیا ہے اور اس پر آپ بیتی سے زیادہ سفر نامے کا گمان ہوتا ہے کیونکہ مصنفہ نے ذاتی مشاہدات اور احساسات سے زیادہ تجربات اور واقعات کا بیان کر کے ایک ناظر اور سفر نامہ نگار کا ثبوت دیا ہے۔ سیدہ عابدہ حسین پر پاکستان کے سنجیدہ طبقوں سے یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ مفاد پرست ٹولے سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو صرف اقتدار میں ہونے والے شخص کا ساتھ دیتے ہیں۔ اُصول، آنا، نظریہ اور نظریاتی سیاست پر عمل پیرا نہیں ہوتے۔ یہ حقیقت بھی ہے کہ کبھی نواز شریف اور کبھی بے نظیر بھٹو کی پارٹی میں شامل ہونے والی سیدہ عابدہ حسین کا سیاسی کیرئیر داغدار ہے۔اپنی آپ بیتی میں وہ اس اعتراض کا بڑا بھونڈا جواز پیش کرتی ہیں۔

یہ آپ بیتی اُس وقت تک چلتی ہے جب اس خاندان کی تیسری نسل یعنی سیدہ عابدہ حسین کی بڑی بیٹی ''شگو'' جھنگ سے صوبائی اسمبلی کی ممبر منتخب ہوئیں۔اس عرصے میں بیگم عابدہ حسین ایک مرتبہ پھر اُس وقت پیپلز پارٹی کی ٹاپ لیڈر شپ میں آئیں جب بے نظیر نے انہیں پارٹی کا سنیئر نائب صدر اور ورکنگ کمیٹی کا ممبر بنا دیا۔وہ بے نظیر بھٹو کی موت تک اُن کے انتہائی قریبی ساتھیوں میں شمار ہوتی رہیں۔آپ نے بے نظیر بھٹو کی زندگی کے آخری دنوں کی خلوت اور جلوت کی داستانیں بیان کی ہیں۔ عورت اپنے خاوند سے وفاداری اور محبت طلب کرتی ہے چاہے وہ عام گھریلو عورت ہو یا وزیر اعظم۔اس سلسلے میں مصنفہ بے نظیر بھٹو سے ایک نجی گفتگو کا حوالہ دیتے ہوئے کہتی ہیں:

''اچانک انہوں نے کہا کہ کیا وہ مجھ سے ایک ذاتی سوال پوچھ سکتی ہیں۔ میں نے اثبات میں جواب دیا تو انہوں نے پوچھا کہ کیا میرے شوہر نے کبھی بے وفائی کی ہے؟ میں نے کہا کہ پینتیس سال تک اپنے شوہر سے بندھی رہنے والی کسی بھی بیوی کی طرح مجھ پر بھی شک کے لمحات آئے لیکن یہ کہنا پڑے گا کہ فخر کی وفاداری پر کوئی سوال نہیں اُٹھایا جا سکتا۔اس پر بے نظیر نے ناقابل بیان اُداسی کے ساتھ کہا کہ شاید وہ مجھ جیسی خوش قسمت نہیں لیکن وہ آصف کو تہہ دل سے چاہتی ہیں اس لیے انہیں معاف کر دیا حالانکہ انہوں نے دکھ پہنچایا تھا۔'' (۲۶۲)

مزکورہ آپ بیتی کا ابتدائی اور وسطی حصہ تو کافی جامع اور مفصل بلکہ بعض ابواب ضرورت سے زیادہ طویل ہیں لیکن اس کا آخری حصہ انتہائی اختصار اور جلدی میں سپرد قلم کیا گیا ہے اقتدار پر مشرف کا قبضہ، نواب اکبر بگٹی کا قتل اور بے نظیر بھٹو کا قتل وہ بڑے بڑے واقعات ہیں جنھوں نے ملکی تاریخ، سیاست، معاشرت اور معیشت پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ مصنفہ نے ان واقعات کو سرسری طور پر بیان کیا ہے۔ اس طرح اُس نے لال مسجد کے واقعے اور افتخار چودھری کے لیے کی گئی سول اداروں کی سیاسی جدوجہد پر خاموشی اختیار کی ہے۔

سیدہ عابدہ حسین نے اپنے وقت کے وہ تمام چھوٹے بڑے واقعات کو ذاتی تجربے کی روشنی میں بیان کیا ہے جن سے ہمارے تاریخ اور سیاست کے تانے بانے تیار ہوئے۔ مصنفہ نے زیادہ تر سیاسی بیانیے پر دیا ہے اور سماجی، ثقافتی، تعلیمی اور ادبی عنوانات پر کم لکھا ہے۔ کتاب کے بعض ابواب میں صرف سیاسی ہنگاموں کی تفصیل ہے۔ تاہم ایک چیز جو اس سرگزشت کو باقاعدہ آپ بیتی کے دائرے میں لاتی ہے۔ وہ مصنفہ کی ہر مقام پر موجودگی، اظہار ذات، ہمدردی اور اپنی ذات کو حالات وواقعات میں جذب کرنا ہے۔ وہ سُنی سُنائی باتوں پر اعتبار نہیں کرتی، کسی اور کے خیالات مستعار نہیں لیتی، ہوا میں بات نہیں کرتی بلکہ حقائق کی روشنی میں اور اپنے تجربے و مشاہدے پر اعتماد کرکے بات آگے بڑھاتی ہیں۔ سیدہ عابدہ حسین کی ایک اور انفرادیت یہ ہے کہ وہ دانشورانہ تجزیہ نہیں کرتیں۔ واقعہ جوں کا توں بیان کرتی ہیں جو اُس کی آنکھوں نے دیکھا اور کانوں نے سُنا اور نتیجہ قاری پر چھوڑتی ہیں۔ ''اور بجلی کٹ گئی'' کی یہی خصوصیات اسے ایک معیاری آپ بیتی بناتی ہیں۔

جہاں تک اس آپ بیتی کے ترجمے کا تعلق مترجم نے بڑی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ وہ موقع کی مناسبت سے اپنا انداز تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ اصل انگریزی متن میں جہاں جہاں مصنفہ نے عبارت آرائی کی ہے مترجم نے عبارت کی روح کو برقرار رکھا ہے:

> ''ایک طرف تھل کے ریتلے ٹیلے اور دوسری طرف دریائے جہلم تھا۔ دیہات قریب قریب تھے اور اُن کے گرد کھجوروں کے درختوں کے جھنڈ گہرے نیلے آسمان کے پس منظر میں کھڑے تھے۔ ان گہرے سبز رنگ کے پتے اور کھجور کے سرخ گچھے جھانک رہے تھے۔ کھیتوں میں سرسبز چارے کا قالین بچھا تھا اور بھینسیں گائیں اور بھیڑیں اطمینان کے ساتھ جگالی کرتی تھیں۔'' (۲۶۳)

مصنفہ نے انگریزی زبان میں کہیں کہیں دلکش منظر نگاری بھی کی ہے۔ مترجم نے ترجمے کا حق ادا کیا ہے:

> ''جب میں نے گرد جھاڑنے کے لیے اپنی چادر کھولی تو دیکھا کہ ایک خوبصورت عقاب میرے جیپ کے قریب ہی ایک کانٹے دار جھاڑی پر بیٹھا ہوا تھا۔ عقاب کی آنکھیں بند

تھیں۔ پہلے اُس نے ایک اور پھر دوسری آنکھ کھولی، غور سے مجھے دیکھا اور پھر پَر پھیلائے،
پرواز لی، ہوا میں آہستہ آہستہ چکر لگاتے ہوئے دائرے کو وسیع کیا اور بلند ہوتے ہوئے
دوبارہ گہرے نیلے رنگ کے آسمان پر محض ایک نکتہ بن گیا۔" (۲۶۴)

عابدہ حسین نے اپنی آپ بیتی میں کئی جگہ پنجابی اور اُردو کے اشعار کا بھی بر محل استعمال کیا ہے نیز انہیں فارسی زبان سے بھی تھوڑی بہت واقفیت ہے۔ وہ فارسی شعر لکھتی ہیں یا اس کا آزاد انگریزی ترجمہ تحریر کرتی ہیں۔ باپ کی وفات کے وقت وہ یہ شعر گنگنا رہی تھی:

"ہرگز نمرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است برجریدہ عالم دوام ما" (۲۶۵)

مترجم نے اُردو ترجمہ کرتے وقت پنجابی، اُردو اور فارسی اشعار کو جوں کا توں لکھا ہے۔

"اور بجلی کٹ گئی" میں جگہ جگہ مرقع نگاری کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مترجم نے اس کو اتنے کامیاب طریقے سے اُردو میں منتقل کیا ہے کہ عبارت پر کہیں ترجمے کا گمان نہیں گزرتا۔ ایوان صدر اسلام آباد کی ایک ضیافت جس میں انڈیا کے وزیر اعظم راجیو گاندھی اور پاکستانی وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو صوفے پر بیٹھے تھے کا مصنفہ نے ایسا مرقع کھینچا ہے کہ اُس موقع، جگہ اور شخصیات کی ہو بہو تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ اس کا ترجمہ ملاحظہ ہو جس پر اصل کا گمان ہوتا ہے:

"راجیو گاندھی دراز قد، صاف رنگت والا نہایت دلکش تھا۔ بے نظیر آئیس پنک
اور خوبصورت لباس میں بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ صدر غلام اسحق خان دونوں
وزرائے اعظم کے درمیان بیٹھے تھے جو آپس میں بڑے جاندار انداز میں بات
چیت کر رہے تھے، جبکہ صدر چپ چاپ تھے۔ خان عبدالولی خان مرکزی میز پر
تھے، نوابزادہ نصر اللہ خان(اپنی مخصوص فارس ٹوپی میں) اور مولانا فضل
الرحمن (کندھے پر اپنے دیوبندی سکارف کے ساتھ) عوامی تاثر دے رہے تھے۔
راجیو گاندھی کی جوان اور پیاری بیوی سونیا ریشمی ساڑھی پہن کر اپنی اطالوی
شناخت کو غیر نمایاں کر رہی تھی۔" (۲۶۶)

عورت ہونے کی وجہ سے مصنفہ کا مشاہدہ کافی تیز ہے۔ جب وہ لوگوں کے ظاہری خد و خال، لباس اور عورتوں کی میک اپ بیان کرنے پر آتی ہیں تو اصل موضوع سے دور ہٹ جاتی ہیں۔ ادب میں اس کو "آوارہ قلمی" کہا جاتا ہے۔ سفر

نامے اور ناول میں تو آوارہ قلمی کی گنجائش ہو سکتی ہے لیکن خود نوشت نگار کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ بغلی گلیوں میں جھانکتا پھیرے۔ اسلامی سر براہی کانفرس کا ذکر کرتے ہوئے، سر براہان اور پھر اُن کی بیویوں کا ذکر شروع کرتی ہیں تو غیر ضروری تفصیل میں چلی جاتی ہیں۔ کرنل قذافی کی نئی نویلی بیگم کے ساتھ بیٹھ کر اُن کی سراپا نگاری کچھ اس طرح کی ہے کہ سارا منظر آنکھوں کے سامنے گزرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ یہاں بھی مترجم نے کافی مہارت کا ثبوت دیا ہے:

> ''اُن کا (معمر قذافی کی بیوی کا) لباس بد نما تھا، زعفرانی پیلا، مختصر گھٹنوں سے تھوڑا اُوپر، جس کے نیچے بھڑکیلے سفید وینائل لانگ بوٹ پہن رکھے تھے۔ میں نے بیگم نصرت بھٹو کو ان حیرت انگیز بوٹس کو گھورتے ہوئے پکڑ لیا۔ جب میں ہنسی روکنے کی سر توڑ کوشش کر رہی تھی تو انہوں نے مجھے آنکھ ماری۔'' (۲۶۷)

''اور بجلی کٹ گئی''، کئی لحاظ سے ایک کامیاب خود نوشت ہے اور اس کا اُردو ترجمہ اتنا معیاری ہے کہ سر سری طور پر پڑھنے سے اس پر ترجمے کا گمان نہیں ہوتا۔

حوالہ جات

۱۔ میری زندگی اور جدوجہد، خان عبدالغفار خان، مترجم: پروفیسر یار محمد مغموم، یونیورسٹی بک ایجنسی پشاور، ۲۰۱۶ء، ص۱۱۔

۲۔ ایضاً، ص۷۔

۳۔ ایضاً، ص۷۔

۴۔ ایضاً، ص۲۳۔

۵۔ ایضاً، ص۳۶۔

۶۔ ایضاً، ص۹۴۔

۷۔ ایضاً، ص۹۴۔

۸۔ ایضاً، ص۱۰۷۔

۹۔ ایضاً، ص۱۱۷،۱۱۶۔

۱۰۔ ایضاً، ص۱۱۸۔

۱۱۔ ایضاً، ص۲۰۴،۲۰۳۔

۱۲۔ ایضاً، ص۱۴۰۔

۱۳۔ ایضاً، ص۹۰۔

۱۴۔ ایضاً، ۱۲۰،۱۴۱۔

۱۵۔ ایضاً، ص۱۵۲۔

۱۶۔ ایضاً، ص۱۸۳۔

۱۷۔ ایضاً، ص۱۷۶،۲۲۔

۱۸۔ ایضاً، ص۴۴۔

۱۹۔ ایضاً، ص۱۰۹۔

۲۰۔ ایضاً، ص۱۲۰۔

۲۱۔ ایضاً، ص۱۷۱۔

۲۲۔ ایضاً، ص۱۵۰۔

۲۳۔ ایضاً، ص۱۰۔

۲۴۔ ایضاً، ص۱۱۶،۳۴۔

۲۵۔ ایضاً، ص۱۸۴۔

۲۶۔ ایضاً، ص۱۹۴۔

۲۷۔ ایضاً، ص۲۰۵۔

۲۸۔ ''جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی''، محمد ایوب خان، مترجم: غلام عباس، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۱۳ء، ص۱۵۔

۲۹۔ ایضاً، ص۱۶۔

۳۰۔ ایضاً، ص۲۹۔

۳۱۔ ایضاً، ص۳۳۔

۳۲۔ ایضاً، ص۳۲۔

۳۳۔ ایضاً، ص۳۴۔

۳۴۔ ایضاً، ص۵۲۔

۳۵۔ ایضاً، ص۵۴،۵۳۔

۳۶۔ ایضاً، ص۵۸۔

۳۷۔ ایضاً، ص۲۳۲۔

۳۸۔ ایضاً، ص۱۵۱،۱۵۰۔

۳۹۔ ایضاً، ص۱۸۶،۱۸۵۔

۴۰۔ ایضاً، ص۲۲۶،۲۲۵۔

۴۱۔ ایضاً، ص۲۴۷۔

۴۲۔ ایضاً، ص۶۸۔

۴۳۔ ایضاً، ص۲۰۔

۴۴۔ ایضاً، ص ۱۴۱۔

۴۵۔ ایضاً، ص ۶۹۔

۴۶۔ ایضاً، ص ۶۹۔

۴۷۔ ایضاً، ص ۶۸۔

۴۸۔ ایضاً، ص ۹۵،۹۴۔

۴۹۔ ایضاً، ص ۱۳۶۔

۵۰۔ ایضاً، ص ۱۹۱۔

۵۱۔ ایضاً، ص ۱۳۷،۱۳۶۔

۵۲۔ ایضاً، ص ۲۴۰،۱۸۹۔

۵۳۔ ایضاً، ص ۱۵۔

۵۴۔ بی بی سی لندن اُردو سروس، رات ۸ بجے کی بُلیٹن، مورخہ ۷ فروری ۲۰۱۰ء۔

۵۵۔ اُردو انسائیکلوپیڈیا؛ جلد نمبر 4 فیروز سنز لاہور 200 ص۔18

۵۶۔ کیا میں پاگل تھا؟ اجمل خٹک، مترجم: آغاز اہد، پشتو ادبی غورزنگ، پشاور، ۲۰۱۰ء، ص ۱۳۔

۵۷۔ ایضاً، ص۔ ۲۳

۵۸۔ ایضاً، ص ۸۲۔

۵۹۔ ایضاً، ص ۸۷۔

۶۰۔ ایضاً، ص ۸۹،۸۸۔

۶۱۔ ایضاً، ص ۷۷

۶۲۔ ایضاً، ص ۹۷۔

۶۳۔ ایضاً، ص ۹۸۔

۶۴۔ ایضاً، ص ۸۷،۸۶۔

۶۵۔ ایضاً، ص۔ ۳۴

۶۶۔ ایضاً، ص۔ ۶۷

۶۷۔ ایضاً، ص۔۱۹

۶۸۔ ایضاً، ص۔۲۲

۶۹۔ ایضاً، ص۔۴۵

۷۰۔ ایضاً، ص۔۶۷

۷۱۔ ایضاً، ص۔۲۳

۷۲۔ ایضاً، ص۔۵۶

۷۳۔ ایضاً، ص۳۵،۳۴۔

۷۴۔ ایضاً، ص۲۸،۲۷۔

۷۵۔ ایضاً، ص۶۲۔

۷۶۔ ایضاً، ص۸۷۔

۷۷۔ ایضاً، ص۱۰۳،۱۰۲۔

۷۸۔ ایضاً، ص۲۲۔

۷۹۔ ایضاً، ص۴۳۔

۸۰۔ ایضاً، ص۵۲۔

۸۱۔ ایضاً، ص۵۶۔

۸۲۔ ایضاً، ص۵۷۔

۸۳۔ ایضاً، ص۱۳۔

۸۴۔ ایضاً، ص۱۳۲۔

۸۵۔ ایضاً، ص۱۱۔

۸۶۔ ایضاً، ص۱۲۔

۸۷۔ ایضاً، ص۱۷۔

۸۸۔ ایضاً، ص۱۳۵۔

۸۹۔ ایضاً، ص۔۴

۹۰۔ ایضاً، ص۔ ۱۱

۹۱۔ ایضاً، ص۔ ۳۵

۹۲۔ ایضاً، ص۔ ۴۲

۹۳۔ ایضاً، ص۔ ۴۴

۹۴۔ ایضاً، ص ۲۔۱۳۔

۹۵۔ ایضاً، ص۲۹۔

۹۶۔ الحمرہ آپ بیتی نمبر نومبر ۲۰۱۲ء لاہور، ''اُردو آپ بیتیوں کی اہمیت''، مشمولہ: جمیل یوسف۔

۹۷۔ کیا میں پاگل تھا؟ اجمل خٹک، مترجم: آغاز اہد، پشتو ادبی غورزنگ پشاور، ۲۰۱۰ء، ص۱۶۵۔

۹۸۔ ایضاً، ص۵۴۔

۹۹۔ ایضاً، ص۔ ۱۱۰

۱۰۰۔ کیا میں پاگل تھا؟ اجمل خٹک، مترجم: آغاز اہد پشتو ادبی غورزنگ پشاور، ۲۰۱۰ء، ص۱۵۳۔

۱۰۱۔ ایضاً، ص۷۰۔

۱۰۲۔ ایضاً، ص۱۷۱، ۱۷۰۔

۱۰۳۔ ''دُخترِ مشرق''، بے نظیر بھٹو، مترجم: عبدالعلی شوکت، مساوات پبلی کیشنز اسلام آباد، ۲۰۱۱ء، ص۷۴۔

۱۰۴۔ ایضاً، ص۶۸۔

۱۰۵۔ ایضاً، ص۸۷۔

۱۰۶۔ ایضاً، ص۱۹۸۔

۱۰۷۔ ایضاً، ص۲۰۵۔

۱۰۸۔ ایضاً، ص۳۲۸۔

۱۰۹۔ ایضاً، ص۴۲۲۔

۱۱۰۔ ایضاً، ص۳۸۹، ۳۸۸۔

۱۱۱۔ ایضاً، ص۴۵۵۔

۱۱۲۔ ایضاً، ص۱۳۔

۱۱۳۔ ایضاً، ص۴۶۸۔

۱۱۴۔ ایضاً، ص۴۶۱۔

۱۱۵۔ ایضاً، ص۴۶۵۔

۱۱۶۔ ایضاً، ص۴۶۶۔

۱۱۷۔ ایضاً، ص۹۹۔

۱۱۸۔ ایضاً، ص۲۶۸۔

۱۱۹۔ ایضاً، ص۳۲۴۔

۱۲۰۔ ایضاً، ص۴۰۸۔

۱۲۱۔ ایضاً، ص۴۱۰۔

۱۲۲۔ ایضاً، ص۳۱۸۔

۱۲۳۔ ایضاً، ص۴۱۰۔

۱۲۴۔ ایضاً، ص۱۱۰۔

۱۲۵۔ ایضاً، ص۱۱۳۔

۱۲۶۔ ایضاً، ص۱۴۱۔

۱۲۷۔ ایضاً، ص۱۹۸۔

۱۲۸۔ ایضاً، ص۲۶۲۔

۱۲۹۔ ایضاً، ص۲۶۲۔

۱۳۰۔ ایضاً، ص۱۸۷۔

۱۳۱۔ ایضاً، ص۲۷۔

۱۳۲۔ ایضاً، ص۱۷۳۔

۱۳۳۔ ایضاً، ص۳۷۔

۱۳۴۔ ایضاً، ص۲۹۹۔

۱۳۵۔ ایضاً، ص۳۰۱۔

۱۳۶۔ ایضاً، ص۸۸۔

۱۳۷۔ ایضاً، ص۱۰۰۔

۱۳۸۔ ایضاً، ص۱۲۱۔

۱۳۹۔ ایضاً، ص۱۳۹۔

۱۴۰۔ ایضاً، ص۱۷۴۔

۱۴۱۔ ایضاً، ص۲۴۲۔

۱۴۲۔ ایضاً، ص۲۴۲۔

۱۴۳۔ ایضاً، ص۳۶۳۔

۱۴۴۔ ایضاً، ص۴۱۱۔

۱۴۵۔ ایضاً، ص۸۸۔

۱۴۶۔ ایضاً، ص۱۱۴۔

۱۴۷۔ ایضاً، ص۶۸۔

۱۴۸۔ ایضاً، ص۲۳۷۔

۱۴۹۔ ''میں اور میرا پاکستان''، عمران خان، مترجم: ہارون الرشید، جہانگیر بکس لاہور، ۲۰۱۱ء، ص۲۳۔

۱۵۰۔ ایضاً، ص۲۲۔

۱۵۱۔ ایضاً، ص۱۸۔۱۹

۱۵۲۔ ایضاً، ص۲۰۔

۱۵۳۔ ایضاً، ص۲۱،۲۰۔

۱۵۴۔ ایضاً، ص۴۳۔

۱۵۵۔ ایضاً، ص۸۹۔

۱۵۶۔ ایضاً، ص۳۹۔

۱۵۷۔ ایضاً، ص۴۲۔

۱۵۸۔ ایضاً، ص۹۵۔

۱۵۹۔ ایضاً، ص۹۲۔

۱۶۰۔ ایضاً، ص۱۱۱،۱۱۰۔

۱۶۱۔ ایضاً، ص۱۳۶۔

۱۶۲۔ ’’تارڑ نامہ‘‘،مستنصر حسین تارڑ، جلد نمبر ۵،سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۴ء، ص۲۱۵۔

۱۶۳۔ ’’میں اور میرا پاکستان‘‘عمران خان، مترجم: ہارون الرشید، جہانگیر بکس لاہور، ۲۰۱۱ء، ص۱۴۱۔

۱۶۴۔ ایضاً، ص۱۴۷۔

۱۶۵۔ ایضاً، ص۱۱۔

۱۶۶۔ ایضاً، ص۴۷۔

۱۶۷۔ ایضاً، ص۱۵۷۔

۱۶۸۔ ایضاً۱۲۔

۱۶۹۔ ایضاً، ص۱۹۔

۱۷۰۔ ایضاً، ص۹۲۔

۱۷۱۔ ایضاً، ص۱۰۸۔

۱۷۲۔ ایضاً، ص۱۰۳۔

۱۷۳۔ ایضاً، ص۱۰۲۔

۱۷۴۔ ایضاً، ص۱۴۹۔

۱۷۵۔ ایضاً، ص۹۹۔

۱۷۶۔ ایضاً، ص۳۹۔

۱۷۷۔ ایضاً، ص۸۹۔

۱۷۸۔ ایضاً، ص۱۰۴۔۱۰۵

۱۷۹۔ ایضاً، ص۱۲۷۔

۱۸۰۔ ایضاً، ص۱۲۸۔

۱۸۱۔ ایضاً، ص۔۱۵۱

۱۸۲۔ ایضاً، ص۱۵۳۔

۱۸۳۔ ایضاً، ص۱۶۷۔

۱۸۴۔ ایضاً، ص۱۰۲۔

۱۸۵۔ ایضاً، ص۲۸۳۔

۱۸۶۔ ایضاً، ص۱۰۴۔

۱۸۷۔ ایضاً، ص۔۲۸۶

۱۸۸۔ ایضاً، ص۸۶۔۲۶۴

۱۸۹۔ ایضاً، ص۹۔۲۸۳

۱۹۰۔ ''سب سے پہلے پاکستان''، پرویز مشرف، مترجم: ہدایت خویشگی، فیروز سنز لاہور، ۲۰۰۶ء، ص۲۶۔

۱۹۱۔ ایضاً، ص۳۲۔

۱۹۲۔ ایضاً، ص۴۵، ۴۴۔

۱۹۳۔ ایضاً، ص۶۴۔

۱۹۴۔ ایضاً، ص۸۹۔

۱۹۵۔ ایضاً، ص۹۴۔۱۰۴۔

۱۹۶۔ ''دختر مشرق''، بے نظیر بھٹو، لیگسی فاؤنڈیشن لاہور، ۲۰۱۱ء، ص۴۵۶۔

۱۹۷۔ ''سب سے پہلے پاکستان''، پرویز مشرف، مترجم: ہدایت خویشگی، فیروز سنز لاہور، ۲۰۰۶ء، ص۱۳۶، ۱۳۵۔

۱۹۸۔ ایضاً، ص۲۱۱۔

۱۹۹۔ ایضاً، ص۲۵۵، ۲۵۴۔

۲۰۰۔ ایضاً، ص۔۳۰۰

۲۰۱۔ ایضاً، ص۳۶۶۔

۲۰۲۔ ایضاً، ص۱۵۴۔

۲۰۳۔ ایضاً، ص۷۔۹۔

۲۰۴۔ ایضاً، ص۲۴۔

۲۰۵۔ ایضاً، ص۱۳۲۔

۲۰۶۔ ایضاً، ص۱۴۰۔

۲۰۷۔ ایضاً، ص۹۱۔

۲۰۸۔ ایضاً، ص۱۹۷۔

۲۰۹۔ ایضاً، ص۱۰۸۔

۲۱۰۔ ایضاً، ص۱۱۲۔

۲۱۱۔ ایضاً، ص۱۱۷۔

۲۱۲۔ ایضاً، ص۲۶۵۔

۲۱۳۔ ایضاً، ص۲۷۲۔

۲۱۴۔ ایضاً، ص۲۹۵۔

۲۱۵۔ ایضاً، ص۲۰۸۔

۲۱۶۔ ایضاً، ص۳۰۸۔

۲۱۷۔ ایضاً، ص۳۰۸۔

۲۱۸۔ ایضاً، ص۳۲۶۔

۲۱۹۔ ایضاً، ص۳۳۰۔

۲۲۰۔ ایضاً، ص۴۵۔

۲۲۱۔ ایضاً، ص۴۵۔

۲۲۲۔ ایضاً، ص۱۵۔

۲۲۳۔ ایضاً، ص۱۳۱۔

۲۲۴۔ ایضاً، ص۱۳۱۔

۲۲۵۔ ایضاً، ص۲۵۳۔

۲۲۶۔ ایضاً، ص۳۵۳۔

۲۲۷۔ ایضاً، ص۲۵۵۔

۲۲۸۔ ایضاً، ص۲۵۵۔

۲۲۹۔ ایضاً، ص۳۴۵۔

۲۳۰۔ ایضاً، ص۳۵۳۔

۲۳۱۔ ایضاً، ص۳۵۳۔

۲۳۲۔ ایضاً، ص۳۶۱۔

۲۳۳۔ ایضاً، ص۱۳۔

۲۳۴۔ ایضاً، ص۱۱۱۔

۲۳۵۔ ایضاً، ص۲۶۱۔

۲۳۶۔ ایضاً، ص۲۶۲۔

۲۳۷۔ ایضاً، ص۲۷۰۔

۲۳۸۔ ایضاً، ص۲۹۶۔

۲۳۹۔ ایضاً، ص۳۷۲۔

۲۴۰۔ ایضاً، ص۳۷۵۔

۲۴۱۔ ایضاً، ص۳۷۵۔

۲۴۲۔ ایضاً، ص۲۵۷۔

۲۴۳۔ ایضاً، ص۴۵۔

۲۴۴۔ ایضاً، ص۱۲۶۔

۲۴۵۔ ایضاً، ص۱۳۳۔

۲۴۶۔ ایضاً، ص۱۴۶۔

۲۴۷۔ ایضاً، ص۱۵۶۔

۲۴۸۔ ایضاً، ص۱۷۴۔

۲۴۹۔ ایضاً، ص۲۵۱۔

۲۵۰۔ ایضاً، ص۲۹۴۔

۲۵۱۔ ایضاً، ص۳۰۲۔

۲۵۲۔ ایضاً، ص۳۲۷۔

۲۵۳۔ ایضاً، ص۴۰۹۔

۲۵۴۔ اور بجلی کٹ گئی، سیدہ عابدہ حسین، مترجم: ندارد، الفیصل ناشران وتاجران کتب لاہور ۲۰۱۷ء ص۔۸

۲۵۵۔ ایضاً، ص، ۵۷۔۵۸

۲۵۶۔ ایضاً، ص۔۶۴

۲۵۷۔ ایضاً، ص۔۱۲۱

۲۵۸۔ ایضاً، ص۔۲۰۰

۲۵۹۔ ایضاً، ص۔۲۶۰

۲۶۰۔ ایضاً، ص۔۲۶۵

۲۶۱۔ ایضاً، ص۲۹۱۔۲۹۲

۲۶۲۔ ایضاً، ص۔۴۴۲

۲۶۳۔ ایضاً، ص۔۱۱۰

۲۶۴۔ ایضاً، ص۔۱۱۱

۲۶۵۔ ایضاً، ص۔۴۱

۲۶۶۔ ایضاً، ص۲۳۹۔۲۴۰

۲۶۷۔ ایضاً، ص۔۷۶

پانچواں باب

حاصل تحقیق/نتائج

سیاسی آپ بیتیوں میں اُٹھائے گئے مختلف مباحث مثلاً ذاتی حالات، انکشافات، سماجی تغیرات، تاریخی تبدیلیاں، کارنامے، مبالغہ آرائیاں، نرگسی رویے، سیاسی حوادث، فتوحات، کامیابیاں، ناکامیاں، اخلاقی اسباق، موجودہ مقام تک پہنچنے میں اُٹھائے گئے مصائب و مشکلات اور اِس قسم کے دیگر موضوعات کو تحقیقی و تنقیدی انداز سے پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دورانِ تحقیق جو نتائج سامنے آئے ہیں وہ کچھ اِس طرح ہیں۔

ا۔ تاریخی سچائیاں:

آپ بیتیاں جہاں مصنف کی ذات، خاندان، ماحول، اعتقاد اور نجی معاملات کے حوالے سے خصوصی اہمیت کی حامل ہیں وہاں آپ بیتیاں علمی، مذہبی، سیاسی، سماجی، تہذیبی، لسانی اور ادبی تاریخ کے نہایت قابلِ اعتماد مرقعے بھی ہیں۔ آپ بیتیوں کے تاریخی اہمیت سے کسی بھی طرح سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور بقول پروفیسر ارشد کیانی:

> ''آپ بیتیاں محض تاریخ نہیں ماورائے تاریخ اور بہت کچھ ہیں۔ ہم صرف آپ بیتیوں میں چٹخارے دار واقعات پڑھ کر شاد کام ہوتے ہیں لیکن اِس کی اصل تاریخی خاصیت کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے۔ اگر کسی طریقے سے دنیا کے کسی خاص عہد کی تاریخی کتابیں دریا بُرد ہو جائیں لیکن اُس زمانے کی آپ بیتیاں موجود ہوں تو میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اُس عہد کی معیاری تاریخ از سرِ نواِن آپ بیتیوں کی مدد سے لکھی جا سکتی ہے۔''(۱)

کسی بھی ملک میں جو مختلف حادثات رونما ہوتے ہیں اُن کا پورا علم ہمیں کسی اور زریعے سے اتنا نہیں ہوتا جتنا آپ بیتیاں ہماری رہنمائی کرتی ہیں۔ آج کی بات اور ہے۔ آج میڈیا کی وجہ سے کوئی بات خفیہ نہیں رِہ سکتی لیکن ایک زمانہ تھا جب بہت ساری باتیں صیغہ راز میں رہتی تھیں۔ ایسے میں آپ بیتی، ذاتی نوٹس، ڈائریاں اور نجی رپورٹیں اِس کمی کو بڑی حد تک پورا کرتیں۔

آپ بیتیوں میں ہمیں وہ کچھ مل سکتا ہے جو تاریخ کی صفحات میں نہیں مل سکتا۔ آپ بیتیوں کو پڑھنے سے کئی تاریخی گرہیں کھولتی ہیں۔ ہماری مشرق زبانوں کی آپ بیتیوں میں تاریخ، ادب، سیاست، معاشرت اور سماج کا وہ رنگ جھلکتا ہے کہ اِن کو سامنے رکھ کر بھی ہم پروفیسر ارشد کیانی کے بقول اپنی تاریخ کو دوبارہ مرتب کر سکتے ہیں۔ اگر ہم مخلصانہ کوشش کر کے اپنی تاریخ کو آپ بیتیوں کی مدد سے ترتیب و تشکیل دیتے تو آج اِس براعظم کی تاریخ کی صورت مختلف ہوتی۔ نیز ہم غیر مسلموں اور نام نہاد تاریخ دانوں کی پیدا کردہ غلط فہمیاں دُور کر سکتے تھے۔

قیام پاکستان کوئی اچانک حادثہ نہ تھا نہ یہ منصوبہ چند سالوں یا ایک دو عشروں میں ہندوستان کے مسلمانوں کے ذہنوں میں پروان چڑھا بلکہ مدت سے اِس کے لیے فضا ہموار ہو رہی تھی۔ بظاہر متفق اور متحد نظر آنے والی ہندوستان کی دونوں بڑی قومیں اندر سے کتنا فاصلہ اور بُعد رکھتی تھیں اِس بارے میں ہماری ہم عصر آپ بیتیاں یہ سچائیاں بیان کر رہی ہیں :

(الف) سیاسی آپ بیتیاں پڑھ کر ہمیں معلوم ہوا کہ انگریز اور ہندو کسی بھی صورت میں تقسیم ہند کا فیصلہ نہ کرتے اگر زمینی حقائق اُن کے خلاف نہ ہو جاتے۔ ہندوستان کے زمینی حقائق یہ تھے کہ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے فوراً بعد ہندوستان کے لوگوں میں نسلی، علاقائی اور مذہبی تعصبات کی خلیج اِتنی وسیع ہوئی کہ اب دنیا کی کوئی طاقت اُنہیں متحد نہیں رکھ سکتی تھی۔اِس بارے میں بیگم شائستہ اکرام اللہ اپنی آپ بیتی'' پردے سے پارلیمنٹ میں'' لکھتی ہیں:

> ''اِس دوران ہندو اور مسلمانوں کے درمیان اختلافات عروج پر تھے۔ ایک ہندو مصنف نے حضور ﷺ پر ایک طنزیہ کتاب تحریر کی۔ دو نوعمر مسلمان لڑکوں امیر علی اور عبداللہ نے اُس مصنف کو ہلاک کیا جس پر عدالت نے دونوں کو موت کی سزا سنائی۔ ہندوستانی مسلمانوں میں اِن مجاہدوں کے لیے ہمدردی کے جذبات پیدا ہو گئے۔ لوگوں میں عام تاثر یہ تھا کہ بنگال میں ہمارے خاندان کے اثر ورسوخ سے اِن مجاہدین کی زندگیاں بچ سکتی ہیں۔ ایک دوپہر دس ہزار افراد کا ایک جلوس ہمارے گھر کی طرف آرہا تھا۔ جلوس پُرجوش نعرے لگا رہا تھا۔ اپنی زندگی میں پہلی بار میں نے ایسا جلوس دیکھا تھا۔ اِس کے بعد بنگال اور بہار میں اِس طرح کے واقعات کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا ۔ روز کہیں نہ کہیں کوئی ہندو شرپسند حضور ﷺ کی شان میں کوئی گستاخی کر دیتا اور پھر صورتحال بے قابو ہو جاتی۔ اِس مرحلے پر ہر سمجھدار انسان اندازہ کر سکتا تھا کہ بٹوارے کے سوا اِس مسئلے کا کوئی دوسرا حل موجود نہیں۔'' (۲)

اِس کے بعد ہندوستان کے سیاسی حالات بد سے بدتر ہو گئے۔ مذہبی فسادات نے سارے ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اب حالات انگریز حکمرانوں، کانگرس اور مسلم لیگ کے ہاتھ سے نکل چکے تھے اور تقسیم ناگزیر ہو گیا تھا۔ گاندھی جیسا کٹر اور اپنے اُصولوں میں سخت سیاسی رہنما جس کا اعلان تھا کہ ''میرے زندہ ہوتے ہندوستان کی دھرتی تقسیم نہیں ہو سکتی''، بھی بالآخر تقسیم کا قائل ہوا۔ ہندو اور مسلم اکثریت والے علاقوں میں جس طرح خون کی ہولی کھیلی جارہی

تھی اِس نے تقسیم کا عمل یقینی بنایا۔ بیگم شائستہ اکرم اللہ اِس تاریخی صداقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رقم کرتی ہیں:

> ''۱۹۴۰ء سے ہندوستان ایک خوفناک بحران میں مبتلا چلا آرہا تھا۔ دونوں قوموں کے نمائندے ایک میز پر بیٹھ کر کوئی قابلِ قبول حل ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن دونوں قوموں میں اختلافات کی خلیج زیادہ وسیع ہو چکی تھی۔ کلکتہ کے فسادات ختم ہو گئے تو پھر بہار میں ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے۔ بہار میں مسلمانوں کی آبادی صرف آٹھ فیصد تھی۔ بہار کے لوگ اپنی خوش اخلاقی کی وجہ سے سارے ہندوستان میں مشہور تھے۔ یہ فسادات ایک ماہ تک جاری رہے۔ اِس کے بعد دریائے جمنا کے کنارے ہندوؤں نے ایک تہوار کے دوران مسلمانوں کا قتل کیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دریا جمنا میں پانی کی بجائے خون بہہ رہا ہو۔ پھر بنگال کے ایک ضلع نواکھالی میں فسادات شروع ہو گئے۔ یہاں مسلمان اکثریت میں تھے یہاں ہندوؤں کو بے دریغ قتل کیا گیا۔ اِن فسادات نے برطانوی حکومت کو لرزہ کر رکھ دیا اور اُنھوں نے جلد از جلد اقتدار ہندوستانیوں کے ہاتھ دے کر ہندوستان چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔''(۳)

(ب) تقسیم ہند کا اعلان ہوتے ہی ہندوستان میں فرقہ وارانہ قتل و غارت کا وہ بازار گرم ہو گیا جس کی نظیر تاریخ انسانی میں مشکل سے ملے گی۔ انسان، انسان نہیں درندہ بن گیا تھا، انسانیت، رحم، دل سوزی اور احترام آدمیت کا احساس ختم ہو کر اِس کی جگہ ظلم، بربریت اور سفاکی نے لی تھی۔ سرحد کے دونوں طرف خواہ وہ مسلمان تھے یا ہندو اور سکھ مخالف مذہب والوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر ثواب دارین حاصل کر رہے تھے۔ نئے بننے والے ملک پاکستان میں مسلمان ہندوؤں کے گھر اور عبادت خانے جلا رہے تھے۔ دوسری طرف ہندو اور سکھ مسلمانوں کے گاؤں کے گاؤں نظرِ آتش کر رہے تھے۔ اِن فسادات کے نتیجے میں عام لوگوں پر کون سی قیامتیں گزر رہی تھیں۔ اِس کا سب سے معتبر اور مستند احوال ہمیں معاصر آپ بیتیوں میں ملتا ہے۔ چنانچہ اِس سلسلے میں گوہر ایوب خان اپنی آپ بیتی ''ایوانِ اقتدار کے مشاہدات'' میں لکھتے ہیں:

> ''مہاجرین کے قافلوں پر حملوں، انسان کی بربریت، قتل عام، تباہی و بربادی کے جو مناظر میں نے اُس وقت دیکھے وہ یاد کر کے اب بھی جسم کا رُواں، رُواں کانپ اُٹھتا ہے۔ میں نے کئی جگہ یہ بھی دیکھا کہ لاشوں کو بلڈوزروں کے ذریعے اجتماعی

قبروں میں دھکیلا جا رہا ہے۔ یہ مناظر لاکھ کوشش کے باوجود ذہن کے پردوں سے نہیں مٹتے۔ میں نے امبالا سے واہگہ تک مختلف دیہاتوں اور قصبوں کے مسلمانوں کو دیکھا جو بے سروسامانی کے عالم میں پاکستان کی جانب دوڑے چلے آرہے تھے۔ وہ ہر سواری کی طرف لپکتے تھے تاکہ اِس میں لٹک کر کسی نہ کسی طرح سرحد عبور کر کے پاکستان پہنچ سکیں۔"(۴)

ایک انگریز نے کہا تھا کہ "ایک آپ بیتی نصف درجن کتابوں پر بھاری ہوتی ہے" اِس قول میں زیادہ مبالغہ بھی نہیں۔ درج ذیل اقتباس پڑھ کر اُس وقت کے فسادات کے بارے میں سارہ منظر نامہ واضح ہو جاتا ہے:

"میرے ایک دُور کے چچا ہمارے بعد فساد زدہ علاقے سے جان بچا کر اور اپنے تمام کنبے کو کٹا کر یہاں آئے تھے۔ ہمیں اُن کی ہیئت کزائی دیکھ کر سخت صدمہ پہنچا۔ گرد آلود پھٹے ہوئے کپڑوں، لتھڑے ہوئے خوفزدہ آنکھوں سے اُس نے خونی واقعات، لوٹ مار اور عصمت دری کی جو لرزہ خیز داستان سنائی وہ ناقابلِ یقین تھی۔ اُس نے بتایا کہ میں اپنی ماں، بیوی، بہن اور ایک چھوٹے بیٹے کے ساتھ آرہا تھا۔ جب راستے میں سکھوں کے ایک جتھے نے ہمارے سارے کنبے کو کاٹ کر نیزوں پر اُٹھا دیا۔ میں زخمی حالت میں دوڑتا رہا اور باصد مشکل ایک دریا کے کنارے پہنچا۔ ایک بڑی سی لکڑی پر بیٹھ کر دریا عبور کرنے لگا۔ وہ دریا انسانی لاشوں سے بھرا پڑا تھا۔ ایک لاش دوسری لاش سے ملی ہوئی تیر رہی تھی۔ یہ دریا ستلج تھا۔ دیگر دونوں دریا راوی اور چناب بھی انسانی لاشوں سے اَٹ گئے تھے۔ میں اُس وقت بچہ تھا اور دم بہ خود یہ قصہ سن رہا تھا۔ اُس وقت میری حالت دیدنی تھی۔"(۵)

(ج) سقوط ڈھاکہ ہماری تاریخ کا ایک تلخ باب ہے جو آج تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔ مشرقی اور مغربی دونوں بازو بڑی فراخدلی، چاہت، محبت اور ارمانوں سے ایک ملک "پاکستان" کی شکل میں ایک ہو گئے تھے۔ ملک کے دونوں حصوں کے درمیان حالات بھی اِتنے گھمبیر نہ تھے اور دونوں خطے مذہب، رسومات اور ثقافت کے حوالے سے بڑی حد تک ایک جیسے تھے۔ اِس سے زیادہ خراب حالات تو بھارت، افغانستان، عراق اور یمن کے ہیں وہاں اِس قسم کے خوفناک حادثے کیوں جنم نہیں لیتے؟ چالیس سال سے زیادہ عرصہ گزرا، مختلف لوگوں نے اِس عنوان پر اپنے خیالات پیش کیے، حمود الرحمٰن کمیشن

رپورٹ بھی منظرِ عام پر آئی لیکن عوام آج بھی اُس بنیادی سوال کا جواب نہ پاسکے کہ آخر وہ کون سا بڑا سبب تھا جو ملک کو دولخت کر گیا۔ پھر اِس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ اِس ملک میں خدانخواستہ یہ تاریخ دوبارہ نہیں دُہرائی جائے گی۔ چنانچہ ۱۹۷۱ء اور اُس کے فوراً بعد لکھی گئیں سیاسی آپ بیتیاں بڑی حد تک اس سوال کا کافی وشافی جواب مہیا کرتی ہیں۔ ''بی ایم کٹی'' کا مشاہدہ یہ ہے کہ مشرقی پاکستان میں حالات اِتنے خراب نہیں تھے کہ اِس کو فوج کے حوالے کر کے فوجی آپریشن شروع کیا گیا۔ وہ فوجی آپریشن کو اِس حادثے کا سب سے بڑا سبب قرار دیتا ہے:

> ''جوں ہی افواج پاکستان نے مشرقی پاکستان کے عوام کے خلاف آپریشن کا آغاز کیا آرمی کے بنگالی سپاہیوں، مشرقی پاکستان رائفلز، پیرا ملٹری فورسز اور پولیس نے بغاوت کر دی۔ تیس ہزار سے زیادہ افراد اسلحہ سمیت اپنے اپنے کیمپوں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ اُن میں سے کچھ تو عوام میں تحلیل ہوگئے اور کچھ سرحد عبور کر کے مغربی بنگال ہجرت کر گئے۔ باغی فوجیوں نے مقامی نوجوان بنگالیوں کو ٹریننگ دینا شروع کی جو آرمی کی مظالم سے بچنے کے لیے مغربی بنگال چلے گئے تھے۔ اِس پس منظر میں لبریشن آرمی ''مکتی باہنی'' پیدا ہوئی۔ ظاہر ہے اُنہیں ہندوستان کی پشت پناہی حاصل تھی۔ آگے جو کچھ ہوا وہ تاریخ ہے۔''(۶)

ایک اور سیاسی خود نوشت نگار مذکورہ بالا واقعے کو عظیم حادثہ کہتا ہے اور اِس کے ڈانڈے زبانوں کے مسئلے سے جوڑتا ہے۔ اُن کی بات اِس لیے دِل کو لگتی ہے کہ اُردو، عربی، پرتگالی اور نارویجین زبانوں کی تاریخ ہمیں اِس بات کی شہادت دیتی ہے کہ کس طرح زبان کی بنیاد پر قومیں، اوطان اور ممالک بنتے اور ٹوٹتے ہیں:

> ''مشرقی پاکستان کی اکثریت بنگالی بولتی تھی۔ قیامِ پاکستان کے بعد جب زبان کا مسئلہ در پیش ہوا تو قائدِ اعظم نے فہم و فراست سے اِسے بروقت حل کر دیا لیکن قائدِ اعظم کی رحلت کے بعد جہاں قیادت کا فقدان تھا وہاں یہ مسئلہ بھی پیش ہوا۔ بنگالیوں نے زبان کا مسئلہ اُٹھایا۔ ہنگامے ہوئے۔ طلبا نے تحریک چلائی۔ طلبا اور دیگر مظاہرین قتل ہوئے۔ لسانی مسئلے نے تحریک کو ایسے اُبھارا کہ پھر یہ تلخی کبھی کم نہ ہو سکی۔ اگر ہمارے اربابِ اختیار آغاز ہی سے اُردو اور بنگالی دونوں زبانوں کو سرکاری زبان قرار دیتے تو نوبت علیٰحدگی بنگال تک نہ آتی۔''(۷)

یہاں بی ایم کھٹی کی کتاب ''خود اختیار کردہ جلاوطنی'' کا حوالہ دینا بھی ضروری ہے۔اگر یحییٰ خان بروقت کوئی آئینی حل نکالتا تو بھی ملک اِس خوفناک بحران سے بچ سکتا تھا:

''دو پاکستان دو آئین کا ڈرافٹ جنرل یحییٰ خان نے انتخابات کے نتائج سامنے آنے کے بعد تیار کرایا تھا اور اس پر انہیں مجیب الرحمٰن کی قبولیت بھی دستیاب ہو چکی تھی اور وہ اسے سرکاری اعلامیہ کے طور پر جاری کرنا چاہتے تھے لیکن بھٹو نے اِس کی شدید مخالفت کی۔اب یہ دستاویز تاریخ کے اوراق میں گم ہے لیکن اگر اس پر عمل درآمد ہو جاتا تو مشرقی پاکستان کنفیڈریشن کی صورت میں پاکستان کے ساتھ وابستہ رہتا اور ہمیں سقوطِ ڈھاکہ کی المناک ہزیمت نہ اُٹھانی پڑتی لیکن سوال یہ ہے کہ تاریخ کی غلطیوں کا مداوا کون کر سکتا ہے۔تاریخ کے اوراق مستقبل کے حکمرانوں کے لیے نوشتہ دیوار ہوتے ہیں لیکن تاریخ سے سبق کس نے سیکھا ہے؟۔''(۸)

۲۔ سیاسی حقائق:

ہماری تحقیق کا عنوان سیاست دانوں کی آپ بیتیاں ہیں۔ہم نے دیگر موضوعات کے ساتھ ساتھ مزکورہ آپ بیتیوں میں یہ بھی تلاش کیا کہ آخر ہماری جمہوری روایات مضبوط کیوں نہیں ہو رہی ہیں؟ نیز ملک میں سیاسی نظام کی خرابی اور مجموعی قومی ترقی میں ناکامی کے کیا اسباب ہیں؟ چنانچہ ہماری سیاسی آپ بیتیاں اس ضمن میں درج زیل تین عناصر کی نشان دہی کرتی ہیں۔

(الف) سیاست میں فوج کا عمل دخل:

سیاست میں فوج کا عمل دخل وہ کھلا راز ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔اِس مملکت کی عمر ستر سال سے زیادہ ہے لیکن اِس پر آدھے سے زیادہ عرصہ فوج برسرِاقتدار رہی اور بقیہ وقت درپردہ نام نہاد منتخب حکومتوں کو کٹھ پتلیوں کی طرح نچاتی رہی۔جس حکمران نے خودسری کا مظاہرہ کیا،اُن کا بھیانک انجام ہوا:

''پاکستان میں سیاسی ادارے کمزور نوعیت کے حامل ہوتے ہیں اور جونہی یہ مزید شکست وریخت کا شکار ہوتے ہیں یہ فوج کو اقتدار پر قبضے کی دعوت دیتے ہیں۔فوج اِس عمل کو عظیم تر مفاد کا نام دے کر اقتدار میں آتی ہے۔ایک بات یاد رہے کہ

جب بھی فوج اقتدار میں شامل ہو جائے تو سیاست کو نقصان تو ہوتا ہی ہوتا ہے خود
اُن کی پیشہ ورانہ زندگی کو شدید دھچکا لگتا ہے۔ پاکستان پر مسلط کی گئی تمام فوجی
حکومتیں تبدیلی کے عمل کو کنٹرول کرنے میں ناکام رہیں اور اُن کا خاتمہ شرمندگی
اور پشیمانی پر ہوا۔" (۹)

ذوالفقار علی بھٹو البتہ سیاست میں فوج کی مداخلت کے عوامل و عواقب کو ایک اور نظر سے دیکھتے اور دکھاتے ہیں:

"جہاں فوجی انقلاب روزمرہ کا معمول بن جائیں نتیجتاً یا علیٰحدگی عمل میں آتی ہے یا
اشتراکی انقلاب رونما ہوتا ہے یا دونوں۔ مشرقی پاکستان کی علیٰحدگی اِس سلسلے کی
واضح مثال ہے۔ افغانستان میں حالیہ انقلاب دوسری مثال ہے۔ بہت سی وجوہات
کی بناپر برصغیر ایک جداگانہ قسم میں آتا ہے۔ اِس کی شریانوں میں قدیم جمہوری
اداروں مثلاً پنچائیت کا خون گردش کناں ہے۔ دوسرا اس کی بے پناہ آبادی ہے۔
تیسرے یہاں عوامی بغاوتیں اور انقلابی تحریکیں آشوک کے زمانے سے چلتی آئی
ہیں۔" (۱۰)

(ب) نوکر شاہی:

نوکر شاہی انگریزی لفظ بیوروکریسی (Bureaucracy) کا اردو مترادف ہے۔ ڈاکٹر محمد احمد قادری کے نزدیک:

"وہ ریاستی ادارہ جو اپنے کردار کے ذریعے مؤثر انتظامی اُمور سرانجام دے رہا ہو
کو عرفِ عام میں بیوروکریسی کہتے ہیں۔" (۱۱)

ترقی پذیر ممالک میں فوج کے بعد نوکر شاہی کا ادارہ ہی ایک ایسا ادارہ ہے جو بہترین طریقے سے منظم اور مؤثر ہوتا ہے۔ اس لیے بیوروکریسی ریڑھ کی ہڈی کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ پاکستان جیسے ملک میں پالیسی بنانا اور نافذ کرنا، نظم و نسق کا قیام اور سیاسی جماعتوں کی اعانت کرنا بیوروکریسی کے فرائض میں شامل ہے۔ ضلع کا انتظامی آفسر ڈپٹی کمشنر بیوروکریسی کا نمائندہ ہے اور حکومت کے تمام تر وسائل اور اختیارات اُس کے پاس ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک میں بیوروکریسی کی طاقت کا اندازہ اِس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ملکی سیاست میں اہم کردار ادا کرنے والے غلام محمد، چوہدری محمد علی، سکندر مرزا، غلام اسحاق خان سب بیوروکریٹ تھے۔ پاکستان میں آزادی کے پہلے پچاس برسوں میں سارا عرصہ فوج یا بیوروکریسی کا تسلط رہا۔

یہی وہ عہد تھا جس میں تمام اداروں اور سیاست کو اپنا رُخ متعین کرنے کا موقع ملا۔اِس پس منظر میں دیکھا جائے تو ہمارا ورثہ حقیقی مفہوم میں فلاحی اور جمہوری نہیں۔اِس سلسلے میں جاوید ہاشمی اپنی آپ بیتی میں ملکی تاریخ کے ماضی، حال اور مستقبل میں نوکر شاہی کی جڑیں یوں تلاش کرتے ہیں:

''اپنی تاریخ کے صفحات پر نظر ڈالیں تو صاف پتہ چلتا ہے کہ تمام قومی اسمبلیاں بیوروکریٹس سیاستدانوں نے توڑی ہیں جنہیں احتساب کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا، یہ اُن کی تربیت میں شامل ہی نہیں۔ایک سیاستدان میں عوام کا اندرونی خوف موجود ہوتا ہے لیکن بیوروکریٹس عوامی مطالبات سے ناآشنا ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ سٹھ سالوں میں تمام اسمبلیاں صحیح المزاج سیاستدانوں کے ہاتھوں نہیں اُن سرکاری افسران کی وجہ سے اپنے انجام کو پہنچیں جو نوکر شاہی کا پس منظر رکھتے تھے۔'' (۱۲)

بیوروکریسی عوام کی خدمت کے لیے بنی ہے اور عوام کے ٹیکس کے پیسوں سے چلتی ہے لیکن یہ ادارہ خود کو اعلیٰ و ارفع اور ہر قسم کے احتساب سے بالا سمجھتی ہے۔ عوام کا کیا پوچھنا یہ عوام کے منتخب نمائندوں اور وزیروں مشیروں کو درخورِاعتنا نہیں سمجھتی۔ تقریباً تمام سیاستدان نوکر شاہی سے نالاں رہتے ہیں۔ محترمہ بشریٰ رحمٰن کی آپ بیتی ''لکھی کو کون موڑے'' سے وفاقی اور صوبائی سیکرٹریوں کی طاقت، منہ زوری، بداخلاقی اور سازشی ذہنیت کی وضاحت اچھی طرح ہو سکتی ہے۔ بشریٰ صاحبہ نے لکھا ہے کہ کس طرح وزارت حج و مذہبی اُمور کا وفاقی سیکرٹری اُن کے پاسپورٹ پر حج ویزہ لگوانے سے پس و پیش کر رہا تھا اور آخر تنگ آکر آپ نے خود اُس کے آفس کے دروازے پر دستک دی۔ جب کسی سیکرٹری کا ایک وفاقی وزیر کے ساتھ یہ رویہ ہو وہ عام لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہوگا:

''میں نے دروازے کو دھکا دیا۔ دروازہ کھل گیا۔ میں اندر داخل ہو گئی۔ دیکھا باریش وفاقی سیکرٹری اپنے ایک دوست کے ساتھ چائے پی رہے تھے۔ پیسٹری کھا رہے تھے اور گپ لگا رہے تھے۔ مجھے یوں سامنے دیکھ کر اُن کا چہرہ غصے سے لال ہو گیا۔ نہ وہ استقبال کے لیے کھڑے ہوئے اور نہ اُنہوں نے معذرت کی۔ نہ شرمندگی کا کوئی تاثر اُن کے چہرے پر اُبھرا۔ نہ اُنہوں نے مجھے بیٹھنے کے لیے کہا۔ میں نے کھڑے کھڑے پوچھا۔ سیکرٹری صاحب! یہ کون سی سرکاری اور اہم

میٹنگ ہے جس کی وجہ سے آپ نے اندر آنے پر پابندی لگا رکھی ہے۔ وہ اس طرح بیٹھے بیٹھے بدتمیزی سے بولے۔ میرے دوست مجھ سے ملنے آئے ہیں۔ میں اُن کے ساتھ بیٹھا ہوں۔ ذاتی میٹنگ ہے۔"(۱۳)

(ج) بدعنوانی:

دیگر ترقی پذیر ممالک کی طرح بدعنوانی پاکستان کا بھی اولین مسئلہ رہی ہے۔ بدعنوانی وہ لعنت ہے جو افراد، خاندان، اقوام اور ممالک کو تباہ کر کے رکھ دیتی ہے۔ ہر قسم کی خرابیاں قابل برداشت ہیں لیکن بدعنوانی چاہے وہ کسی قسم یا نوعیت کی ہو ناقابل برداشت جرم ہے۔ ہمارے ہاں بدعنوانی جب سیاست دانوں اور حکمرانوں کی زندگیوں میں آئی تو نہ صرف ہمارا باہر دنیا میں تاثر خراب ہو گیا بلکہ اندرونی لحاظ سے بھی ہم خوفناک بحرانوں کی زد میں آئے۔ بدعنوانی کے نتیجے میں ماضی میں کئی حکومتیں ختم ہوئی ہیں۔ حالیہ زمانے میں جب تعلیم کی شرح بلند ہوئی، لوگوں میں شعور آیا، میڈیا نے کھل کر اِس قبیح مسئلے کو موضوع بنایا تب تمام لوگوں کی توجہ اِس طرف مبذول ہو گئی بلکہ جن لوگوں نے بدعنوانی کے خلاف آواز اُٹھا کر اِسے ختم کرنے کا پروگرام دیا عوام نے اُنہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے سیاستدانوں نے بھی اپنی سوچ، عقل، معلومات اور فہم کے مطابق اپنی آپ بیتیوں میں بدعنوانی پر بات کی ہے اور اِس کے خراب اثرات اور سیاست پر اِس کے پڑنے والے بھیانک نتائج پر اپنے تجربات رقم کیے ہیں۔ عمران خان "میں اور میرا پاکستان" میں کرپشن کی وجوہات اور نقصانات کا خلاصہ یوں نکالتے ہیں:

> "۱۹۹۰ء کے عشرے میں پاکستانی ملک کے دگرگوں حالات کے ہاتھوں قنوطیت کا شکار ہونے لگے۔ ملک میں افراتفری اور بدعنوانی بڑھتی چلی گئی۔ تقریباً ہر بڑا قومی ادارہ تباہ کر دیا گیا۔ زندگی کے ہر شعبے میں ایوان وزیراعظم سے وزراء تک، وزراء سے ارکان پارلیمنٹ اور افسر شاہی سے پولیس اور عدالتوں تک کرپشن کینسر کی طرح پھیل گیا۔ ۱۹۹۰ء کی ایک شام اُس وقت کے پنجاب کے ایک آئی جی پولیس عباس نے مجھے بڑی رازداری سے بتایا کہ ۲۵۰۰۰ پولیس والوں کو سفارش پر بھرتی کیا گیا ہے اور اِن میں سے بعض جرائم پیشہ ہیں۔ محکمہ پولیس کو جان بوجھ کر تباہ کیا گیا تاکہ وہ الیکشن جیتنے اور مخالفین کی زندگیاں حرام کرنے کے کام آئیں۔ معاشرے کا اخلاقی پیراہن ادھیڑ

دیا گیا چنانچہ ۱۹۹۶ء میں ٹرانسپرنسی انٹرنیشنل نے ۲۸ ممالک کے مقابلے میں
پاکستان کو دنیا کا دوسرا سب سے کرپٹ ملک قرار دیا۔'' (۱۴)

پرویز مشرف بنیادی طور پر سیاستدان نہیں تھے بلکہ ایک سیدھے سادھے فوجی تھے۔ پہلی مرتبہ اقتدار میں آنے کے بعد اُس نے ملک کے اِداروں میں بدعنوانی کو دیکھ کر کیا نتیجہ نکالا اُن کے الفاظ میں:

''ملک کی اقتصادی حالت خراب اور دیوالیہ پن کے نزدیک تھی۔ برسوں سے ہمارے لیڈروں نے کسی قدغن کے بغیر ملک کو بہت بُری طرح اور بغیر کسی فکر کے چلایا تھا۔ کرپشن اور اقربا پروری عام تھی۔ تمام حکومتی ادارے اور سرکاری کمپنیاں نااہل سربراہوں اور ڈائریکٹروں کی تقرری کی وجہ سے کرپشن کا شکار تھیں۔ کرپشن اعلیٰ سطح سے نیچے کی طرف چلتی تھی۔ میں نے تجربے سے یہ سیکھا ہے کہ پاکستان میں کسی بھی محکمے میں ۱۰ فیصد لوگ انتہائی دیانتدار ہیں۔ دس فیصد انتہائی بے ایمان اور ۸۰ فیصد یہ دیکھتے ہیں کہ ہوا کس رُخ پہ چل رہی ہے اور اسی طرح اپنے آپ کو ڈھال لیتے ہیں۔ ۹۰ کی دہائی میں ہماری سرکاری کمپنیوں کے اعلیٰ عہدیدار اُنہیں لوٹنے اور تباہ کرنے میں مصروف تھے۔'' (۱۵)

صحت اور تعلیم کے ادارے کسی بھی ملک میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر محکمہ تعلیم کو کرپشن کا ناسور لگ جائے تو سارا بدن ڈھ جاتا ہے اور نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ ٹیکسٹ بک بورڈ نئی نسل کو نصاب بناتا ہے اور اُس کے تناظر میں نسلیں پروان چڑھتی ہیں۔ جب نصاب سازی کے ادارے بھی بدعنوان ہو جائیں تو پھر ہر شعبہ زندگی میں تباہی و بربادی اُس قوم کی مقدر ہو جاتی ہے۔ شیخ رشید نے اپنی آپ بیتی میں اِس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے:

''ٹیکسٹ بک بورڈ اِس ملک کا ایک کرپٹ ادارہ ہے۔ اِس میں لوگ سوچی سمجھی سازش کے تحت رشوتیں لے کر اپنی کتابیں لگوا لیتے ہیں اور لاکھوں کی تعداد میں یہ ایڈیشن سکولوں میں بِک جاتے ہیں۔ ذرا تصور کیجئے جب نونہال قوم اِس قسم کے نصاب سے آگے آئیں گے تو آپ یہ گلہ کیوں کریں گے کہ ہمارا منسٹر نالائق، ہمارا ڈاکٹر نالائق، ہمارا پروفیسر نالائق، ہمارا جج نالائق اور ہمارا انجینئر اُلو ہے۔''(۱۶)

۳۔ صداقت اور واقعیت:

خود نوشت نگار خود اپنی زندگی کے ساتھ ساتھ اِرد گرد لوگوں کی شخصیت اور کردار پر بھی روشنی ڈالتا ہے اور اپنے دوست احباب کے علاوہ اپنے ہم منصب اور ہم پیشہ لوگوں کے ساتھ اپنے تعلقات کی وضاحت اِس انداز سے کرتا ہے کہ اِس سے خود نوشت نویس کی شخصیت اور حالات زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے اور اُس عہد کی بے شمار سچائیاں اور صداقتیں منظر عام پر آتی ہیں۔ ہم مشرقی معاشرے میں رہنے والے لوگ ہیں یہاں مغرب کی طرح ہر بات یا واقعہ کھل کر اور آزادی کے ساتھ بیان نہیں کیا جاتا۔ مصنف چھوٹی چھوٹی اور معمولی باتوں میں بھی مکمل احتیاط کرتے ہیں اس لیے زیادہ تر سچائیاں لوگوں کی نظروں سے چھپ جاتی ہیں۔ چونکہ واقعات مکمل صداقتوں سے منظر عام پر نہیں آتے اس لیے ادبی اور سیاسی تاریخ ادھوری رہتی ہے جس کے نتیجے میں نہ صرف تاریخی مغالطے وجود میں آتے ہیں بلکہ شخصیت پرستی کا خوفناک رجحان بھی بڑھ جاتا ہے۔ ایسے کتنے افراد ہیں جنہوں نے منافقت کے لبادے اوڑھ رکھے ہیں۔ دنیا کو روشنی عطا کرنے والے اور نوجوانوں کی فکری اصلاح کرنے والے ذاتی زندگیوں میں کتنے تاریک باطن اور فکری لحاظ سے کتنے منتشر تھے۔ اگر یہاں سچ رقم کرنے، سچ بولنے اور سچ برداشت کرنے کا حوصلہ ہوتا تو خود نوشت نگاروں کی صداقت اور سچائی سے کتنے ایسے مشاہیر کی عظمت کے بلند و بالا مینار دھڑام سے زمین بوس ہو جاتے۔ افسوس کہ مشرقی حیاداری نے ایسے ایسے شخصیات کے گرد تقدس کا ہالہ گھوما یا جو ذاتی زندگیوں میں زاہد خشک نہیں رندِ خراب تھے۔ مشرقی آپ بیتیوں میں اخفا اور پردہ رکھنے کی روش کا جواز بشری رحمٰن یوں پیش کرتی ہیں:

> ''میں نے واقعات کو پوری سچائی کے ساتھ نہیں لکھا۔ بعض قبیح واقعات حذف کر دیئے گئے ہیں۔ خاص طور سے بعض خواتین کے حوالے سے۔ میں لوگوں کی عیب گننے نہیں گئی تھی نہ اُن کا اعمال نامہ کھول کر سامنے رکھنا چاہتی تھی۔ ذرا ذرا سے اشارے کر کے میں آگے گزر گئی۔ اکثر قارئین نے یہ پوچھا میں نے بعض ایسے لوگوں کے نام لکھنے سے گریز کیوں کیا ہے۔ لحاظ کے مارے، معلوم نہیں۔ وہ حیات ہیں۔ کس عمر میں ہیں۔ اُن کو یا اُن کی اولادوں کو ان باتوں سے شرمسار نہ ہونا پڑے۔'' (۱۷)

ذاتی، پرائیویٹ اور انتہائی نجی واقعات میں تو خیر ہے اگر آپ نے کسی کی پردہ داری رکھی لیکن عام اور معمولی واقعات کو صیغہ راز میں رکھنا، ہر آدمی کو پارسا ثابت کرنا، ہر کسی کے بارے میں اچھا گمان رکھنا اور واقعات کی تفصیل میں جان بوجھ کر

صداقت جھٹلانا تاکہ لوگ ناراض نہ ہوں پڑھنے والوں کے ساتھ سراسر ناانصافی ہے۔ البتہ اُردو کی ایک اور مصنفہ، شاعرہ اور خودنوشت نگارہ کی آپ بیتی ''کشور ناہید کی نوٹ بک'' پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر مسرت بانو صاحبہ نے لکھا:

> ''اِن یادداشتوں سے پتہ چلتا ہے کہ کشور ناہید ایک نڈر اور بے باک خاتون ہیں۔ وہ منہ پھٹ ہونے کی حد تک ایک صاف گو انسان ہیں اور واقعیت و حقیقت نگاری کے سلسلے میں کسی معروف ہستی کے مقام و مرتبے اور مقبولیت کو خاطر میں لانے کی روادار نہیں ہیں۔ زندہ اور مقتدر لوگوں کے بارے میں بے لاگ رائے دینا کشور کا حوصلہ ہے۔'' (۱۸)

تاہم یہ ایک دوسری حد ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ اردو کے بہت کم خودنوشت نگاروں نے درمیان کا راستہ چنا ہے۔ اکثر افراط و تفریط کا شکار ہو گئے ہیں۔ پھر سیاسی یادداشتیں لکھنے والوں نے تو اکثر موقعوں پر سچائی سے پہلو تہی کی ہے۔ حق گوئی کی جسارت کم لوگ کر سکتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جہاں اور جس کے بارے میں سچ لکھنا مقصود ہو وہاں سیاست دانوں نے اخفا سے کام لیا ہے جبکہ غیر ضروری مقامات پر حق گوئی دیکھائی ہے۔ جتنی سیاسی یادداشتیں ہمارے سامنے ہیں اُن میں بہت کم آپ بیتیاں اِس اُصول پر پورا اُترتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض سیاستدانوں نے بڑی جرأت کے ساتھ سچائیاں بھی قلم بند کی ہیں۔ شیخ رشید احمد ایک جگہ چند سیاستدانوں کے باقاعدہ نام لے کر اُن کی خصلتیں بیان کرتے ہیں۔ کوئی دوسرا سیاستدان ہوتا تو سرے سے واقعہ تحریر نہ کرتا۔ اگر زیادہ ضروری سمجھتا تو ناموں کی جگہ نقطے لگاتا:

> ''میں نے نواز شریف کی قربت میں دو افراد ایسے دیکھے ہیں جو ٹکٹ لینے کے لیے ۹۰ کے زاویے سے پاؤں پڑتے ہیں اور امتحان کا وقت آنے پر آنکھ نہیں ملاتے۔ اُن میں ایک راؤ خضر حیات ہیں اور دوسرے سردار آصف احمد علی۔ دونوں کا تعلق قصور سے ہے۔'' (۱۹)

جنرل پرویز مشرف کی آپ بیتی ''سب سے پہلے پاکستان'' میں یہ خصوصیت خاص طور پر نوٹ کی گئی کہ وہ اکثر حقیقت بیان کرتے ہیں۔ تمام فوجی آفیسر پرائیویٹ محفلوں میں اپنے ادارے ''فوج'' کے بارے میں سخت الفاظ کہتے ہوں گے لیکن عام لوگوں کے سامنے فوج میں موجود بے قاعدگیوں کے بارے میں لب کشائی نہیں کرتے۔ پھر تحریری طور پر تو اِس بات کا سوال بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ پرویز مشرف نے اپنے ادارے میں موجود ناانصافیوں، قربت داریوں اور پسند کی ترقیوں کو موضوع بناتے ہوئے بڑے تلخ حقائق بیان کیے ہیں:

"میں لیفٹیننٹ جنرلوں کی امتیازی فہرست میں تیسرے نمبر پر تھا اور اِس کی وجہ سابق آرمی چیف جنرل وحید کاکڑ کی وہ کاروائی تھی جو اُنہوں نے علی قلی خان کو سر فہرست رکھنے کے لیے کی جنہیں وہ ترقی دینا چاہتے تھے۔ اگر یہ ناانصافی نہ ہوتی تو میں اوّل ہوتا اور علی قلی آرمی چیف بننے کا وقت آنے سے پہلے ہی اپنی سروس کی مدت پوری کر کے ریٹائرڈ ہو چکے ہوتے۔" (۲۰)

ہمارے معاشرے میں عورت خواہ کسی بھی منصب پر پہنچ جائے لیکن اپنے خاوند کے متعلق بڑی محتاط ہوتی ہے۔ اُن پر ہمیشہ گہری نظر رکھتی ہے اور اِس بارے میں کافی حساس واقع ہوئی ہے۔ اِس طرح جب عورتیں کبھی مل بیٹھیں تو وہ اپنے احساسات اور کیفیات ایک دوسرے کے ساتھ بیان کرتی ہیں۔ جنرل ضیاء الحق کی بیوی بیگم شفیقہ ضیاء الحق بڑی سنجیدہ اور مشرقی روایات کی پیکر تھی۔ وہ اپنے خاوند کے بارے میں کتنی محتاط تھیں۔ بیگم عابدہ حسین "اور بجلی کٹ گئی" میں اس حقیقت کی نشاندہی کرتی ہیں:

"لیکن ملتانی عورتیں بہت خطرناک ہیں۔ کیا آپ کو اپنا شوہر اِس شہر میں اکیلا چھوڑ کر خوف نہیں آتا؟ بیگم صاحبہ نے ہمدردی سے پوچھا۔۔۔۔ آپ جانتی ہیں کہ اگر مجھے محسوس ہوا کہ فخر امام کسی عورت کو مجھ پر ترجیح دے رہے ہیں تو بھاڑ میں جائیں وہ۔ اپنے طویل جواب کے بعد میں نے سوچا کہ میرا مدعا واضح طور پر بیگم ضیاء تک پہنچ گیا ہو گا اور اُن کا تجسس دُور ہو گیا ہو گا۔ اُن کا جواب میرے لیے حیران کن تھا۔ جب کنٹونمنٹ کی بیویاں مجھ سے کہتی ہیں کہ اپنے شوہر کو اکیلے سفر نہ کرنے دوں تو میں بھی اُنہیں یہی کہتی ہوں کہ اگر میرا مرد بے وقوفی میں اپنے بچوں کی ماں پر کسی عورت کو ترجیح دے تو اُسے ہی نقصان ہو گا اور پچھتائے گا۔ میں شفیقہ ضیاء کو پسند کیے بغیر نہ رِہ سکی۔" (۲۱)

راجہ انور مشور سیاسی رہنما اور پیپلز پارٹی کے بانی ارکان میں سے تھے۔ اُس نے جیل میں جنرل ایوب خان کے ایک کاروباری منیجر سے ملاقات کی۔ اس ملاقات میں اُس نے جنرل ایوب کے بارے میں جو انکشافات کیے، اُس سے سابق صدر کی شخصیت کا ایک نیا اور بالکل الگ پہلو سامنے آتا ہے۔ لوگ اُنہیں ایک مثالی اور ہر قسم کی بدعنوانی سے پاک شخص بتاتے ہیں لیکن "راجہ انور" اُن کی شخصیت کو اور طرح سے بے نقاب کرتے ہیں:

''چاچاجی (ایوب خان کے مینجینگ ڈائریکٹر) نے بتایا کہ جنرل ایوب کی زمینوں سے پیدا ہونے والی گندم محکمہ زراعت ۵۰ روپے من کے حساب سے خریدتا تھا (یاد رہے کہ اُس زمانے میں عام گندم ۵ تا ۷ روپے فی من تھی)۔ جنرل کو خوش رکھنے کے لیے لاکھوں روپے قوم کے ضائع ہوئے۔ خوشامدی یہ کہتے نہ تھکتے حضور جو خوشہ گندم آپ کی زمینوں میں اُگتا ہے وہ دنیا بھر میں بے مثال ہے۔ چاچا نے مزید بتایا کہ سابق صدر کے باغات سے ہر سال لاکھوں روپے کا فروٹ بکتا تھا۔ ملک کے بڑے بڑے سیٹھ، سرمایہ دار اور مراعات یافتہ لوگ محض ان کی خوشنودی کی خاطر پچاس پچاس ہزار کے مالٹے خریدتے۔ اُنہوں نے کچھ افراد اور کمپنیوں کے نام بھی بتائے۔۔۔۔۔'' (۲۲)

مشرقی اور مغربی پاکستان کے سیاسی رہنماؤں کے درمیان شدید اختلافات ابتدا سے موجود تھے حالانکہ اُن کا تعلق ایک ہی سیاسی پارٹی آل انڈیا مسلم لیگ سے تھا۔ اِس بات سے قائدِاعظم محمد علی جناح بھی مضطرب تھے۔ بعد میں یہی اختلافات بڑے سیاسی رہنماؤں سے عام عوام تک آپہنچے۔ اگر یہ اختلافات ابتدا ہی میں روک لیے جاتے تو وہ عظیم حادثہ درپیش نہ ہوتا جو آج تاریخ میں سقوطِ ڈھاکہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ کڑوا حقیقت ہمارے سیاسی خود نوشت نگار اِس طرح پیش کرتے ہیں:

''یہ آغاز ۱۹۵۱ء کی بات ہے۔ وزیراعظم لیاقت علی خان مدرستہ اللبنات گرلز ہائی سکول کے سامنے اولڈ پنجاب یونیورسٹی گراؤنڈ میں ایک عوامی جلسے سے خطاب کر رہے تھے۔ میں بھی اپنے کچھ دوستوں کے ہمراہ اُن کی تقریر سُن رہا تھا۔ وہ اپنی تقریر میں بار بار آل انڈیا مسلم لیگ کے رہنما حسین شہید سہروردی کے لیے سیاسی یتیم کا لفظ استعمال کر رہا تھا۔ شاید ہی آج کسی کو اِس واقعے کا علم ہو لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے عوام کے دِلوں میں نفرت کے بیج عین اس زمانے سے بونا شروع کر دیئے گئے تھے۔'' (۲۳)

۴۔ سماجی اور معاشرتی تبدیلیاں:

ہم اکیسویں صدی میں رہنے والے انسان ہیں جو تاریخِ انسانی کی سب سے ترقی یافتہ صدی ہے۔ یہ تغیرات،

انقلابات، تعمیر، اصلاح، نشو و نما اور فکری آزادی کی صدی ہے۔ سائنسی کمالات اور حیران کن ایجادات نے زندگی کے ہر شعبے میں انقلاب برپا کر دیا ہے۔ پرانے زمانے میں تاریخ دائرے میں حرکت کرتی تھی۔ سائنس کی ترقی سست رفتار تھی اور ٹیکنالوجی نے ابھی زندگی کو اپنی گرفت میں نہیں لیا تھا اِس لیے سماجی تبدیلیاں کافی وقت لیتی تھیں۔ معاشرتی تغیرات، سماجی تبدیلیاں، ثقافتی ترقی اور اقتصادی برتری کا زیادہ دار و مدار نئی ایجادات سے ہے۔ سائنس نے سب سے اہم کام یہ کیا کہ انسانی فکر کو ہر قسم کے توہمات اور پابندیوں سے آزاد کرایا۔ جوں ہی انسانی سوچ معاشرتی قدغنوں سے آزاد ہوئی دنیا نے رفتار پکڑلی۔ یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا دنیا کی تمام سماجی تبدیلیاں مثبت انداز سے ظہور پذیر ہو رہی ہیں؟ اِس کا جواب یقیناً نفی میں ہے ہر ایجاد اور ہر سائنسی آلہ معاشرے پر مثبت اور منفی دونوں طرح کے اثرات مرتب کرتا ہے۔ یہاں ایک اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے دانشور، مذہبی پیشوا، سیاسی رہنما اور حکمران معاشرتی تبدیلیوں کو کس زاویے سے دیکھتے ہیں؟ سیاستدانوں کی آپ بیتیوں پر دورانِ تحقیق معلوم ہوا کہ ہمارے سیاستدان اپنی تہذیب و ثقافت کا مکمل شعور رکھتے ہیں۔ سماجی تغیرات پر اُن کی گہری نظر ہے اور وہ اپنے تغیر پذیر سماج سے پریشان و فکر مند بھی ہیں نیز اُنہیں اپنی ثقافت کے اچھے خصوصیات کو محفوظ رکھنے کا شعور بھی ہے۔ اِن یادداشتوں میں تاریخ و سیاست، تہذیبی و ثقافت، زبان و ادب اور سماجی تغیر و تبدّل کے مختلف پہلو عیاں ہوتے ہیں جن کی روشنی میں ہمارے سیاستدانوں اور حکمرانوں کے مزاج اور شخصیت کے مختلف رنگ بھی منعکس ہوتے ہیں۔

ہماری معاشرتی تاریخ میں ایک دور ایسا بھی گزرا ہے۔ جب ہمارے سارے فیصلے جرگے یا پنچائیت کے زریعے ہوتے تھے۔ لوگ اپنے چھوٹے بڑے مسئلے جرگے کے سامنے پیش کرتے اور پھر بڑے بڑوں کے فیصلوں کو دِل سے تسلیم کرنا پڑتا تھا۔ بڑوں کا احترام تھا۔ حجرے اور چوپال کمیونٹی سنٹر کا کردار ادا کرتے تھے۔ چھوٹے بڑوں سے سیکھتے اور تہذیب و ثقافت ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتی مگر اب حالات بدل چکے ہیں۔ جدید دور کے انسان ایک دوسرے سے بیگانہ ہو گئے ہیں۔ اعتزاز احسن معاشرتی ترقی سے تقریباً مایوس ہیں۔ وہ اپنی آپ بیتی میں اِس بات کا رونا روتے ہیں:

> ''دنیا کہاں سے کہاں جا پہنچی اور ہم کہاں بھٹک رہے ہیں۔ آج علم اور ایجادات کی روشنی کا یہ حال ہے کہ ہزاروں کلو میٹر دُور ایک باولر برق رفتاری سے گیند پھینکتا ہے اور ہم اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر ٹیلی ویژن سکرین پر بال کی سلائی کے بخیے تک دیکھ سکتے ہیں۔ ہم سُنی ، وہابی، دیوبندی، بریلوی، شیعہ کی بحثوں میں اُلجھے ہوئے ہیں۔ یہ کافر وہ گستاخ اور واجب القتل۔'' (۲۴)

البتہ یوسف رضا گیلانی کا خیال ہے کہ جب ہم نے پنچائتی نظام چھوڑ دیا تو عدالتوں میں مقدمات کے انبار لگے:

> ''معاشرتی ناہمواریوں نے ہمارے معاشرے کو اندر سے کھوکھلا کر دیا ہے۔ پہلے تو لوگوں کی سماجی رُتبے اور اقتصادی تفاوت زیادہ نہ تھا۔ لوگوں میں معاشرتی لحاظ سے بہت کم فرق تھا مگر اب یہ فرق بڑھتا بڑھتا خلیج کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ مقامی سطح پر جب سے پنچائتی نظام کی کمی آئی ہے۔ مقدمات کی بھرمار اور عدالتی معاملات میں تاخیر واقع ہو گئی ہے۔'' (۲۵)

ہر معاشرے کے اپنے اُصول، خصوصیات اور خدوخال ہوتے ہیں جو وقت کے ساتھ ساتھ اُس معاشرے کی پہچان بن جاتے ہیں۔ جو رسوم و رواج زمانے کے ساتھ نہیں چل سکتے۔ معاشرے کے لوگ اُنہیں چھوڑ کر نئے رواج اپناتے ہیں جس معاشرے میں مثبت تبدیلیوں کو جلد اپنانے کی صلاحیت ہو وہ معاشرہ زیادہ دیر تک زندہ رہ سکتا ہے جو قوم یا معاشرہ اپنی شدت پسندی کی وجہ سے اپنے فرسودہ خیالات وافکار کو سینے سے لگائے رکھے وہ معاشرہ تاریخ کے شاہراہوں میں کہیں گم ہو جاتا ہے۔ پنجاب کے سابق گورنر اور پاکستان پیپلز پارٹی کے رہنما محمد حنیف رامے اِس معاشرتی پہلو پر اِس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

> ''قوموں، قومیتوں اور معاشروں کا کوئی مخصوص یا اٹل مزاج نہیں ہوا کرتا اگر ایسا ہوتا تو نسل پرستی کا جواز پیدا ہو جاتا جو ایک غیر انسانی اور غیر اسلامی تصور ہے۔ قومیں اور قومیتیں تاریخ کے مختلف ادوار میں اور نشوونما کے مختلف مدارج پر کچھ رویوں اور رجحانات کو اپنا لیتی ہیں۔ وہ قومیں اور قومیتیں جنہیں زندگی کے سفر میں نت نئی للکاریں درپیش ہوں، صحت مند رویوں اور رجحانات کو مستحکم کرتی چلی جاتی ہیں اور غیر صحت مند رجحانات و رویوں سے چھٹکارا حاصل کر لیتی ہیں جو معاشرے ایسا نہیں کر پاتیں وہ پورس کے ہاتھیوں کی طرح اپنے آپ کو ملیامیٹ کر لیتی ہیں۔'' (۲۶)

مزکورہ سیاسی آپ بیتیوں میں ہمارے سیاستدانوں نے نجی معاملات، گھریلو ذمہ داری، ازدواجی زندگی اور زندگی کے مختلف گوشوں پر بھی قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اِن لوگوں نے اپنی آپ بیتیوں میں زندگی کے بعض ایسے واقعات بھی بیان کی ہیں جن کا ذکر ہمیں کہیں اور نہیں ملتا۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں اہل وطن کا جوش و خروش

ہو یا ۱۹۷۱ء کی جنگ ہو، پاکستان میں بین الاقوامی اسلامی سربراہی کانفرنس کا انعقاد ہو یا ضیاء الحق کے زمانے میں رقص و موسیقی اور دیگر فنون لطیفہ پر سنسر کے احکامات، ۱۹۹۰ء کی دہائی میں بدترین سیاسی کشمکش ہو یا افغان جنگوں کی تفصیلات، دہشت گردی اور اِس کے نتیجے میں ہونے والی خوفناک تباہی ہو یا ہمارے خاندانی نظام کی ٹوٹ پھوٹ جیسے موضوعات غرض اپنے زمانے کی تمام تر تاریخی، سماجی، سیاسی اور دیگر سرگرمیوں کو ان آپ بیتیوں میں سمیٹ دیا گیا ہے۔

۵۔ انکشافات:

ہمارے سیاستدانوں نے اپنی ذات، اپنے اِرد گرد کے لوگوں، نامور شخصیات اور اہم قومی واقعات کے بارے میں بعض ایسے انکشافات بھی کیے ہیں جس سے اُن کی آپ بیتیوں میں کشش اور جاذبیت کے عناصر پیدا ہو گئے ہیں۔

سیاستدانوں میں عمران خان وہ سیاستدان ہیں جس نے زیادہ انکشافات کیے ہیں۔ وہ روایتی سیاستدانوں کی طرح گھما پھیرا کر بات نہیں کرتا بلکہ جو واقعہ جس طرح اُن کے تجربے اور مشاہدے میں آیا ہے اُسی طرح بیان کیا ہے۔ عمران خان نے اپنی آپ بیتی میں بتایا ہے کہ ہمارے ملک میں سیاستدانوں پر امریکہ کا دباؤ ہوتا ہے حتیٰ کہ عام انتخابات میں حصہ لینے یا نہ لینے کا فیصلہ بھی وہ بیرونی طاقتوں کی منشا کے مطابق کرتے ہیں۔ چنانچہ ۲۰۰۸ء کے عام انتخابات کے بارے میں عمران خان یہ انکشاف کرتے ہیں:

> ''مجھے یاد ہے کہ اے پی ڈی ایم (آل پارٹی ڈیموکریٹک الائنس) کے ایک اجلاس کے دوران وہ (نواز شریف) برطانوی وزیر خارجہ کا فون سننے کے لئے ۴۰ منٹ تک غائب رہے۔ اے پی ڈی ایم میں شامل باقی جماعتوں کی اکثریت نے اپنے فیصلے پر قائم رہتے ہوئے انتخابات کا بائیکاٹ کیا تاہم عوامی نیشنل پارٹی کے قائد اسفند یار ولی کو بھی امریکی دورے کے دوران الیکشن لڑنے پر مائل کیا گیا۔''(۲۷)

۲۰۰۷ء میں فوج نے اسلام آباد کی لال مسجد میں کاروائی کی تھی جس میں مدرسے میں محصور طالبعلم جان بحق ہو گئے تھے۔ اِس واقعے کے بارے میں کئی طرح کی کہانیاں مشہور ہیں۔ آپریشن کے بعد کسی صحافی یا فلاحی کارکن کو مسجد کے قریب جانے کی اجازت نہیں تھی۔ سارا آپریشن فوج کی نگرانی میں کیا گیا۔ آج تک آپریشن کے اصل حقائق اور مرنے والوں کی صحیح تعداد تک کسی کی رسائی نہیں ہو سکی۔ البتہ ہماری آپ بیتیوں میں درست اندازے تک پہنچا جا سکتا ہے۔ عمران خان لال مسجد آپریشن کی حقیقت یوں طشت از بام کرتے ہیں:

> ''چوہدری شجاعت حسین نے وزیراعظم شوکت عزیز کو فون کیا تو پتہ چلا کہ موصوف شب دو بجے خاندان کے ساتھ قلفی نوش فرمانے تشریف لے جا چکے

ہیں۔اِس واقعے کا ذکر ہو تو چوہدری شجاعت جذباتی ہو جاتے ہیں،آنسو کے ساتھ رو دیتے ہیں۔ اب بھی اُن طالب علموں کے چہرے اُنہیں دکھائی دیتے ہیں جنہیں زندہ جلا دیا گیا۔ کوئی نہیں جانتا کہ اِس کے بعد جو تباہی آئی اُس میں کتنی جانیں گئیں۔ حکومت کا دعویٰ ہے کہ سو کے قریب دہشت گرد اور طالب علم جان بحق ہوئے۔ جماعت اسلامی کے رہنما قاضی حسین احمد کے مطابق مرنے والوں کی تعداد سات سو سے زائد تھی۔ کوئی تحقیقات نہ ہوئی۔اُس جگہ کو سیل کر کے لاشوں کو بے نام قبروں میں دبایا گیا۔" (۲۸)

عمران خان نے اپنی آپ بیتی میں یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو میں تکبر بہت تھی وہ کسی کا لحاظ نہیں کرتی تھی۔آکسفورڈ میں دونوں ہم جماعت تھے اِس لیے مصنف کو اُنہیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔اِس کے بعد بھی بے نظیر کو آپ نے مختلف ضیافتوں میں دیکھا۔ وہ اُن کے بارے میں یہ انکشافات کرتے ہیں:

"وہ (بے نظیر بھٹو)ایک ملکہ جیسی زندگی گزار رہی تھی میں نے اُنہیں شاہانہ بلکہ شہنشاہانہ انداز کا حامل پایا۔وہ پُر شکوہ انداز میں بات کرتی تھیں اور اپنے لیے میں کی بجائے ہم کہہ کہتیں۔ ۱۹۷۴ء میں نیدرلینڈ کے سفارتخانے میں پاکستانی کرکٹ ٹیم کے اعزاز میں دی گئی ایک ضیافت مجھے یاد آتی ہے۔ ۲۰ سال کی یہ محترمہ ایک جہاندیدہ سفیر کو اس طرح حکم پہ حکم دے رہی تھیں جیسے وہ اُن کا ذاتی ملازم ہو۔"(۲۹)

مولانا کوثر نیاز نے اپنی آپ بیتی میں جہاں اور کئی انکشافات کیے ہیں وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو، غلام اسحاق خان سے ہمیشہ نالاں رہتے تھے۔ وہ اِس لیے کہ ذوالفقار علی بھٹو کو صاف گو لوگ پسند نہیں تھے۔ اُنہیں خوشامدی اور چاپلوس افراد اچھے لگتے تھے۔ غلام اسحاق خان جو اُس وقت وفاقی سیکرٹری دفاع جیسے اہم منصب پر تھے۔ دوسری بات یہ کہ بھٹو صاحب کو شک تھا کہ غلام اسحاق خان حکمرانوں کی کمزوریوں سے فوج کو آگاہ کرتے رہتے ہیں۔اِس شک کو تقویت اُس وقت ملی جب جنرل ضیاء الحق نے غلام اسحاق خان کو سینٹ کا چیئرمین بنایا۔ کوثر نیازی صاحب غلام اسحاق خان کے حوالے سے یہ دلچسپ انکشاف کرتے ہیں:

"غلام اسحاق خان سے بھٹو کی کبھی نہیں بنی۔ مجھے وہ اجلاس یاد ہے جس میں دیر کے لوگوں کے خلاف آرمی ایکشن پر غور و خوض ہوا۔ صوبوں کے گورنر بھی موجود

تھے۔ جنرل فضل حق علاقے کے کور کمانڈر تھے۔ اُس وقت بھی دبنگ آدمی تھے۔
اُنہوں نے بریفنگ دی۔ سب نے باری باری اظہارِ خیال کیا۔ غلام اسحاق خان کی
باری آئی تو اُنہوں نے کہا میں اِس آپریشن سے اتفاق نہیں کرتا۔ بھٹو صاحب کو
حکومت کے ایک سیکرٹری کی طرف سے کھلم کھلا اِس طرح کا اختلاف اچھا نہ لگا۔
اُنہوں نے کہا جو لوگ حکومت کی پالیسی سے اتفاق نہیں کرتے وہ حکومت میں نہ
رہیں۔ بھٹو صاحب کو قوی یقین تھا کہ غلام اسحاق خان آرمی چیف سے ملتا ہے۔ اب
معلوم نہیں جہاں خان صاحب بیٹھتے وہاں خاص آلات لگتے تھے یا کسی اور ذریعے
سے بھٹو صاحب کو اپنے سیکرٹری کے پَل پَل کی خبر ملتی۔'' (۳۰)

بلوچستان ایک انوکھی سرزمین ہے۔ بلوچ قبائل کی اپنی روایات اور رسوم ورواج ہیں جو سینکڑوں سالوں سے چلے آرہے ہیں۔ نواب اکبر بگٹی، بگٹی قبیلے کے ایک نامور سردار تھے۔ برطانیہ سے جدید تعلیم حاصل کرنے والے اکبر بگٹی پر تعلیم نے کوئی خاص اثر نہیں ڈالا تھا۔ وہ ایک کٹر، سفاک اور شدت پسند بلوچ تھے۔ اپنے رسوم ورواج کا دلدادہ بگٹی حیرت انگیز طور پر ملحدانہ سوچ رکھنے والے شخص تھے۔ وہ کھلے بندوں مذہبی عقائد کا مذاق اُڑاتے۔ حیات بعد از ممات کے متعلق اکبر بگٹی کا کیا عقیدہ تھا ملاحظہ ہو ایک آپ بیتی سے اقتباس:

''میں ایسی باتوں پر یقین نہیں کرتا، نواب اکبر بگٹی نے کہا۔ موت اور موت کے
بعد کیا ہے زمین ہے۔ کیڑے مکوڑے کھا جاتے ہیں لیکن میرا یہ حاجی بھانجا، اُس
نے اپنے بھانجے کی طرف سفاکانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ یہ جنت پر ایمان
رکھتا ہے۔ یہ دو بار حج کر چکا ہے۔ کیا آپ جانتی ہیں جنت میں اس کے ساتھ کیا وعدہ
کیا گیا ہے؟ حوریں، غلمان اور شراب، جسم فروش عورتیں اور چھوٹے لڑکے اور
شراب، بہت ہی خاص قسم کی طوائفیں اور لڑکے جن کو پہلے کسی نے نہیں چھوا۔
نواب اکبر بگٹی کے لہجے میں زہریلی حقارت تھی۔'' (۳۱)

ذوالفقار علی بھٹو بڑی صلاحیتوں والے انسان تھے۔ اُس نے بہت کم عرصے میں بڑی بڑی سیاسی کامیابیاں حاصل کیں۔ پاکستان کو پہچان دی اور پاکستانیوں کو نیا و متفقہ آئین دیا۔ اُن کے بارے میں تقریباً سب لوگوں کا خیال ہے کہ وہ بڑے دلیر سیاسی لیڈر تھے اور اُس نے اُس وقت کی فوجی حکومت سے کوئی سمجھوتہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن ایک آپ بیتی

ذوالفقار علی بھٹو کے بارے میں ایک جدا اور منفرد انکشاف کرتی ہے:

"بھٹو کو کیوں مرنا پڑا؟ میں نے پوچھا۔ دو باتیں ہیں۔ آپ جانتی ہیں جنرل ضیاء الحق نے جواب دیا۔ جب اُسے گرفتار کیا گیا تو اُسے جیل میں نہیں مری میں ایک شاندار بنگلے میں رکھا گیا۔ اس کے بعد اُسے رہا کر دیا گیا اور وہ میرے پاس آیا۔ ضیاء تیرے پاس طاقت ہے لیکن میرے پاس ذہن ہے۔ ہم دونوں مل کر ایک شاندار ٹیم بن سکتے ہیں۔ میں نے کہا کہ (اب) کچھ نہیں ہو سکتا۔" (۳۲)

ذوالفقار علی بھٹو ضرورت سے زیادہ روشن خیال تھا۔ وہ ہر وقت اِس کوشش میں ہوتے کہ کس طرح باہر کی دُنیا بالخصوص مغربی طاقتوں کو یہ باور کرائے کہ میں اپنے ملک کو فرسودہ خیالات سے نکال کر جدیدیت کی طرف لے جا رہا ہوں چنانچہ سرکاری ٹی وی پر اشتہارات اور دیگر پروگرام دراصل اُن کا باہر والوں کو پیغام تھا۔ بھٹو کے اِس قسم کے اقدامات میں بڑے شہروں میں مخلوط پارٹیوں کو رواج دینا بھی تھا۔ پاکستان کی ایک سابق وزیر عطیہ عنایت اللہ کا اِن مخلوط مجلسوں کے بارے میں ہوش رُبا انکشاف ملاحظہ ہو:

"بھٹو کے زمانے میں کی (Key) کلب ہوتی تھیں۔ لوگ ایک برتن میں اپنی کار کی چابیاں ڈال دیتے تھے اور عورتیں ان مردوں کے گھروں میں اُن مردوں کے ساتھ چلی جاتی تھیں جن کی چابیاں وہ اُٹھاتی تھیں۔" (۳۳)

بشریٰ رحمٰن وہ مصنفہ ہیں جو سچ بات کہنے اور لکھنے سے نہیں گھبراتیں۔ چودھری شجاعت حسین کے بارے میں اپنی آپ بیتی میں لکھتی ہیں:

"البتہ چودھری صاحب نے اپنے پرانے گھر کے باہر والی سڑک پر خاردار تار لگا دیے تھے اور پروٹوکول سٹاف کے خیمے بھی۔ آنے والوں کی جانچ پڑتال ہوتی جبکہ چودھری صاحب کا حکم تھا کہ کسی ملاقاتی کو نہ روکا جائے اور سب کو کھانا کھلا کر بھیجا جائے۔ سیاست میں صرف چودھری برادران کا دستر خوان دیکھا جو ہر چھوٹے بڑے ملاقاتی کے لیے ہمیشہ ہر موسم میں کھلا رہتا تھا۔ سردی ہو یا گرمی وہ اقتدار کے اندر ہوں یا باہر حتیٰ کہ ڈرائیوروں کو باقاعدہ کھانا کھلایا جاتا گویا مدعا یہ تھا: کر تواضع کہ ہو تسخیر یہ عالم سارا۔" (۳۴)

بشریٰ بی بی جن سیاستدانوں میں کمزوری دیکھتی ہیں وہ بھی بیان کرنے سے نہیں ہچکچاتیں۔ایک طرف چودھری برادران کی تعریف کرتی ہیں اور دوسری سانس میں اُسی پارٹی کے شوکت عزیز کی شخصیت کے بارے میں یہ انکشاف کرتی ہیں:

> ''وزیرِاعظم بنتے ہی شوکت عزیز کا حلیہ ہی بدل گیا۔ ہر روز نیا سوٹ اور خوبصورت خوش رنگ نکٹائی لگاتے۔ اپنے دورِ اقتدار میں آپ نے انتہائی بیش قیمت سوٹوں اور ٹائیوں کا رواج ڈالا۔ یہ سب امپورٹڈ ہوتے۔ چونکہ وزیرِاعظم کا ہر خرچہ حکومت کے ذمے ہوتا ہے اِس لیے اگر وہ پچاس لاکھ کا سوٹ اور پانچ لاکھ والی ٹائی باندھنا چاہے تو کوئی ممانعت نہیں۔ شروع شروع میں شوکت عزیز انگریزی میں تقریر کرتے تو کوئی دھیان نہ دیتا۔ قارئین کے علم کے لیے لکھ رہی ہوں کہ ایوان کے اندر انگریزی زبان چلتی نہیں نہ کوئی توجہ سے سنتا ہے اور نہ ڈیسک بجاتا ہے۔ ایوان میں صرف اُردو زبان کا ڈنکا بجتا ہے۔ اِس لیے شوکت عزیز کو بھی صدر پرویز مشرف کی طرح رفتہ رفتہ سلیس اُردو سیکھنا پڑی۔'' (۳۵)

۶۔ کامیاب زندگی گزارنے کے گُر:

آپ بیتی پڑھنے کے جہاں بے شمار فوائد ہیں وہاں ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ ہم مصنف کی زندگی کو غور سے پڑھیں اور اُن اسباب و عوامل پر غور کریں جس کی بدولت وہ ایک بڑا شخص بنا۔ ہو سکے تو ہم بھی اُن اُصولوں کو اپنی زندگی میں لائیں۔ اِس سے ہمیں ذہنی سکون، ایک خاص طرح کا اطمینان نصیب ہوتا ہے اور ہم بھی زندگی کے مشکل مراحل کامیابی سے سر کر سکتے ہیں۔ کوئی بھی شخص ماں کے پیٹ سے جنرل، صدر، وزیرِاعظم، وزیر، گورنر، تاجر، مالدار سیٹھ اور نامور آدمی پیدا نہیں ہوتا بلکہ لگاتار جدوجہد، سخت ترین محنت اور اپنے کام کے ساتھ اخلاص ہی سے ایک کامیاب آدمی بنتا ہے۔ آپ بیتیاں ہمیں دعوت دیتی ہیں کہ کس طرح عام اور معمولی لوگ سیاہ و سفید کے مالک بن جاتے ہیں۔ نیز بڑے لوگوں کو بھی قدم قدم پر رُکاوٹیں سامنے آتی ہیں تاہم مسلسل ناکامیوں سے وہ مایوس نہیں ہوتے۔ خان عبدالغفار خان ایک بڑے سیاسی رہنما تھے۔ آپ نے اپنے صوبے کے لوگوں میں سیاسی، سماجی اور فکری شعور پیدا کیا۔ وہ اِس دھرتی کے پہلے حریت پسند تھے جس نے منظم طریقے سے انگریز کے خلاف آزادی کی بھرپور جنگ لڑی۔ آپ کا بڑا کارنامہ پٹھانوں کو انگریز کے خوف سے نکالنا اور اپنے حق کے لیے آواز بلند کرنا ہے۔ عبدالغفار خان نے اپنی آپ بیتی میں اپنی زندگی کے کئی واقعات لکھے ہیں اور پھر اس سے اپنی کامیاب

زندگی کا یہ نتیجہ اخذ کیا ہے:

> ''اُوپر کے حالات بتانے کا مقصد یہ ہے کہ جو لوگ بلند ہونا چاہتے ہیں اُن کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہر قسم کے خطروں کو لبیک کہنے کے لیے تیار رہیں۔ مصائب و مشکلات سے گھبرائیں نہیں اور کوئی راہ ایسی نہ چھوڑیں جو اُن کی بہتری کے لیے ہو، چاہے اُس راہ کو اختیار کرتے ہوئے اُن کے لیے کتنی بھی مشکلات کیوں نہ پیدا ہوں۔''(۳۶)

عمران خان عجیب کرشماتی شخصیت کے مالک ہیں۔ زندگی میں جتنی عزت، شہرت اور عوامی مقبولیت اُس کے حصے میں آئی بہت کم لوگوں کو نصیب ہوئی ہوگی۔ عمران خان آج بھی نوجوانوں کے دِل کی دھڑکن ہیں جو اُس کی زندگی کی کہانی میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ عمران خان اپنی آپ بیتی میں اپنی کامیابی کا یہ راز بتاتا ہے:

> ''دباؤ میں آدمی تب آتا ہے جب شکست کا خوف اُسے آلے۔ خطرہ باہر نہیں اندر ہوتا ہے آدمی کے ذہن میں، کھیلنے کے لیے وکٹوں کی طرف جاتے ہوئے۔ جب ٹیم بحران میں ہو اور آپ پہلی گیند پر آؤٹ ہونے کے خوف کا شکار ہو گئے تو تباہی مقدر ہے۔ جب ناکامی کا اندیشہ ذہن کو جکڑ لیتا ہے تو منفی قیادت کی فصل اُگتی ہے۔''(۳۷)

عمران خان زندگی کے تمام مسائل کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کو ہی کامیابی کا گر بتاتے ہیں۔ چنانچہ تحریر کرتے ہیں:

> ''زندگی کے ہر شعبے میں خوف سے آزادی کامیابی کی بہترین ضمانت ہے۔ ایک سپاہی جو موت سے ڈرتا ہے کبھی اعزاز کا مستحق نہیں ہوتا۔ ایک تاجر جو خطرہ مول نہیں لیتا تو اُس کی کامیابی کا امکان کم ہو جاتا ہے۔ ایک لیڈر جس میں جرأت کی کمی ہو کبھی عزت نہیں پا سکتا اور نہ اپنی ٹیم میں جذبہ پیدا کر سکتا ہے۔'' (۳۸)

پرویز مشرف نے ایک متوسط خاندان میں آنکھ کھولی۔ اِس طبقے کے اکثر لوگ عام طور پر اعلیٰ ترین مقام پر پہنچنے کی اُمید ہی نہیں کرتے۔ وہ اپنی گزری ہوئی زندگی کے نشیب و فراز کی کہانی سنا کر یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فضل اور مہربانی شامل نہ ہو تو آپ کی کوئی صلاحیت آپ کے کام نہیں آتی۔ زندگی میں کامیابیاں حاصل کرنے کے لیے دیگر چیزوں کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کا خصوصی کرم بھی نہایت ضروری ہے۔ وہ ذاتی تجربے کی روشنی میں کامیابی حاصل کرنے کے چار

خصوصیات بیان کرتا ہے:

"اوّل میں نے زندگی میں خود دیکھا ہے کہ مشکل حالات میں اگر نقصان پہنچنے کا احتمال ہو تب بھی ایمانداری سے کام لینا چاہیے۔ دوم جو کچھ بھی میں نے حاصل کیا اُس نے مجھے مطمئن اور ہر قسم کے لالچ اور بسیار طلبی سے دُور رکھا۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں نے اِتنی ترقی کی لیکن اگر ایسا نہ ہوتا تب بھی میں مطمئن رہتا۔ ایک انسان کو درخت کی طرح ہونا چاہیئے جو جتنا اُونچا ہوتا ہے اُتنا ہی لچکدار ہو جاتا ہے۔ سوم اپنے عروج کے باوجود انکساری آپ کا قد بڑھاتی ہے۔" (۳۹)

جاوید ہاشمی بھی ہمارے سیاستدانوں کے اُس قبیلے سے ہیں جس کا تعلق کسی جاگیر دار یا سیاسی خاندان سے نہیں ہے۔ آپ نے اپنی محنت سے اپنا مقام بنایا اور ثابت کیا کہ نچلے طبقے کا فرد بھی اگر چاہے تو ہر شعبہ زندگی میں ترقی کر کے اپنا اور اپنے خاندان کا نام روشن کر سکتا ہے۔ محنت دنیا میں تمام کامیابیوں کی کنجی ہے۔ محنت کے بغیر کامیابی دیرپا نہیں ہوتی۔ جو خوشی محنت کے بعد ملنے والی کامیابی پر ملتی ہے اُس کا تصور ہی انسان کو فرحت عطا کرتا ہے۔ جاوید ہاشمی محنت کو ہر کامیابی کی کلید کہتا ہے:

"دنیا میں اگر کوئی فرشتہ بھی آسمان سے نازل ہو اور وہ محنتی نہ ہو تو اُس کی کامیابی کا اِس دنیا میں کوئی امکان نہیں اور اگر کوئی شخص محنتی ہو اور اُس میں کوئی غیر معمولی نقص نہ ہو تو اُس کی کامیابی میں کوئی شک نہیں۔ میں نے درجنوں سیلف میڈ لوگوں کی زندگیوں کا مطالعہ کیا ہے۔ اُن سے ملا ہوں اور اُن سے اُن کی کامیابی کے بارے میں گھنٹوں باتیں کی ہیں۔ اِن میں سے ایک بھی ایسا نہیں ملا جو انتہائی محنتی نہ ہو۔ میں نے تجارتی لحاظ سے تباہ حال لوگوں کی زندگیوں پر بھی غور کیا ہے۔ اُن میں پچھتر فیصد ایسے لوگ تھے جن کا وقت محنت کی جگہ عیش وآرام کی نظر ہوا۔" (۴۰)

۷۔ نرگسیت/مبالغہ:

نرگسیت (Narcissism) بنیادی طور پر علم نفسیات کی اصطلاح ہے جو خود پرستی یا حُبِ ذات کے اُلجھاؤ کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ "ادبی اصطلاح" کے مصنف پروفیسر انور جمال نرگسیت کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"خود اپنی ہر ادا پر سو سو جان سے فدا ہونا نرگسیت ہے۔ خود ہی محب، خود ہی محبوب

گویاپیش نظرہے آئینہ دائم نقاب میں، کی کیفیت ہوتی ہے۔'' (۴۱)

مشاہیر اور حکمران طبقے کے لوگ چونکہ ہر وقت لوگوں کی توجہ کا مرکز ہوتے ہیں، ہر وقت میڈیا میں زیر بحث رہتے ہیں جہاں جاتے ہیں تمام نگاہیں اُن کی طرف اُٹھتی ہیں، کیمروں کی چکاچوند کے سامنے اُن کے شب وروز گزرتے ہیں اس لیے اُن میں نرگسی رویے پروان چڑھتے ہیں۔ سیاستدانوں کی آپ بیتیوں میں یہ خصوصیت بھی خاص طور پر نوٹ کی گئی کہ نرگسیت اور مبالغہ آرائی کسی نہ کسی سطح پر ان آپ بیتیوں میں موجود تھی۔

شیخ رشید احمد ایک غریب پس منظر رکھنے والے سیاستدان ہیں۔ راولپنڈی کے بابڑا بازار کے تنگ وتاریک ماحول سے اُٹھنے والے شیخ رشید احمد کے لاشعور میں غربت، افلاس سمایا ہوا ہے۔ کثیر الاولاد والدین کے گھر میں پرورش پانا اُن کے ذہن کے نہاں خانوں میں محفوظ ہے اِس لیے جب اُن کو موقع ملا اُس نے بچپن کی محرومیوں کو شاہ خرچیوں سے مٹانے کی کوشش کی۔ ماہرین نفسیات کہتے ہیں کہ سپرنگ کو جتنا دبایا جائے اُتنا ہی وہ اُچھلتا ہے۔ اگر کسی بچے پر بچپن میں سختی کی جائے تو وقت آنے پر وہ اُتنا ہی، عیاش اور فضول خرچ نکلتا ہے۔ شیخ رشید احمد اپنی سرگزشت میں اِن نرگسی رویوں کی طرف اِن الفاظ میں اشارہ کرتے ہیں:

> ''اب میں سکوٹر کے بجائے گاڑی پر سوار ہو چکا تھا اور ٹرین کے دھکوں کے بجائے ہوائی جہازوں کی فرسٹ کلاس میں سفر کرتا۔ نیا نیا امیر ہوا تھا اِس لیے شاہ خرچ بھی بہت تھا۔ اچھا لباس اور اچھا کھانا میری کمزوری تھی۔ چاہے میرے پاس واپسی کا کرایہ نہ بچے لیکن اِس کے باوجود میں کوشش کرتا کہ فرسٹ کلاس میں سفر کروں۔ میں لوگوں کو بتانا چاہتا تھا کہ اب اُن کے درمیان میرا کیا مقام ہے۔''(۴۲)

بے نظیر بھٹو ایک دلیر خاتون تھیں۔ مردوں کے غلبے والے معاشرے میں اُس نے اپنی ایک ساکھ بنائی تھی۔ اگر چہ وہ ذوالفقار علی بھٹو کی بیٹی تھی لیکن اُس نے بعد میں ثابت کیا کہ اُس میں خود بھی بڑی سیاسی بصیرت اور قائدانہ صلاحیتیں موجود ہیں۔ بے نظیر بھٹو کی آپ بیتی سے عیاں ہے کہ مصنفہ خود کو اور اپنی کہانی کو بڑھا چڑھا کر پیش کر رہی ہے۔ وہ بار بار اِس بات کی طرف ہماری توجہ دِلاتی ہیں کہ عورت ہونے کے باوجود وہ کسی طرح مردوں سے کم نہیں۔ ایک مرتبہ لیاری کے ایک جلسے میں جب اُن پر لاٹھی چارج کیا گیا اور آنسو گیس پھینکی گئی تو آپ نے بڑی مہم جوئی دکھائی۔ اپنی ایک دوست کا دوپٹہ سر پر لیا اُسی کا حلیہ بنایا اور ٹیکسی میں یک و تنہا بیٹھ کر کلفٹن کی طرف روانہ ہوئی۔ یہ مہم جوئی اُن کے لیے مہنگی پڑ سکتی تھی لیکن خوش قسمت تھی کہ اُس وقت محفوظ رہیں۔ یہاں مصنفہ بین السطور یہ پیغام دے رہی ہیں کہ اُس جیسا کوئی نہیں:

"جب ہم کلفٹن کے قریب پہنچتے ہیں وہاں پولیس رکاوٹیں کھڑی کی ہوئی ہیں اور ہر طرف پولیس ہی پولیس ہے۔ ڈرائیور گھبرا جاتا ہے۔ معمول کے مطابق گاڑی چلاؤ اور اپنی ایک ہی رفتار رکھو، میں اُسے کہتی ہوں۔ پولیس کو پیلی گاڑی کی تلاش نہیں بے چارہ ڈرائیور کانپ رہا ہے۔ میں نے سمیعہ کا دوپٹہ پہنا ہوا ہے اور پولیس والے مجھے نہیں پہچانتے۔ کیا کرایہ لوگے میں اپنا بٹوہ نکال کر ڈرائیور سے پوچھتی ہوں۔ میں ٹیکسی ڈرائیور نہیں یہ میری اپنی کار ہے۔ تم ڈرائیور نہیں ہو؟ میں حیرت سے پوچھتی ہوں کیونکہ میں اُسے بُری طرح حکم دیتی رہی۔ نہیں میں تو صرف پی پی پی کا ایک حامی ہوں وہ یہ کہتے ہوئے چلا جاتا ہے۔" (۴۳)

راجہ انور کی آپ بیتی میں بھی انتہائی مبالغہ، تعلی اور نرگسیت پائی جاتی ہے جو اُن کی شخصیت کے مختلف روپ آشکارا کرتی ہیں۔ وہ بار بار قاری کی توجہ اِس بات کی طرف مبذول کراتا ہے کہ وہ بہت اُصول پسند ہے اور جیل قوانین کا احترام کرتا ہے۔ ایک واقعے کا حوالہ دیتا ہے کہ ایک مرتبہ اُنہیں دِن دھاڑے جیل سے بھاگ جانے کا موقع ہاتھ آیا لیکن اُس نے ایسا کرنا مناسب نہ سمجھا۔ لکھتے ہیں:

"چنانچہ کھٹاک سے مرکزی گیٹ کھلا اور پہرہ دار جیسے جھپٹ کر مجھے تقریباً گھسیٹتا ہوا اندر لے گیا۔ وہ بار بار منتیں کرتا رہا۔ صاحب کو نہ بتایے گا مجھے شناخت نہ تھی یہاں نیا آدمی ہوں۔ اُسے تسلی دی کہ فکر نہ کرو لیکن وہ اِس بات پر بھی پریشان تھا کہ کس قیدی سے واسطہ پڑا ہے جو فرار ہونے کے بجائے زبردستی واپس آگیا اور خوش بھی تھا کہ اُس کی جان بچ گئی اگر میری جگہ دوسرا قیدی ہوتا تو پہرہ دار کی شامت آجاتی۔" (۴۴)

فوجی جوانوں اور افسروں کے بارے میں عام لوگوں کی رائے یہ ہے کہ یہ لوگ کافی مبالغے سے کام لیتے ہیں۔ فوج میں ایک افسر جوں جوں ترقی کرتا ہے توں توں وہ مختصر لوگوں تک محدود ہوتا جاتا ہے اِس لیے نرگسیت اور دیگر نفسیاتی عوارض کا بھی شکار ہو جاتا ہے۔ جنرل ایوب خان اور پرویز مشرف کی آپ بیتیاں ہمارے اِس دعوے کی گواہی دیتی ہیں۔ ایوب خان کی آپ بیتی میں مذکورہ عنصر اِتنا زیادہ نہیں کیونکہ اُس نے خارج پر توجہ دی اور اپنے ذاتی احساسات، کیفیات، جذبات، تکلیفات اور دُکھ درد بیان کرنے کے بجائے اپنی حکومت کی بے مثال کارکردگی کا ڈول پیٹا ہے۔ پرویز مشرف کی

آپ بیتی البتہ فن آپ بیت نگاری پر بڑی حد تک پوری اُترتی ہے۔ پرویز مشرف کے یہاں مبالغہ اور نرگسیت واضح دیکھے جا سکتے ہیں۔ اپنے افسرِ اعلیٰ کی ماتحتی میں جب اُنہیں کام آسان نہیں لگا اور جب کمانڈر کی اظہار برہمی نے اُنہیں شدید طیش میں مبتلا کر دیا اُس موقع پر مشرف نے اپنا ردّ عمل بیان کیا ہے۔ اِس موقع پر مشرف کا مبالغہ آمیز رویہ اور نرگسیت قابل غور ہے:

"اور میں نے اپنے کمانڈر سے کہا کہ اگر مجھے صحیح بات کرنے پر ڈانٹ پڑتی ہے تو معلوم نہیں میں آئندہ فیصلے کیسے کروں گا۔ اِس پر اُنہیں ایک جھٹکا سا لگا اُس نے مجھے تسلی دی اور پھر خوش قسمتی سے وہ میرے ساتھ اپنے رویے میں بہت محتاط ہو گئے۔" (۴۵)

۸۔ اسفار کی تفصیلات:

ہمارے سیاستدانوں نے آپ بیتیوں میں اپنے سفروں کا حال بھی سنایا ہے۔ انھوں نے بیرون ممالک سیاحت کے دوران کیے گئے مشاہدات و تجربات لکھ کر عالمی مشاہیر سے اپنی ملاقاتوں کا احوال بیان کیا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے سیاستدان بیرون ممالک کے دوروں کے بارے میں کیا تاثرات پیش کرتے ہیں اور کون کون سی نئی چیزیں، خیالات، معلومات وغیرہ اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ یوں تو ہر سیاسی رہنما نے اپنی آپ بیتی میں بیرون ممالک سفروں کی تفصیلات دی ہیں تاہم منظور احمد وٹو، یوسف رضا گیلانی، گوہر ایوب خان اور سیدہ عابدہ حسین نے جتنی تفصیل سے اپنے غیر ملکی دوروں کے بارے لکھا ہے باقی آپ بیتی نگاروں کے ہاں اتنی تفصیل نظر نہیں آتی۔ بلکہ منظور احمد وٹو اور یوسف رضا گیلانی کی آپ بیتی پر تو سفر نامے کا گمان ہوتا ہے۔ یوسف رضا گیلانی کی آپ بیتی کا یہ اقتباس پڑھیے جو خود بھی عالم وارفتگی میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے اور قاری کو بھی اَن دیکھے جزیروں میں اپنے ساتھ لے جاتا ہے:

"دورہ چین کے دوران ہمیں پیانو سٹی لے جایا گیا۔ وہاں ایک خاص وقت میں پوری آبادی سے پیانو کی بڑی دلفریب اور مدھر آوازیں آتی ہیں۔ امریکہ کے صدر رچرڈ نکسن بھی وہاں جا چکے تھے۔ وہ لمحے ہمارے لیے سحر انگیزی اور دلکشی کا منفرد تجربہ تھا۔ اُس پیانو سٹی میں پہاڑ کی چوٹی پر ایک مقام ایسا بھی ہے جس تک پہنچنا سخت چڑھائی کے سبب دُشوار ہے۔ وہاں مشہور ہے کہ صرف بہادر لوگ ہی چوٹی تک پہنچ سکتے ہیں۔ میں بھی کوشش کر کے اُس چوٹی تک پہنچ گیا۔" (۴۶)

گوہر ایوب خان قومی اسمبلی کے سابق سپیکر تھے۔ ایک مرتبہ حکومت ترکی کی دعوت پر اُن کے سرکاری مہمان بنے۔ وہ اپنی یادداشتوں میں ترکی کے متعلق مفید معلومات دے کر ترکی کھانوں اور کلچر کی ایک جھلک بھی دکھاتے ہیں:

"قونیہ کا گورنر ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ، مہذب اور نہایت متحرک آدمی تھا۔ بعد ازاں شام کو گورنر ہمیں مولانا رومی کی مزار پر لے گیا۔ جہاں ہم نے فاتحہ کی۔ مزار سے ہمیں ایک دوسری جگہ لے جایا گیا جہاں روایتی رقص کا انتظام تھا۔ یہ بڑا خوشگوار تجربہ تھا۔ گورنر کو مولانا رومی کے تصورات اور اقبالیات دونوں پر دسترس حاصل تھی۔ بات چیت کے دوران وہ دونوں کے حوالے دیتے رہے۔ گورنر نے پاکستانی وفد کو عشائیہ بھی دیا جو ترکی کی روایتی مہمان نوازی کا آئینہ دار تھا۔ کھانے میں کباب کے علاوہ سفید شہد کے قتلے رکھے ہوئے تھے اُنہیں ٹافی کی طرح چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹا گیا تھا۔ شہد کے یہ قتلے پنیر اور ترکی روٹی کے ساتھ پیش کیے گئے۔" (۴۷)

سیدہ عابدہ حسین نے اپنی امریکی دوروں کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے۔ امریکہ میں سرکاری وفود، وزارت داخلہ اور وزارت خارجہ کے لوگوں سے تفصیلی گفتگو بھی بیان کی ہے۔ اُس زمانے میں جب پاکستان نے ایٹمی دھماکے نہیں کیے تھے تو پاکستانی سرکاری وفود پر امریکہ کی طرف سے ایٹمی پروگرام رول بیک کرنے کا کتنا دباؤ تھا یہ اور بہت کچھ عابدہ حسین نے اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے۔ وہ امریکہ کے ایک خاتون ڈپٹی سیکرٹری سے ملاقات کا احوال یوں بیان کرتی ہیں:

"ڈپٹی سیکرٹری کے دفتر میں داخل ہونے پر میں نے فوراً اچھا محسوس کیا۔ لارسن ایگل برگر کی ڈیسک پر رکھی ایک تختی پر لکھا تھا: سگریٹ نوشی کی آزادی ہے۔ جب میں بیٹھ گئی تو اُس نے مجھے ایک سگریٹ پیش کیا اور کہا کہ مجھ سے پہلے ہی میری شہرت وہاں پہنچ چکی تھی۔ وہ خوش اخلاق اور خوش دل تھی۔ اُس نے سگریٹ نوشی کرنے والوں اور سگریٹ نوشی کے بارے میں لطائف سنائے۔" (۴۸)

۹۔ اسلوبیاتی جائزہ:

اسلوبیاتی سطح پر ویسے تو گزشتہ ابواب میں تفصیل سے آپ بیتیوں کا جائزہ لیا گیا ہے یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ بحثیت مجموعی ان تمام آپ بیتیوں میں سادگی و سلاست اور افسانوی وڈرامائی انداز نظر آتا ہے۔ ان آپ بیتیوں میں شوخی وظرافت کے ساتھ ساتھ خوب صورت مناظر کی عکاسی بھی ملتی ہے۔ الفاظ وتراکیب اور ضرب الامثال کا خوبصورت استعمال اِن آپ بیتیوں کی اسلوبیاتی اور لسانی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے مگر یہاں یہ بات کہنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں کہ

مذکورہ آپ بیتیوں کے مطالعے کے بعد یہ بات سامنے آتی ہے کہ اِن آپ بیتی نگاروں میں بنیادی طور پر ایک بھی آپ بیتی نگار صاحب اسلوب نہیں کہلایا جاسکتا۔ وجہ یہ ہے کہ یہ تمام آپ بیتی نگار بنیادی طور پر ادیب نہیں تھے بلکہ ان کا بنیادی حوالہ سیاست وانتظامیہ ہے۔ البتہ ان آپ بیتی نگاروں کی ہاں کچا پکا ادبیانہ رنگ بہر حال موجود ہے۔

حوالہ جات

۱۔ اُردو میں جدید نثر نگاری کا اِرتقا، پروفیسر محمد ارشد کیانی، علمی کتب خانہ لاہور، سن اشاعت ندارد، ص ۳۴۔

۲۔ پردے سے پارلیمنٹ تک، بیگم شائستہ اکرام اللہ، ناشر و سن اشاعت ندارد، ص ۲۴۴، ۲۴۳۔

۳۔ ایضاً، ص ۲۵۱۔

۴۔ ایوان اقتدار کے مشاہدات، گوہر ایوب خان، سنگ میل لاہور ۲۰۰۷ء، ص ۲۹۔

۵۔ جرم سیاست، منظور احمد وٹو، جنگ پبلشرز لاہور، سن اشاعت ندارد، ص ۲۸۔

۶۔ خود اختیار کردہ جلاوطنی، بی۔ایم کٹی، جمہوری پبلی کیشنز لاہور ۲۰۱۲ء، ص ۳۴۱۔

۷۔ ''ہاں میں باغی ہوں'' جاوید ہاشمی، ساگر پبلشرز لاہور ۲۰۰۵ء، ص ۵۱۔

۸۔ خود اختیار کردہ جلاوطنی، بی ایم کٹی، جمہوری پبلی کیشنز لاہور ۲۰۱۲ء، ص ۲۴۸، ۲۴۷۔

۹۔ پاکستان کی نظریاتی تاریخ حکومت و سیاست، محمد آصف ملک، پبلشرز ایمپوزیم لاہور ۲۰۱۱ء، ص ۴۰۳۔

۱۰۔ اگر مجھے قتل کیا گیا، ذوالفقار علی بھٹو، علم و عرفان پبلشرز لاہور ۲۰۱۵ء، ص ۱۴۳۔

۱۱۔ ''پاکستان اور نوکر شاہی''، ڈاکٹر محمد احمد قادر، مشمولہ ''روزنامہ جنگ راولپنڈی'' ۱۴، اگست ۱۹۹۷ء۔

۱۲۔ ''ہاں میں باغی ہوں'' جاوید ہاشمی، ساگر پبلشرز لاہور ۲۰۰۵ء، ص ۷۴۔

۱۳۔ ''دلکھی کو کون موڑے'' بشریٰ رحمٰن، مشمولہ الحمرا لاہور، شمارہ اکتوبر ۲۰۱۷ء، ص ۶۶۔

۱۴۔ میں اور میرا پاکستان، عمران خان، مترجم: ہارون الرشید، جہانگیر بک ہاؤس ۲۰۱۱ء، ص ۹۸۔

۱۵۔ سب سے پہلے پاکستان، پرویز مشرف، مترجم: ہدایت خویشگی، فیروز سنز لاہور ۲۰۰۶ء، ص ۱۷۸۔

۱۶۔ فرزند پاکستان، شیخ رشید احمد، رُمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز لاہور ۲۰۱۳ء، ص ۱۰۹۔

۱۷۔ پسِ نوشت، بشریٰ رحمٰن، مشمولہ الحمرا لاہور، شمارہ جون ۲۰۱۸ء، ص ۳۹۔

۱۸۔ ''ایک نڈر اور بے باک خاتون کی نوٹ بک'' ڈاکٹر مسرت بانو، مشمولہ الحمرا لاہور، شمارہ جنوری ۲۰۱۹ء، ص ۱۲۶۔

۱۹۔ فرزند پاکستان، شیخ رشید احمد، رُمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز لاہور ۲۰۱۳ء، ص ۱۵۴۔

۲۰۔ ''سب سے پہلے پاکستان'' پرویز مشرف، مترجم: ہدایت خویشگی، فیروز سنز لاہور ۲۰۰۶ء، ص ۱۰۴۔

۲۱۔ ''اور بجلی کٹ گئی'' سیدہ عابدہ حسین، الفیصل لاہور ۲۰۱۷ء، ص ۱۴۵۔

۲۲۔ ''بڑی جیل سے چھوٹی جیل تک''راجہ انور، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۱۱ء، ص۹۷،۹۶۔

۲۳۔ خود اختیارہ کردہ جلاوطنی، بی ایم کٹی، جمہوری پبلی کیشنز لاہور ۲۰۱۲ء، ص۵۱۔

۲۴۔ ''سچ کہوں گا'' اعتزاز احسن، نگارشات پبلشرز لاہور ۲۰۰۹ء، ص۴۸،۴۷۔

۲۵۔ چاہ یوسف سے صدا، یوسف رضا گیلانی، نگارشات لاہور ۲۰۰۶ء، ص۲۳۳۔

۲۶۔ پنجاب کا مقدمہ، محمد حنیف رامے، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۱۰ء، ص۴۶۔

۲۷۔ میں اور میرا پاکستان، عمران خان، مترجم: ہارون الرشید، جہانگیر بک ۲۰۱۲ء، ص۲۱۰۔

۲۸۔ ایضاً، ص۲۲۔

۲۹۔ ایضاً، ص۹۴۔

۳۰۔ ''اور لائن کٹ گئی'' کوثر نیازی، علم و عرفان پبلشرز لاہور ۲۰۱۵ء، ص۱۵۸،۱۵۷۔

۳۱۔ پاکستان کا سیاسی سفر نامہ، ایماڈنکن، مترجم: ستار طاہر مقبول اکیڈمی لاہور ۱۹۹۶ء، ص۳۹۔

۳۲۔ ایضاً، ص۱۳۲۔

۳۳۔ ایضاً، ص۱۳۷۔

۳۴۔ ''لکھی کو کون موڑے'' بشریٰ رحمٰن، مشمولہ ''الحمرا لاہور، شمارہ اکتوبر ۲۰۱۷ء، ص۶۳۔

۳۵۔ ایضاً، ص۶۳۔

۳۶۔ میری زندگی اور جدوجہد، خان عبدالغفار خان، مترجم: پروفیسر یار محمد مغموم، یونورسٹی بک ایجنسی پشاور 2017ء، ص۲۵۔

۳۷۔ میں اور میرا پاکستان، عمران خان، مترجم: ہارون الرشید، جہانگیر بکس ۲۰۱۲ء، ص۱۰۲۔

۳۸۔ ایضاً، ص۸۶۔

۳۹۔ سب سے پہلے پاکستان، پرویز مشرف، مترجم: ہدایت خویشگی، فیروز سنز لاہور ۲۰۰۶ء، ص۴۱۱،۴۱۰۔

۴۰۔ ہاں میں باغی ہوں، جاوید ہاشمی، ساگر پبلشرز لاہور ۲۰۰۵ء، ص۷۶،۷۵۔

۴۱۔ ادبی اصطلاحات، پروفیسر انور جمال، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ۲۰۱۶ء، ص۱۷۱۔

۴۲۔ فرزند پاکستان، شیخ رشید احمد، رومیل ہاؤس راولپنڈی ۲۰۱۳ء، ص۸۶۔

۴۳۔ دختر مشرق، بے نظیر بھٹو، بھٹو لیگی فاؤنڈیشن لاہور ۲۰۱۱ء، ص۳۷۹۔

۴۴۔ بڑی جیل سے چھوٹی جیل تک، راجہ انور، سنگ میل لاہور ۲۰۱۱ء، ص ۵۱۔

۴۵۔ سب سے پہلے پاکستان، پرویز مشرف، مترجم: ہدایت خویشگی، فیروز سنز لاہور ۲۰۰۶ء، ص ۹۰۔

۴۶۔ چاہ یوسف سے صدا، یوسف رضا گیلانی، نگارشات لاہور ۲۰۰۶ء، ص ۱۶۱۔

۴۷۔ ایوان اقتدار کے مشاہدات، گوہر ایوب خان، سنگ میل لاہور ۲۰۱۳ء، ص ۳۲۸،۳۲۷۔

۴۸۔ ''اور بجلی کٹ گئی'' سیدہ عابدہ حسین، الفیصل لاہور ۲۰۱۷ء، ص ۳۱۱۔

کتابیات

ماخذ

بنیادی ماخذ:

اور بجلی کٹ گئی، سیدہ عابدہ حسین، الفیصل ناشران وتاجران کتب لاہور، ۲۰۱۷ء۔
اور لائن کٹ گئی، کوثر نیازی، علم و عرفان پبلشرز لاہور، ۲۰۱۵ء۔
ایوان اقتدار کے مشاہدات، گوہر ایوب خان، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۷ء۔
بڑی جیل سے چھوٹی جیل تک، راجہ انور، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۱ء۔
پردے سے پارلیمنٹ تک، بیگم شائستہ اکرام اللہ، العباس پبلشرز، سن اشاعت ندارد۔
پنجاب کا مقدمہ، محمد حنیف رامے، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۰ء۔
جبر اور جمہوریت، بیگم کلثوم نواز شریف، ساگر پبلشرز لاہور، ۲۰۰۷ء۔
جرم سیاست، منظور احمد وٹو، جنگ پبلشرز لاہور ۲۰۰۱ء۔
جس رزق سے آتی ہے پرواز میں کوتاہی، محمد ایوب خان، مترجم: غلام عباس، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۳ء۔
چاہ یوسف سے صدا، یوسف رضا گیلانی، نگارشات پبلشرز لاہور، ۲۰۰۶ء۔
دُختر مشرق، بے نظیر بھٹو، مترجم: عبدالعلی شوکت، بھٹو لیگیسی فاؤنڈیشن لاہور، ۲۰۱۱ء۔
سب سے پہلے پاکستان، پرویز مشرف، مترجم: ہدایت خویشگی، فیروز سنز لاہور، ۲۰۰۶ء۔
سچ تو یہ ہے، چودھری شجاعت حسین، فیروز سنز لاہور، ۲۰۱۸ء۔
سچ کہوں گا، چودھری اعتزاز احسن، نگارشات پبلشرز لاہور، ۲۰۰۹ء۔
سفر زندگی، الطاف حسین، جنگ پبلشرز لاہور، ۱۹۸۸ء۔
فرزند پاکستان، شیخ رشید احمد، رُمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز راولپنڈی، ۲۰۱۳ء۔
کیا میں پاگل تھا؟، اجمل خٹک، مترجم: آغا زاہد، پشتو ادبی غورزنگ پشاور، ۲۰۱۰ء۔
میری تنہا پرواز، کلثوم بیگم، علی پبلشنگ بیورو، اسلام آباد، ۲۰۱۱ء۔
میری زندگی اور جدوجہد، خان عبدالغفار، مترجم: پروفیسر یار محمد مغموم، یونیورسٹی بک ایجنسی پشاور، ۲۰۱۷ء۔

میں اور میرا پاکستان، عمران خان، مترجم: ہارون الرشید، جہانگیر بکس ہاؤس لاہور، ۲۰۱۱ء۔
وزیر جیل سے اسیر جیل تک، سید قمر عباس، بے نظیر بکس لاہور، ۲۰۰۹ء۔
ہاں میں باغی ہوں!، جاوید ہاشمی، ساگر پبلشرز لاہور، ۲۰۰۵ء۔

ثانوی ماخذ:

(الف) کتب:

آپ بیتی کے توانا لہجے، قدرت اللہ شہزاد، ستلج پبلشرز بہاؤلپور، ۲۰۰۴ء۔
آپ بیتی، خواجہ حسن نظامی، نظامی پریس دہلی، ۱۹۱۴ء۔
اپنی تلاش میں، کلیم الدین احمد۔ مکتبہ اردو لاہور ۱۹۷۵ء
ادبی اصطلاحات، پروفیسر انور جمال، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ۲۰۱۶ء۔
اصناف ادب، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۲ء۔
اعمال نامہ، سر رضا علی، فکشن ہاؤس لاہور، ۱۹۹۵ء۔
اُردو انسائیکلو پیڈیا، چوتھا ایڈیشن، فیروز سنز لاہور، ۲۰۰۵ء۔
اُردو خود نوشت فن اور تجزیہ، وہاج الدین علوی، شعبہ اُردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، ۱۹۷۹ء۔
اُردو خود نوشت سوانح حیات آزادی کے بعد، ڈاکٹر محمد نوشاد عالم، عرشیہ پبلشرز نئی دہلی، ۲۰۱۱ء۔
اُردو میں جدید نثر نگاری کا ارتقا، پروفیسر محمد ارشد کیانی، علمی کتب خانہ لاہور، سن اشاعت ندارد۔
اُردو میں سوانح نگاری، ڈاکٹر سید شاہ علی، گلڈ پبلشرز ہاؤس لاہور، ۱۹۶۱ء۔
اُردو میں سوانح نگاری کا ارتقا، الطاف فاطمہ، کتاب گھر اُردو بازار لاہور، ۱۹۸۸ء۔
اُردو نثر کا فنی ارتقا، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، الوقار پبلشرز لاہور، ۲۰۰۳ء۔
اسلوبیاتی تنقید، طارق سعید، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی
اور تبدیلی لائی گئی، سلیم صافی، ساگر پبلشر لاہور، 2018ء۔
بیوروکریسی کا زوال، محمد قیوم اعوان، ساگر پبلشرز لاہور، ۲۰۱۲ء۔
بیسویں صدی میں اُردو ادب، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ساہتیہ اکادمی دہلی، ۲۰۰۲ء۔
پاکستان، فوج اور سیاست، رفیق ڈوگر، دید شنید پبلشرز لاہور، ۱۹۹۷ء۔

پاکستان کا سیاسی سفر، ایماڈنکن، مترجم: ستار طاہر، مقبول اکیڈمی لاہور، ۱۹۹۶ء۔
پاکستان کی سیاسی تاریخ، جلد اوّل تا دہم، ادارہ مطالعہ تاریخ لاہور، ۱۹۹۲ء۔
پاکستان کی سیاسی جماعتیں، مرتبہ: پروفیسر محمد عثمان، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۴ء۔
پاکستان کی نظریاتی تاریخ، محمد آصف، ایمپوزیم پبلشرز لاہور، ۲۰۱۱ء۔
پاکستان کے پچاس سال، پروفیسر رفیع اللہ ہاشمی، مقبول اکیڈمی لاہور، سن اشاعت ندارد۔
پاکستان کے پہلے ساتھ وزرائے اعظم، نعیم احمد، جنگ پبلشرز لاہور، ۱۹۹۷ء۔
پاکستان میں اُردو ادب، ڈاکٹر سلیم اختر، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۳ء۔
پاکستان میں انٹیلی جنس ایجنسیوں کا سیاسی کردار، منیر احمد، گورا پبلشرز لاہور، سن اشاعت ندارد۔
پاکستان میں جمہوری حکومتیں قیام سے انجام تک، ظہیر احمد بابر، فاتح پبلشرز لاہور، ۲۰۰۱ء۔
پاکستان میں فوجی حکومتیں، مرتضیٰ انجم، دارالشعور لاہور، ۱۹۹۶ء۔
پس نوشت اور پس پس نوشت، ڈاکٹر پرویز پروازی، نیا زمانہ پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۳ء۔
تارڑ نامہ، جلد نمبر ۵، مستنصر حسین تارڑ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۴ء۔
تاریخ اور سماجیات، عائشہ بیگم، پرنٹ لائن پبلشرز لاہور، ۱۹۹۹ء۔
تاریخ پاکستان، محمد علی چراغ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۴ء۔
المیہ تاریخ، ڈاکٹر مبارک علی، فکشن ہاوس لاہور، ۱۹۹۵ء۔
جالب بیتی، حبیب جالب، مقبول اکیڈمی لاہور، ۱۹۷۹ء۔
جرنیل بیتی، مقبول ارشد، فیکٹ پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۶ء۔
جرنیل شاہی، منیر احمد، گورا پبلشرز لاہور، ۱۹۹۷ء۔
خود اختیار کردہ جلاوطنی، بی ایم کٹی، جمہوری پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۲ء۔
داستان غدر، سید ظہیر الدین ظہیر دہلوی، مکی دارالکتب لاہور، ۲۰۰۲ء۔
داستان میری، تصدق حسین راجہ، مکتبہ دانیال اسلام آباد، ۱۹۹۵ء۔
زیرو پوائنٹ، جاوید چودھری، علم و عرفان پبلشرز لاہور، ۲۰۰۷ء۔
سیاستدانوں کی قلابازیاں، وکیل انجم، فیروز سنز لاہور، ۱۹۹۴ء۔

سیاستدانوں کے اصلی چہرے، منیر احمد، شام کے بعد پبلشرز لاہور،۱۹۹۸ء۔
طیف نثر، ڈاکٹر سید عبداللہ، مرتبہ: ممتاز منگلوری، لاہور اکیڈمی لاہور، ۱۹۹۴ء۔
غدار کون؟ محمد نواز شریف، مرتبہ: سہیل وڑائچ، ساگر پبلشرز لاہور، ۲۰۰۶ء۔
فوج اور عدلیہ، منیر احمد، فرنٹیئر پوسٹ پبلشرز لاہور، ۱۹۹۳ء۔
فن ترجمہ نگاری، مرتبہ: خلیق انجم، سرسید بک ڈپو علی گڑھ، ۱۹۹۴ء۔
کشاف تنقیدی اصطلاحات، ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۸۵ء۔
کشور ناہید کی نوٹ بک، کشور ناہید، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۴ء۔
کیا پاکستان بھٹو نے توڑا؟ وسیم گوہر، سارنگ پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۷ء۔
قلم کمان ۲، حامد میر، دوست پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۴ء۔
مشاہدات، مشاہد حسین سید، حزینہ علم وادب لاہور، ۲۰۰۵ء۔
ناقابل فراموش، دیوان سنگھ مفتون، ساگر پبلشرز لاہور، ۲۰۱۳ء۔
نامور شخصیات کی آپ بیتیاں، مرتب: شاہد نذیر چودھری، ایجوکیشن پبلشنگ ہاؤس لاہور، ۱۹۹۴ء۔
نواز شریف ایک حکمران ایک سیاستدان، محمد فاروق قریشی، قومی پبلشرز لاہور، ۱۹۹۴ء۔
نواز شریف اٹک سے اڈیالا تک، سلیم سافی، ساگر پبلشرز لاہور، 2018ء۔
میں نے ہتھیار کیوں ڈالے؟، امیر عبداللہ خان نیازی، فیکٹ پبلی کیشنز لاہور، سن اشاعت ندارد۔
یادوں کی دُنیا، یوسف حسین خان، فکشن ہاؤس لاہور، ۱۹۹۵ء۔

(ب) رسائل و جرائد:

اُردو ڈائجسٹ آپ بیتی نمبر، جون ۲۰۱۸ء، کراچی۔
الحمرا، جون ۲۰۱۸ء، لاہور۔
الحمرا (سالنامہ)، جنوری ۲۰۱۹ء، لاہور۔
سیارہ ڈائجسٹ، آپ بیتی نمبر، مارچ ۱۹۸۰ء، لاہور۔
ماہ نو، خصوصی ایڈیشن، جلد ۶۹، شمارہ ۴، ۴ دسمبر ۲۰۱۶ء، وزارت اطلاعات و نشریات اسلام آباد۔
نقوش، آپ بیتی نمبر، جون ۱۹۶۴ء، ادارہ فروغ اُردو لاہور۔

(ج) غیر مطبوعہ مقالات:

""آپ بیتی کا فن اور جہان دانش""، ملیحہ وزیر حسین، غیر مطبوعہ مقالہ (ایم فل اُردو)، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد، ۱۹۹۷ء۔

""اُردو کی منتخب آپ بیتیوں میں ناول کے عناصر""، عاصمہ، غیر مطبوعہ مقالہ (ایم فل اُردو)، قرطبہ یونیورسٹی پشاور، ۲۰۱۲ء۔

""کشمیر میں اُردو آپ بیتی کی روایت""، فیاض نقی، غیر مطبوعہ مقالہ (ایم فل اُردو)، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد، ۲۰۱۲ء۔

""کوہاٹ میں اُردو آپ بیتی کا تعارف، تجزیاتی مطالعہ""، ارشد نعیم، غیر مطبوعہ مقالہ (ایم فل اُردو)، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد، ۲۰۱۰ء۔